ر
از مش
ران یوسفی

آخرِ شب کے ہمسفر

قرۃ العین حیدر

چودھری اکیڈمی

۳۱۳۔ ذوالقرنین چیمبرز، گنپت روڈ، لاہور

ناشر ——— محمد خالد چودھری
اہتمام ——— میاں محمد اسلم
مطبع ———
قیمت ——— پنتیس ۳۵ روپے

مطبوعہ
عبداللہ سنز پرنٹرز
۱۴ - دربار مارکیٹ - لاہور

پیش لفظ

بنگال کی دہشت پسند اور انقلابی تحریک، ۱۹۴۲ء کا اندولن، مطالبۂ پاکستان، تقسیمِ ہند اور قیام بنگلہ دیش کے تناظر میں لکھے ہوئے اس ناول کے تمام کردار قطعی فرضی ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں ولیم کینٹ ویل نام کا کوئی انگریز ڈھاکہ کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نہیں تھا۔ نہ اس کے بعد "چارلس بارلو، بنگال سویلین"۔ اسی طرح سر ایڈورڈ سے لے کر نوجوان رچرڈ تک سارا بارکو خاندان، دیپالی سرکار، ریحان الدین احمد، پادری بنرجی، اُما رائے، نواب قمر الزماں چودھری، جہاں آرا بیگم، ناصرہ نجم السحر، یاسمین بلمونٹ، وغیرہ وغیرہ سارے کردار اور ان سے منسوب واقعات خیالی اور محض افسانہ ہیں۔ اور کسی ہندوستانی، پاکستانی یا بنگلہ دیشی شخصیات سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

اس ناول کے اٹھائیس ابواب ۱۹۶۶ء۔۱۹۶۷ء میں رسالہ گفتگو (بمبئی) میں شائع ہو چکے ہیں۔

سرورق کی تصویر اسمبلاژ میں ناچیز نے بنائی ہے۔ کسان کا جھونپڑا، مسجد، کالی باڑی، آبی راستے اور نوکائیں، عہد ایسٹ انڈیا کمپنی کا جارجین کولونیل مکان اور دخانی جہاز مشرقی بنگال کا مخصوص نظارہ ہے۔ کولونیل مینشن انگریز حاکم یا پلانٹر یا بڑے بنگالی زمیندار کی جائے رہائش، مشرقی بنگال کے عظیم دریاؤں پر چلنے والا اور مشرقی بنگال کے "سنہرے ریشے" پٹ سن کو کلکتہ اور اسکاٹ لینڈ لے جانے والا جہاز بنگال کے تین سو سالہ سیاسی، ذہنی اور تہذیبی برٹش کنکشن کی علامت بھی ہے۔

قرۃ العین حیدر

بمبئی، مئی ۱۹۷۹ء

ابواب

نمبر صفحہ

۱۔ چندر کُنج ۹
۲۔ طوفان سے پہلے ۱۷
۳۔ وُوڈلینڈز ۲۰
۴۔ جوار بھاٹا کا گیت ۲۴
۵۔ کماری اُوما رائے ۲۸
۶۔ ریورنڈ پال میتھیو بنرجی ۴۸
۷۔ نیا عہد نامہ ۶۲
۸۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا بنگلہ ۶۶
۹۔ کلثوم آپا ۷۱
۱۰۔ ویشنو بیراگی ۷۵
۱۱۔ رلی کا ٹچ ۸۲
۱۲۔ شانتی نکیتن ۹۱
۱۳۔ مس روزی بنرجی اور سولیڈر ٹی ۹۴
۱۴۔ اُمار پرانیر آرام مو تیر آنند ۹۸

۱۵۔ سندربن ۱۰۱
۱۶۔ ارجمند منزل ۱۲۵
۱۷۔ گوڑ ملہار ۱۴۷
۱۸۔ میگھ رنجنی راگنی ۱۵۱
۱۹۔ بھیربی کا خواب ۱۵۴
۲۰۔ ہرے بنگال کا "آنند کانن" ۱۶۳
۲۱۔ اگست اندولن اور پیپلز وار ۱۶۸
۲۲۔ بدروہی ۱۷۱
۲۲۔ گنگا اور برہم پتر ۱۸۰
۲۴۔ چارلس بارلو، "بنگال سویلین" ۱۸۹
۲۵۔ نواب قمر الزماں چودھری ۲۳۲
۲۶۔ ریحان الدین احمد ۲۳۷
۲۷۔ جہاں آرا بیگم ۲۶۱
۲۸۔ رونگیلا نابیر مانجھی ۲۶۷
۲۹۔ شریمتی رادھیکا سانیال ۲۷۳
۳۰۔ ڈاکٹر بینوئے چندر سرکار ۲۷۹
۳۱۔ دلہن کی پالکی ۲۹۱
۳۲۔ کمل اور اکمل ۲۹۹

٣٣۔ برڈز آف پیراڈائز ٣٠٩
٣٤۔ ایستھر گری بالا بینرجی ٣٢٣
٣٥۔ یاسمین بلمونٹ، "ڈارک ڈانسر" ٣٢٦
٣٦۔ پائلٹ آفیسر اکمل مرشد زادہ ٣٢٧
٣٧۔ نشتکری کا ناچ ٣٣٤
٣٨۔ گڈلک ڈائری ٣٣٥
٣٩۔ شہزاد کرسٹینا بلمونٹ ٣٥٠
٤٠۔ سوامی آتم آنند شنکر ریمی ٣٥٣
٤١۔ جلسہ گھر ٣٥٦
٤٢۔ نامرہ نجم السحر قادری ٣٧٠
٤٣۔ رچرڈ بارلو ٣٧٦
٤٤۔ آتما شانتی ـ ؟ ٣٨٢
٤٥۔ ونگاڑ راگنی ٣٨٧
٤٦۔ بھیرو راگ ٣٩٢

۱

چندر کنج

ڈھاکہ شہر کے ایک درمیانی درجے کے رہائشی علاقے میں آم اور کیلے کے درختوں میں چھپی وہ ایک پرانی وضع کی سفید کوٹھی ہے۔ اس کی دیواریں کائی سے سبز ہو چکی ہیں اور روشن دانوں اور کھڑکیوں میں کئی جگہ پر شیشوں کی جگہ ٹین کے کنستر کے ٹکڑے اور دفتیاں لگی ہیں۔ سامنے کے برآمدے میں ایک سرے پر بانس کی مضبوط چٹائیاں کھڑی کر کے ایک کمرہ بنا دیا گیا ہے۔ کمرے کے دروازے پر نیلے رنگ کی آدھی ساری کا پردہ ٹنگا ہے۔ اندر ایک بنچ، ایک میز اور طبّی معائنے کا اونچا سا پلنگ بچھا ہے، جس کے گدّے کا نیلا چمڑا جگہ جگہ سے اُدھڑ گیا ہے۔ دواؤں کی الماریاں اور تام چینی کی چلمچی کا اسٹینڈ ایک دیوار کے برابر لگا ہوا ہے۔ میز کے پیچھے بڑا کیلنڈر آویزاں ہے۔

برآمدے اور کشادہ ہوادار کمروں کے سُرخ روغنی فرش بافراط پانی سے دھوئے جانے کی وجہ سے صاف ستھرے اور چمکیلے ہیں۔ برآمدے میں ایک بنچ اور دو تین مونڈھے پڑے ہیں اور دو سائیکلیں کھڑی ہیں۔ برآمدے میں سے اندر "بیٹھک خانہ" صاف دکھلائی دیتا ہے۔ اس میں بید کا ایک صوفہ اور چند بے جوڑ کرسیاں رکھی ہیں۔ کونے کی ایک میز پر کامنی غلاف سے ڈھکا ہارمونیم اور دیوار کے سہارے ایک اسراج بھی موجود ہے۔ بیٹھک کی دیواروں پر آمنے سامنے ایک مرد اور ایک عورت کے دو بڑے پورٹریٹ آویزاں ہیں۔ ان پر ایسی دھندلی سی کیفیت طاری ہے، جو کسی پُراسرار نامعلوم کیمسٹری کے ذریعے ان لوگوں کی تصویروں پر آپ سے آپ چھا جاتی ہے، جو مر چکے ہیں۔ عورت نوعمر اور دلکش، ریشمی ساری سے سر ڈھانپے اور ایک انگلی اپنی ٹھوڑی پر رکھے خاصی خوابناک آنکھوں سے کیمرے کو دیکھ رہی ہے۔ دوسری تصویر میں سفید شال لپیٹے ایک خوش شکل نوجوان سر جھکائے غور سے ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہا ہے۔

چند ضخیم کتابیں مخملیں میز پوش پڑی اس کی ایک ہتھی کے نزدیک رکھی ہیں۔ دونوں تصویروں پر گوٹے کے ہار پڑے ہیں، جن کا جھوٹا گوٹا تقریباً کالا پڑ چکا ہے۔

"بیٹھک خانے" کے دروازے پہلو کے دو کمروں میں کھلتے ہیں۔ دائیں جانب والے کمرے میں کھانے کی میز اور نعمت خانے کے نزدیک برابر برابر تین چارپائیاں۔ کونے میں بید کی تین میزوں پر اسکول کی کتابوں کے انبار۔ کھونٹی پر نیکریں اور قمیضیں۔ کینوس کے نئے اور پرانے جوتوں کا ڈھیر ایک کونے میں پڑا ہے۔ اَدھ کھُلے ٹین کے بکس چارپائیوں کے نیچے ٹھنسے ہیں۔ کھانے کی میز کھڑکی کے پاس بچھی ہے۔ یہ کھڑکی پہلو کے ہرے بھرے احاطے میں کھلتی ہے۔ اسی کمرے کے برابر میں ایک اور چھوٹا کمرہ ہے جس کی ایک دیوار پر لکڑی کے تختے لگا کر کارنس سی بنا دی گئی ہے۔ اس پر دواؤں کی شیشیاں، پُرانے خطوط، قلم دوات، چند زنانہ بنگالی رسالے اور سلائی کی ٹوکری رکھی ہے۔ کارنس کے نیچے پتلے سے تخت پر شفاف بستر لگا ہے۔ ایک کونے میں مختصر سا مندر ہے۔ صندل کی چوکی پر رکھی ہوئی مورتیوں پر گیندے کے تازہ ہار پڑے ہیں۔ مورتیوں کے سامنے انجلی رکھی ہے۔ ایک پہلو میں ایک چھوٹی تصویر، جس میں ایک وکیل صاحب گاؤن پہنے بیٹھے ہیں۔ اس تصویر پر بھی تازہ ہار پڑا ہوا ہے۔ چوکی کے سامنے سیتل پاٹی بچھی ہے جس کے ایک کنارے پر کھڑاؤں کی جوڑی رکھی ہے۔ کمرے کے دوسرے کونے میں رُسّی کی الگنی پر بغیر کنّی کی چند سفید ساریاں پڑی ہوئی ہیں۔ اس کمرے کا دروازہ پچھلے برآمدے میں رسوئی گھر کے عین مقابل میں کھلتا ہے۔

"بیٹھک خانے" کے بائیں جانب والے کمرے میں جو مطب سے ملحق ہے، صرف ایک پلنگ اور ایک آرام کرسی پڑی ہے۔ کونے میں دو ٹرنک رکھے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کمرے کا مکین دنیاوی ضروریات سے خاصا بے نیاز اور بے پروا ہے۔

اس کمرے کے پیچھے ایک اور کمرہ ہے۔ اس میں سلاخوں والی کھڑکی کے نیچے کھادی کی چادر سے ڈھکا پلنگ بچھا ہے۔ سرہانے ایک الماری ایک میز۔ ۔ ۔ پائینتی کی دیوار کے ساتھ ایک بڑا ٹرنک اور اس کے اوپر ایک چمڑے کا اٹیچی کیس۔ کھونٹی پر چند سوتی ساریاں۔ الماری کے ایک پٹ میں آئینہ، کنگھی، ناریل کے تیل کی کٹوری . . . . فرش پر ایک کونے میں بچھی خوش

رنگ دری پر کتابوں اور کاپیوں کا ڈھیر۔

پچھلے برآمدے کے ایک سرے پر رسوئی گھر اور دوسرے پر گودام ہے، جس کے دروازے
یں بھاری تالا پڑا ہے۔ غسلخانے برآمدے سے باہر آنگن میں ایک قطار میں بنے ہیں جن تک پہنچنے
ے لئے ایک چوبی تختے پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ غسلخانوں کے برابر میں سے زینہ کوٹھی کی چھت پر بنے
رے اور ٹین کے سائبان کی طرف جاتا ہے۔ سرسبز آنگن کے وسط میں تالاب جس میں روہو
چھلیاں پلی ہیں۔ تالاب کے سامنے تلسی کا منقش گملا اور دور ایک گوشے میں آم کے گھنے درخت
ے نیچے جھلملیوں والی بند گاڑی کھڑی ہے۔ جس کی کھڑکیوں میں چڑیوں نے گھونسلے بنا لئے ہیں۔
گن کے تین طرف سرخ اینٹوں کی دیوار ہے۔ ڈیوڑھی کے چوڑے دروازے کے باہر اونچی
نچی گھاس میں سے گزرتی ایک پگڈنڈی آگے جا کر پچھواڑے کی سنسان سڑک سے جا ملتی ہے۔
ن میں کپڑوں کی خالی الگنی پر کوّے آن بیٹھے ہیں۔

ہاوٹ ابھی برس کر تھمی ہے۔ کوٹھی میں بڑا سنّاٹا ہے۔ خالی کمروں میں بھیگی ہوئی ہوا
لے دروازوں میں سے گزرتی منڈلاتی پھر رہی ہے۔ ایک غسلخانے میں سے پانی گرنے کی آواز آ رہی
اور پھاٹک کے باہر ایک کہار اکڑوں بیٹھا چلم پی رہا ہے۔ جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں اس کی
م کی روشنی کبھی کبھی تیزی سے چمک اٹھتی ہے۔ پھاٹک کے اک ستون پر جو برسہا برس کی بارشوں
و جھاڑ سے ترچھا ہو کر ایک طرف کو دھنس سا گیا ہے۔ "ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار، ایم۔ بی۔
" کا بورڈ لگا ہے۔ دوسرے ستون پر سنگ مرمر کے ٹکڑے پر بنگالی میں "چندر کنج" نقش ہے۔

اندر مطب کی دیوار پر لگے چرخہ کاتتے گاندھی جی اور متبسّم جوان سال نہرو کی بھدّی رنگین
یروں والے کیلنڈر کے ورق بوڑھی گنگا پر سے آتی ہوئی اس بھیگی ہوا میں آہستہ پھڑپھڑا
ہے ہیں۔

اس روز، دسمبر ۱۹۳۹ء کی اس تاریک شام، جب سارا گھر سنسان پڑا تھا۔ چندر کنج کے
برآمدے والے گودام میں چوری ہو گئی۔

سیند لگانے والی، اس گھر کی انیس سالہ بیٹی دیپالی تھی۔

ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار مطب بند کر کے حسب معمول ہوا خوری کے لئے باہر جا چکے تھے۔ اُن کے تینوں لڑکے کھوکھو، شوتُو اور ٹُٹو ابھی فٹ بال کے میدان سے نہیں لوٹے تھے۔ اور غسلخانے میں پانی گرنے کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر سرکار کی بیوہ بہن بھُوتارنی دیبی اشنان کے چند منٹ بعد پوجا میں مصروف ہونے والی ہیں۔

اس وقت ڈاکٹر سرکار کی اکلوتی لڑکی دیپاؔلی لالٹین ہاتھ میں لئے زینے سے نیچے باغ میں اُتری، اُس کے دوسرے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اور وہ اندھیرا پڑتے تک کوٹھے والے کمرے میں جہاں بجلی کی روشنی نہیں تھی "ہوم ورک" کرتی رہی تھی۔ نیچے آکر اس نے لالٹین تلسی کے گملے کے پیچھے چھپا دی اور دبے پاؤں برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں گئی۔ جو بیٹھک خانے کے بائیں جانب تھا۔ دروازے کی آڑ سے اس نے دیکھا کہ اس کی پھوپھی بھُوتارنی دیبی غسلخانے سے نکل کر کھڑاؤں پہنے کھٹ کھٹ کرتی چوبی پُل پر سے گزر کے اپنے کمرے کی طرف جا رہی ہیں۔

دیپاؔلی دم سادھے کواڑ کے پیچھے کھڑی رہی اور چند منٹ بعد پنجوں کے بل چلتی بھُوتاؔرنی دیبی کے کمرے میں گئی جو سیتل پاٹی پر آلتی پالتی بیٹھ کر لوبان سلگانے کے بعد آنکھیں بند کر کے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکی تھیں۔ اِن کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ دیپاؔلی نے چند لحظوں کی ہچکچاہٹ کے بعد آگے بڑھ کر کنجیوں کا موٹا گچھا ان کی پشت پر پڑے پلّو سے کھولا اور باہر آگئی۔ تلسی کے پیچھے سے لالٹین نکال کر گودام تک پہنچی اور ڈرتے ڈرتے تالا کھولا۔ اندر جا کر لالٹین ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر رکھ دی اور چاروں طرف دیکھا۔ گودام میں شدت کا حبس اور سیلن تھی۔ آنگن کے رخ والی مقفّل کھڑکی کے شیشوں پر امرت بازار پتریکا کے پیلے کاغذ چپکے ہوئے تھے۔ متفرق فالتو سامان کے علاوہ کوٹھری میں ایک بہت بڑا چوبی صندوق اینٹوں کے اوپر رکھا تھا۔ اس صندوق میں بنارسی اور بالوچر بوٹے دار ساریاں اور دوسرا قیمتی سامان مقفّل تھا۔ ہر سال جاڑوں میں بھُوتاؔرنی دیبی صندوق کھول کر بڑے اہتمام سے بالوچر ساریاں باہر نکالتیں اور آنگن میں چارپائیوں پر پھیلا کر اُن کو دھوپ میں سُکھایا جاتا۔ اس کے بعد یہ بالوچر ساریاں پھر نیم کے پتّوں کی تہہ دے کر اسی احتیاط سے بکس میں واپس رکھ دی جاتیں۔

دیپاؔلی نے سانس روک کر صندوق کا تالا کھولا۔ اس کے کپڑوں پر بچھی کشمیری شال سرکا کر تہہ میں سے ساریاں نکالیں اور اُن کو جلدی جلدی فرش پر رکھتی گئی۔ بنارسی اور جامدانی کی ساریاں ایک طرف

کر کے اس نے "بانو چر بوٹے دار" ساریاں علیحدہ کیں جو تعداد میں تین تھیں۔ باہر کی آواز پر کان لگاتے ہوئے اس نے لالٹین کی لو اونچی کر کے ساریوں پر ہاتھ پھیرا۔ ساریاں بیحد پرانی ہونے کے باوجود بالکل نئی معلوم ہو رہی تھیں جیسے ابھی ابھی نوابی کے مرشد آباد کے کرگھوں سے اتری ہوں۔

موقع کی نزاکت کے باوجود وہ ان کے آنچلوں پر بنے نقش و نگار کو دیکھنے میں محو ہو گئی۔ کاسنی، نارنجی فیروزی۔ کاسنی ساری سب سے بیش قیمت تھی۔ اس کے آنچل پر ایک قطار میں مرشد آباد کے نواب پیچوان نوش کر رہے تھے۔ نارنجی ساری کے پلو پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ناؤ میں بیٹھے تھے۔ فیروزی ساری کے آنچل پر مغل بیگمات ہاتھی کے ہودے پر بیٹھی گلاب کا پھول سونگھنے میں معروف تھیں۔ وقت ریشم کے اس تانے بانے میں الجھ کر تھم چکا تھا۔

اچانک برآمدے میں آہٹ ہوئی۔ دیپالی نے پھرتی سے تینوں ساریاں سفید ململ کے ٹکڑے میں لپیٹیں۔ باقی سامان صندوق میں واپس رکھا اور سہم کر دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ مگر اب پھر خاموشی چھا چکی تھی۔ صحن میں کیلے اور پپیتا پھل کی ڈالیاں سرسرا رہی تھیں۔ بہت دور سڑک پر ایک گھوڑا گاڑی کھڑکھڑاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس گھپ اندھیرے میں نجانے کہاں جا رہی تھی۔

دیپالی نے لمبا سانس لیا اور ساریوں کا بنڈل اپنے آنچل میں چھپا کر باہر نکلی۔ گودام میں تالا لگایا۔ بنڈل برآمدے کی سیڑھیوں پر ڈال دیا اور بھوتارنی دیبی کے کمرے میں جا کر نہایت صفائی سے کنجیاں اُن کے پلو میں باندھ دیں۔ بھوتارنی دیبی چڑچڑی اور تنک مزاج ہونے کے علاوہ کنجیوں کے معاملے میں حد سے زیادہ سخت گیر اور محتاط تھیں۔ وہ ڈولی تک کا تالا صرف اپنے ہاتھ سے کھولتی تھیں۔ کنجیاں ان کے پلو میں باندھنے کے بعد دیپالی نے پوری طرح آنکھیں کھول کر بھگوتی کی مورتی کو دیکھا اور دروازے سے نکلی۔ سیڑھیوں پر سے بنڈل اُٹھا کر آنگن میں سے بھاگتی ڈیوڑھی سے تیر کی طرح نکل کے پچھلی سڑک پر پہنچ گئی۔ پھاٹک پر بیٹھا کہار چلم ختم کر کے کہیں غائب ہو چکا تھا۔ دیپالی نے چاروں طرف دیکھا اور چند قدم آگے بڑھی۔ سڑک کی پلیا کے نزدیک نوجوان سائیکل سنبھالے کھڑا بے نیازی سے آسمان کو تک رہا تھا۔ دیپا کو دیکھ کر اس نے ہاتھ کا ہلکا سا اشارہ کیا۔

دیپالی دوڑ کر اس کے قریب پہنچی اور اچک کر سائیکل کے پیچھے کیریر پر بیٹھ گئی۔

نواب پورے کی ایک گلی کے سرے پر ایک قدیم مکان کی بیٹھک میں چند نوجوان فرش پر بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں اُن میں سے ایک نے نظر اٹھا کر دیکھا دیپالی سرکار سامنے کھڑی تھی۔ اس نے جھک کر بنڈل نوجوانوں کے سامنے رکھ دیا۔ ایک نوجوان نے بنڈل کھولا۔

"دادا۔ اس سے زیادہ قیمتی چیز میرے گھر میں نہیں ہے۔"

اس نوجوان نے جسے دیپالی نے مخاطب کیا تھا۔ ساریاں الٹی پلٹیں۔ "بالوچر ساریاں" اُس کے منہ سے نکلا۔ اس نوجوان نے اپنے شانوں پر زلفیں چھٹکا رکھی تھیں۔

"بالوچر۔۔!" دوسرے نوجوانوں نے حیرت اور اشتیاق سے ساریوں پر ہاتھ پھیرا۔

"مگر بھائی ان کو خریدے گا کون۔؟ ہمیں تو فوراً چھ سو روپے چاہئیں۔"

"چار سو تک بھی نہیں بک جائیں گی؟" دیپالی نے متفکر ہو کر پوچھا۔

"بالوچر ساریاں؟ آج کل دیپالی اپر کلاس لیڈیز انگریزی جارجٹ پہنتی ہیں۔"

"مگر یہ۔۔ یہ تو بے مثل چیز ہے اور نایاب۔" دوسرے نوجوان نے کہا۔

"ہندوستان کا بیشتر پرانا فن نایاب اور بے مثال ہے۔" پہلے نے چڑ کر جواب دیا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" پھر وہ دیپالی سے مخاطب ہوا۔ "تمہارے پاس اور کچھ نہیں؟"

دیپالی نے تاسف سے سر ہلایا۔ دفعتاً اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "ان کو بیچنے یا گروی رکھنے کی کوشش تو کیجئے اکشئے دادا۔"

زلفوں والا نوجوان گہرا سانس لے کر فرش پر سے اٹھا۔ "اچھا۔ تھینک یو۔ دیپالی۔ اب تم واپس بھاگ جاؤ فوراً۔۔" اور دفعتاً وہ تینوں نوجوان، جن میں سے تیسرا بالکل خاموش رہا تھا۔ بنڈل سمیت کوٹھری کے پچھلے دروازے سے نکل کر باہر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

اب رات کے نو بج رہے تھے اور میز پر کھانا چنا جا چکا تھا۔ بھوتارنی دیبی حسب عادت بڑبڑاتی ہوئی رسوئی گھر اور کھانے کے کمرے کے پھیرے کر رہی تھیں۔ کھوکھو، شونو اور ٹونو میچ سے واپس آ کر تندہی سے کھیل پر بحث کرنے میں مشغول تھے۔ ڈاکٹر سرکار چہل قدمی سے لوٹ آئے تھے اور اپنے کمرے میں آرام کرسی پر نیم دراز حسبِ عادت ایک پاؤں ہلاتے ہوئے سوچ بچار میں مصروف تھے۔

"دیپالی ـــ" انہوں نے آواز دی۔

دیپالی اپنے کمرے سے نکلی۔ ڈاکٹر سرکار آرام کرسی سے اُٹھ کر بیٹھک خانے سے گزرتے کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے۔ وہ ایک بھاری جسم کے متین چہرے اور سوچتی ہوئی آنکھوں والے انسان تھے۔ ان کے چہرے کے سکون سے ظاہر ہوتا تھا کہ خاموشی اور صبر کی دوسرائے میں زندہ رہنا انہوں نے سیکھ لیا ہے۔

کھانے کی میز پر جا کر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے دیپالی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں وہ اسی وقت اندر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر سرکار نے ذرا تعجب سے اس کا جائزہ لیا۔

"کیا بات ہے؟ طبیعت خراب ہے؟ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔"

"جی نہیں ـــ بابا ـــ میں روزی ـــ روزی کے گھر گئی تھی۔ واپس آ رہی تھی تو ـــ پلیا کے پاس ایک بھینسہ مل گیا ـــ اُس کے ڈر سے دوڑتی دوڑتی آ رہی ہوں۔" اس نے گلے پر ہاتھ رکھ کر ہنسنا چاہا۔

"اتنی رات گئے روزی کے گھر سے اکیلی آ رہی ہو؟" ڈاکٹر سرکار نے ذرا درشتی سے اُسے ڈانٹنے کی کوشش کی۔

"جی۔ جی نہیں۔ جوزف ساتھ آیا تھا۔" وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

اُس کے تینوں چھوٹے بھائی شور مچاتے ہوئے کھانا کھانے میں جُٹ چکے تھے۔

"ایک خوش خبری تمہارے لئے۔" کھانے کے دوران میں ڈاکٹر سرکار نے دیپالی سے کہا۔

وہ دھک سے رہ گئی۔ "کیسی خوش خبری ـــ بابا؟"

"اشیت بابو ـــ" ڈاکٹر سرکار نے کرسی پیچھے سرکا کے جواب دیا۔ "میں ابھی اشیت بابو کے ہاں گیا تھا۔ وہاں ان کے بہنوئی آئے ہوئے ہیں۔"

"کلکتے والے ـــ؟ جیوتی بابو۔؟"

"جیوتی بابو ـــ وہ تمہارے ریکارڈ بھرنا چاہتے ہیں۔ ایچ۔ ایم۔ وی ریکارڈ۔"

"میرے ریکارڈ!؟ سچ بابا۔ سچ بتائیے ـــ!؟"

تینوں لڑکوں نے کھانا چھوڑ کر غل مچانا شروع کر دیا۔

"دیدی جی کے ریکارڈ بجیں گے۔ گھر گھر دیدی کے ریکارڈ بجیں گے۔" کھوکھو نے گمبھیرتا سے اعلان کیا۔

"دیدی امیر ہو جائے گی۔" منجھلا شونو زور سے چلّایا۔

"دیدی ہم کو پیسے دے گی۔" ٹونو نے سر جھکا کر نرمی سے کہا۔

"ہمارے سائینس ماسٹر شنبل بابو کی بڑی دیدی کے ریکارڈ سارے انڈیا میں بکتے ہیں۔ وہ اتنی امیر ہو گئی ہیں۔ اُن کے پاس تو موٹر بھی ہے۔" شونو بولا۔

"دیدی ریڈیو سے جتنے پیسے ملتے ہیں لا کر تم لوگوں پر خرچ کر دیتی ہے۔" کھوکھو نے ڈانٹ بتائی۔

"دیدی اتنے پیسے کیا کرے گی؟" سب سے چھوٹے ٹونو نے جو سب سے لاڈلا تھا مطالبہ کیا۔

"اپنا جہیز بنائے گی، اور کیا تمہارا سر کرے گی۔" بھوتارنی دیبی نے جواب تک تیوری پر بل ڈالے چپ چاپ کھانا کھاتے میں مشغول تھیں، گرج کر کہا۔

دیپالی ذرا سی سرخ ہو گئی اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ اس سارے ہنگامے میں وہ شام کی مہم کو تقریباً بھول چکی تھی۔ وہ میز پر سے اٹھنے لگی تو ڈاکٹر سرکار نے اس سے کہا۔ "جیوتی بابو — انہوں نے تم سے کل ریڈیو اسٹیشن پر ملنے کو کہا ہے۔ تم کو ریکارڈنگ کے لئے کلکتہ جانا ہوگا۔ تم ریڈیو اسٹیشن کل کس وقت جاؤ گی؟"

"صبح کو بابا — دس بجے۔"

"کالج پھر ناغہ —؟"

"بابا۔ اب تو چھٹیاں شروع ہونے والی ہیں۔ اور (لڑکے اب ہلّڑ مچاتے ہاتھ دھونے کیلئے باہر جا چکے تھے۔ بھوتارنی دیبی چپ چاپ برتن سمیٹنے میں مصروف تھیں) بابا — پروگرام کے پیسے جمع کر کے بچوں کے کپڑے بنا دیئے تھے۔" وہ ٹھٹھک گئی — "بابا۔ میری ساریاں بھی بالکل پھٹنے والی ہو رہی ہیں۔" اس نے جھینپ کر بات ختم کی۔

ڈاکٹر سرکار نے سر جھکا لیا۔ پھر وہ آہستہ سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اور گودام کے نزدیک والے نل کے پاس کھڑے ہو کر کُلّا کرنے لگے۔ دیپالی چپکے چپکے پیچھے آئی اور گودام کے بند کواڑوں کو غور سے دیکھا جن میں لگا لوہے کا وزنی تالا بےحد ساکت اور پُراسرار معلوم ہو رہا تھا۔

۲

طوفان سے پہلے

"ابانی گنگوپادھیائے۔"

"پریذنٹ۔"

"مولینا گھوشال۔"

"پریذنٹ۔"

"روزی بنرجی۔"

"پریذنٹ۔"

"جہاں آرا چودھری۔"

"پریذنٹ۔"

"دیپالی سرکار۔"

"ایبسنٹ۔"

سوکس (civics) کی لیکچرر مسز بوس نے سیکنڈ ایر آرٹس کی حاضری لیتے ہوئے روزی بنرجی اور جہاں آرا چودھری کے برابر والی تیسری خالی کرسی پر نظر ڈالی۔

"دیپالی پھر غائب ہے۔" انہوں نے کہا۔

"دیکھئے کرونادی۔" جہاں آرا نے پلّو منہ پر رکھ کر کھی کھی کرتے ہوئے مسرور ہنسی چھپانے کی کوشش کی۔ "دیپالی بیمار ہے۔"

"تم کو کیسے معلوم۔؟ تم تو اس کے گھر سے اتنی دور رہتی ہو۔۔۔؟"

"وہ کل ۔۔۔ میرا مطلب ہے، کل مجھے معلوم ہوا تھا کہ بیمار پڑ گئی ہے بے چاری۔"

"لڑکیو۔۔۔" مسز بوس نے کلاس کو بڑے دکھ سے مخاطب کیا۔ "فائنل امتحان سر پر ہیں اور

تم سب کی سب ہو گی فیل۔ اور روزی۔"

"یس کرد نادی۔"

"تم دونوں۔ تم اور دیپالی ہر وقت ڈرامے کرنے میں جٹی رہتی ہو۔ ہر وقت۔ ایکٹریس بنو گی؟"

"کھی کھی کھی۔" روزی اور جہاں آرا نے ہنسی روکی۔

"کہہ دوں۔؟" روزی نے چپکے سے جہاں آرا سے پوچھا۔

"کہہ دو۔"

"کرد نادی۔ دیکھئے کرد نادی۔ اصل میں دیپالی کلکتے جا رہی ہے۔ ایچ۔ ایم۔ وی ریکارڈ بھروانے"

"ایچ۔ ایم۔ وی ریکارڈ۔" ساری کلاس نے نعرہ لگایا۔

"آج وہ گراموفون کمپنی کے ڈائرکٹر سے ملنے جا رہی تھی تو راستے میں میرے گھر پر چھٹی کی عرضی چھوڑ گئی۔" روزی نے کہا۔

"کہاں ہے عرضی۔؟"

"بھول آئی کرد نادی۔ کھی کھی کھی۔"

مسز لوئس ایک نیک دل اور شریف خاتون تھیں۔ انہوں نے ذرا جھلا کر روزی کو گھورا اور باقیماندہ کلاس کی حاضری لگانے کے بعد فوراً اپنا کلاس روم والا بے رنگ لہجہ اختیار کر کے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "صفحہ ۲۱۸ کھولو۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء"

"اوہ۔ ہو۔ ہو۔ اوہ۔ دیپالی کی خوشی میں کرد نادی۔ آج جلدی چھٹی پلیز۔ پلیز۔ پلیز۔"

"جاؤ۔ بھاگو۔ منہ جلی چڑیلیں۔" آدھ گھنٹہ پڑھانے کے بعد مسز لوئس نے مصنوعی غصے کے ساتھ کتاب زور سے بند کی۔ لڑکیاں پھڑ پھڑ کرتی کمرے سے نکل کر باہر گھاس پر بکھر گئیں۔

روزی اور جہاں آرا نے ٹک شاپ پر جا کر چاٹ خریدی۔

ابانی نے قریب آ کر چپکے سے روزی سے کہا۔ "پھاٹک پر کوئی لڑکا دیپالی کو پوچھ رہا ہے۔"

"وہی۔؟"

"ہاں۔"

"میں جاتی ہوں۔"

روزی بھاگتی ہوئی دور پھاٹک پر پہنچی ۔ نوجوان جو کل شام دیپالی کو سائیکل پر بٹھا نواب پور لے گیا تھا، اطمینان سے درخت کی آڑ میں کھڑا پان چبا رہا تھا۔ قریب ہی ایک گائے سس پر بکھرے چاٹ کے خالی دونوں پر منہ مارنے میں مصروف تھی ۔

"دیپالی نہیں آئی ہے ۔ کوئی پیغام ہے ؟"

"ہاں ۔۔" لڑکے نے کہا۔ "اس سے کہنا ۱۹ تاریخ کی شام کو ریڈیو اسٹیشن کی برساتی ٹھیک سات بجے ضرور پہنچ جائے۔ اور دوسری بات یہ کہ وہ جس کام کے لئے کل گئی تھی وہ امید ایک دو دن میں ہو جائے گا۔"

"اور کچھ ۔۔؟"

"بس ۔۔ نومشکار ۔۔" لڑکا سائیکل کے پیڈل پر پاؤں مارتا ہوا ہوا ہو گیا۔

روزی جو بے حد تیزی سے دوڑتی پھاٹک پر آئی تھی۔ اب سر جھکائے سوچ میں ڈوبی ٹک شاپ پہنچی۔ جہاں بہت سی لڑکیاں اکٹھی ہو کر کسی نئی خبر پر زور زور سے تبصرہ کر رہی تھیں ۔

"اور سنا تم نے روزی ۔۔" سندھیا نے کہا۔ "مس ہیڈ نے آج کہہ رہی تھیں کہ مس اومارا سے واپس آ گئی ہیں اور شاید پھر یہاں پڑھانا شروع کر دیں ۔"

"مارے گئے ۔۔ دیدی کو انہوں نے پڑھایا تھا۔ دیدی کہتی ہیں کہ بس جان نکال لیتی تھیں۔" ی نے کہا ۔

"ہمارے تو بھیّا مزے ہیں۔ ہم تو انٹر کے بعد گھر بیٹھ جائیں گے۔ ابّا نے حکم دے دیا ہے!" آرا نے کہا۔ "تم لوگ اپنے مرتی رہو۔"

"تیرا تو ۔۔ اس کا جہاں آرا کا تو کسی ڈرھیل مولوی سے بیاہ ہو گا ۔۔ جناب مولوی بے نو ر بن احمد صاحب ۔ !" موٹی مسخری رومولا نے منہ پھاڑ کر ہا ہا کرتے ہوئے کہا۔ اور جینی پھانکتی رہ

"ارے ہٹ بھاگ ۔"

"تو خود بھاگ ۔"

سہ منزلہ عمارت میں پانچویں پیریڈ کی گھنٹی بجی ۔

"چلو بھائی ۔۔ آگیا مس گرین فیلڈ کا گھنٹہ ۔" روزی نے منہ بنا کر کہا ۔

"وہیں وہیں وہیں۔" رومولا منہ ٹیڑھا کر کے مس گرین فیلڈ کی نقل کرتی، چنے پھانکتی آ
آگے چلنے لگی۔ اس کے پیچھے پیچھے روزی بنرجی اور جہاں آرا چودھری لڑکیوں کے غول میں شامل
عمارت کی سمت روانہ ہو گئیں۔

اس وقت جاڑوں کی سہانی دھوپ ہماری زندگی پر بکھری ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ ایڈ
گرلز کالج کی بلند عمارات پڑھائی کی سنجیدہ خاموشی میں ڈوب گئیں۔ جس طرح جہاز آہستہ
گہرے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ ان عمارتوں کے روشن کمروں کی دیواروں پر لگی برطانیہ
شاہی خاندان اور بنگال کے سابق گورنروں کی منجمد آنکھیں چپ چاپ سامنے کے منظر کو دیکھ
رہیں۔ جہاں بھانت بھانت کے سماجی اور اقتصادی پس منظر سے آئی ہوئی، قدیم بنگال کی
بیٹیاں اپنی اپنی کتابوں پر جھکی حصولِ علم میں منہمک تھیں۔ اور کون کہہ سکتا تھا کہ باہر بیکراں
پرانی جنگوں کی جھنکار سے گونج رہی ہے۔ ان جنگوں میں لڑنے والے جو زبانیں بولتے تھے، وہ
دی گئیں۔ وہ قومیں اور نسلیں ختم ہو چکیں۔ جن وجوہات پر اور جن مقاصد کے لئے وہ لڑائی
لڑی گئیں۔ وہ فراموش کر دیئے گئے۔ پرانے فیصلوں پر نظرِ ثانی کرنے کی مہلت دنیا کو نہ
لیکن بیکراں زندگی میں ہر آواز، ہر کرب اور وقت کا ہر عکس موجود ہے اور زندہ ہے اور
دفعتاً کالج پر پھیلا ہوا سناٹا اتنا گہرا ہو گیا کہ اُسے بآسانی سنا جا سکتا تھا۔ طوفان
چھانے والا سناٹا

۳

ووڈلینڈز

رمنا کی ایک عالیشان کوٹھی کے ایک پہلو کے کمرے کے فرانسیسی دریچے میں سے
اور نیلا آسمان نظر آسکتا تھا کیونکہ حدِ نظر تک ہریالی کے علاوہ وہاں کچھ اور نہیں تھا۔ اکا دکا پور

پھولوں کے تختوں میں چھپے چپ چاپ اپنے کام میں مصروف تھے۔ دریچے کی سیٹ پر، جو سُرخ ب کے پھولوں والے جھالردار غلاف سے ڈھکی ہوئی تھی، ایک نوجوان خاتون عینک لگائے بیت کے عالم میں بیٹھی خط لکھ رہی تھیں۔ سیزر ان کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ دریچے کے قریب ں لکڑی کی رائیٹنگ ٹیبل پر چھوٹے چھوٹے بیضوی فریموں میں چند اور ارسٹوکریٹ بنگالی تین کی تصاویر جھلملا رہی تھیں۔ یہ کمرہ جو انگریزی اصطلاح میں مارننگ روم کہلاتا تھا۔ س کی دیواروں پر گلاب کی بیل کے ہلکے گلابی اور زرد، اور کاسنی اور سبز پیٹرن والا وال منڈھا تھا۔ اس طرح کا وال پیپر ایک زمانہ میں امرائے کلکتہ خاص طور پر ولایت سے منگوا کر نے کمروں میں لگواتے تھے۔

دیواروں پر سنہری فریموں والی بڑی بڑی تصویریں تھیں۔ لارڈ بائرن یونان کے ساحل تی سے اتر رہے ہیں۔ کانسٹیبل کا ایک دیہاتی منظر۔ آبری بیرڈزلے کی مشہور سلومے کر وائلڈ والی۔ جو سیاہ کپڑوں میں ملبوس، تھالی میں دھرے یوحنا پیغمبر کے بریدہ، سر کے بال پکڑ ہیں بھر رہی ہے۔ ایک تصویر مسٹر پک وک کی تھی۔

دروازوں پر اور دریچوں میں موٹی ریشمی ڈوریوں سے بندھے پھندنوں والے دبیز ریشمی پردے ے تھے۔ آتش دان پر ڈریسڈن چائنا کی چرواہی بیٹھی تھی۔ اس کمرے کا اور سارے گھر کا طرزِ آرائش طور پر مغربی اور وکٹورین تھا۔

لیکن جو خاتون اس مارننگ روم میں موجود تھیں وہ وکٹورین نہیں تھیں۔ وہ ایک جوشیلی باشعور اور سنجیدہ سیاسی کارکن تھیں۔ جس پیڈ پر وہ خط لکھ رہی تھیں اس کے اوپر کے ایک کونے ’ووڈلینڈز، رمنا، ڈھاکہ“ گوتھک پرنٹ میں ثبت تھا۔ مگر مکتوب الیہ لندن اسکول آف نس کا ایک برطانوی یہودی، کمیونسٹ پروفیسر تھا۔

خط لکھتے لکھتے دفعتاً انہوں نے غصّے سے توڑ مروڑ کر اسے دور پھینک دیا۔ فربہ سیزر۔ ذرا سے اٹھ کر اخلاقاً اس کی طرف لپکا۔ لیکن خاتون اسی طرح دل گرفتہ اور جھنجلائی ہوئی بیٹھی رہیں۔ کہ ان کو یاد آگیا تھا کہ یہ خط سارا کا سارا سنسر کی نذر ہو جائے گا

چند منٹ بعد سر ہاتھوں میں لے کر وہ دریچے سے باہر دیکھنے لگیں اور بےحد کرب سے انہوں نے

سوچا۔ اب مجھ پر دورہ پڑنے والا ہے۔ انہوں نے عینک اتار کر آنکھیں زور سے میچ لیں۔ اور اسی طرح ساکت بیٹھی رہیں۔ اب وہ دانتے گیبریل روزیٹی کی دا موزیل معلوم ہو سکتی تھیں۔

جب بیرسٹر پری توش کمار رائے نے اپنی وسیع و عریض کوٹھی کا نام "ووڈ لینڈز" رکھا تو وہ اُس رواج کی تقلید کر رہے تھے جس کے تحت ہندوستان کا نیا مغربی تعلیم یافتہ اوپری طبقہ تقریباً سو برس سے اپنی کوٹھیوں کے انگریزی نام رکھنے میں مصروف تھا۔ مہاراجہ کوچ بہار کے کلکتے والے محل کا نام بھی ووڈ لینڈز تھا۔ مگر بیرسٹر رائے کو یہ نام اس قدر پسند تھا کہ انہوں نے اسے تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

بیرسٹر رائے برہمو تھے۔ بنگال کے رائے اور ٹھاکر خاندان چودھری پریواروں کی مانند زمیندار تھے اور مذہبی لحاظ سے قدامت پسند ہندو۔ زیادہ تر دت، سین اور گپتا۔ غیر برہمن جاتیاں برہمو ہو چکی تھیں۔ لیکن بیرسٹر رائے کے دادا کیشب چندر سین کے چیلے بن گئے تھے اور ان کا خاندان اب تقریباً پون صدی سے برہمو اور آزاد خیال تھا۔ بیرسٹر رائے کی والدہ اور پھوپھیوں تک نے اسکول اور کالج میں پڑھا تھا۔ بیرسٹر رائے کی بیوی مشہور "سوشل فگر" تھیں۔ اُن کا بڑا لڑکا انزملیندو، برڈ اینڈ کمپنی کلکتہ میں اعلیٰ ایگزیکیٹو اور "کنفرمڈ بیچلر" تھا۔ اور زیادہ وقت ریس کورس پر اور شراب نوشی میں گزارتا تھا۔ بیرسٹر رائے کو فکر تھی کہ ان کی لڑکی بھی کہیں کنفرمڈ اسپنسٹر نہ بن جائے۔ آثار یہی نظر آتے تھے۔ مگر اس صورت حال کا مداوا اُن کے پاس نہیں تھا۔ اُن کے باپ کی نسل نے بچپن کی شادی اور دوسری سماجی خرابیوں کے خلاف جہاد کیا تھا۔ اور آزادیٔ نسواں کا پرچار کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے تھے۔ اور اب اوما اُن کی لڑکی اٹھائیس سال کی ہونے کو آئی تھی اور شادی سے منکر تھی۔ اور وہ اور ان کی بیوی اوما کی خلاف مرضی اسے شادی پر مجبور نہ کر سکتے تھے۔ انقلاب اپنے ہی بچوں کو کھاتا ہے۔ بیرسٹر رائے اکثر دکھ سے سوچتے ہماری ان "پاینیر" خواتین کا جن میں اوما بھی شامل ہے، کیا انجام ہوگا؟ نیا بنگال سو برس سے ایک ترقی یافتہ سماج ہے، مگر پرانی اور نئی اقدار کی اس آویزش کی زد خود اپنی زندگی پر پڑے تو کیا کرنا چاہئے؟

اوما کی شکل بہت معمولی تھی۔ باپ کی دولت و ثروت کی وجہ سے اچھے رشتے اس کے لئے آ سکتے تھے۔ لیکن وہ سیاست کے چکّر میں مبتلا تھی۔ اوما دیبی ایک گول مٹول چہرے والی گدبدی سی

لڑکی تھی۔ خلیق اور متواضع۔ گمبھیر اور تیز بین۔ لیکن اسے غصہ بہت جلد آجاتا تھا۔ اور ماں باپ سمیت کوئی بھی اس کی خلاف مرضی کوئی بات اس سے کہتا تو وہ فوراً آگ بگولہ ہو جاتی تھی۔ میری بیٹی اپنی زندگی میں ایک "بیک بنچر" کبھی نہیں بنے گی۔ بیرسٹر رائے اکثر سوچتے اور مزید فکرمند ہونے لگتے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کرنے کے بعد اس نے کچھ عرصہ گرلز اسکول میں پڑھایا تھا اور اسی زمانے میں صوبے کی کمیونسٹ تحریک میں شامل ہو گئی تھی۔ پھر بیرسٹر رائے نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیا تھا۔ وہاں کرشنا مینن کی انڈیا لیگ اور رجنی پام دت کی برطانوی کمیونسٹ پارٹی کی وجہ سے کڑوا کریلا نیم چڑھا چکا تھا۔ لندن اسکول آف اکنامکس سے ڈگری حاصل کرکے اوما چند روز قبل ہی ڈھاکہ واپس آئی تھی اور بیرسٹر رائے کی ملاقات ایک قدرے اجنبی لڑکی سے ہوئی تھی۔ بیرسٹر رائے یکلخت بے حد پریشان ہو گئے تھے۔ اب تک انہوں نے ایک "مغربی ذہن پرست رویہ" سمجھ کر اوما کے سیاسی مشاغل پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ کیونکہ بیٹی کی محبت کے علاوہ وہ خود چالیس برس قبل کے انگلستان سے لبرل ازم کا سبق سیکھ کر آئے تھے (زندگی میں کتنے بہت سے رویّے آپس میں گڈمڈ رہتے ہیں) مگر اب حالات بے حد مختلف تھے۔ جنگ چھڑ چکی تھی اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی تھی۔ بیرسٹر رائے کے سالے اور اوما کے ماموں دھریندر موہن سین ڈی۔ آئی جی پولس نے کئی بار اپنی بہن اور بہنوئی کو سمجھایا تھا کہ لڑکی کو قابو میں رکھیں۔ مسز رائے عرصہ ہوا قیصر ہند کا تمغہ حاصل کر چکی تھیں۔ اور بیرسٹر رائے کو سر کا خطاب ملا چاہتا تھا۔ عنقریب ہائی کورٹ جج بننے ــــ والے تھے۔

اوما کی سرگرمیاں اب ذہنی تفریح کی حدود سے آگے بڑھ کر بڑی خطرناک صورت اختیار کر سکتی تھیں۔

اوما رائے نے مورننگ روم کے دریچے کی سفید چوکھٹ پر سے سر اٹھا کر زور سے کنپٹیاں دبائیں اور دوبارہ عینک لگا کر باہر جھانکا۔ دو کانسٹیبل آپس میں باتیں کرتے گھاس پر سے گزر کر سامنے برساتی کی سمت جا رہے تھے۔ اوما

پہنچی تھیں۔ اُن کے ماموں دھریندر موہن سین ڈی۔ آئی۔ جی پولس، بھانجی کے سواگت کے لئے شمالی بنگال سے ووڈ لینڈز ڈھاکہ آئے ہوئے تھے۔ اور اُن کے عملے کے کانسٹبل اور پولس انسپکٹر ووڈ لینڈز کے احاطے میں ہر طرف ٹہلتے پھر رہے تھے۔

ابھی ڈائننگ روم میں لنچ کا سریلا گھنٹہ بجے گا۔ ماں اور پاپا اور ماما کھانے کی طویل میز پر بیحد شائستگی سے آکر بیٹھیں گے اور کھڑکھڑاتے ـــــ سفید نیپکن کھولتے ہوئے اس سے بحری سفر کے حالات دریافت کریں گے۔ جنگ چھڑنے کے بعد اوما کے بخیریت وطن واپس آجانے کی خاطر کنبے میں خوشیاں منائی جائیں گی۔ اوما آدھے سر کے درد کی مریض تھیں۔ لندن جانے سے قبل اکثر و بیشتر جب دردِ سر کا دورہ پڑتا تھا تو وہ تبدیلِ آب وہوا کے لئے رائے خاندان کے گارڈن ہاؤس چلی جاتی تھیں۔ جو دریائے میگھنا کے ایک خوبصورت جزیرے پر پلاش کے درختوں میں چھپا کھڑا تھا۔ آج صبح بریک فاسٹ کی میز پر ماموں نے ان کی مضمحل صورت دیکھ کر تجویز کیا تھا کہ وہ سفر کی تھکان دور کرنے کے لئے چند روز کو گارڈن ہاؤس چلی جائیں، لیکن خود اوما رائے کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بہت سخت بیمار پڑنے والی ہیں۔ اور بہت سی متوقع اور غیر متوقع مصیبتوں، کلفتوں اور پریشانیوں کا انھیں بہت جلد سامنا کرنا ہے۔ سفید کشمیری شال کندھوں سے اچھی طرح لپیٹ کر وہ ونڈو سیٹ پر سے اٹھیں اور آہستہ آہستہ قدم رکھتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

۴

چوار بھاٹا کا گیت

ڈھاکہ کے ایک مسلمان رئیس کی دو منزلہ کوٹھی کرائے پر لے کر حکومت نے حال ہی میں اس میں ریڈیو اسٹیشن قائم کیا تھا۔ یہ کوٹھی بھی ڈھاکے کی ساری عمارتوں کی طرح قدیم، دقیانوسی اور ماضی میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جب دیپالی نے ریڈیو پر گانا شروع کیا۔ ڈاکٹر سرکار بڑی باقاعدگی سے اس کے ساتھ آتے تھے اور چھڑی کی موٹھ پر ہاتھ دھرے برآمدے کی ایک کرسی پر چپ چاپ بیٹھے

رہتے تھے۔ لیکن تین چار بار آنے کے بعد وہ اُکتا گئے تھے۔ مطب کے حرج کی پرواہ انہیں نہیں تھی۔ مگر انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ریڈیو اسٹیشن غیر اخلاقی شے نہیں ہے۔ کلکتہ شہر میں بڑی آزادی تھی۔ لیکن فیوڈل ڈھاکہ ابھی بے حد قدامت پسند اور پسماندہ تھا۔ اور خود ڈاکٹر سرکار غفار گاؤں ضلع میمن سنگھ کے جس مفلوک الحال زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس میں لڑکیوں کا تنہا گھر سے باہر نکلنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب دیپالی اکیلی ریڈیو اسٹیشن آتی تھی یا کبھی کبھار کھوکھو اس کے ساتھ آجاتا تھا — وہ عبّاس الدین احمد کی شاگردی میں مشرقی بنگال اور بالخصوص میمن سنگھ کی لوک سنگیت کی ماہر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے نغزیہ پروگرام بے حد مقبول ہو چکے تھے۔

۱۹ دسمبر کی شام، وہ اپنا پروگرام ختم کر کے اسٹوڈیو سے نکل رہی تھی کہ برابر کے ایک دروازے پر ڈاکٹر سرکار کے پرانے دوست اور شانتی نکیتن کے پروفیسر، ماہر لسانیات سیّد مرتضےٰ حسین اس سے ٹکرا گئے۔ انہوں نے تیوری پر بل ڈال کر اور چھڑی اُٹھا کے گویا ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "تمہارے بابا کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں کاکا!" وہ تیزی سے پھر آگے بڑھی۔ لیکن سیّد مرتضےٰ حسین اس کے پیچھے لپکے۔

"اور سنو لڑکی، تم نے ہمارے ہاں آنے کے متعلق کیا فیصلہ کیا؟" سیّد مرتضےٰ حسین نے چھڑی ہوا میں لہرائی۔ دیپالی نے غیر یقینی انداز میں سر ہلا دیا۔ اور گیلری کے سرے پر آویزاں کلاک پر نظر ڈالی شام کے سات بج رہے تھے۔ اب وہ دونوں صدر دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ چاروں طرف ایک تارا اور ایسراج اٹھائے فن کاروں اور ریڈیو کے اراکین کی آمد و رفت جاری تھی۔

پروفیسر سیّد مرتضےٰ حسین جو ہندوستان اور یورپ کی قدیم و جدید بیس پچیس زبانوں کے ماہر تھے۔ برآمدے میں پہنچ کر ٹھٹھک گئے۔ "بیوقوفوں کی طرح سر کیوں ہلا رہی ہو؟" انھوں نے درشتی سے مطالبہ کیا۔

اندر عبّاس الدین احمد نے گانا شروع کر دیا تھا اور ان کی خوبصورت جان لیوا آواز پدما کی لہروں کی طرح سارے میں پھیلتی جا رہی تھی — پدما کے مانجھی کا گیت — جوار بھاٹا کا نغمہ۔ عبّاس الدین احمد کی امر سنگیت — بھٹیالی —

دیپالی نے برآمدے کے ایک در سے ٹیک کر پل کی پل کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

"تم خوش قسمت ہو دیپالی کہ تم کو عبّاس الدین احمد کی شاگردی میسّر ہے۔ زندگی کا ہر لمحہ غنیمت جانو۔"

دور پدما کی تاریک پُرسکون لہروں پر سے بہتی سیّد مرتضیٰ حسین کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ یہ میرا دیس، یہ پدما اور میگھنا اور برہم پتر۔ یہ سنگیت۔ یہ دھان کلاکار۔ یہ سب اسی طرح رہے گا۔ مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تاریک راتوں میں اہم سازشیں ہو رہی ہیں۔ پروفیسر مرتضےٰ حسین کو بھی شاید پوری طرح معلوم نہیں کہ ہم کیا کرنے والے ہیں! وہ خود اور ہم سب کہاں ہیں۔ اس کی ہمت دوبارہ عود کر آئی اور اس نے ذرا بشاشت سے کہا۔ "کاکا اب فرنچ میں ڈانسنگ نو۔ یا —"

"کیا بات ہے۔ اتنی جلدی میں کیوں ہو۔؟" پروفیسر نے دریافت کیا۔ اور اسے بڑے غور سے دیکھا — "کبھی ایسا موقع زندگی میں نہ آنے دینا کہ بعد میں پچھتاؤ کہ تم نے اپنے خواب کیوں نہ پورے ہونے دیئے۔" انہوں نے باہر نظر ڈالی — "وہ دیکھو تم کو کوئی بلا رہا ہے شاید۔ جاؤ۔ بھاگو —" اتنا کہہ کر وہ جھپاک سے برابر کے کمرے میں گھس گئے۔

دیپالی سرعت سے برساتی میں اُتری۔ پیغامبر نوجوان نیم تاریک لان پر مزے سے ٹہل رہا تھا اُسے دیکھ کر وہ سڑک پر آگیا۔ وہ دونوں عمارت کے پھاٹک سے نکل کر باہر سڑک پر پہنچے۔ نوجوان نے کرتے کی جیب سے ایک لمبا، موٹا لفافہ نکال کر اُسے تھما دیا۔ "ریحان دا — ریحان دا نے کہا ہے یہ خط دیپالی سرکار کے ذریعے کماری اوما رائے کو پہنچا دیا جائے۔ جلد از جلد —"

"اوما رائے —؟" دیپالی نے چپکے سے پوچھا۔ "لیکن میں تو ان کو جانتی بھی نہیں۔"

"جان جاؤ گی۔" نوجوان نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ سڑک پر کچھ دور نکل آئے۔

"اوما دیدی، بیمار پڑی ہیں۔ ان کے ڈی۔ آئی۔ جی ماموں اُن کے یہاں مقیم ہیں۔ اس وجہ سے ڈیوڑھی پر پولس کا پہرہ ہے۔ اوما دیدی کے بیڈ روم تک دیپالی صرف تمہاری رسائی ہو سکتی ہے —" نوجوان نے پھر بات شروع کی۔ "چلو تم کو سریندر دا سے ملواؤں۔ میری جگہ یہ اب تم سب سے رابطہ رکھیں گے میں باریسال جا رہا ہوں۔"

وہ دونوں تنگ اور نیم تاریک سڑک پر ذرا اور آگے بڑھے۔ ایک دیوار کے سائے میں ایک نوجوان اُن کا منتظر تھا۔ "ہیلو دیپالی —!" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"سریندر دا —!" دیپالی نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ "آپ کھلے خزانے گھوم رہے ہیں کیا معافی مانگ لی —؟" اُس نے غصے سے پوچھا۔

نوجوان ہنس پڑا۔ "تم نے دیپالی میرے متعلق غلط افواہ سنی تھیں۔ میں ابھی بلیک لسٹ پر نہیں ہوں۔ تم وہی کلاسیکل ریولیوشنریز (REVOLUTIONARIES) کے زمانے کی بات کرتی ہو۔ اب تکنیک بدل چکی ہے۔"

"میرے کاکا کلاسیکل ریولیوشنری تھے۔" دیپالی نے اداسی سے کہا۔

وہ تینوں سر جھکائے تیز تیز چلتے گھوڑا گاڑی اسٹینڈ کی طرف بڑھنے لگے۔

"وہ ساڑیاں تمہاری ۔۔۔ بک گئیں۔ پورے ساڑھے پانچ سو میں۔" سریندر مکرجی نے سگریٹ سلگانے کے بعد دیا سلائی جھٹک کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" دیپالی کا دل ڈوب گیا۔

"ہاں۔" سریندر مکرجی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "جن صاحب کے پاس ہم یہ ساڑیاں لے کر گئے وہ تو ان کو دیکھ کر بالکل اچھل پڑے۔ کہنے لگے بھائی یہ تو میوزیم پیس ہیں۔ فوراً کلکتہ میوزیم کے لئے خریدوانا ہوں۔ اور مزے کی بات یہ ۔۔۔" سریندر مکرجی نے سگریٹ کی راکھ جھٹک کر بات جاری رکھی ۔۔۔ "مزے کی بات یہ کہ قیمت ۔۔۔ جانتی ہو ۔۔۔ کس نے ادا کی ۔۔۔؟ خود ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ۔۔۔"

"مسٹر کینٹ ویل نے۔؟"

"مسٹر کینٹ ویل آئی۔ سی۔ ایس نے۔!" سریندر نے جواب دیا۔

"او۔ ماں ۔۔۔!" خاندانی یادگاروں کے بکنے کا وقتی غم بھول کر دیپالی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"روپیہ ریحان دا کو وقت پر پہنچ گیا۔ کام شروع ہو چکا ہے۔" سریندر مکرجی نے بات ختم کی۔

وہ پالکی گاڑیوں کے اڈے پر چوراہے کے مدھم لیمپ کے نیچے پہنچ چکے تھے۔ سریندر مکرجی یک لخت چھلاوے کی مانند رات کے کہرے میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دیپالی سرکار جو اس کی طرح چھلاووں کی عادی ہو چکی تھی۔ سکون سے ایک گھوڑا گاڑی کا دروازہ کھول کر اس میں سوار ہوئی۔ پیغامبر نوجوان مقابل کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مسلمان کوچوان نے نحیف و نزار گھوڑے پر چابک لہرایا۔ گاڑی چرخ چوں کرتی کچی سڑک کے گڑھوں پر سے گزرتی دیپالی کے گھر کی سمت روانہ ہو گئی۔

۵

کماری اُوما رائے

دُور ڈاب کے سُبک پیڑوں کی لامتناہی قطار سے مزّین نارنجی افق پر بیحد سرخ سورج بہت آہستہ آہستہ اس طرح ڈوب رہا تھا۔ گویا شاہ باغ کی سنسان، سایہ دار سڑک پر سے گزرتی بند گاڑی میں بیٹھی دیپالی سرکار کے مسرور چہرے کا اچھی طرح نظارہ کرنا چاہتا ہو۔ کیونکہ شاید ایسا بے فکر چہرہ اسے دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملے گا۔

سال، شیشم اور نیم کے پتّے رمنا کی چوڑی سڑکوں پر نرم روی سے اُڑتے پھر رہے تھے۔ فضا میں خنکی آگئی تھی۔ پگڈنڈیوں پر گلہریاں دوڑ رہی تھیں۔ پھاٹکوں کی سفید بلّیوں پر بیٹھے اِکّا دُکّا ملازم بیڑیاں پینے میں مصروف تھے۔ کچھ دیر بعد ان سڑکوں پر مدھم مدھم لیمپ جھلملا اٹھیں گے۔ مکان، گھاس اور درختوں اور ہواؤں اور چاندنی رات کی ٹھمری سنتے سنتے آرام سے سو جائیں گے۔

گھوڑے کی ٹاپیں سڑک کی کنکریلی سطح پر بڑا پرسکون سا شور پیدا کر رہی تھیں۔ عبدالقادر کوچوان سر جھکائے نہ جانے ان بہت ساری دنیاؤں میں سے کون سی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ اُس کی دنیا کون سی تھی؟ (ایک بانس کا جھونپڑا یا شہر کی غلیظ گلی میں ایک تنگ و تاریک مکان، یا ایک شکستہ شاگرد پیشہ۔ دس آدمیوں کا کنبہ اور مسلسل فکرِ معاش اور مسلسل غمِ زیست) عبدالقادر کوچوان جو محکمہ مردم شماری کے لئے ایک عدد اور اہلِ سیاست کے لئے ایک ووٹ کی حیثیت رکھتا تھا، اُن دیکھے طوفانوں میں گھرا دیپالی سرکار کو وُوڈ لینڈز لئے جا رہا تھا۔

موڑ پر پہنچ کر جھلملیوں والی بند گاڑی دوسری سڑک پر اس طرح نمودار ہوئی جیسے کہانی کا نیا باب کھلتا ہو۔ (چاروں طرف زندگی کی کہانیوں کے باب کھلتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں اور کردار صفحات میں سے نکل کر قبروں میں جا لیٹتے ہیں۔ چتاؤں میں پھونک دیئے جاتے ہیں۔ نیا صفحہ پلٹ کر قاری آگے بڑھتا ہے)

سے رہنے کے قابل بنایا گیا تھا۔ اس نے اپنے اُجاڑ چندر گنج کا تصوّر کیا جس کے خالی مطب میں بابا اُن مریضوں کے انتظار میں صبر سے بیٹھے ہوں گے، جو کبھی کبھار اس طرف آ نکلتے تھے۔ ڈھاکہ شہر کے ہزاروں، لاکھوں نیم تاریک مفلس مکان اور جھونپڑے، جن میں لالٹین اور مٹی کے دیئے ٹمٹما رہے تھے۔ دور غار گاؤں میں اس کا آبائی مکان جو تقریباً ڈھے چکا تھا۔ ایسا افلاس، ایسی ویرانی اس ملک پر۔ اس ہندوستان پر طاری ہے۔

مگر وہ دفعتاً ایک نئے جوش اور خود اعتمادی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی ـــ انقلاب آنے والا ہے۔ اس انقلاب کے لانے والے ہم خود ہیں اور ہم کامران ہوں گے۔ اس انقلاب ہی کی عظمت ہے جس کی وجہ سے ووڈ لینڈز کے مالک کی بیٹی دھارے میں شامل ہو چکی ہے۔ جواہر لال نہرو بھی تو آنند بھون میں پروان چڑھے تھے۔

بیرے تے باہر آ کر پہلی بار اس سے بات کی۔ "مس صاحب پلنگ میں نہیں۔ اب اندر جائیے۔"

"کس طرف ـ ؟" اس تے دریافت کیا۔

"مس صاحب مارننگ روم میں ہیں۔ اِدھر۔"

دیپالی کی سمجھ میں نہ آیا ـ شام کے وقت اگر مارننگ روم میں ہیں تو اسے ایوننگ روم کیوں نہ کہنا چاہیئے۔ خیر بہر حال۔

بیرے نے بھاری عنابی پردہ اٹھایا۔ وہ اندر گئی۔ پردہ اس کے پیچھے برابر ہو گیا۔ اب وہ اس بڑے کمرے میں کھڑی تھی، جس کے فرانسیسی دریچے کے نزدیک ایک کوچ پر کاری اوما رائے شال اوڑھے آنکھیں بند کئے کشنوں کے سہارے نیم دراز تھیں۔

ارے تو یہ ہیں اوما دیوی ـــ اُسے ذرا سی مایوسی ہوئی۔ مگر فوراً اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ یہ میری بورژوا رومانیت ہے۔ میں کسی ناول کی ہیروئن کی متوقع کیوں تھی ـــ اوما دیوی ایک فالتو، رومانی ہیروئن کی بجائے نئے ہندوستان کی نئی عورت ہیں۔ ہمیں اپنے نیتاؤں کو خواہ مخواہ گلیمرائز نہیں کرنا چاہیئے۔

آہٹ سن کر اوما دیوی نے آنکھیں کھولیں اور نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔

بڑے بڑے دریچوں والے کمرے میں شفق کی سہانی روشنی پھیل گئی تھی۔ کمرہ ایسا لگتا تھا،

اب دیپالی نے کھڑکی کی جھلملی چڑھا کر باہر جھانکا۔ اسی راستے پر آگے جا کر ارجمند منزل تھی جس میں جہاں آرا رہتی تھی۔ جہاں آرا بیگم، جو اس دھندلی داستان کے آخری صفحات پر زندہ تھی جس کے مصنفوں نے جہانگیر نگر[ہ] آباد کیا تھا۔ اسی راستے پر، اونچے اونچے معزز درختوں کے پیچھے ڈپٹی ایم کا بنگلہ تھا۔ اس بنگلے میں رہنے والا ولیم کینٹ ویل اس داستان کا ایک اہم کردار تھا جس کے مصنفوں نے جہانگیر نگر اجاڑا تھا۔ اسی راستے کے اختتام پر "ووڈ لینڈز" تھا۔ نئی داستان کے مصنفوں نے جہانگیر نگر کے فاتحین کے تعاون سے اپنے لئے کیسے کیسے "ووڈ لینڈز" تعمیر کئے تھے۔

دیپالی شاداں و فرحاں تھی کہ ایک نئے ڈرامے میں حصہ لے رہی تھی۔ جس کے لیکھک ارجمند منزل اور ڈی ایمز ہاؤس اور ووڈ لینڈز کی بنیادیں ہلانے والے تھے۔ دیپالی کی آدرش وادی زندگی اس وقت بڑی مکمل تھی۔ جس زندگی میں مہربان، سمجھ دار، درد مند رفیق اور ساتھی موجود تھے۔ سب مل کر خطروں کا چیلنج قبول کر رہے تھے۔ آگے قدم بڑھا رہے تھے۔ اوما دیبی سے ملنے کی خوشی میں وہ رات بھر سو نہیں سکی تھی۔ ان دیکھے ریحان دا نے ایک اہم پیغام رسانی اسی کے سپرد کی تھی۔ ریحان دا جیسے بڑے نیتا اسے اب گویا اپنے اندرونی حلقے میں شامل کر چکے تھے۔ خوشی کے مارے اس کا بس نہ چلا کہ پر لگا کر اوما رائے کے پاس پہنچ جائے۔

لیکن ووڈ لینڈز کے پھاٹک پر کانسٹیبل کھڑا دیکھ کے وہ دھک سے رہ گئی۔ بیگ مضبوطی سے تھام کر وہ جلدی سے نیچے اتری اور کانسٹیبل سے کہا کہ اوما رائے کی پرانی شاگرد ہے۔ کانسٹیبل نے بے پروائی سے سر ہلایا۔ غالباً دیپالی کو اتنا گھبرانے کی ضرورت نہ تھی۔ عبدالقادر کو کرایہ ادا کرنے کے بعد وہ چند لمحوں کے لئے پھاٹک پر ٹھٹکی اور گاڑی کو واپس جاتے دیکھتی رہی۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس اجنبی جگہ پر غیر محفوظ اور تنہا رہ گئی ہے۔ عبدالقادر کوچوان، حکام اور امرا کی اس قانی دنیا میں اسے اکیلا چھوڑ کر سر جھکائے جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں ٹخ ٹخ کرتا دور چلا جا رہا تھا۔ وہ ٹ کر باغ کی سرخ سڑک پر آئی تو سامنے گھاس پر پولیس کا وردی پوش اعلیٰ افسر (ہندوستانی) ر ایک وردی پوش اعلیٰ افسر (انگریز) باتوں میں منہمک گھاس پر ٹہلتے نظر آئے۔ تیز تیز چلتی برساتی میں نچی تو بیرا اس پر بھونکا۔ اس نے سراسیمگی سے "اوماں" کا ہلکا سا نعرہ لگایا تو ایک عالی شان ڑا سی اس کی سمت لپکا۔ اس نے اپنے الفاظ دہرائے: اوما دیبی کی پرانی شاگرد دیپالی سرکار ملنے

[ہ] ڈھاکہ کا پرانا مغل نام

کے لئے آئی ہے ۔

چپراسی اندر گیا ۔ اور چند منٹ بعد سفید چیکن اور سبز پٹی والا بیرہ باہر آیا اور منھ سے کچھ بولے بغیر سر کی جنبش سے اس نے دیپالی کو اندر آنے کا اشارہ کیا ۔ وہ ذرا جھجکتے ہوئے طویل گیلری میں داخل ہوئی، جس کی دیواروں پر دو رویہ بارہ سنگھوں کے سر اپنی کانچ کی آنکھوں سے باہر آنے جانے والے کو گھور رہے تھے ۔ سیاہ اور سفید ٹائیلوں کے فرش پر سے گزرتے ہوئے دیپالی کو یاد آیا ۔ بیرسٹر رائے کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے موکل اشرفیوں سے بھری تھیلیاں لا لا کر ان کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں اور ان کی بیوی مسز اوما رائے اپنی سینڈلز میں ہیرے جڑواتی ہیں ۔ دیپالی سوچنے لگی ۔ اتنی دولت مند اوما دیبی تحریک کی مالی مدد کیوں نہیں کرتیں ۔ جب ضرورت پڑتی ہے تو ہم جیسے غریب کارکنوں کو اپنے گھر میں سیندھ لگانا پڑتی ہے ۔ اکشئے دا ٹیوشن کرتے ہیں ۔ ستیندر مزدور ہے ۔ محمود الحق پریس میں پروف ریڈر ہے اور دن رات اپنی کمزور آنکھیں پھوڑتا ہے ۔ اس طرح جو کچھ بن پڑتا ہے یہ سب لا کر تحریک کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں ۔ اوما رائے ایک محل میں رانیوں کی طرح رہتی ہیں اور ریحان دا کسی پُراسرار دیوتا کی طرح کہیں چھپے بیٹھے ہیں اور "اوپر" سے ریحان دا کی طرف سے جو حکم ملتا ہے ۔ ہم سب اسے بجا لانے کے لئے مستعد ہیں ۔

اب وہ بیرے کے پیچھے پیچھے ایک ہال میں داخل ہوئی ۔ جس کے وسط میں سنگ مرمر کی گول میز پر کسی یونانی دیبی کا مرمریں مجسمہ استادہ تھا ۔ فرش پر شیر کی کھالیں اور بخارا کے قالین بچھے تھے ۔ دیواروں کے برابر برابر لحیم شحیم صوفے رکھے ہوئے تھے ۔ دیپالی نے ایسی شان و شوکت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی ۔ ارجمند منزل میں بھی نہیں ۔ ارجمند منزل بھی بڑی عالیشان کوٹھی تھی ۔ مگر وہاں کی ہر چیز بوسیدہ اور مضمحل سی معلوم ہوتی تھی ۔ اوما دیبی سے ملاقات کی خوشی نے اسے راستے میں جس قدر مضطرب کیا تھا اس پر کیف اور جگمگاتے ماحول کو دیکھ کر وہ یک لخت اتنی ہی دل گرفتہ ہو گئی ۔

کریم خان بیرے نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا کہ یہیں ٹھہر جائے (بیرا ملاقاتیوں کی اوقات پہچان کر بات کرتا تھا ۔ اور ہما شما کو اشاروں ہی پر ٹرخاتا تھا) وہ ایک دروازے کا عنابی پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا ۔ دیپالی ایک کرسی کے کنارے پر ٹک گئی ! وہ ہال کی آرائش کو غور سے دیکھنے لگی ۔ انسانوں کی زندگیوں میں اتنا شدید تفاوت بھی ممکن ہے ۔ اسے عبد القادر کوچوان کا شکستہ قبر ایسا مکان یاد آیا، جو چندر گنج کے کھنڈر ایسے شاگرد پیشے میں ٹاٹ اور ٹین کے ٹکڑوں اور بانس کی بوسیدہ چٹائیوں کی مدد

جیسے باہر باغ میں شامل ہو گیا ہے۔ ہر شے ساکت اور متحیر اور منتظر تھی۔

"نومشکار۔ اوما دیدی۔"

"نومشکار۔ آؤ۔ آؤ۔ بیٹھو۔"

دیپالی کوچ کے مقابل ایک کرسی پر ٹک گئی۔

تب اوما رائے نے تپائی پر سے اٹھا کر عینک لگائی اور نووارد اجنبی لڑکی کو تیکھی، گہری ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔

"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے اوما دیدی؟"

"کیا نام بتایا تھا تم نے — دیپالی سرکار —؟"

"جی —"

"تم — اسکول میں کون سی کلاس میں تھیں؟" اوما رائے نے عینک اتار کر ساری کے پلّو سے صاف کرنے کے بعد دوبارہ ناک پر جمائی۔ "سوری — میں تم کو پہچان نہیں سکی —"

"جی — میں — اوما دیدی — مجھے سریندر دا نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ سریندر مکرجی نے۔" اس نے اپنے بیگ پر ہاتھ رکھ کر نیچی آواز میں کہا۔

"اوہ —" اوما دیبی چونک کر اٹھ بیٹھیں۔ ہاتھ بڑھا کر کیوپڈ اور سائیکی کے سروں پر پھیلے سبز جھالردار شیڈ والا اٹرا لیمپ روشن کیا۔ شفق کا اجالا تیز برقی روشنی میں ڈوب گیا۔ اب باغ میں پرندے بسیرا لینے کے لیے چہچہا رہے تھے۔

"بڑی سردی ہے۔" اوما دیبی نے شال لپیٹتے ہوئے کہا۔ "یہ کھڑکی بند کر دو۔"

دیپالی نے اٹھ کر فرانسیسی دریچے کے سلسلے وار پٹ بند کر دیے۔ اور واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اوما دیبی اسے بڑے دھیان سے دیکھ رہی تھیں۔

"تم کون ہو —"

"دیپالی سرکار —"

"صرف نام دہرانے سے کام نہیں چلے گا — اس نام کے میرے لیے ابھی تک کوئی معنی نہیں ہیں۔ تفصیل سے بتاؤ —" اوما رائے نے جھنجھلا کر کہا اور انگلیوں سے کنپٹیاں دبائیں۔ دیپالی جو کانچ

میں اُوما رائے کی سخت گیری کی حکایتیں سن چکی تھی۔ اس اندازِ گفتگو سے زیادہ نہیں گھبرائی اور اطمینان سے دوبارہ مزاج پرسی شروع کی۔ "آپ کی طبیعت کیسی ہے اوما دیدی؟"

وہ خاموش رہیں۔ پھر کہا۔ "کوئی پیغام لائی ہو۔؟"

"جی۔ مسز نیرد ایرا کو شیکٹ ہیں۔ میں کالج میں سیکنڈ ایئر میں پڑھتی ہوں۔ میرے بابا آتومے چندر سرکار پرائیویٹ پریکٹس کرتے ہیں۔" اس نے اپنے گھر کا پتہ بتایا۔

"کیا پیغام ہے۔؟" اوما دیبی نے پوچھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"ریحان دا نے آپ کو خط بھجوایا ہے۔"

"ریحان —" وہ اب چونک کر پھر سیدھی ہو بیٹھیں۔ "ریحان کا خط ہے تو اتنی دیر سے فضول باتوں میں وقت کیوں ضائع کر رہی ہو۔ لاؤ۔"

دیپالی نے بڑے اطمینان سے بیگ کھولا۔

عین اسی وقت عنابی پردے کو جنبش ہوئی۔ سفید ساری میں ملبوس ایک باوقار معمر خاتون نے اندر جھانکا۔ اور آواز دی۔ "ہاؤ آر یو اُوما۔"

"آئی ایم فائن۔" اوما نے خاصی بیزاری سے جواب دیا۔ "میری ایک پرانی شاگرد آئی ہوئی ہے ذرا چائے بھجوا دیجیے۔"

"اچھا۔" لیکن واپس جانے کے بجائے مسز رائے اندر آ گئیں۔ دیپالی نے تعظیماً کھڑے ہو کر ان کو نمسکار کیا۔

"جیتی رہو۔" دیپالی پر سرسری سی نظر ڈال کر انہوں نے اوما کو فکر مندی سے دیکھا۔ "دوا پی لی۔؟ ڈاکٹر چیٹرجی کہہ رہے تھے، جب تک مرض کی تشخیص نہیں ہو جاتی —"

"کتنی بار کہوں گی ماں —" اُوما نے چڑ کر مسز رائے کی بات کاٹی۔ "مجھے کوئی مرض ورض نہیں۔ خالی سفر کی تکان ہے۔ آپ سب جانے کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔"

مسز رائے نے اس تلخ لہجے کی پرواہ کئے بغیر پھر کہا۔ "ہم لوگ کلب جا رہے ہیں۔ وقت پر کھانا کھا لینا۔" اوما نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مسز رائے چند سیکنڈ تک اسی طرح کھڑی رہیں اور پھر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

"اوہ ـــ والدین ـــ!" اوما نے پہلی بار مسکرا کر دیپالی کو دیکھا۔ "تمہارے والدین بھی اتنے صبر آزما ہیں ـــ؟"

دیپالی اوما دیبی کے مزاج کی اس تبدیلی سے خوش ہوئی اور ہنس پڑی۔

"اچھا۔ اُٹھو اور دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دو۔"

"لیکن ابھی تو اوما دی آپ نے چائے منگوائی ہے۔"

"ارے ہاں ـــ بہت سمجھدار بچی ہو واقعی!"

"بچی ـــ! اوما دی، میں اس اپریل میں انیس برس کی ہو جاؤں گی۔"

"صرف انیس برس!"

"ذرا میری بدقسمتی ماں سے پوچھیے۔ اُن کو یہی غم کھائے جا رہا ہے کہ میری بیاہ کی عمر ہی نکل گئی۔!" دیپالی اپنی رَو میں کہے گئی۔ اوما دفعتاً پھر تیوری پر بل ڈال کر سنجیدہ ہو گئیں اور سُرعت سے لفافہ چاک کیا۔

سائے کی طرح بیرے نے اندر آ کر چائے کی کشتی میز پر رکھی اور واپس چلا گیا۔ دیپالی نے چائے بنائی اور دروازہ اندر سے بند کیا۔ اوما پیالی سے ایک گھونٹ بھر کر طویل طویل خط پڑھنے میں محو ہو گئیں۔

اپنی پیالی ختم کر کے دیپالی کرسی سے اٹھی اور ٹہل ٹہل کر دیواروں پر لگی تصویریں دیکھنے لگی۔ لارڈ بائرن، جن کے عقب میں طوفانی سمندر تھا، اور ملّاح ان کی کشتی کنارے سے باندھ رہا تھا اور وہ فاتح قلوب اپنی مغرور اور توانا مسکراہٹ کے ساتھ گویا اپنے قدموں پر جھکی ہوئی دنیا کا نظارہ کرنے میں مصروف تھا۔ وینس اور ایڈونس ـــ مسٹر پک وک ـــ اور سیاہ پوشاک میں ملبوس ایک لرزہ خیز عورت، جو ایک باریش مرد کا بریدہ سر ہاتھوں میں لیے چیخیں مار رہی تھی۔ یہ بڑی بھیانک تصویر تھی۔

دیپالی چند لمحوں تک اس تصویر کو دیکھتے رہنے کے بعد ذرا خوفزدہ سی ہو کر اپنی کرسی پر واپس آ بیٹھی۔ اوما دیبی خط ختم کر کے گہری فکر اور پریشانی میں مبتلا آنکھیں بند کر چکی تھیں۔ باہر گھپ اندھیرا چھا گیا تھا اور دریچے کے نزدیک املتاس کی ڈالیاں سرسرا رہی تھیں۔ دور سے سیزر کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اوما دیبی نے آنکھیں کھولیں اور دیپالی کو بڑی سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"یہ کس کی تصویر ہے اوما دی ـــ؟" دیپالی نے پوچھا۔

"کون سی؟"

"یہ والی۔" اُس نے اشارہ کیا۔

"نہیں جانتیں؟ انٹرمیڈیٹ میں انگریزی پڑھتی ہو یا گھاس کھودتی ہو؟"

اس ڈانٹ سے واقعی وہ سہم گئی۔

"یہ آسکر وائلڈ کی سلومے ہے۔" ادما دیبی نے ترشی سے کہا۔

"یہ کر کیا رہی ہے ادما دی؟"

"تم مجھے بہت بے وقوف معلوم ہوتی ہو۔" ادما دیبی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ "یا بیوقوف ہو یا بن رہی ہو۔"

، اترانے والی، جیسی لڑکیاں بہت ہی بُری معلوم ہوتی ہیں۔ انہوں نے دل میں اضافہ کیا اور کہا "کیا تم کو نظر
یں آیا کہ یہ کیا کر رہی ہے؟"

"مگر اس کی کہانی کیا تھی ادما دی۔"

"مجھے یاد نہیں۔ مجھے مذہبی اساطیر سے مطلق دلچسپی نہیں ہے۔" وہ کوچ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔
تم مجھ سے ڈیکیڈنٹ تصاویر پر گفتگو کرنے آئی ہو یا کچھ کام کرنا ہے؟"

"جی ادما دی!" دیپالی پھر ہنس دی۔

یہ لڑکی خوبصورت ہے اور بیوقوف ہے۔ اس لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ ادما دیبی نے
کو بہ جوہرا کر کے مٹھی میں بھینچا۔ مگر حصول مقصد کے لئے رسک لینے ناگزیر ہیں۔ انہوں نے ایک گہری سانس
اور ونڈو سیٹ پر جا بیٹھیں۔

"ادھر آؤ۔ اور غور سے جو کچھ میں کہنے والی ہوں سنو۔" انہوں نے درشتی سے کہا۔

یکایک دیپالی کو اسی کیفیت نے آن دبوچا، جو اس پر ہال میں طاری ہوئی تھی۔ یہ میری اُستانی
ی نہیں رہیں۔ عمر میں بہت بڑی البتہ ہیں۔ مگر مجھ پر اس طرح حکم کیوں چلا رہی ہیں۔ ؟ اس لئے کہ
ن زادی ہیں؟ اُس نے بڑی بے خوفی سے جواب دیا۔ "جی ہاں۔ ادما دی، مگر پہلے میں آپ سے ایک بات
پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"کہو۔"

"آپ اتنی بے تحاشا دولتمند ہیں۔ چپکے چپکے تحریک کی مالی مدد کیوں نہیں کرتیں؟"

بیوقوف ہے۔ اسی لئے نڈر اور منہ پھٹ بھی ہے۔ اُوما نے دل میں سوچا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر اُسے جواب دیا۔ "دیپا آپی یہاں آن کر بیٹھو۔ ایک ایک منٹ بہت قیمتی ہے۔" ربا! ابھی تک میرے " جی پس منظر کو معاف نہیں کر سکے۔ انہوں نے دل میں کہا) تمہارے سوال کا سیدھا سا جواب دیپا آپی یہ ہے کہ میں تین برس سے لندن میں تھی اور چند روز قبل ڈھاکے واپس پہنچی ہوں۔ اور آتے ہی بیمار پڑ گئی۔ ساتھیوں سے میرا پہلا رابطہ اس وقت تمہارے ذریعے قائم ہوا ہے اور ایک انتہائی اہم کام کے سلسلے میں۔ چنانچہ غور سے سنو۔"

"اوہ ـــ" دیپا آپی نے بے حد نادم ہو کر کہا۔ "آئی ایم سوری اُوما دیدی۔" وہ شرم سے پانی پانی ہوتی ونڈو سیٹ پر جا بیٹھی۔

"اب میں چند سوال تم سے کرتی ہوں۔ سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ کیونکہ ایک بڑی خطرناک مہم ہمارے سامنے ہے جس میں برسوں کی جیل کے علاوہ جانیں بھی جا سکتی ہیں۔" پھر وہ چند لمحوں کے لیے چُپ ہو کر پیشانی پر انگلیاں پھیرتی رہیں۔

"بتائیے اوما دی۔"

"بہت جلد اس علاقے میں کمیونسٹوں کی عام گرفتاری شروع ہونے والی ہے۔ گرفتاریوں ک متعلق اور دوسرے خفیہ احکام کی خبر لگانے کے لئے ریحان الدین احمد نے لکھا ہے کہ۔ کہ دیپا آپی سرکا کی مدد لی جائے۔"

"میری ـــ میری مدد ـــ؟" دیپا آپی ہکا بکا رہ گئی۔ "مگر ریحان دا تو مجھے جانتے بھی نہیں شاید میرے نام سے بھی واقف نہیں ہوں گے وہ ـــ اور ـــ میں کیا کر سکتی ہوں بھلا۔ اوما آن ـــ"

"تم یہ سارا کام کس طرح کرو گی۔ اس کی تفصیل ریحان نے مجھے لکھ بھیجی ہے۔" اُوما نے لفافے پر ہا رکھ دیا۔ "پہلے یہ بتاؤ انگریزی بولنی آتی ہے؟"

"جی ہاں ـــ"

"انگریز جب آپس میں تیز تیز بولیں تو سمجھ لو گی ـــ؟"

"جی ہاں۔ مس جنگز اور مس ہبڈے ہم کو انگریزی پڑھاتی ہیں۔ اس لئے عادت ہو گئی ہے۔"

"گڈ ـــ ہمت ہے ـــ؟"

"جی ہاں۔ کافی ہمت ہے۔"

"ابھی تم یہاں آئیں تو تم کو کس کس نے دیکھا تھا۔ میرے اور میری والدہ کے علاوہ۔"

"ایک کانسٹبل اور ایک چپراسی نے۔"

"میرے ماما کو پہچان سکتی ہو؟"

"شاید وہی باہر ٹہل رہے تھے۔ ایک انگریز کے ساتھ۔"

"ہاں۔ اسپیشل آرمڈ کانسٹیبلری والا کرسٹوفر ہیگ بھی ان سے ملنے آیا ہوا ہے۔ لو یہ خط
و۔ بہت غور سے پڑھنا۔"

دیپالی نے آدما کے ہاتھ سے خط لیا اور پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ آدما دیبی دریچے سے باہر دیکھنے
۔ باغ پر جاڑوں کی دھند چھا چکی تھی۔ دیپالی نے خط ونڈو سیٹ پر رکھ دیا۔ اور چپکی بیٹھی رہی۔
نے مڑ کر اس پر نظر ڈالی۔

"مجھے خود تعجب ہے کہ ایک ناتجربہ کار اور کمسن لڑکی پر اتنی بڑی ذمہ داری ریحان نے کس طرح
دی۔ ریحان کے اس خط سے ظاہر ہے کہ وہ تم کو اچھی طرح جانتا ہے اور اسے یقین ہے کہ صرف
یہ کام بآسانی کر سکتی ہو۔"

"مگر آدما دی۔۔ ریحان دا مجھے بالکل نہیں جانتے۔۔ میں نے تو آج تک ان کی شکل کیا تصویر
نہیں دیکھی۔"

"تم کو مجھ سے جھوٹ بولنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔"

"آدما دی۔ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ ریحان دا کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

آدما پھر جھلا گئیں۔ "تم مجھے سکھلاؤ گی کہ انڈر گراؤنڈ کا کام کس طرح کیا جائے۔ یہ بیا ریحان
طرح کی ہدایات کس کو دے۔ میں ریحان کو بہت قریب سے جانتی ہوں۔ یہ بھی مت سوچ بیٹھنا
کوئی رومینٹک ہیرو ہے۔ گو میں جانتی ہوں کہ سارے بنگال میں کالج کی لڑکیاں بہت دنوں سے
پر زہر کھا رہی ہیں۔۔۔ خیر۔۔۔ تو یاد رکھو کہ وہ رومینٹک نہیں ہے۔ بےحد پریکٹیکل اور انتہائی سمجھ دار
ن ہے۔ وہ کوئی ڈرامہ نہیں کھیل رہا ہے۔ دو مرتبہ اس کے عزیز دوست اس کو شدید دھوکا دے چکے
اس لئے وہ بے انتہا محتاط ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود اس نے تم پر بھروسہ کیا ہے۔ سارے بنگال کی

نوجوان لڑکیاں ـ" انھوں نے سپاٹ، مضبوط آواز میں دہرایا ــ "ریحان الدین احمد پر عاشق ہیں۔ مگر ا
کو جانتی صرف میں ہوں ۔ صرف میں اس کی رفیق اور دوست ہوں ۔ مجھ سے زیادہ کوئی اسے نہیں جانت
وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں مجھ سے جونیئر تھا مگر لندن میں بھی ہم دونوں ایک ہی کالج میں تھے۔ اکٹھے ہم نے وہاں کی تحریک
میں کام کیا ہے ۔ وہ رپورٹر کی حیثیت سے اسپین بھی گیا ۔ مجھے یہی افسوس مرتے دم تک رہے گا کہ میں محاذ
نہ جاسکی ۔ خیر ۔ تو اس نے لکھا ہے کہ تم سیدھی اور قابل اعتماد ہو ۔ ریحان انسان کو خوب پہچانتا ہے ۔ یہ
نظر میں آدمی کو پہچان لیتا ہے ۔ امید ہے کہ اس نے تم کو پہچاننے میں بھی غلطی نہ کی ہوگی ــ"

"مگر وہ تو مجھ سے بھی ــ" دیپالی نے کہنا شروع کیا اور پھر ڈر کر چپ ہوگئی۔

"وہ تم کو پہچان سکتا ہے ۔ مگر یاد رکھو کہ تمہارا اسے پہچاننا قطعی ضروری نہیں ۔" اوما دیبی نے بات ختم
کمرے کے ریشمیں پردے آبشاروں کی طرح سرسرانے لگے ۔ دفعتاً دیپالی کو بڑا بے تکا خیال اس وقت
آیا۔ اوما دی کے پاس بھی بالوچر بوٹے دار ساریاں ہوں گی ۔ ایک سے ایک نایاب ــ خیر یہ کیا کیا جھک
ہے۔ اور میں ایک پرخطر مہم پر جا رہی ہوں ۔

"مجھے اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ ۔" اوما کی آواز دور سے اس کے کان میں آئی۔

"کلاس کی بیک گراؤنڈ ــ؟"

"ہاں ــ"

"مڈل کلاس ۔"

"اوما دیبی نے غور سے سننا شروع کیا۔ گویا ہسپتال میں کسی مریض کی ہسٹری سن رہی ہوں۔

"تم نے کیا عمر بتائی تھی ۔؟"

"انیس سال اور اب تک سکنڈ ایئر ہی میں ہوں ۔" دیپالی نے تاسف سے کہا۔

"وجہ ــ؟"

"میں بارہ سال کی تھی جب ماں مرگئیں ۔ ان کو ــ کینسر ہوگیا تھا۔ بابا پٹنہ لے کر گئے ۔ و
ہسپتال میں مرگئیں ۔ میں سب سے بڑی تھی ۔ تینوں بھائی چھوٹے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے میں
اسکول چھوڑ دیا ۔"

"ہاں ۔ ہاں ۔ کہے جاؤ ۔" اوما دیبی گھٹنوں پر کہنیاں رکھ کر غور سے سنتی رہیں۔

"بابا ماں پر عاشق تھے۔ ان کے مرنے کے بعد بجھ کر رہ گئے۔"

"پُور مَین۔"

یک لخت دیپالی نے اوما پر نظر ڈالی۔ اور اسے خیال آیا۔ بابا کی بقیہ عمر بھی اسی طرح تنہا اور اداس گزر جائے گی۔ کاش انہیں اوما دی جیسی سمجھ دار اور دردمند عورت کی رفاقت میسر ہو سکتی پھر اس نے بے ساختہ بڑے فخر اور پیار سے کہا۔ "میرے بابا بہت خوبصورت ہیں۔ دکھوں نے انہیں وقت سے بہت پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ مگر اب بھی بہت اچھے لگتے ہیں — اور میرے کاکا — میرے کاکا تو بابا سے بھی زیادہ —" پھر اس کی آواز روندھ گئی۔

"اتنی جذباتیت سے کام نہیں چلے گا۔ دیپالی سرکار —" اوما رائے نے درشتی سے کہا — "تمہارے کاکا کو کیا ہوا —؟"

"پھانسی —" دیپالی نے مضبوطی سے جواب دیا۔

"اوہ — آئی ایم سوری۔" اوما دیبی نے آہستہ سے کہا۔

"کیا نام تھا تمہارے چچا کا —؟"

"دنیش چندر سرکار۔"

"گڈ گاڈ۔ اوما دیبی سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ "تم — تم دنیش چندر سرکار کی بھتیجی ہو؟"

"جی ہاں۔ وہ بابا کے اکلوتے چھوٹے بھائی تھے۔ جب ۳۱ء میں ماں ریڈیم ہسپتال میں تھیں تب کاکا کو دہشت پسندوں کے اس مشہور کیس میں پکڑ لیا گیا۔ بابا نے — بابا نے پٹنے سے عقار گاؤں جا کر ساری آبائی کھیتی باڑی بیچ کھوچ پٹنے کا ایک بڑا بیرسٹر کھڑا کیا (اسے یاد آیا بابا کہتے تھے کہ وہ شری پری توش بھادرائے کو کھڑا کرنا چاہتے تھے مگر ان کی فیس زیادہ تھی) مقدمہ چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ مگر وہ بیرسٹر کاکا کو بچا نہ سکا۔ اور ان کو پھانسی ہو گئی۔ جس سال ماں مری ہیں، اسی کے چھ مہینے بعد ہی کاکا کو پھانسی ہو گئی۔"

"تم کو یاد ہیں —؟"

"خوب اچھی طرح یاد ہیں۔ چھ سال پہلے ہی کی تو بات ہے۔" دیپالی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ مرے کا کلاک ٹک ٹک کرتا رہا۔ چند لمحوں بعد دیپالی نے کہا۔ "اوما دی بعض دفعہ صبح منہ اندھیرے میری انکھ کھل جاتی ہے۔ جب ابھی پوری طرح اجالا نہیں پھیلتا۔ اور پلنگ پر پڑے پڑے کھڑکی سے باہر اندھیرے

آسمان کو دیکھ کر سوچتی رہتی ہوں، بالکل ایسے ہی وقت میں، پو پھٹنے کے وقت میں، کاکا انقلاب اور ہندوستان کی آزادی کے نعرے لگاتے تختے پر چڑھ گئے تھے ــــ اور میں خوب روتی ہوں اور سوچتی ہوں کاکا اور ان کے ہزاروں ساتھیوں کا خون رائیگاں نہ ہونے دوں گی ــــ وہ خاموش ہو گئی۔

سوئس کاٹیج کی شکل کا کلاک ٹک ٹک کرتا رہا۔ اب رات کے پونے دس بج رہے تھے۔ دیپالی نے وقت پر نظر ڈالی اور جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ "کاکا کی شہادت کے بعد بابا کا دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ اگر ہم بچوں کا بکھیڑا نہ ہوتا تو وہ شاید سنیاس لے لیتے۔ مگر وہ مذہبی بھی نہیں ہیں۔ وہ کانگریس میں شامل تھے اور جیل بھی کاٹ چکے تھے، مگر لاڈلے بھائی کی موت کے بعد سے ان کو ایک عجیب طرح کا ڈزی الیکشن ہو گیا۔"

"سیاست سے نفرت ہو گئی؟"

"تقریباً۔ اب وہ دن بھر چپ چاپ کمرے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ غریبوں کا مفت علاج کرتے پھرتے ہیں۔ پریکٹس چلتی نہیں۔ بس اتنا کما لیتے ہیں کہ گھر چل جائے۔"

"تم ابھی کھیتی باڑی کی کیا بات کر رہی تھیں؟"

"غفار گاؤں کے نزدیک ہمارے یہاں مغلوں کی دی ہوئی زمینداری تھی۔ وہ بابا کے پُرکھوں نے ناچ گانے اور شراب پینے میں اڑا دی۔ اس غصے میں کہ نودولتے بنیوں کے آگے نہیں جھکیں گے۔"

"فیوڈل ڈکیڈنس جو انیسویں صدی کے برطانوی بورژوا نظام سے ٹکرا کر ہار گیا۔" آوما رائے نے سر ہلا کر کہا۔ دیپالی نے ذرا آنکھیں پھیلا کر انھیں دیکھا۔

"اب تمہارے کنبے میں کون کون باقی ہے؟"

"تھوڑے سے رشتہ دار ہیں، وہ غفار گاؤں میں چھوٹی موٹی سرکاری ملازمتیں کرتے ہیں۔ بابا کے ایک چچازاد بھائی ہیں۔ وہ بھی ڈاکٹر ہیں۔ چند سال ہوئے وہ ٹرینیڈاڈ ہجرت کر گئے۔ وہاں ہزاروں کما رہے ہیں۔ بس اور کوئی نہیں۔ ٹھاکرماں[1] کا پچھلے سال انتقال ہو گیا۔ میری ماں کا میکہ سراج گنج میں ہے۔ وہ بھی ملازمت پیشہ لوگ ہیں۔ اور کیا بتاؤں۔ ہاں۔ یہ "چندر کنج" ہماری کوٹھی کتنے کی خوشحالی

---

[1] دادی

کے زمانے میں ٹھاکر دا[1] نے بنوائی تھی۔ ٹھاکر دا کی زندگی ہی میں بابا اور کاکا قومی تحریک میں شامل ہو کر جیل یاترا کے لئے چلے گئے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے یہاں ایسی غربت چھائی کہ بعض دفعہ رات کو مٹی کا تیل خریدنے کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔ صرف اسی امید نے ہم سب کو زندہ رکھا کہ انگریز سے چھٹکارا ملنے کے بعد دیس کے ان سارے اندھیرے گھروں میں اجالا ہو جائے گا۔"

"ایسا ضرور ہو گا۔ دیپالی۔ ایسا ضرور ہو گا۔" اوما رائے نے آہستہ سے کہا۔ "تم مایوسی کا شکار کبھی نہ ہونا۔"

"میں مایوس بالکل نہیں ہوں اوما دی۔" دیپالی نے دفعتہً ہنس کر کہا۔

"تم نے دوبارہ پڑھائی کیسے شروع کی؟"

"بابا کی ایک ہی سگی بہن ہیں۔ عمر میں ان سے بہت بڑی۔ چار سال ہوئے وہ بیوہ ہو گئیں۔ ان کے شوہر فرید پور میں وکالت کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد پشپی ماں ہمارے یہاں آگئیں۔ وہ لاولد ہیں۔ انہوں نے آن کر گھر سنبھال لیا تو میں نے ہائی اسکول پاس کیا اور کالج میں داخل ہو گئی۔ ساتھ ہی عباس الدین احمد کے ہاں جا کر سنگیت بھی سیکھتی رہی۔ میں بابا کی مدد کے لئے ڈاکٹری پڑھنا چاہتی تھی۔ لیکن بابا جانتے ہیں کہ ڈاکٹری کی تعلیم میں میرا جی بالکل نہیں لگے گا، اس لئے انھوں نے سائنس نہیں لینے دیا۔ اب اس جولائی میں وہ مجھے شانتی نکیتن بھیج رہے ہیں۔ ان کے دوست پروفیسر مرتضیٰ حسین کا بھی سخت اصرار ہے کہ میں شانتی نکیتن چلی جاؤں ــــ" دیپالی نے پھر کلاک پر نظر ڈالی۔

"تحریک میں کس طرح شامل ہوئیں؟" اوما رائے کے سوالات ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔

دیپالی پھر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"بیہودہ اسکول گرل گگلز ــــ" اوما رائے نے غصے سے کہا۔

دیپالی نے گلے پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی۔ "اس کا قصہ بہت دلچسپ ہے اوما دی۔ ایک روز ــــ ایک روز شام کے وقت ــــ"

دفعتاً اوما رائے نے اس کی بات کاٹی۔ "تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے کاکا اگر زندہ رہ جاتے تو ہندوستان کے بہت بڑے مورخ بنتے؟"

---

[1] دادا

"جی ہاں۔ میں نے ان کی کتاب کئی بار پڑھی ہے۔ مگر سمجھ میں نہیں آتی۔ بابا کہتے ہیں ابھی میرے سمجھنے کے لئے وہ موضوع ہی بہت ٹھوس ہے ۔۔۔ بنگال کی اقتصادی تاریخ۔"

"تم تحریک میں کس طرح شامل ہو گئیں؟" اوما دیبی نے سوال دہرایا۔

"پچھلے سال میں ایک روز شام کو برآمدے میں اکتائی ہوئی کھڑی اپنے بھائیوں کا انتظار کر رہی تھی، جو رات کے کھانے سے ذرا قبل فٹ بال کھیل کر لوٹتے ہیں۔ بیتی ماں رسوئی میں تھیں اور بابا مطب بند کر کے نہانے کے لئے غسل خانے میں جا چکے تھے۔ اتنے میں برآمدے میں سے کیا دیکھتی ہوں کہ ایک مسلمان فقیر پھاٹک پر کھڑا ہے ایک تارہ لئے۔ مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس نے جھٹ سے ایک تارہ چھیڑا اور بڑی دلدوز آواز میں باؤل گانا شروع کر دیا۔ بیتی ماں فقیروں اور سنیاسیوں کو بڑی عقیدت سے دیتی دلاتی رہتی ہیں، اس لئے میں نے اسے آواز دی کہ پچھواڑے آنگن کی ڈیوڑھی پر چلا جائے۔ مگر میری بات سن کر وہ جھپاک سے برآمدے میں آ گیا اور کہنے لگا کہ ڈاکٹر سرکار سے ملنا چاہتا ہے۔ میں ابھی کوئی جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ اس کی نظر اندر بیٹھک خانے میں لگی کاکا کی بڑی تصویر پر پڑ گئی۔ اور اس نے جلدی سے کہا کہ اسے اس تصویر کی مدتوں سے تلاش تھی۔ اور میری گھبراہٹ اور احتجاج کی مطلق پروا کئے بغیر جھٹ سے کمرے میں گھس گیا۔ اور دیوار کے پاس جا کر بڑی محویت سے پورٹریٹ کو دیکھنے لگا۔ میں ہڑبڑا کر اندر گئی تو اس نے پوچھا "اس تصویر کی ایک کاپی مل سکتی ہے؟" اور پھر اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنے جھولے میں سے کچھ کاغذ نکالے اور چاروں طرف دیکھ کر بولا۔

"تم کون ہو؟ دینیش بابو کی لڑکی ہو؟"

"میں ان کی بھتیجی ہوں، ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔ تو کہنے لگا ۔۔۔ "اچھا اپنے بابا کو بلاؤ۔" میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں ایک دم بہت ڈر گئی۔ اور پچھلے برآمدے میں جا کر بابا کو آواز دی۔ بابا جلدی آئیے، ایک عجیب سا فقیر آ کر بیٹھک خانے میں بیٹھ گیا ہے۔ جلدی آئیے۔ بابا تولیہ کندھے پر ڈالے جلدی سے باہر نکلے اور کمرے میں گئے تو وہ فقیر فوراً کھڑا ہو گیا۔ اور چپکے چپکے ان سے باتیں کرنے لگا۔ بابا اسے دیکھتے رہے پھر اداسی سے مسکرا دئے۔ میں دروازے میں سے اندر جھانک رہی تھی۔ انہوں نے مجھے آواز دی کہ چائے بناؤں۔ میں چائے بنا کر لے گئی۔ اب وہ اور بابا پرانے دوستوں

کی طرح صوفے پر بیٹھے باتوں میں منہمک تھے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اس نے اپنا نام نورالرحمٰن میاں بتلایا۔ اور کہنے لگا کہ بار دیپال میں اس کا تکیہ ہے۔ جب میں اس کا مطلب نہ سمجھی تو ہنس پڑا۔ اور کہنے لگا کہ وہ ایک بنگالی ویکلی کا ایڈیٹر ہے۔ اور کاکا کے متعلق ایک خاص نمبر نکال رہا ہے۔ اور اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے آیا ہے ۔۔ کاکا کے نجی حالات، ان کے پرانے مسودے، جیل سے لکھے ہوئے خط، پرانی تصویریں، یہی سب ۔ مجھے اس کی جھاڑ جھنکار داڑھی پر بڑی ہنسی آئی۔ کہ ایڈیٹر لوگ تو باؤل فقیروں کا حلیہ بنا کر ایک تارہ نہیں بجاتے پھرتے۔"

"پھر کیا ہوا ۔۔" اُوما نے جو اب بڑے غور سے یہ داستان سن رہی تھیں، سوال کیا۔

"تو بابا نے اس سے کہا کہ وہ ساری چیزیں بکسوں میں سے تلاش کر کے اس کے لئے نکال رکھیں گے اور اسے دو دن بعد آنے کے لئے کہا۔ اتنے میں میرے تینوں بھائی آ گئے اور ایک عجیب سے مہمان کو اندر بیٹھا دیکھ کر کھڑکی میں سے جھانکنے لگے۔ تو فقیر نے یعنی نورالرحمٰن میاں نے مجھ سے کہا کہ میں دروازے بند کر کے کھڑکیوں کے پردے گرا دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اور بچوں کو بھگانے کے لئے باہر گئی۔ اتنی دیر میں نورالرحمٰن میاں ۔۔ یعنی باؤل فقیر بھی ایک تارہ بجاتا باہر آ کر جھپاک سے پھاٹک پر پہنچ گیا۔ ہمارے برآمدے اور پھاٹک کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے ۔۔ دو دن بعد وہ کاغذات اور تصویریں لینے کیلئے اسی وقت اندھیرا پڑے آیا۔ بابا کو کسی مریض کو دیکھنے کے لئے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ اور وہ ساری چیزیں میرے حوالے کر گئے تھے۔ فقیر پھر بڑی بے تکلفی سے بیٹھک خانے میں آ گیا۔ اور میں نے جلدی سے دروازے بند کر کے کھڑکیوں کے پردے گرا دئے۔ صوفے پر بیٹھ کر وہ مجھے اس طرح دیکھتا رہا گویا بہت محظوظ ہو رہا ہو۔" اتنا قصہ سنا کر دیپالی پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اس قدر ہنستی کیوں ہو؟" اُوما نے ناگواری سے کہا۔ وہ بھول چکی تھیں کہ اس عمر میں بات بے بات ہنسی کے فوارے چھوٹتے ہیں۔

"سوری اُوما دی ۔۔"

"تم نے اتنے دکھ اٹھائے ہیں پھر بھی اتنی مسرور اور بشاش ہو۔" اوما کے لہجے میں رشک کی تلخی کے علاوہ بڑی عجیب سی آزردگی تھی جو دیپالی نے محسوس نہیں کی۔ وہ اپنی بشاشت پر نادم نظر آنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔

"پھر کیا ہوا ——" اُوما نے سختی سے پوچھا۔

"بس پھر میں نے بابا کا دیا ہوا بڑا فائیل اس کے حوالے کر دیا۔ اور وہ کہنے لگا کہ مجھے جو کچھ کاکا کے بارے میں یاد ہو اسے بتاؤں۔ میں نے کاکا کا ذکر کیا تو ایک دم رونے لگی۔ وہ بہت گھبرا گیا۔ خیر پھر اس نے جلدی جلدی نوٹ لئے۔ اور اپنے رسالے میں میری دلچسپی دیکھ کر اس نے کہا کہ اگلے مہینے سے پرانا پلٹن کے فلاں مکان میں ایک اسٹڈی سرکل قائم ہو رہا ہے میں اس میں ضرور جایا کروں۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے ایک باؤل گیت سکھا دے۔ کیونکہ میں تے عباس داسے بہت سے باؤل گیت سیکھے ہیں۔ مگر یہ والا باؤل جو وہ گا رہا تھا میں نے کبھی نہیں سنا تھا اس نے کہا آج تو دیر ہو جائے گی۔ اگر میں اجازت دوں تو وہ کل شام کو اسی وقت آ سکتا ہے۔ میں بے حد خوش ہوئی۔"

"چنانچہ وہ تیسرے روز بھی آیا۔" اوما دیبی نے آنکھیں بند کر کے سپاٹ آواز میں کہا۔

"جی ہاں اوما دی۔ اور میں نے حسبِ معمول جلدی جلدی دروازے بند کئے اور پردے گرا دیئے۔ مجھے بڑی ہنسی آ رہی تھی۔ اس نے مجھے باؤل گیت سکھایا۔ اور مجھ سے بھی دو تین گانے سنے۔ اور کہنے لگا کہ وہ ریڈیو پر ہمیشہ جب موقعہ ملتا ہے تو میرے گانے ضرور سنتا ہے۔ بہت ہی سُوئیٹ فقیر تھا اوما دی۔ میرا مطلب ہے —— فقیر نہیں —— نور الرحمٰن میاں ——"

"ہوں ——"

"بابا اتفاق سے اس روز بھی باہر گئے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کے مریض کی حالت خطرناک ہو چکی تھی۔ خیر جب وہ واپس آئے تو میں نے ان کو بتایا۔ وہ اچانک ایک دم اداس ہو گئے اور کہنے لگے —— دیپالی —— اپنے عزیز از جان بھائی کا بلیدان دے چکا ہوں۔ اب تم تو اس خطرناک راستے پر نہیں چلو گی؟ میں نے دل میں کہا۔ ماں[۱] مجھے معاف کر دینا۔ میں بابا سے جھوٹ بول رہی ہوں۔ اور میں نے بڑی صفائی سے جواب دیا کہ میں اس راستے پر ہرگز نہیں چلوں گی۔ وہ مطمئن ہو گئے۔

"اس کے بعد نور الرحمٰن میاں ایک مرتبہ اور آئے تھے۔ رات کے وقت۔ یہ بتانے کے لئے وہ کہیں اور جا رہے ہیں۔ انہوں نے جاتے جاتے مجھے ایک مرشدی گان اور ایک ودیاپتی کا گیت بھی سکھا دیا۔ جو میتھلی میں ہے۔

"دیدی میں اگلے مہینے بابا کے ساتھ کلکتے جاؤں گی اپنے گانے ریکارڈ کرنے۔ وہاں وہ مرشدی

---

[۱] کالی

گان اور ودیا پتی کا گیت بھی ریکارڈ کرواؤں گی۔ آپ کو سناتی مگر اب بہت دیر ہو جائے گی۔

او ۔۔۔ ماں ۔۔۔ دس بج گئے ۔۔۔!"

"بہت خوب ۔۔۔" اوما دیبی نے کچھ اور سوچتے ہوئے بے دھیانی سے جواب دیا۔

"مگر وہ رسالہ تو شائع ہوا نہیں اور نور الرحمٰن میاں بھی غائب ہو گئے۔ اس کے بعد میں پرانا پلٹن اسٹڈی سرکل میں جانے لگی۔ وہاں نور الرحمٰن میاں کبھی نظر نہیں آئے۔ مگر دوسرے ساتھیوں سے ملاقات ہوئی۔ میں بابا سے کہہ کر جاتی تھی کہ روزی کے گھر جا رہی ہوں اور میں اور روزی سیدھے پہنچتے تھے پارٹی آفس۔ جب سے میں ہمدرد کی حیثیت سے تحریک میں ہوں۔ اور تھوڑا بہت کام جو مجھ سے بن پڑتا ہے۔ کرتی رہتی ہوں۔

"پچھلے مہینے سرمیندر دا نے تشویشناک خبر دی کہ اس غیر قانونی رسالے اور اس کے پریس پر چھاپہ مار کر پولس نے سارے اسٹاک پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور ریحان دا اور ان کے ساتھی راتوں رات اپنے خفیہ مستقر سے فرار ہونا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے انھیں فوری دو ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ روپیہ فوراً فراہم کیا گیا۔ اس میں پانچ سو کی کمی پڑ رہی تھی ۔۔۔ تو میں نے ۔۔۔ میں نے اپنی ماں کی چھوڑی ہوئی بالوچر بوٹے دار ساڑیاں بکوا دیں۔ اب ریحان دا نے جانے کون سے گاؤں میں جا کر نیا ہینڈ پریس لگا لیا ہے اور کسانوں کی تنظیم کے لئے پرچے اور پمفلٹ چھاپ رہے ہیں۔ اب جاگرده کا کادالا نمبر بھی شائع ہو جائے گا۔ مگر دیدی ۔۔۔ مجھے تعجب تو یہی ہے کہ ریحان دا مجھ سے آج تک نہیں ملے۔ انھوں نے آپ کو یہ کیسے لکھا ہے کہ مجھ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور اتنا ذمہ داری کا کام آج میرے اوپر ڈال دیا۔ کمال ہے۔"

اوما نے بیحد اکتاہٹ کے ساتھ ونڈو سیٹ پر نیم دراز ہو کر کروٹ بدلی۔ اور چند لحظوں تک خاموش رہنے کے بعد بیزاری سے کہا۔

"دیپالی سرکار۔ تم ایک برس سے انڈر گراؤنڈ کے لئے کام کر رہی ہو اور تم کو یہ تک پتہ نہیں کہ انڈر گراؤنڈ کے لیڈر طرح طرح کے بھیس بدلتے رہتے ہیں ۔۔۔ وہ مسلمان بزرگ جنہوں نے تم سے خلوص بڑھایا۔" اوما کی آواز پر اب شدید تکان غالب تھی ۔۔۔ "ریحان الدین احمد تھے ۔۔۔"

"او ۔۔۔ ماں ۔۔۔" دیپالی گم صم رہ گئی۔ چند لحظوں تک بالکل حواس باختہ رہنے کے بعد اس نے آہستہ سے کہا "لیکن انہوں نے تو اپنا نام نور الرحمٰن بتلایا تھا ۔۔۔"

"اکثر کامریڈ، موقع پڑنے پر باری باری ایک فرضی نور الرحمٰن میاں بنتے رہتے ہیں۔"

"او ماں ـــــ" دیپالی مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ اسے لگا، جیسے اس کی زبان گنگ ہوگئی ہو۔ آدا نے کروٹ بدلی۔ بڑے دھیان سے اس کی صورت دیکھی اور خستگی سے انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور دفعتاً کاروباری اور کرخت آواز میں پوچھا "تم نے اپنی اس ہمراز سہیلی کا کیا نام بتایا جو تمہارے ساتھ تحریک میں شامل ہوگئی ہے۔؟"

"روزی بنرجی۔"

"قابل اعتماد ہے؟"

"بیحد قابل اعتماد۔ ریحان دا ـــــ اس کے متعلق جانتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انہوں نے یہ اسکیم بنا کر آپ کو بھیجی ہے۔"

"ہوں ـــــ اچھا آئینے کے سامنے جاؤ۔"

دیپالی نے تعمیل حکم کی۔

ادا آرا نے سر نیہوڑا کر اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔

"اب اپنے میمن سنگھ کے دیہاتی لہجے میں بولو تو ـــــ میں شام کو تمہیں سب سمجھا چکی ہوں۔ ریحان نے لکھا ہے تم بہت بڑھیا ایکٹریس ہو۔ یہ مہم کامیابی سے سر کر لو گی۔"

وہ چپ رہی۔ کوئی تعجب نہیں کہ باؤل فقیر نے کسی اور بھیس میں جا کر اس کے کالج کے ڈرامے بھی دیکھ لئے ہوں۔ آئینے میں اس نے دیکھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔

"کیا نام ہے ـــــ؟" ادا آرا نے اسٹیج ڈائرکٹر کی طرح ڈپٹ کر دریافت کیا۔

"جی ـــ جی ـــ ہم ـــ؟ ہم کلثوم بی بی۔"

"کہاں سے آئی ہو ـــ؟"

"جی۔ میمن سنگھ ضلعے سے ـــ"

"سرٹیفکٹ ہیں؟"

"جی نہیں ـــ ہمارے خالو نواب صاحب بوگرہ کے خانساماں ہیں۔ انہوں نے بھیجا ہے۔"

"شاباش ـــ! مگر نواب صاحب بوگرہ نہ کہہ دینا ـــ آفت آجائے گی۔" ادا آرا نے

دفعتاً ہنس کر کہا۔

"سوری ــــ کچھ اور سوچ لوں گی۔ آگے پوچھیے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ ریحان ــــ نے غلط نہیں کہا۔ ہاں ــ اور برقعہ ــــ؟"

"کل حاصل کر لوں گی ــــ عبدالقادر کی بی بی سے ــــ"

"عبدالقادر کون ہے؟"

"گاڑی والا ــــ ہمارا کوچوان نہیں۔ ہماری گاڑی تو کب کی ٹوٹ پھوٹ کے برابر ہوئی۔ بابا نے اسے ہمارا شاگرد پیشہ دے رکھا ہے۔ مجھے کہیں جانا ہو تو بڑے خیال سے لاتا لے جاتا ہے۔"

"جولی گڈ ــ فائن ــ اوہو ــ بہت رات ہو گئی۔ بابا سے کیا کہہ کر آئی تھیں؟"

"بابا روزی اور جہاں آرا کے گھر سے میرے دیر سے لوٹنے پر کچھ نہیں کہتے۔ اور ہمیشہ وہاں کا ملازم مجھے گھر پہنچا آتا ہے۔ ڈھاکے میں میری یہی دو عزیز سہیلیاں ہیں۔ اُوما دی ــ میں ان کے علاوہ اور کسی کے گھر نہیں جاتی۔"

"رائیٹ ــــ" اُوما نے برقی گھنٹی کا سوئچ دبایا۔ "یہ بھی اچھا ہوا کہ یہاں سب لوگ اس وقت کلب گئے ہوئے ہیں۔" سیتزر نے بند دروازے پر دستک دی۔ اوما دیبی نے آگے بڑھ کر چٹخنی کھولی اور جھک کر سیتزر سے باتیں کرنے لگیں۔ بیرہ آیا۔ "ڈرائیور سے کہو ــ ٹھہرو ــ کون سی موٹر ہے؟"

"میم صاحب کی۔"

"اچھا۔ گوپال سے کہو برساتی میں لگا دے جلدی۔ ایک دم۔" ستوتمے کی تصویر پر غیر ارادی طور سے ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر دیپالی۔ اُوما کے ساتھ مارننگ روم سے باہر نکلی۔ ہال کے دروازے پر پہنچ کر اوما رائے نے کہا۔ "موٹر اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر رکوانا۔" پھر انہوں نے دیپالی کی پیٹھ ٹھونک کر کامیابی کی امید ظاہر کی اور سر جھکائے گیلری میں چلی گئیں۔

دیپالی برآمدے میں نکلی۔ اور برساتی میں اتر کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ موٹر ایک جھونک کے ساتھ طویل رائیو کا چکر کاٹ کر پھاٹک پر پہنچی۔ اب اس لمحے سے میں اپنی نئی ذمّے داری کی معیت میں بالکل تنہا ہوں۔ اس نے سوچا۔ موٹر تیزی سے رمنا کی چوڑی سنسان سڑک پر آئی۔ روشن ووڈلینڈز اچانک ندھیرے میں ڈوب گیا۔

دیپالی نے آگے جھک کر ڈرائیور سے کہا: "ذرا مشن کمپاؤنڈ کی طرف سے ہوتے چلو"

۶

ریورنڈ پال متھیو بنرجی

مشن کمپاؤنڈ کے دیسی گرجا گھر کے اندر کرسمس کی تیاریوں کے سلسلے میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ بڑے دن میں صرف چار روز رہ گئے تھے۔ کمپاؤنڈ میں سخت گہما گہمی اور رونق تھی۔ کرسمس ویک کے دوران میں دیسی مشنریوں کی سالانہ کانفرنس منعقد ہونے والی تھی جس میں شرکت کے لئے الہ آباد، سیتاپور، آگرہ، شاہجہانپور، لدھیانہ، انبالہ، لاہور اور دوسرے بڑے بڑے مشنری مراکز سے نمائندہ مبلغین ڈھاکے آن پہنچے تھے اور کمپاؤنڈ میں لگے خیموں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس وقت گرجا گھر میں نمائندوں کی ٹولیاں اپنے اپنے کرسمس کیرل کی مشق میں جٹی تھیں۔ ڈھاکہ مشن کمپاؤنڈ کے انچارج ریورنڈ پال متھیوز منوموہن بنرجی گرجا کے اندر اپنے دفتر میں بیٹھے دوات میں نب ڈبو ڈبو کر کرسمس کا وعظ لکھنے میں مصروف تھے۔ گرجا کے عقب میں ان کا مکان جو "بلی کاٹج" کہلاتا تھا غباروں کاغذی ربنوں اور مصنوعی ستاروں سے سجایا جا رہا تھا۔ مسز بنرجی کچن میں فرش پر بیٹھی کرسمس کیک اور کرسمس پڈنگ کے لئے خشک میوہ صاف کرنے میں منہمک تھیں۔ باہر باغ میں بانس کے سائبان کے نیچے کمپاؤنڈ کی عورتیں اور لڑکے بالے سب مل کر مُنّا سا اصطبل تیار کرنے میں لگے تھے۔ ولادت مسیح کے ٹیبلو کے لئے حضرت مریم، سینٹ جوزف، چرواہوں اور بیل گاڑیوں کی ننھی منی صورتیاں سنواری جا رہی تھیں۔ روئی کا ببوا یعنی یسوع مسیح بڑی احتیاط سے بھوسے کے ننھے سے ڈھیر پر رکھ دیا گیا تھا۔

اچانک گرجا کے ہال میں لدھیانہ مشن کی ٹولی نے اونچی بارعب آواز میں ایک پنجابی حمد شروع کر دی

رب خداوند بادشاہ ہے ـــ او جلال دا بادشاہ ہے۔ اے خداوند ـــ اپنی راہ اپنے بندے نوں دِکھا ـ آ ـــ آ

پادری بنرجی نے اپنے دفتر میں وعظ لکھتے لکھتے قلم ایک طرف رکھ دیا اور عینک ماتھے پر

چڑھا کر چھت کو دیکھنے لگے۔ الماریوں میں مشن کے رجسٹر اور موٹی موٹی کتابیں رکھی تھیں۔ سامنے دیوار پر ایک بڑی سی سیاہ صلیب آویزاں تھی۔ میز پر پھولوں سے بھرا گلدان رکھا تھا۔ باہر سے گانوں اور ہارمونیم اور بچوں کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بڑا پرسکون اور سہانا وقت تھا۔ خدا کے خوف سے ہر وقت ڈرنے والے، نیک دل پادری بنرجی نے آنکھیں بند کیں اور زندگی کی نعمتوں کے لئے خدا باپ کا شکر ادا کیا۔ پھر انھوں نے اٹھ کر الماری میں سے ایک رجسٹر نکالا اور وعظ کے کاغذات ایک طرف رکھ کر مشنری کانفرنس میں پیش کرنے کے لئے رپورٹ مکمل کرنے کا ارادہ کیا۔ پچھلے چند برسوں میں بپتسمہ لینے والوں کی تعداد میں کمی آتی جا رہی تھی۔ بہت عرصے سے قحط نہیں پڑا تھا۔ اور ہندو تجدیدیت اور مسلم تجدیدیت نے الگ اودھم مچا رکھی تھی۔ مسلمان تو خیر یوں بھی شاذ و نادر ہی عیسائی ہوتے تھے۔ یہ بھی بڑی ہٹیلی اور رعونت پسند قوم تھی۔

پچھلی صدی میں سیرام پور مشن نے کلکتے میں بڑا عہد آفریں کام کیا تھا۔ وہ جفادری، دھن کے پکے عظیم مشنریوں کا دور تھا۔ بشپ ریجنالڈ ہیبر۔ ولیم ٹیٹیس۔ کیری اور مارش مین۔ ان لوگوں نے اس دیس کی کتنی خدمت کی۔ پریس کھولے۔ کتابیں چھاپیں۔ تعلیم پھیلائی۔

جواں مرگ بشپ ہیبر، پادری بنرجی کا محبوب کردار تھا۔ وہ انگلستان سے آیا ہوا روحوں کا جیالا رکھوالا، جو اسی سنہرے بنگال کی دھرتی پر گھوما تھا۔ رجسٹر کی ورق گردانی کرتے ہوئے پادری بنرجی کو دفعتاً خیال آیا کہ وہ کرسمس کے وعظ میں بشپ ہیبر کی مختصر لیکن درخشندہ زندگی کی مثال پیش کریں۔ انھوں نے بنگلہ میں تحریر شدہ اپنے وعظ کے کاغذات اپنی طرف سرکا کر دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ "وہ مبارک زمانہ جب آج سے سوا سو سال قبل، مادر کلیسا کا لاڈلا سپوت بہ نفسِ نفیس ڈھاکے آیا تھا۔ وہ جواں سال، خوبصورت، پادری شاعر پدما کے کنارے کنارے ٹہل کر، میرے بچو، تمہاری روحانی نجات کی دعائیں مانگتا تھا۔ اور تمہارے غم میں گھلتا تھا۔"

پادری بنرجی نے اٹھ کر ایک اونچی الماری میں سے "ہیروز آف اور انڈین ایمپائر" نکالی۔ بشپ ہیبر کا باب کھولا اور اس شاعر پادری کی تحریر کا ایک اقتباس پڑھنے لگے ــــ "دریا کے کنارے سے بندھی میری ناؤ ــــ رات میں مہکنے والے پھول ــــ تاڑ کے پتوں کی مدھم سرسراہٹ۔ کوئل کی پکار۔ بانس کے تاریک جنگلوں میں جگمگاتے جگنو ــــ عظیم دریا کی سطح پر منعکس استوائی چاند ــــ

اور میں نے محسوس کیا کہ اس دیس میں موجود ہونا بہت خوب ہے۔"

پادری بنرجی نے ورق الٹا —— اور ان کی نظر بشپ ہیبر کی ایک نظم پر پڑی۔ "اپنی بیوی سے:"

اگر تم میرے ساتھ ہو
تو سرسبز بنگال کے آنند کانن میں
شام کا اندھیرا بڑی تیزی سے چھا جائے

پادری بنرجی نے کتاب ایک طرف سرکا دی اور بھووں پر انگلیاں رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ بشپ ہیبر کو بھول کر وہ یکایک دور شمال کے رنگ پور ضلع میں اپنے دور افتادہ گاؤں پہنچ گئے تھے۔ جہاں بانس کے جھنڈ میں چھپے کالی کے مندر کے پیچھے کوئلیں چلا رہی تھیں۔ اور ان کی پڑوسن اور محبوبہ شونا اُن کی ماں کے ساتھ پوجا کے لئے مندر آتی تھی اور وہ سامنے دریا پر اپنے نوکے میں چھپے اس کے منتظر رہتے تھے۔

وہ وقت اور یہ آج کی رات —— یہ مطمئن بڑھاپا —— یہ محفوظ خانۂ خدا —— سکونِ قلب۔

انہوں نے پرانے خواب جھٹک کر اپنی ماں کو یاد کیا۔ نجات جس کی قسمت میں نہ تھی۔ ماں۔ تُو تو بت پرستی کی گمراہی میں مبتلا ہی دوسری دنیا کو چلی گئی۔ اب تیری روح اس اندھیرے میں۔ اس اندھیرے میں جانے کہاں ہوگی۔ یہ سب کیا ہے؟

اسرارِ الٰہی۔

پادری بنرجی پھر کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ مگر سرمن کے الفاظ اور سالانہ رپورٹ کے اعداد و شمار میں ان کا دل نہ لگا —— روحوں کے اعداد و شمار۔ نجات یافتہ روحیں۔ گمشدہ روحیں —— انہوں نے رجسٹر زور سے بند کیا اور قریب کی الماری میں سے ایک اور پرانی کتاب اپنی طرف کھینچی۔ "انگلستان میں راجہ رام موہن رائے کے آخری ایام۔ از میری کارپنٹر" انہوں نے بے دھیانی سے ورق گردانی کرتے ہوئے ضمیمے کے آخری صفحات کھولے

"چار قابلِ قدر نیٹو کرسچین۔

۱۔ سرجو کمار چکربرتی۔ اونچی ذات کا برہمن۔ خود اپنی درخواست پر لندن میں بپتسمہ حاصل کیا۔ لندن یونیورسٹی سے ڈگری لینے کے بعد کلکتہ میڈیکل کالج سے وابستہ ہوا۔ ۱۸۵۵ء میں لندن واپس گیا۔ وہ پہلا نیٹو تھا جو کمپنی کی نئی کووننٹڈ میڈیکل سروس میں شامل کیا گیا۔ ۲۔ بھولاناتھ داس۔ معرکۂ ستلج کے موقع پر کمپنی کی افواج کا اسسٹنٹ سرجن تھا۔ بعد میں ڈھاکہ کا سول سرجن بنا۔ ۳۔ دوارکاناتھ بوس۔ [illegible] تھا

۱۔ گوپال چندر رسیل ۔۔"

آخری نام پر پہنچ کر پادری بنرجی ٹھٹھک گئے۔ اور گذشتہ صدی میں مس کارپینٹر کی لکھی ہوئی کتاب س میں مصنفہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ رام موہن بابو دراصل عیسائی ہو گئے تھے آہستہ سے بند کر دی۔

یہ محض اتفاق تھا یا اسی کو ہندو کرم اور سنسکار کہتے ہیں! اور مسلمان نوشتۂ تقدیر۔ لیکن ہم یسائی اس حسنِ اتفاق کو گریس آف گاڈ کہیں گے۔

لیکن ـــــ زندگی کا دھارا اچانک، ایک دم کس طرح اپنا رُخ بدل لیتا ہے۔ ایک انسان کے ی ایک مخصوص سمت قدم اٹھانے سے اُس کی ساری آنے والی نسلوں کا مستقبل مختلف ہو جاتا ہے۔ ر مستقبل کیا ہے؟

اس غیر اہم، بھولے ہوئے نام "گوپال چندر رسیل" کو دیکھو۔ یہ آج سے ستّر برس قبل میرے گاؤں ں پیدا ہوا تھا۔ وہ عیسائی ہو کر ڈاکٹری پڑھنے ولایت گیا۔ اور وطن واپس آ کر بےچارہ نوجوان دریا ں ڈوب کر مر گیا۔

اور ایک روز میں، منوموہن بنرجی ـ ایک مفلس سولہ سالہ طالب علم لال منیر ہاٹ سے اپنے گاؤں ا رہا تھا۔ جب اسٹیمر پر ایک بوڑھا انگریز مشنری مجھے ملا۔ اور اس نے مجھ سے میرے گاؤں کا نام پوچھا اور بڑی سرت سے بتایا کہ اسی گاؤں کے ایک قابلِ فخر نیٹو نوجوان گوپال چندر رسیل کو اس کے باپ نے بپتسمہ دیا تھا۔ ن میں نے اس نوجوان کا کبھی نام بھی نہ سُنا تھا۔ (پادری بنرجی عادتاً دل میں اس انداز میں سوچنے لگے، جس رح وہ منبر پر وعظ کہتے تھے) برہمپتر کے طویل سفر کے دوران اس مہربان مشنری نے پہلے صفحہ پر اپنا پتہ لکھ کر یل مقدس مجھے دی اور جب میں گاؤں پہنچا، میری ماں بسترِ مرگ پر پڑی تھی ـــ اور دیکھو اس کے بُت اسے نہ سکے۔ اور میں، جو انجیل مقدس سے بےحد متاثر ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے باپ کو بنگلہ انجیل پڑھنے کو دی۔ اور سال ر بعد میں، میرا باپ، چچا، بہن بھائی، سارا کنبہ رنگ پور اس انگریز مشنری کے ہاں پہنچ کر اس کے ہاتھ پر ایمان ئے۔ چنانچہ (پادری بنرجی نے کرسی پر پہلو بدلا! اور اپنے غیر مرئی سامعین سے مخاطب رہے) ایک سچّا مشنری ین، جو آج سے مدتوں قبل مُوا ایسے اَن دیکھے اور بالواسطہ طریقہ سے میرے خاندان کے یسوع تک پہنچنے وسیلہ بنا۔

اگر میں اس روز اس اسٹیمر پر اس مشنری سے نہ ملتا۔ یہ کرم تھا ـــ؟ یا محض اندھا اتفاق ـــــ

ریورنڈ بنرجی نے سر ہلایا اور متحیر سے بیٹھے دروازے سے باہر مشن کمپاؤنڈ کا نظارہ کرنے لگے۔

ہندوستان کے ہر ضلع میں ایک مشن کمپاؤنڈ موجود ہے۔ بلکہ مختلف کلیساؤں کے مختلف مشن کمپاؤنڈ موجود ہیں۔ جس میں ڈیڑھ دو سو سال سے سفید فام مشنری خواتین سفید ساڑے اور سفید سولا ہیٹ پہنے ہاتھ میں بائبل لئے ہندو لوگوں کی روحوں کو بچانے کے لئے دن رات کوشاں رہی ہیں۔ اور کالا پادری ہندوستانی معاشرے کے ایک کنارے پر اپنی انجیل لئے کھڑا ہے۔

شروع شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت مشنریوں کو ایک نیوسنس سمجھتی تھی۔ سیرام پور میں بپٹسٹ مشن کی طرف سے شائع ہونے والا انتہائی دلآزار لٹریچر پہلے فورٹ ولیم میں سنسر کیا جاتا تھا۔ کہ ابھی ہندوستان میں مسیحی مشن کو یونین جیک کی سرپرستی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لارڈ منٹو نے سیرام پور کے لٹریچر کے متعلق کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کو مطلع کیا تھا۔ کہ یہ ہندوؤں کے لئے بے حد اشتعال انگیز ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے جواب میں سیرام پور کے مشہور مشنری ڈاکٹر مارش مین نے لکھا تھا کہ ہندوستانی انتہائی کمزور اور احمق کردار کا مالک ہے۔ اور اس کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ کسی نہ کسی غیر قوم کا محکوم رہے گا۔ اور اس کے اس بودے پن کو عیسائیت بھی دور نہیں کر سکتی۔ لیکن برطانیہ کے زیر سایہ زندہ رہنا اس کے لئے برکت الٰہی کا موجب ہے۔ اس وجہ سے جو ہندو یا محمڈن عیسائی ہو جائے وہ اپنے تحفظ کی خاطر برطانیہ کا انتہائی وفادار ثابت ہو گا۔ کیونکہ محض اس ایمپائر کی سلامتی اور توسیع پر اس کے وجود کا انحصار ہے۔

سیرام پور والوں کو راجہ رام موہن رائے کی طرف سے بڑی امیدیں تھیں۔ مگر انہوں نے عیسائی ہونے کے بجائے اُلٹے اُن سے مناظرے شروع کر دیئے کہ آخر گوڈ کو برہما ہی کیوں نہ کہا جائے؟ مشنری اُن کی روح کو بالآخر نہ بچا سکے۔

یہ انگریز مشنری۔ واقعی بہت بھولے تھے۔ بشپ ہیبر ۱۸۲۵ء میں ہندوستان کے دورے کے بعد لنکا گئے اور کنیڈی کے شاہی محل کے دربار ہال میں ڈیوائن سروس منعقد کی۔ اور ان کے ساتھی مسٹر روبنسن نے اس موقع کے متعلق بعد میں لکھا۔ ”سروس کے بعد میں اور بشپ ہیبر گھر لوٹے اور میں نے بشپ سے کہا۔ عبادت کے دوران میں مجھے خیال آیا کہ صرف چند سال قبل اسی ہال میں ایک جابر ایشیائی بادشاہ اپنی مظلوم رعایا کو درشن دیتا تھا۔ اور آج اس میں ایک عیسائی بشپ سچے دین کا پیغام سنا رہا تھا۔

ب میں نے یہ کہا تو بشپ ہیبر نے سر جھکالیا اور رو پڑے ۔"

ان مشنریوں نے کالے مبلغ اور پادری تیار کیے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد عیسائیت کو حکومت کا مکمل تعاون ہو چکا تھا۔ (انگریزوں کا عبادت خانہ ــ گرجا ــ بے چارے مسلمان جل کر کہتے تھے) کالا پادری راہوں اور سڑکوں پر تبلیغ کرتا پھر رہا تھا۔ اور مولویوں سے مناظرے کر رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان، دیسی عیسائیوں کالشین، جمرشین اور پیلی صاحب کہہ کر خوش ہو لیتے تھے۔ لیکن تبدیلیٔ مذہب کے بعد مظلوم اچھوتوں رافلاس زدہ تعلیم یافتہ افراد کی زندگی بدل جاتی تھی۔ سری رام کرشن کے چیلے اور سوانح نگار مہندر ناتھ تا نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ ایک مرتبہ انھوں نے مائیکل مدھو سودن دت سے دریافت کیا کہ وہ عیسائی دل ہو گئے۔ تو انھوں نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا ــ اس کی خاطر۔

بھوک کے علاوہ ذہنی بے چینی بھی بنگال میں عیسائیت کے فروغ کی ایک وجہ تھی۔ اٹھارویں صدی میں نال کا اور سارے ہندوستان کا ہندو سماج تنزل کی آخری حدود تک پہنچ چکا تھا۔ رام موہن رائے نے ۱۸۱۶ء ہندو کالج قائم کیا۔ اس کے طلباء اپنے مذہب سے برگشتہ ہوتے جا رہے تھے۔ متعدد انگریزی تعلیم تہ برہمن خاندان عیسائی ہو گئے۔ عیسائیت ایک فاتح، عقلیت پرست، حیرت انگیز، شاندار قوم کا بڑا عقول مذہب تھا ــ نئے بنگالی مصلحین، ہندو، برہمو، عیسائی سبھی انگریز کے حامی تھے، جو اس اندھیرے ل میں نئی روشنی پھیلا رہا تھا۔ صرف بنگالی مسلمان، جن کو انگریز نے کچل دیا تھا، اور جو اس کے باوجود ہدین کی صفوں میں شامل ہو کر اس سے لڑے جا رہے تھے۔ انگریزی دور اور انگریزی تعلیم کے لن تھے اور بنگال کا پسماندہ طبقہ بن چکے تھے۔

کلکتہ میں، بھدرا لوگ، کرانی اور بابو لوگ کی ایک نئی دنیا آباد ہو چکی تھی۔ اور انگریز بنگالی بابو کا لیے رح مذاق اڑاتا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں ایک انگریز طنز نگار نے انڈین ایمپائر کے متعلق اپنی ایک اب "سر علی بابا کا سفر نامہ" میں لکھا تھا۔ "ہم بابوازم کو ایمپائر میں کتنا ہی فروغ دیں۔ بابو کے وجود ہمیں آنسو بہانا چاہئیں کہ بابو ایک سخت قابلِ رحم شے ہے۔ یہ بابو نئے مذہب، نئی موسیقی، آرٹ رسائنس سے خوب پیٹ بھر کے جب موٹا ہو جائے گا تو ایسی دولتی جھاڑے گا کہ ہم اس کا مذاق اڑانا بھول ائیں گے۔ اس کے پیٹنٹ لیدر جوتے، اس کی ریشمی چھتری۔ اس کے دس ہزار ہارس پاور کے انگریزی الفاظ رہ جملے ــ اس کی مغربی خیالات کی جگالی ــ یہ سب ایک روز بے حد خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں

سائنس، مغربی فلسفے اور مشنریوں نے اس کے دماغ کو اتنا چکا چوند کر دیا ہے کہ اب اس کا اپنی پرانی حیثیت پر واپس جانا مشکل ہے —"

"سر علی بابا کے سفر نامے" کا یہ مضمون پادری بنرجی کو ایک مرتبہ ارجمند منزل میں نواب قمر الزماں چودھری نے اپنے کتب خانے کی ایک الماری میں سے نکال کر دکھلایا تھا۔

"یہ دیکھئے بنرجی بابو — ہمارا صاحب بہادر ہم ہندوستانیوں کا کس بے پناہ حقارت سے ذکر کرتا ہے۔" نواب صاحب نے کہا تھا۔

ارجمند منزل —

پادری بنرجی ارجمند منزل میں سیاسی بحث مباحثے سے ہمیشہ احتراز کرتے تھے۔ لیکن جب کبھی وہاں جاتے ڈرائنگ روم میں مسلم لیگ اور صوبجاتی سیاست کا تذکرہ چھڑا ملتا۔ اور ریورنڈ بنرجی چپکے بیٹھے سنا کرتے۔ ارجمند منزل ڈھاکے کی پرانی مسلم تہذیب، اردو شاعری، تھیٹر، راگ رنگ کے جلسوں، قدامت پرستی اور مسلم سیاست کا مرکز تھی۔ اور پادری بنرجی کو مسلم سیاست یا ہندو سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صدق دل سے انگریزی حکومت کے وفادار تھے۔

ارجمند منزل — یہ بھی کیا اتفاق تھا کہ ان کی قابل قدر لائق احترام اور نیک بخت بیوی ایستھر اُن کو ارجمند منزل کے وسیلے سے ملی۔ خداوند خدا کے وسیلوں کے اسرار کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

نواب قمر الزماں چودھری ضلع فرید پور کے زمیندار تھے۔ اور گری بالا چٹوپادھیائے ان کے علاقے کے ایک غریب برہمن کی لڑکی تھی ابھی پانچ برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد پندرہ سال کی عمر تک اس نے سسرال میں ہر طرح کے ظلم سہے۔ اور ایک رات چپکے سے ناؤ میں بیٹھ کر ڈھاکے بھاگ آئی۔ اور ارجمند منزل پہنچ کر نواب قمر الزماں کی والدہ بیگم نور الزماں سے فریادی ہوئی۔ بڑی بیگم صاحبہ نے اسے فوراً اپنی پناہ میں لے لیا۔ اور کچھ عرصے تک اسے ارجمند منزل کے زنانخانے میں رکھا۔ جب نوجوان نواب زادوں نے اس میں دلچسپی لینا شروع کی تو بیگم صاحب نے سوچا کہ کلمہ پڑھا کر زمینداری کے کسی اہلکار کے ساتھ اس کا نکاح کروا دیں۔ مگر تقسیم بنگالہ کے بعد ہندو مسلم تعلقات بیحد کشیدہ ہو چکے تھے۔ اور گری بالا کے تبدیلیٔ مذہب سے فوراً فرقہ وارانہ فساد کا خدشہ تھا۔ (گو یہ بات بیحد دلچسپ تھی کہ عیسائی ہو جانے پر ہندو عیسائی فساد نہیں ہوتے تھے) اس موقع پر ڈھاکے کے انگریز بڑے پادری رائٹ ریورنڈ الفرڈ براؤن کی میم آڑے

آئیں۔ میم صاحب ہفتے میں دو مرتبہ نواب زادیوں کو انگریزی پڑھانے ارجمند منزل آیا کرتی تھیں۔ بڑی بیگم نے گری بالا کو میم صاحب کے ذریعہ اُن کے مشن اسکول میں داخل کروا دیا۔ بڑے پادری والفرڈ براؤن صاحب نے اُسے بپتسمہ دے کر اپنی بیوی کے نام پر اس کا نام ایستھر میرین رکھا اور جب اس نے میٹرک کر لیا تو اس کی شادی پال میتھیو من موہن بنرجی سے کر دی۔ پال بنرجی ایستھر سے عمر میں بیس برس بڑے تھے۔ مگر ایستھر بے حد خوش تھی کیونکہ اسے عمر میں پہلی بار عزت اور آرام ملا تھا لہذا ایسا شریف شوہر۔

رنگ پور میں بپتسمہ لینے کے بعد من موہن بنرجی ایک ہونہار مبلّغ ثابت ہوئے تھے! اور انھیں مشن کی طرف سے برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی میں ٹریننگ کے لئے لندن بھیجا گیا تھا۔ اور واپس آکر وہ صوبے کے مختلف دیسی پروٹسٹنٹ گرجاؤں میں کیوریٹ رہے تھے اور اب ڈھاکہ میں اس دیسی گرجا کے پادری تھے۔

ریورنڈ بنرجی نے کھڑکی کے شیشے میں اپنا عکس دیکھا۔ شمالی بنگال کے ایک گاؤں کا وہ سولہ سالہ برہمن لڑکا۔ گھِسا ہوا سیاہ کوٹ پتلون پہنے، بغیر فریم کی عینک لگائے، سنجیدہ، نوجوان مبلّغ۔ جو کبھی اپنی سائیکل پر مسلمان بستیوں کی طرف نکل جاتا تو لونڈے اس کے پیچھے دوڑ کر تالیاں بجاتے اور وہ یسوع کی خاطر یہ سب ذلتیں سہتا ـــ اور آج، ۲۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کی رات، ڈھاکہ چرچ کا یہ بزرگ پادری ۔ خداوند خدا کی برکتوں کا مشکور پال میتھیو بنرجی ـــ راستہ طے کرتے کرتے ایک وقت ایسا آتا ہے، جب انسان پیچھے مڑ کر اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے! اور اپنے ماضی کو سکھ اور دکھ کے ترازو تولتا ہے اور کتنے لوگ ہیں، جن کے ہاں سکھ کا پلڑا بھاری ہو؟

ریورنڈ بنرجی نے عینک اتار کر پلکوں پر انگلیاں پھیریں۔ خداوند خدا نے مجھے کیا کچھ نعمتیں نہیں دیں۔ ایک سعادت مند گلّہ۔ ایک محبت شعار بیوی۔ ایک پیاری اور فرماں بردار بیٹی۔

اُنھوں نے ایک گہرا سانس لے کر دوبارہ قلم اُٹھایا اور نب دوات میں ڈبو کر کرسمس کا وعظ لکھنا شروع کر دیا۔

پادری بنرجی کی اکلوتی لاڈلی بیٹی روزی لِلی کاٹیج کے سٹنگ روم میں بیٹھی مریمؑ کی مورتی کیلئے نئی سی نیلی ساڑی پر سچا لچکا ٹانک رہی تھی۔ جو وہ کالج سے لوٹتے میں جہاں آرا کے گھر سے لیتی آئی تھی کہ

ارجمند منزل کے زنانخانے کی الماریوں میں سچے گوٹے لچکے کی افراط تھی۔ یوں وہ ارجمند منزل بہت کم جاتی تھی۔ وہ جہاں آرا کی بڑی پکی سہیلی تھی۔ مگر جب سے وہ بڑی ہوئی تھی اور اس کی ایک پھوپھی نے اُسے اس کی ماں کی زندگی کی داستان سنائی تھی اُسے ارجمند منزل جاتے ہوئے جھینپ سی آتی تھی۔ جہاں آرا نے کبھی اس سے اس داستان کا ذکر نہیں کیا تھا اور وضعداری کی وجہ سے کالج میں بھی اس نے روزی کی ماں کا وہ المناک پس منظر کسی کو نہیں بتایا۔ اس کے باوجود روزی کو لاشعوری طور پر نوابوں اور زمینداروں کے مسلمان معاشرے اور قدیم وحشیانہ رسوم سے جکڑے تنگ نظر ہندو سماج سے نفرت تھی۔ ساتھ ہی اسے اپنے دیسی عیسائی طبقے کی مضحکہ خیز حیثیت کا بھی خاصا احساس تھا۔ ہندو سماج نے اُس کی بھولی ماں کو تین سال کی عمر میں بیاہ کر اور پانچ سال کی عمر میں بال ودھوا بنا کر اس پر ظلم توڑے تھے۔ مسلمان زمینداروں کے نونہالوں نے یعنی خود جہاں آرا کے باپ اور چچاؤں نے اس کی بے سہارا ماں کو اپنا کھلونا بنانا چاہا تھا۔ لیکن اس کے برعکس عیسائی سوسائٹی نے اُس کی ماں کو عزت، تعلیم و تربیت اور گھر عطا کیا تھا۔ ان سارے آپس میں اُلجھے ہوئے حقائق کے باوجود بیس سالہ حساس اور ذہین روزی بنرجی جذباتی اور ذہنی طور پر خود کو ایک دوراہے پر موجود پا رہی تھی۔ وہ خود کو خالص ہندوستانی کلچر اور قومی سیاسی عزائم سے مماثل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا عیسائی سماج انگریز کا تخلیق کردہ تھا اور انگریز کا نمک حلال تھا۔ اور یہ باتیں وہ اپنے شفیق اور نیک طینت باپ سے کسی طرح نہ کہہ سکتی تھی۔ کسی سے نہ کہہ سکتی تھی۔ اور اس کی ماں ایستھر گری بالا بنرجی عیسائی ہونے کے باوجود ایک خالص بنگالی پتی ورتا گھریلو عورت تھی۔ جسے ان مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

تبدیلیٔ مذہب کے باوجود جنوبی ہند کے عیسائیوں کی مانند بنگالی عیسائیوں پر بھی اپنے صوبے کی کلچر کا گہرا اثر باقی تھا۔ مسز ایستھر بنرجی کی سسرالی عورتیں بنگال کی بیشتر برہمن اور دوسری اونچی ذات کی عیسائی خواتین کی طرح مانگ میں سیندور لگاتی تھیں اور مذہبی رسوم کے علاوہ ساری پرانی ریت رسموں کی پابند تھیں۔

روزی اسکول کی آٹھویں کلاس سے دیپالی سرکار کی ہم جماعت تھی۔ بڑی ہونے پر چھٹی کے گھنٹوں میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر وہ سینیئر لڑکیوں سے سیاسی گفتگو سنتی۔ تحریکِ آزادی کا ہر طرف چرچا تھا۔ بہت سی باتیں ابھی پلے نہیں پڑتی تھیں۔ لیکن بنگال انقلابی تحریک کا پرانا گڑھ تھا۔ اور ان نوعمر لڑکیوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ انگریز کو مار مار کر بھوسہ بھر کے دیس سے نکال دو۔

یہ پرانی دہشت پسند پارٹی انوشیلن کے ہیڈ کوارٹرز بردوان ضلع سے آئی ہوئی آبانی اپنے ماں باپ سے سُنے ہوئے اور بیندو گھوش اور سوامی وویکانند کے انقلابی بھائی بھوپیندر دت کے قصے چھیڑتی۔ اس صدی کے شروع میں ہندوستانی انقلابی آئرلینڈ کے SIN FEIN روس کے سوشل ڈیموکریٹس اور مزینی کے "ینگ اٹلی" سے متاثر ہوئے تھے۔ جنہوں نے اسی زمانے میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ وہ ڈبلیو بی ایٹس کا آئرلینڈ —— ایٹس جو اپنے ملک کی آزادی کا نقیب تھا اور ساتھ ہی عارفانہ نظمیں لکھتا تھا —— اور جو ہندوستانی روحانیت کا مدّاح تھا۔ وویکانند۔ ٹیگور۔ ایٹس —— وہ بھی کیا زمانے تھے۔ رومینٹک اور ولولہ خیز اور دلکش۔ روزی ان سب باتوں کو سن کر سوچا کرتی —— اور ۱۹۰۶ء کے ان انقلابیوں نے لیفٹیننٹ گورنر کو مارنے کے ارادے سے ریلوے لائن پر ایک چھوڑ تین تین بار بارود بچھائی تھی۔ اور علی پور سازش شروع ہوئی تھی اور سی۔ آر۔ داس نے اربندو گھوش کا مقدمہ لڑا تھا۔ اور اسی وقت برین گھوش نے کہا تھا۔ ہم انگریزوں کو مار کر آزادی حاصل کرنے کے خواب نہیں دیکھ رہے۔ ہم صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہم میں مارنے اور مرنے کی ہمّت ہے —— یورپ میں ہندوستانی طلبا نے انقلابی گروہ بنائے تھے۔ سکھ کسانوں نے امریکہ اور کینیڈا میں غدر پارٹی قائم کی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں سر کرزن ولی کو جو ہندوستان کے خلاف قانون بنا رہا تھا۔ لندن میں ایک ہندوستانی طالب علم مدن لال نے گولی کا نشانہ بنا دیا تھا اور پھانسی پر چڑھا تھا۔ دہلی میں لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا گیا تھا اور چار نوجوان دار پر جا لٹکے تھے۔ آج سے چھبیس سال پہلے مغربی سامراجیوں نے آپس میں اسی طرح کی ایک بھیانک جنگ لڑی تھی۔ اور اس زمانے میں ہندوستانی انقلابیوں نے برلن کمیٹی بنائی تھی جس میں سروجنی دیوی کے بھائی ویریندر چٹوپادھیائے، اور راجہ مہندر پرتاپ اور بھوپیندر ناتھ دت اور سوہن سنگھ اور برکت اللہ اور چمپک رمن پلّے اور ایم۔ این۔ رائے شامل تھے۔ بنگالی۔ پنجابی۔ مدراسی۔ ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ کون کہتا ہے کہ ہندوستانی قوم متحد نہیں ہو سکتی ۔؟ اور غدر پارٹی کے اراکین امریکہ سے ہندوستان پہنچے تھے۔ اور ۲۱ فروری ۱۹۱۵ء غدر کی تاریخ مقرر ہوئی تھی اور فوجی سپاہی یو۔ پی اور پنجاب میں غدر شروع کرنے والے تھے۔ جب کسی میر جعفر نے پھر حکومت سے مخبری کر دی۔ پھر سینکڑوں کو پھانسی لگی۔ سینکڑوں کالے پانی گئے۔

عدم تعاون اور خلافت کی تحریک کی ناکامی کے بعد ۱۹۲۴ء میں تشدّد پسند تحریک دوبارہ شروع ہوئی۔ اور پھانسی کی کوٹھڑیاں آباد ہوئیں۔ یو۔ پی میں انقلابیوں نے کاکوری میں سرکاری خزانہ لوٹا اور اشفاق اللہ

اور اس کے ساتھی پھانسی پر چڑھے۔ آندھرا میں الوری سیتا رام راجو کے گوریلا دستے حکومت سے لڑتے بھڑتے اور مارے گئے۔ سردار بھگت سنگھ نے مرکزی اسمبلی میں بم پھینکا اور کہا کہ ان کا مقصد ملک میں اشتراکی حکومت قائم کرنا ہے اور پھانسی پر چڑھے۔ ہندوستانی سوشلسٹ ری پبلکن آرمی کے کمانڈر الہ آباد میں پولس سے لڑتے اور مارے گئے۔ چاٹگام میں ۲۲ اپریل ۱۹۳۰ء کو آئرلینڈ کے ایسٹر سنڈے کی طرح کی معرکہ آرائی ہوئی اور انقلابیوں کی نئی "نوجوان ترک پارٹی" جگانتر نے سرکاری اسلحہ خانے پر حملہ کیا اور جگانتر کے لیڈر سوریہ سین اور ان کے ساتھی جلال آباد کی پہاڑیوں پر برطانوی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے مشین گنوں سے شہید ہو گئے۔ نوجوان کلپنا دت کو قید کر لیا گیا اور کالج گریجویٹ پریتی لتا چاٹگام کے یورپین کلب پر مسلح حملے کی قیادت کرتی ہوئی پکڑی گئی اور پولس کے قبضے میں آنے سے پہلے اس نے خودکشی کر لی۔ نوجوان شانتی دیبی اور سُمتی دیبی کو کومیلا کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو پستول کا نشانہ بنانے کی سزا میں کالے پانی بھیج دیا گیا ـــ کماری بینا داس نے بنگال کے گورنر پر گولی چلا دی ـــ چند سال قبل ہی کی بات ہے کہ بنگال کے انسپکٹر جنرل پولیس، انسپکٹر جنرل آف پرزنز اور سیشن جج علی پور سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ضلع مدنا پور کے تین انگریز جج ایک کے بعد ایک مارے جا چکے تھے۔ یورپین ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ، اسٹیٹسمن کے ایڈیٹر اور سر چارلس ٹیگارٹ پر قاتلانہ حملے افسوس کہ ناکام رہے تھے۔

جگانتر کا ہیڈ کوارٹرز چاٹگام کے نزدیک دھول گھاٹ میں آج بھی موجود تھا۔ سوریہ سین، یعنی ماسٹر دا آج بھی بنگال کے ہیرو تھے۔ خودی رام باسو سے لے کر دیپالی کے چچا دلیش چندر سرکار کے زمانے تک ملک میں پھانسیوں کے سیاہ درختوں کا کتنا بھیانک جنگل کھڑکھڑا رہا تھا۔ جس کے ایک طرف کالا پانی تھا اور دوسری طرف اونچے قید خانے ـــ اور یہ سارے انقلابی نوجوان بنگال کے ہیرو تھے۔ بھدرا لوگ۔ ! متوسط ہندو بنگالی طبقے نے ایسے ایسے بہادر نوجوان پیدا کئے تھے! بھدرا لوگ۔!! اور روزی سوچا کرتی کیا میں کلپنا دت۔ پریتی لتا۔ شانتی۔ سمتی اور بینا داس جیسی ہیروئن نہیں بن سکتی؟ پچھلے چند برسوں میں سارے دہشت پسند انقلابی کمیونسٹ ہو گئے تھے۔ اور اب کالج میں لڑکیاں ان نئے انقلابیوں کا تذکرہ کرتیں۔ ریحان الدین احمد اور اکشے مکرجی اور اُدما رائے ـــ لڑکیوں کے دل و دماغ میں ماسٹر دا کی جگہ اب ریحان الدین احمد لے چکے تھے۔

سال بھر قبل دیپالی نے بڑے مضطرب لہجے میں روزی سے کہا تھا ـــ "روزی۔ سنو تو ـــ کل ہم ایک خفیہ اسٹڈی سرکل میں گئی تھی۔ اب کے سے تم بھی میرے ساتھ چلو۔ وہاں بہت اچھی باتیں

معلوم ہوتی ہیں۔" روزی چپ رہی تو دیپالی نے کہا تھا۔ "اپنے پاپا سے کہہ دینا میرے گھر جا رہی ہو۔ کالج کی پڑھائی کرنے۔"

آئندہ اتوار کو روزی دیپالی کے ہمراہ پرانا پلٹن کے اس پُراسرار مکان میں گئی۔ اور چند ہفتوں بعد بین الاقوامی اشتراکی تحریک کی بڑی سخت حامی ہو گئی تھی۔ خود اپنے وجود کے متعلق بہت سے پریشان کن سوالوں کا جواب اُسے مل گیا تھا۔ سیدھی سی بات یہ تھی کہ برطانیہ کی اقتصادی بالادستی کی وجہ سے جب ملک میں قحط پڑتا تھا اور کساد بازاری چھاتی تھی اور بے روزگاری پھیلتی تھی تو مشنری لوگ بھوکے ننگے ہندوستانیوں کو عیسائی بنا لیتے تھے۔

پھر اس ستمبر میں جنگ چھڑی تو اسٹڈی سرکل میں اکشے دا نے روزی کو سمجھایا کہ مغربی سامراجیوں کی اس جنگ کو ہندوستان میں خانہ جنگی میں تبدیل کرنا ہمارا فرض ہے۔ تاکہ سُرخ انقلاب فی الفور آ سکے۔ اب ہم اس مقصد کے حصول کے لئے کام کریں گے اور اس جنگ کے خلاف اور خانہ جنگی کے پرچار کی خاطر خفیہ طور پر لٹریچر چھاپ کر جنتا میں تقسیم کریں گے۔ روزی اس مجوزہ خانہ جنگی کے لئے بھی بخوشی تیار ہو گئی تھی۔

پادری بنرجی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ روزی اتوار کے روز کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ "کہدو بھائی روزی تم نے شہر کے ایک محلے میں سنڈے اسکول کھولا ہے۔" پچھلی مرتبہ اکشے نے ہنس کر اس سے کہا تھا۔

لیکن ابھی چند روز قبل وہ خفیہ اسٹڈی سرکل ٹوٹ گیا۔ ساتھی پل کے پل میں انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ دیپالی بیحد خاموش رہنے لگی۔ اب وہ روزی کو کچھ نہ بتاتی تھی۔ شاید یہ لوگ مجھ پر پوری طرح بھروسہ نہیں کرتے۔ کیونکہ میرا سارا خاندان انگریزوں کا پروردہ ہے۔ ڈھاکا کا موجودہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ولیم کینٹ ویل پاپا کو بیحد مانتا ہے۔ مسز کینٹ ویل بھی کبھی کبھی لِلی کاٹیج آتی رہتی ہیں۔ میں ساتھیوں پر کبھی یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ میں برٹش راج کی وفادار نہیں ہوں۔ شاید وہ یہی سمجھتے ہوں کہ میں ان کی مخبری کر دوں گی۔ روزی کو پچھلے روز سے اندازہ تھا کہ دیپالی کے پاس انڈر گراؤنڈ سے اہم پیغام آ رہے ہیں۔ مگر دیپالی نے اس سلسلے میں بالکل چپ سادھ رکھی تھی۔

حضرت مریمؑ کی ساری پر لچکا ٹانک کر اور سلمیٰ ستارے کا منا سا تاج بنا کر روزی ایک لمبا سانس لے کر کوچ پر سے اٹھی۔ اور شال لپیٹ کر باہر صحن میں آ گئی۔ سائبان کے اندر ٹیبلو تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ روزی در میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ کمپاؤنڈ کی غریب بنگالی عیسائی عورتیں کتنی شردھا سے مورتیاں سجانے میں منہمک تھیں۔ اندر جا کر اس نے مریمؑ کی مورتی کو کپڑے پہنائے اور تاج سر پر رکھا۔ اور یکلخت اس نے سوچا۔ اس سائبان اور درگا پوجا کے پنڈال میں کیا فرق ہے؟ ان غریب عورتوں کے لئے کیا مریمؑ بھی لاشعوری طور پر درگا کی مانند ایک اور دیوی

نہیں؟ اور کیا ہم عیسائی لوگ بُت پرستی نہیں کرتے؟ پھر ہندو کافر اور گمراہ کیوں ہیں؟ اگر خدا فاختہ کا روپ دھار کر دنیا میں آ سکتا ہے تو کچھوے اور مچھلی میں اوتار کیوں نہیں لے سکتا؟ میرے بے چارے پاپا۔ ہائے میرے پیارے بیچارے بوڑھے پاپا۔ تم نے ساری زندگی ان بے معنی بحثوں میں کیوں ضائع کی؟ فاختہ اور روح القدس ——!

وہ یکایک بے حد دل گرفتہ ہو کر آہستہ آہستہ قدم رکھتی گرجا گھر کی طرف بڑھی اور ہال میں جھانکنے لگی۔ ہال کے ایک کونے میں پنجابی ٹولی زور زور سے گا رہی تھی۔

رب خداوند بادشاہ اے۔ او جلال دا بادشا اے
اُچے کرو سر جان جلال دا بادشاہ آوے۔

وہ دبے پاؤں اندر پہنچی۔ لدھیانہ مشن کے پادری ریورنڈ ہنری لبسواس کا نوجوان بیٹا مسٹر لوتھر لبسواس بڑل والے ہارمونیم پر بیٹھا تندہی سے حمد کی سنگت کر رہا تھا۔

"اے خداوند اپنی راہ اپنے بندے نوں دکھا۔ آ۔ آ۔" روزی کو اپنے قریب کھڑا دیکھ کر مسٹر لوتھر لبسواس گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بھجن منڈلی بھی چپ ہو گئی۔ چند لڑکیاں سفید شلواروں، سُرخ سویٹر اور سفید دوپٹوں میں ملبوس شرما کر کھی کھی ہنس پڑیں۔

مسٹر لوتھر لبسواس ذرا جھینپ کر مسکراتے ہوئے روزی کو دیکھنے لگے۔

یہ لوگ سب کسی دوسری دنیا کے باشندے تھے۔ روزی اخلاقاً مسکرائی۔ "سوری۔ میں نے آپ لوگوں کی پریکٹس کو ڈسٹرب کر دیا۔ پلیز کیری آن ——"

"آپ —— آپ بیٹھیں نا روزی سسٹر ——" ایک پنجابی لڑکی نے کہا۔

"نہیں بھئی —— مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے۔ گڈ نائٹ۔"

مسٹر لوتھر لبسواس کے سامنے مسکرا کر سر ذرا سے خم کرتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔ اور دروازے پر پہنچ کر اس نے محسوس کیا کہ گو بھجن منڈلی نے دوبارہ گانا شروع کر دیا تھا لیکن مسٹر لوتھر لبسواس کی دزدیدہ نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی ہیں —— اور وہ بے طرح شرما رہے ہیں۔

او مائی گاڈ —— اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور عمارت کا چکر لگا کر پادری بنرجی کے دفتر کی کھڑکی کے نیچے پہنچی اور اندر جھانک کر دیکھا۔ پاپا عینک ناک کی نوک پر رکھے میز پر جھکے لیمپ کی روشنی میں تندہی سے

دعا لکھنے میں مصروف تھے۔ اسے اپنے بوڑھے باپ پر بے اختیار پیار آ گیا۔ خدایا ان کو زندہ رکھ۔ خدایا ان کو میرے سر پر زندہ سلامت رکھ۔ اس نے دعا مانگی! اور دروازے کی طرف جا کر چپکے سے کمرے میں داخل ہو گئی۔

قلم سرعت سے چل رہا تھا۔ سر۔ سر۔ سر۔

روزی کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ اور جھانک کر پڑھنا چاہا۔ اور دل میں مسکرائی۔ گُڈ اولڈ پاپا۔ پاپا اور اُن کے سالانہ کرسمس سرمن۔

"ـــ کفارے کی نسبت جو ہمارے خداوند یسوع نے اے لوگوں تمہارے لئے کیا ـــ اُس نے جان کھوئی کہ تم اس کو دوبارہ حاصل کرو ـــ گیہوں کا دانہ جو مرنے کے بعد ـــ" قلم کی رفتار تیز ہو گئی ـــ "وے جو مسیح پر ایمان لائے ـــ خداوند تیری برکت تیرے بندوں پر ہے۔ وے روح القدس میں غوطہ دلائے جاویں گے کہ وہ جو ہمارے لئے مُوا اور مدفون ہوا۔ اور جی اٹھا اور وہ خداوند خدا کا اکلوتا بیٹا، جو ہماری تمہاری خاطر صلیب پر لٹک گیا۔ اس کا مبارک یوم ولادت منانے ہم آج جمع ہوتے ہیں اور اس خداوند خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اس ملک میں امن و امان کی حکومت کے زیرِ سایہ ـــ"

"دیدی ـــ" کھڑکی کے نیچے سے کمپاؤنڈ کے ایک بچے نے اُسے آہستہ سے پکارا۔ وہ سرعت سے باہر نکلی۔ بچے نے اس سے کہا۔ "پھاٹک پر یہ بڑی کالی موٹر کھڑی ہے۔ اس میں دیپالی دیدی بیٹھی ہیں۔ آپ کو بلا رہی ہیں۔ ایک دم جلدی ـــ"

"دیپالی موٹر میں بیٹھی ہے؟" روزی نے حیرت سے دُہرایا۔ اور چاروں طرف نظر ڈال کر تیزی سے بھاگی......

اوما رائے کی موٹر اندھیرے برگد کے نیچے کھڑی تھی۔

"روزی ـــ تمہارے ہاں تو بڑا ہنگامہ ہے۔" دیپالی سرکار نے کار کی کھڑکی میں سے جھانک کر گھبراتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ فکر مت کرو۔ کیا بات ہے؟"

"بے حد سیریس۔ تم کل سویرے میرے گھر پہنچ جاؤ ـــ وقت بالکل نہیں ہے اور بالکل خاموش رہو۔ ٹوپ سیکرٹ ـــ گڈ نائٹ۔" دیپالی نے سرگوشی میں جواب دیا ـــ کار زن سے آگے چلی گئی۔

روزی چپ چاپ اور متفکر پھاٹک کے اندر واپس آئی اور کنکریوں کو پیروں سے ٹھکراتے ٹھکراتے

بلی کاٹج کی سمت روانہ ہو گئی۔ سامنے گرجا گھر میں سے پنجابی ٹولی کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

اے خداوند میرا دل اک پاسے کر۔ تاں میں رکھاں تیرا ڈر ــــ

اور اب لوتھر بسواس کی بھاری آواز حمد میں شامل ہوئی۔ ہارمونیم زور زور سے بجنے لگا ــــ

تسی گاؤ ثنا ــــ گاؤ ــــ ثنا تسی رب دی ــــ سچیاں دی ٹولی وچ دل نال گاواں ــــ ثنا سناواں رب دی۔ رب خداوند بادشاہ اے۔ او جلالی دا بادشاہ اے۔ اے خداوند اپنی راہ اپنے بندوں نوں دکھا ــــ آ ــــ آ ــــ آ ــــ

۷

نیا عہد نامہ

چندر کنج کے کوٹھے والے سائبان میں کھڑی دیپالی سرکار صبح کے ناشتہ کے بعد سے روزی کا انتظار کر رہی تھی۔ دور سڑک کے موڑ پر روزی کی سائیکل آتے دیکھ کر وہ تیزی سے نیچے اتری اور بیٹھک خانے کا دروازہ کھولا۔ جوں ہی روزی اندر آئی دیپالی نے اسے اپنے کمرے میں لے جا کر جھٹ پٹ دروازہ بند کیا۔ اور چٹخنی لگا دی ــــ اور بڑے ڈرامائی انداز سے الماری پر سے بائبل اتار کر (جو ایک مرتبہ پادری بنرجی نے اسے دی تھی) روزی کے ہاتھ میں ٹھونس دی۔

"آنکھیں بند کرو، روزی۔"

حیران و پریشان روزی نے آنکھیں بند کیں۔

"کہو ــــ ملک و قوم کی خاطر حلف اٹھاتی ہوں۔ گوڈ دی فادر ــــ گوڈ دی سن اور گوڈ دی ہولی گھوسٹ کے نام پر ــــ"

روزی نے ایک آنکھ کھولی ــــ "مس ہیڈلے نے پرسوں ہی بتلایا ہے کہ صحیح تلفظ گھوسٹ نہیں گوسٹ ہے۔"

"اچھا۔ اچھا۔ ہولی گوسٹ کے نام پر۔ چلو۔ بولو تو۔"

روزی نے دونوں آنکھیں کھول لیں اور ٹھٹھک کر کہا۔ "دیپالی۔ میرے پاپا پر تو کوئی آفت نہیں

آئے گی؟ وہ بہت بوڑھے ہیں۔"

دیپالی چپ ہو گئی۔ اسے بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ "میں۔ میں مستقبل کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ روزی۔ مگر۔ مگر تم سچی ہندوستانی ہو کہ نہیں۔" اس نے لمحہ بھر کے بعد کہا۔

"ہاں۔" "میں کالیٹن بنیٹو کرسچین سچی ہندوستانی ہوں۔ اس نے دل میں تلخی سے کہا۔ پھر اس نے فوراً اپنے آپ کو ڈانٹا۔ اس خود رحمی کی کیا ضرورت ہے۔ تحریکِ آزادی میں ان گنت عیسائی شامل ہیں۔ ایک سے ایک بڑے محب وطن۔ حبِ وطن کیا کسی ایک ہی فرقے کی میراث ہے؟ اس وقفے میں دیپالی سانس روکے توقع نظروں سے روزی کو دیکھے جا رہی تھی۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو۔ ؟ تو کیا ہو گا۔ ؟ دیپالی کو محسوس ہوا جیسے ہندوستان کا سارا مستقبل اس وقت محض روزی بنرجی کے ہاں یا نہ کرنے پر منحصر ہے۔ دیپالی کو کپکپی ی محسوس ہوئی۔ اتنے میں روزی نے فرش پر دو زانو بیٹھ کر زیرِ لب حلف دُہرایا اور بائبل سر اور آنکھوں سے گا کر کہا۔ "سو ہیلپ می گوڈ۔"

دیپالی اطمینان کا گہرا سانس لے کر اپنے پلنگ پر جا بیٹھی۔

"روزی۔ ادھر آؤ۔" اب گویا وہ گروپ لیڈر تھی۔ روزی اس کی چیلی تھی۔ "غور سے سنو روزی" یپالی کی آواز میں تحکم آ گیا تھا۔ او مارائے کی طرح اقتدار اور احساس ذمہ داری انسان کو پل کی پل میں بدل تی ہے۔

"روزی۔ ڈی ایم کے بنگلے پر تمہارے کمپاؤنڈ کا کوئی آدمی ملازم ہے۔ تم نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا۔"

"مسز کنیٹ ویل کی آیا ہمارے ہاں کی عورت ہے۔ پیلا۔ ممی نے ہی اُسے وہاں رکھوایا تھا۔"

"کہاں کی رہنے والی ہے؟"

"پالا تو ممی نے اسے کمپاؤنڈ میں ہے۔ مگر اُس کی نانی نرسنگھ دی میں رہتی ہے۔"

دیپالی چند لمحوں تک سوچا کی۔ پھر پوسٹ کارڈ اور قلم نکال کر روزی سے کہا۔

"میں اُس کی نانی کی طرف سے تمہاری ممی کو خط لکھ رہی ہوں۔ نانی بہت سخت بیمار ہے۔ لہذا دیبی ایک ہفتے کے لئے فوراً نرسنگھ دی پہنچے انہ کو [illegible] نرسنگھ [illegible] بلائے گا اور یہ کارڈ وہاں ڈاک میں ل دے گا۔ اچھا ٹھہرو۔ جوزف بید قابلِ اعتبار ہے!؟"

"تم دیپالی جوزف کو برسوں سے دیکھ رہی ہو۔"

"اچھا ۔۔ جوزف ایک لفافہ لے کر لیلا کے نام ڈی۔ ایمز ہاؤس جائے گا اور اس سے کہے گا کہ گاؤں سے آدمی یہ چھٹی لایا ہے ۔۔ وہی نانی کی بیماری والی ۔ اور یہ کہے گا کہ ہفتے بھر کی عیوضی کا انتظام بھی کرتا آیا ہے۔ یہ لیلا جو ہے تمہاری ۔ یہ میم صاحب سے چھٹی مانگے گی۔ میم صاحب کیسی آدمی ہیں؟"

"اچھی خاصی ہیں۔ شریف عورت ہیں ۔" روزی نے جواب دیا۔ مگر الجھن سی محسوس ہوئی۔ میں مسز کینیٹ بیل سے واقف ہوں ۔ ان سے ملتی رہتی ہوں ۔ اور اب ان کو دھوکا دینے جا رہی ہوں ۔ "اچھی خاصی ہیں ۔" اس نے دہرایا ۔

"اُس کے بعد شام کو ایک برقعہ والی ملازمہ کلثوم بی بی ڈی۔ ایمز ہاؤس پہنچ جائے گی۔ لیلا کی عیوضی۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ خط لے کر تم جاؤ اور لیلا کو چھٹی دلا دو اور بعد میں کلثوم بی بی کو پہنچا دو۔ تو منٹوں میں کام بن جائے گا۔ مگر پھر خیال آیا کہ تم کو مصیبت میں نہ ڈالوں ۔"

"کیوں ۔۔؟ روزی نے غصے سے پوچھا۔ "پھر حلف کس لئے اٹھوایا ہے؟"

"تم خود چلی جاؤ گی؟"

"اف کورس ۔"

"اوہ ۔۔ ونڈر فل ۔۔ روزی ۔۔" دیپالی خوشی سے اچھل پڑی۔

"مگر دیپالی ۔۔ یہ سب کس لئے ۔۔؟ تم مسٹر کینیٹ ڈیل پر بم تو نہیں پھینکو گی؟"

"روزی۔ تم کو پتہ ہے، ہم لوگ بم نہیں پھینکتے ۔"

'ہم لوگ ۔' دیپالی نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ اور روزی مرعوب ہوئی۔ مگر اچانک اس نے کہا "ایک بڑا سخت لُوپ ہول ہے تمہاری اسکیم میں۔ پوچھو کیا ۔۔؟ لیلا ایک ہفتے کے لئے کہاں جائے گی؟ خط تو فرضی ہے۔"

"اس کا انتظام بھی کر لیا گیا ہے۔ فکر مت کرو۔ یہ بہت معمولی بات ہے۔ اچھا۔ روزی۔ آج ہے ۲ تاریخ ۔۔ ۲۷ دسمبر سے پہلے کلثوم بی بی کا ڈی۔ ایمز ہاؤس میں پہنچ جانا لازمی ہے۔"

"مگر کیوں آخر ۔۔؟"

"یہ تمہیں نہیں بتایا جا سکتا۔"

"کیوں؟"

"روزی بنرجی۔ تم نے انڈر گراؤنڈ میں کام کرنے کے لئے حلف اٹھایا ہے نا۔ اب زبان بند رکھنے او
دال نہ کرنے کی عادت ڈالو۔"

"تم تو واقعی ڈکٹیٹر بن گئیں" روزی نے منہ لٹکا کر کہا۔

دیپالی بچوں کی سی لکھائی میں لیلا بتی آیا کی نانی کی طرف سے مسز الیتھر بنرجی کو پوسٹ کارڈ لکھنے میں
مروف ہو گئی۔

۲۴ دسمبر کی صبح روزی لیلی کاٹیج کے برآمدے میں بیٹھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور لاٹ پادری کے ہاں سے
ے ہوئے کھلونوں اور گرم کپڑوں کے پارسل بنانے میں مصروف تھی۔ جو کمپاؤنڈ کے یتیم بچوں میں تقسیم کئے جانے
ے۔ اُسی وقت ڈاکیئے نے ایک پوسٹ کارڈ لاکر دیا۔ پڑھ کر روزی نے اپنی والدہ کو آواز دی، جو کانفرنس کے
ندوں کی صبح کی چائے کے انتظام میں سرگرداں پھر رہی تھیں۔

"ممی ـــــ بے چاری لیلا بتی کی نانی کا خط آیا ہے۔ بڑی سخت بیمار ہے۔"

"ارے کیا ہوا؟" مسز الیتھر بنرجی نے پوچھا۔

"یہ نہیں لکھا۔ یہ دیہاتی لوگ تو صرف ایک ہی بات جانتے ہیں۔ پران نکلنے والے ہیں فوراً پہنچو۔"

"خدا باپ رحم کرے۔" الیتھر بنرجی نے کہا۔ "روزی تم خود جا کر مسز کینٹ ویل کو خط دکھا دو۔ ورنہ
شاید چھٹی نہ دیں۔ لیلا مجھ سے کئی بار کہہ چکی ہے کہ گاؤں جانا چاہتی ہے۔ مگر میم صاحب ابھی چھٹی نہیں دے
ہی ہیں۔"

"کیوں؟ اُن کے ہاں آیا کا کام ہی کیا ہے؟"

"نہیں، مگر اُن کے ہاں مہمان آنے والے ہیں۔ پرسوں جیری بازلر کے لئے آئی نہیں تھیں تو مجھے
رہی تھیں۔"

"کون مہمان آنے والے ہیں۔ ماما؟"

"مجھے کیا معلوم۔ مسز کینٹ ویل سے میری اتنی بے تکلفی نہیں ہے کہ مجھے تفصیلات بتائیں۔ ہو
لے کوئی۔"

روزی نے پارسل اکٹھے کر کے اندر سٹنگ روم میں کرسمس ٹری کے پاس رکھ دیئے۔ چند لمحوں کے لئے چپ کھڑی رہی۔ پھر غیر ارادی طور سے عیسیٰؑ کی تصویر پر نظر ڈالی، جو آتشدان کے اوپر ٹنگی تھی (کمرے کی ایک دیوار پر لشب ہمبر کی تصویر بھی آویزاں تھی) باہر آکر اس نے سائیکل نکالی اور رمنا کی سمت روانہ ہوگئی۔

٨

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا بنگلہ

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پُر فضا بنگلے کا وسیع باغ موسمِ سرما کے روشن پھولوں سے جگمگا رہا تھا۔ بنگلے کے اندر چھوٹا حاضری کے بعد ملازمین بڑے دن کی تیاریوں میں سرگرمی سے مصروف ہو چکے تھے۔ روزی بنرجی نے سائیکل ایک گل مہر کے نیچے کھڑی کی اور برآمدے میں جا کر ڈرائنگ روم کے دریچے سے اندر جھانکا۔ بیرہ گول میز کی جھاڑ پونچھ کرتا نظر آیا۔ روزی نے ذرا ڈرتے ڈرتے دریچے پر دستک دی۔ غفور بیرہ روزی مس صاحب کو پہچانتا تھا۔ اُس نے باہر آکر کھیسیں نکال دیں۔ مگر جھک کر سلام نہیں کیا کہ بڑے صاحب کا بیرہ تھا۔

"میم صاحب ہیں؟" روزی نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔ اس کا حلق سوکھ رہا تھا۔

"اندر ہیں۔"

"اور صاحب۔؟"

"صاحب کچہری جانے والا ہے۔"

اندر سے بوٹوں کی چاپ اور ہلکی سی سیٹی کی آواز آئی۔ اور کسی نے پکارا۔ "ڈارلنگ۔"

"یس ڈیر۔" یہ مسز کینٹ ویل کی آواز تھی۔

بجلی کے کوندے کی طرح روزی کو خیال آیا کہ واپس چلی جائے۔ وہ کس زبردست حماقت میں پھنس گئی ہے۔ قوم پرستی وغیرہ بالکل ٹھیک ہے ـــــ مگر یہ خطرناک سازشیں ـــــ وہ ایک دم پیچھے ہٹی۔

کہ اتنے میں فریڈا کینٹ ویل کتے کو آواز دیتی خود ہی باہر نکل آئیں۔

"گڈ مارننگ مسز کینٹ ویل۔"

"گڈ مارننگ — گڈ مارننگ — ہاؤ آر یو روزی —؟"

"فائن — تھینک یو — مسز کینٹ ویل — ہاؤ از ڈسکی —؟"

ڈسکی کتا تھا۔ جو بھاگتا ہوا برآمدے میں آیا۔

"یس روزی —؟" مسز کینٹ ویل نے سوالیہ انداز سے اسے دیکھا۔ انہوں نے اسے بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔ اُسے ڈرائنگ روم میں نہیں لے گئیں۔ وہ اس سے اس طرح مخاطب تھیں۔ جس طرح ڈاکیے، پھیری والے یا اخبار فروش سے کھڑے کھڑے بات کی جاتی ہے۔

"ہاؤ از دی اولڈ پادرے —؟" فریڈا کینٹ ویل نے جھک کر ڈسکی کو گود میں اٹھاتے ہوئے دریافت کیا — "تم کسی خاص کام سے آئی ہو —؟"

میں — روزی شرمیلا بنرجی — ریورنڈ پال میتھو بنرجی کی بیٹی — انسان — محض ایک حقیر ہندوستانی ہوں — یہ دوسری بات ہے کہ حقیر ہندوستانی جہاں آرا بھی ہے — مگر نواب قمرالزماں چودھری اور بیرسٹر پری توش رائے اعلیٰ طبقے کے افراد ہیں اور ڈی۔ ایم سے برابری سے ملتے ہیں۔ جہاں آرا بیگم اور اد مارائے کو فریڈا کینٹ ویل اپنے ہاں ڈنر پر بلاتی ہیں اور ان کے گھر جا کر ڈنر کھاتی ہیں۔ اور میں محض ان کے پروردہ نیٹو پادری کی لڑکی ہوں۔

چند سیکنڈ قبل روزی نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ یہ کہہ کر کہ انہیں "میری کرسمس" وش کرنے آئی تھی۔ واپس بھاگ جائے گی۔ جہنم میں جائے انڈر گراونڈ — مگر اب اس نے یکلخت سر اٹھا کر بڑے دھڑلے سے انہیں جواب دیا — "جی ہاں، ایک ضروری کام ہے" بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اس نے پوسٹ کارڈ سوئیٹر کی جیب سے نکالا اور بولی — "لیلا بتی کی نانی کا کارڈ ملک کے پاس آیا ہے۔ وہ بوڑھی عورت بہت سخت بیمار ہے۔"

"اوہ — ڈیم — عبدالغفور — آیا کو بلاؤ —" فریڈا کینٹ ویل نے کہا اور ٹہلتی ٹہلتی جا کر گملوں کے پاس کھڑی ہو گئیں۔

آیا باہر آئی — روزی نے اُسے بنگالی میں نانی کی خبر سنائی۔ اور پوسٹ کارڈ اس کے ہاتھ میں دے د ےچاری عورت کا رنگ فق ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"گھبرانے کا بات نہیں آیا —" فریڈا کینٹ ویل نے مسکرا کر کہا۔ "جیا ستی بیمار ہوتا تو ٹیلی گرام د ہارا گرینڈ مدر — ڈونٹ یو تھنک سو روزی؟"

"ہم کو چھٹی دے گا میم صاحب۔ ؟" لیلا نے کہا۔

"جاؤ۔ مگر عیوضی کا انتظام پہلے کرنا مانگتا۔" کمر پر ہاتھ باندھے پیچھے کھڑے عبدالغفور نے کہہ دیا۔ ظاہر تھا کہ عبدالغفور میم صاحب کے منہ چڑھے ملازم ہیں۔

"عیوضی۔ ؟ اوہاں۔ مس صاحب۔ ادھر کمپاؤنڈ میں ڈیزی یا سوشیلا ابھی ہیں گی ؟" لیلا نے گھبرا کر پوچھا۔

"اِدھر بنگلے پر ٹرینڈ آیا مانگتا مس صاحب۔ عیوضی میں۔" عبدالغفور نے رعونت سے کہا۔ مسز کینٹ ویل معاملہ عبدالغفور پر چھوڑ کر مالی کو ہدایات دینے کے لئے برآمدے کے دوسرے سرے پر چلی گئیں۔ آویزاں گملے کے نیچے کھرپی لئے کھڑا کچھ سٹر پٹر کر رہا تھا۔

روزی ان کے پیچھے پیچھے گئی۔ "مسز کینٹ ویل۔ ماما نے لیلا کو اپنی اولاد کی طرح پالا ہے اس لئے ان کو اس کی بڑی فکر ہے۔ ابھی یہ کارڈ آیا تو ماما کو بھی عیوضی کا خیال آیا تھا۔ ہمارے درزی کی بھانجی آیا کا کام جانتی ہے۔ اگر آپ کہیں تو بھیج دوں۔"

فریڈا کینٹ ویل روزی کی طرف مڑیں۔ یہ نازک ترین لمحہ تھا۔

"درزی کی بھانجی۔ ؟ کون سا درزی۔ ہمارا حسن علی ؟" انہوں نے پوچھا۔ ظاہر تھا کہ فریڈا کینٹ ویل ایک خالص گھریلو بی بی یعنی ہاؤس وائف تھیں اور درزیوں اور نوکروں کے سلسلے میں انہیں گہری دلچسپی تھی۔

اب روزی ہڑبڑائی۔ "جی نہیں۔ مشن کا ایک پرانا درزی تھا۔ کریم اللہ۔ وہ اب چلا گیا ہے۔ اس کی بھانجی کلثوم کچھ روز ہوئے ماما کے پاس کام کی تلاش میں آئی تھی۔ انگریزی نہیں جانتی، مگر بڑی ایماندار لڑکی ہے۔ بیوہ ہے۔" لاشعوری طور پر روزی نے اپنی ماں کی کہانی دہرائی۔

"اگر تم اُس کی ذمہ داری لیتی ہو تو بھیج دو۔ میرے کمروں میں سارا سامان کھُلا پڑا رہتا ہے۔ بِل کے بکس تک کھلے رہتے ہیں۔ ہمیں اپنے نوکروں پر اتنا بھروسہ ہے۔"

"اچھا۔ لیلا میں جوزف کے ساتھ کلثوم کو بھیج دوں گی۔ تم اسے سارا کام سمجھا دینا۔" روزی نے آیا کو مخاطب کیا۔

"اچھا، روزی بابا۔ گاڈ بلیس یو روزی بابا۔" لیلا نے سر ہلا کر کہا۔

فریڈا کینٹ ویل اب سیڑھیاں اُتر کر کریسنتھمم کی ایک کیاری کا معائنہ کر رہی تھیں۔ روزی ن کو "بائی" کہا اور سائیکل پر بیٹھ کر فراٹے سے باہر نکلی۔

جب وہ سڑک پر پہنچی تو پسینہ ہو رہی تھی

اُس وقت صبح کے گیارہ بجے تھے۔

چندر کنج جا کر دیپالی کو تفصیل بتانے کے بعد روزی کمپاؤنڈ واپس آ گئی اور اس کے جانے کے یک گھنٹے بعد اوما رائے کی کار چندر کنج کے پھاٹک پر آ کر رکی۔ اوما رائے شال لپیٹے نیچے اتریں۔ وہ سب معمول بہت مضمحل نظر آ رہی تھیں۔

ڈاکٹر سرکار برآمدے میں کھڑے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اجنبی مہمان خاتون کو دیکھ کر ذرا ھبرا سے گئے اور نمسکار کیا — اوما رائے نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا۔ اور اپنا تعارف کرایا۔

ڈاکٹر سرکار ان کو بیٹھک خانے میں لے آئے۔ دیپالی کواڑ کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔

ما نے آواز دی۔

"دیپالی۔"

"جی اوما دی۔"

"وہ جو مضمون میں نے تم کو لکھنے کو دیا تھا۔ کچھ کامیابی ہوئی۔؟"

"جی اُوما دی۔ پوری کامیابی۔"

"گڈ —" اُوما رائے نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر وہ ڈاکٹر سرکار سے مخاطب ہو گئیں۔ اور کچھ ہر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولیں۔ "بنوئے بابو — میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر ئی تھی۔ دراصل —"

"کہیئے۔"

"میں ہفتہ بھر کے لئے کومیلا میں اپنے گاؤں جا رہی ہوں — اگر آپ اجازت دیں تو دیپالی کو اپنے تھ لے جاؤں۔ اس کا کالج بند ہوا ہے۔ ذرا یہ بھی سیر تفریح کر لے بے چاری۔"

ڈاکٹر سرکار چپ ہو گئے۔ مگر اپنی قدامت پسندی کے باوجود وہ ایسی اعلیٰ خاندان اور بلند سیرت

خاتون سے انکار نہ کر سکتے تھے۔ انھیں یہ بھی احساس تھا کہ تنگدستی کی وجہ سے وہ دیپالی کو کسی قسم کی سیر تفریح نہیں کرا پاتے۔

اب تینوں لڑکے اندر آ چکے تھے۔ اور کان لگا کر مکالمہ سن رہے تھے۔

"ہم بھی چلیں گے۔" چھوٹے دونوں نے شور مچایا۔

"تمہارا میچ ہے۔ کیسے جاؤ گے؟" دیپالی نے اندر سے نکل کر ڈانٹا۔

"تو گویا پروگرام پہلے سے بن چکا ہے۔" ڈاکٹر سرکار نے کہا۔

"پرسوں نرسوں اُوما دی نے ذکر کیا تھا۔" دیپالی نے ذرا گھبرا کر جواب دیا۔ "میں چلی جاؤں بابا؟"

"جاؤ — ہو آؤ — کیا آج ہی جا رہی ہو؟"

"جی ہاں — رات کے اسٹیمر سے داؤدکندی پہنچنے کا ارادہ ہے۔ اچھا۔ دیپالی، تم تھوڑا سا سامان باندھ لو۔ میں تیسرے پہر کو کار بھیج دوں گی۔" اُوما نے کہا اور ڈاکٹر سرکار سے باتوں میں مصروف ہو گئیں۔

دیپالی نے اچانک اپنے باپ پر نظر ڈالی۔ بابا مدتوں بعد، بخلاف معمول ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ اتنی آسانی سے اجازت دیدی! — بابا — بابا! تم پر اُوما دی کا جادو چل گیا! کومیلا کی رہنے والی ہیں۔ ضرور کوئی منتر جانتی ہوں ہوگی۔ ہمارے کامریڈ ان کی غیر حاضری میں بھی ان کا وظیفہ پڑھتے تھے۔ اب دیکھو کس طرح بابا کو منٹوں کے اندر شیشے میں اتار لیا۔ بے چارے بابا۔ اس نے تاسف سے پوچھا۔ اوما دی کی زندگی میں سیاست کے علاوہ اور کسی بات کی گنجائش بھی ہوگی؟ اُس نے سر اٹھا کر اپنی ماں کی تصویر کو دیکھا، جس کے نیچے اوما رائے کرسی پر بیٹھی ڈاکٹر سرکار سے مخاطب تھیں اور بار بار حسب عادت عینک اتار کر آنکھیں جھپک کر ڈاکٹر سرکار کو دیکھتی تھیں اور پھر عینک پلّو سے صاف کر کے لگا لیتی تھیں۔ اوما دی کی آنکھیں بڑی بڑی اور سُرمگیں تھیں۔ کاش بابا اور اوما دی — لیکن کوئی تک نہیں ہے۔ اوما دی بڑی سخت دل معلوم ہوتی ہیں۔ حالانکہ اتنی نرم دل بھی ہیں۔

اوما رائے کے جانے کے بعد اپنے کمرے میں اٹیچی کیس پیک کرتے ہوئے وہ دیر تک یہی سب سوچنے میں ایسی کھوئی رہی کہ آنے والے دنوں کے خطرے اور نزاکت کا خیال بھی اس کے دل میں نہ آیا۔

ٹھیک ساڑھے تین بجے اُوما رائے کی کار آ گئی۔ دیپالی دری کا چھوٹا سا بستر اور اٹیچی کیس اٹھائے چندر کنج سے نکلی اور کار میں جا بیٹھی۔

۹

کلثوم آیا

ساڑھے چار بجے شام مشن کمپاؤنڈ کا بوڑھا اور معتبر چوکیدار جوزف اپنے ہمراہ کلثوم آیا کو لے ڈی ایمز ہاؤس پہنچا۔ میم صاحب ابھی سو رہی تھیں۔ صاحب کچہری سے نہیں آیا تھا۔ لیلا بتی سامان ۔ ھے نرائن گنج جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ اُس نے کلثوم بی بی کو اندر بلا لیا۔ اور کام سمجھانے میں مصروف ئی۔ کوٹھی کے سارے کمرے دکھلائے اور اس کے فرائض سے روشناس کیا۔

”شام کے ٹیم۔“ لیلا بتی اپنا انگوٹھا اٹھا کر منہ تک لے گئی۔ ”صاحب، میم صاحب دھت ہو تا ہے۔ اس کے بعد چھٹی۔ میم صاحب رات کو کپڑا خود بدلی کرتا ہے۔ بچہ کوئی ہے نہیں۔ صاحب، م صاحب دونوں بہت شریف آدمی ہے۔ تم خوش رہے گا۔ ہفتہ دس روز کا تو بات ہے۔“ لیلا اُسے لے برآمدے کے سرے پر اپنی کوٹھری میں لے گئی۔ کلثوم نے اپنا اٹیچی کیس چارپائی کے نیچے سرکا دیا۔ کوٹھری سرکے تیل کی عجیب سی بو بسی تھی۔ اُسے اُبکائی سی آئی۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔

شام کی چائے کے وقت میم صاحب نے طلبی کی۔ لیلا اسے اپنے ساتھ لے کر گئی۔ صاحب م صاحب لان پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کلثوم نے جھک کر سلام کیا۔

”پہلے کہیں کام کیا ہے؟“ میم صاحب نے انٹرویو شروع کیا۔

”کلکتے میں میم صاحب۔“

”کدھر کا رہنے والا ہے؟“

”میمن سنگھ — ادھر لال باغ میں ہمارا ماموں ہے۔ اس کے پاس رہتا ہے۔“

”بل — پادرے کی لڑکی نے یہ آیا بھیجی ہے۔ آئی تھنک شی وِل ڈو۔“ مسز کینٹ ویل نے ہر کو مخاطب کیا۔

ولیم کینٹ ویل نے بے پرواہی سے سر خم کیا اور اسٹیٹسمین پڑھنے میں مصروف رہے۔

ثوم بی بی نے اپنی مستعدی اور خدمت گزاری سے فریڈا کینٹ ویل کو منٹوں میں رام کر لیا اور فریڈا کینٹ ویل کہ خاصی سیدھی تھیں۔ فوراً اس کے آگے لیلابتی کی شکایتیں کرنے لگیں۔ کاہل اور کام چور ہے دن بھر سوتی ہے۔ پادرے کی بیوی کی سفارش پر اتنے دنوں سے رکھا ہوا ہے۔ اگر وہ گاؤں سے واپس نہ آئے تو تم یہیں رہنا کھُل سُم۔

کلثوم نے اقرار میں سر ہلایا۔ اور میم صاحب کے پاؤں دباتی رہی۔

وہ پردے کی وجہ سے شاگرد پیشے کی طرف بالکل نہیں گئی۔ بوڑھے عبدالغفور میاں ہم مذہبی کے ناطے اس کے متعلق خاصی دلچسپی لے رہے تھے۔ اُن کا بڑا لڑکا نواب پورے میں سائیکلوں کی دوکان پر نوکر تھا۔ مگر آوارہ ہوتا جا رہا تھا۔ عبدالغفور چاہتے تھے کوئی نیک بے زبان لڑکی ملے تو دو بول پڑھوا دیں۔ چنانچہ کلثوم کے گھر کے حالات اور اس کی بیوگی کی المناک داستان سن کر انھیں اس سے اور زیادہ ہمدردی ہو گئی اور وہ اس کی خاطر مدارات میں لگے رہے۔

"کرسمس ایو" کی وجہ سے وہ شام بڑی مصروف اور ہنگامہ خیز گزری۔ کلثوم رات گئے تک کام میں لگی رہی۔ دوسری صبح بڑا دن تھا سویرے ہی سے سامنے کا برآمدہ ڈالیوں سے بھر گیا۔ اور سلام کے لئے آنے والے ہندوستانیوں کا تانتا بندھ گیا۔ شام کو صاحب لوگ آئے۔ وہ دن بھی بڑا مصروف گزرا۔

تیسرے روز کلکتے سے مہمان آنے والے تھے۔ عبدالغفور بڑے دن اور مہمانوں کی آمد کی وجہ سے کام کی زیادتی کا شکوہ کرتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے تو کلثوم نے ان سے کہا۔ "چچا لاؤ جھاڑ پونچھ میں کئے دیتی ہوں۔ اتنے میں تم کٹلری صاف کر ڈالو"۔ بنگلے پر اَن گنت ملازم تھے۔ مگر گول کمرے صاحب اور میم صاحب کے کمرے اور کھانے کے کمرے کی صفائی عبدالغفور خود کرتے تھے جھاڑن کندھے پر ڈال کر عبدالغفور پیٹھ پر ہاتھ رکھے جھُکے جھُکے پینٹری کی طرف چلے گئے۔ پھ واپس آکر انہوں نے کلثوم سے کہا۔ "سب چیز بہت اچھی طرح جھاڑنا۔ میم صاحب گرد کا ایک ذرّ بھی دیکھ لیں تو مار ڈالیں گی۔"

میم صاحب صبح کے ٹیم ملنے ملانے باہر جا چکی تھیں۔ کلثوم ڈرائنگ روم کی صفائی کرنے کے بعد سب سے پہلے صاحب کے دفتر کے کمرے میں گئی۔ جس کے سب دروازے اندر سے بند تھے۔ اس نے صاحب کی میز کے کاغذات سنوارے، فائیل سلیقے سے رکھے۔ ایک آدھ دراز جو آدھ کھلی پڑی تھی اُ

ھی ٹھیک کر دیا۔ اور آدھ پون گھنٹے تک کمرے کی جھاڑ پونچھ میں مصروف رہی۔

میم صاحب کی واپسی سے ذرا قبل وہ ان کے ڈریسنگ روم میں آ کر ان کے کپڑوں پر استری کرنے یں مشغول ہو گئی۔

مہمان کلکتے سے رات کو پہنچے۔ اس وقت کلثوم اپنی کوٹھری میں جا کر سو چکی تھی۔

بریکفاسٹ کی میز پر اس نے مسٹر گلبرٹ بلومر انسپکٹر جنرل پولیس اور ان کی میم کی جھلک دیکھی۔ مگر ائیننگ روم میں اس کا کوئی کام نہ تھا۔ ناشتے کے بعد میم صاحب نے اس سے کہا کہ مسز بلومر کے پاس جائے۔

چنانچہ وہ گیسٹ روم میں پہنچی اور جھک کر سلام کیا۔ مسز بلومر ادھیڑ عمر کی خوش مزاج خاتون ھیں۔ انہوں نے اپنے کپڑے نکال کر کرسی پر رکھے۔ مسٹر بلومر کا اردلی ابھی کمرے میں نہ آیا تھا۔ کلثوم نے ھوبی کو بلایا۔ سفر کے کپڑے دھوبی کو دینے کے لئے مسز بلومر نے گنگناتے گنگناتے سارا سامان تلپٹ ر دیا۔ بہت سے سرکاری کاغذات تتر بتر ہو گئے۔ کلثوم نے سلیقے سے ان سب کو سمیٹ کر ایک طرف کھ دیا۔

"گُڈ گرل ۔۔۔!" مسز بلومر نے کہا۔ "ہمارے ساتھ کیل کٹا چلے گا؟" (مسز کینیٹ ڈیل نے ن کو بتا دیا تھا کہ یہ آیا عارضی ہے)

کلثوم نے شرما کر منہ میں پلو ٹھونس لیا۔ "میم صاحب ہمارا سادی ہونے والا ہے۔"

"سادی! ویری گڈ ۔۔۔ لو کھُل سُم ۔۔۔ یہ صاحب کا بکسا ادھر رکھو۔ اس میں بڑا ضروری کاغج کھا ہے۔ صاحب اس کی چابی مانگے گا تو ہم کو آ کر بولنا۔ چابی ہمارے اس نیلے بیگ میں ہے۔ ٹھیک ہائے؟"

"ٹھیک ہے میم صاحب ۔۔۔" کلثوم نے جواب دیا۔

رات کو کھانے کے بعد مسٹر کینیٹ ڈیل اور مسٹر بلومر شراب کے گلاس ہاتھ میں لے کر ڈرائنگ وم کے دروازے اندر سے بند کئے آہستہ آہستہ گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ اتفاق سے کلثوم برابر والے ندھیرے کمرے میں ہی موجود تھی۔ جس کا دروازہ پہلے سے کھُلا رہ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد صاحب نے پکارا ۔۔۔ "کوئی ہائے ۔ عبدل ۔"

کلثوم دبے پاؤں پینٹری میں گئی ۔۔۔ جہاں عبدالغفور عشاء کی نماز میں مصروف تھے (میم صاحب

اور مسز پلومر اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو چکی تھیں) صاحب نے دوبارہ آواز دی تو کلثوم بھاگی بھاگی ڈرائنگ روم کے گیلری والے دروازے پر پہنچی اور دستک دی۔ صاحب نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اور اس پر اس طرح نظر ڈالی جیسے اُسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ وہ ذرا جھینپ گئی۔ مگر اس نے فوراً کہا۔ "صاحب عبدل نماز پڑھ رہا ہے۔ کیا کام ہے؟"

"تم اب تک کیوں جاگ رہی ہو کلثُم۔؟" مسٹر کینٹ ویل نے پوچھا۔ ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

"میں میم صاحب کے پاؤں دبا رہی تھی۔ صاحب۔"

"اوہ اچھا۔"

کلثوم نے ایش ٹرے خالی کی۔ سگرٹ کا نیا ٹن کھول کر مہمان کے قریب تپائی پر رکھا۔ اس دوران میں دونوں صاحب لوگ پھر گفتگو میں محو ہو چکے تھے۔ لیکن جب وہ کمرے سے باہر نکل رہی تھی تو دفعتاً مسٹر پلومر نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا۔ اور شگفتگی سے کہا۔ "آئی سے تِل۔ ڈیٹس اے پرٹی گرل"۔ کلثوم ہڑبڑا کر گیلری میں پہنچی اور سرپٹ دوڑتے ہوئے اپنی کوٹھری میں جا کر کھاٹ پر لیٹ رہی۔

مسٹر پلومر صوبے کے اعلیٰ پولیس اور سول حکام کی ہنگامی کانفرنس کے لئے ڈھاکے آئے تھے۔ ایک روز ایک اہم میٹنگ ڈی۔ ایم کے بنگلے پر بھی ہوئی۔ جس میں بیرسٹر رائے کے سالے دھریندر موہن سین ڈی آئی۔ جی بھی شامل تھے۔ بنگلے پر پولیس والوں اور سی آئی ڈی والوں کی ریل پیل تھی۔ کلثوم مستعدی سے اس دوران میں مسز پلومر کی حاضری میں رہی اور بڑی تندہی سے مہمانوں کی خدمت میں مصروف رہی۔

کلکتے واپس جاتے وقت مسز پلومر نے اس کو دس روپے بخشیش دیئے۔

دسویں دن لیلاوتی اپنے گاؤں سے واپس آگئی۔ آتے ہی اس نے کلثوم کے کان میں کہا۔ "نانی بیمار نہیں تھی۔ مجھے بہانے سے بلوایا تھا۔ ورنہ میم صاحب چھٹی نہ دیتیں۔"

جس دن لیلاوتی ڈی۔ ایم کے بنگلے پر اپنی ڈیوٹی بجانے واپس پہنچی۔ اسی روز شام کو اوما رائے کی موٹر دیپالی سرکار کو [illegible] چھوڑ گئی۔ دیپالی نے ڈاکٹر سرکار کو بتایا کہ اس نے کومیلا میں اوما رائے کے کنٹری ہاؤس میں بےحد خوشگوار وقت گذارا۔

۹ جنوری ۱۹۴۰؁ء کو پولیس نے دریائی راستوں کی ناکہ بندی کر کے ریحان الدین احمد اور اس کے تھیوں کے خفیہ مستقر اور خفیہ پریس پر چھاپہ مارا۔ مگر ریحان الدین احمد اور اس کے ساتھی وہاں سے غائب چکے تھے۔ اور اب کی مرتبہ وہ ایسے غائب ہوئے تھے کہ پانچ اضلاع کی پولیس اُن کو تلاش کرتے کرتے عاجز ی۔ مگر ان کا سراغ کہیں نہ ملا۔ یورپ میں جیسے جیسے جنگ نے زور پکڑا اور برطانیہ کمزور پڑتا گیا۔ ہندوستا پولیس کی سرگرمیوں میں تیزی آگئی۔ بنگال میں ریحان الدین احمد اور ان کے ساتھیوں کی تلاش بھی تندہی ے جاری رہی۔ مگر وہ سب شاید فضا میں تحلیل ہو چکے تھے۔

لیکن جنگ کے خلاف اور خانہ جنگی کے پرچار میں ان کا لٹریچر اسی طرح خفیہ ٹھکانوں سے چھپتا ر تقسیم ہوتا رہا۔

۱۰

ویشنو بیراگی

کلپ ترو دیپالا کا وہ درخت ہے جو سمندر منتھن سے نکلا تھا اور اس کے پھولوں میں اپنی ضی کے مطابق کوئی سی بھی خوشبو سونگھی جا سکتی تھی اور جو ہر خواہش پوری کر دیتا تھا۔

شانتی نکیتن میں برہمو مندر کے پاس ایک پرانا برگد کھڑا ہے۔ دیپالی سرکار اسے اپنا کلپ ترو سمجھتی ہے۔ کیونکہ ایک روز اس درخت نے بڑے انوکھے اور غیر متوقع انداز میں اس کی ایک خواہش پوری کر دی۔

ایسٹرن ریلوے کی صاحب گنج لوپ لائن پر کلکتے سے سو میل کے فاصلے پر سنتھال پرگنہ کے نزدیک بولپور ایک جگہ کا نام ہے۔ بولپور آج سے سو برس پہلے اپنے ڈاکوؤں کے لئے مشہور تھا۔ کیونکہ س علاقے کی کنکریلی زمین میں کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور یہاں کے باشندے ڈاکے ڈال کر اپنا پیٹ لتے تھے۔ وہ چھری، جس سے یہ ڈاکو مسافروں کا گلا کاٹتے تھے بول کہلاتی تھی۔ اور اسی وجہ سے اس ویرانہ نام بولپور پڑ گیا تھا۔

ہمالیہ پر شانتی کی تلاش سے ناکام لوٹنے کے بعد ایک مرتبہ مہارشی دیویندر ناتھ ٹیگور زمیندار سنہا سے

ملنے پالکی میں بیٹھے رائے پور جا رہے تھے۔ جب بولپور کا یہ سنسان بیہڑ راستے میں پڑا۔ اس میدان میں مہارشی کو ایک بڑا سایہ دار درخت نظر آیا۔ انہوں نے پالکی وہیں رکوالی اور درخت کی چھاؤں میں قالین بچھا کر مراقبہ میں مصروف ہو گئے۔ وہاں انہوں نے "یو دیو و گر دیو پسُو و شوم بھون مادیویشیھ یہ اوشدھی شُو یو دو نسپتی شُو تسمیٔ دیوا یہ نمو نماہ" والی ویدک حمد دہرائی اور مہارشی کو اس درخت کے نیچے وہ شانتی مل گئی، جس کی کھوج میں وہ سارے ہندوستان میں گھومے تھے۔

انہوں نے رائے پور جا کر زمیندار سنہا سے یہ علاقہ خرید لیا۔ درخت اور باغ لگوائے۔ ڈاکوؤں نے ڈاکہ ڈالنے سے توبہ کی۔ اور ۱۸۶۳ء میں مہارشی نے اپنی آرام و آسائش کی زندگی تیاگ کر یہاں شانتی نکیتن آشرم قائم کیا۔ شانتی نکیتن ولا تعمیر کروائی اور یہاں رہنے لگے۔ برگد کے اس درخت کے نیچے انہوں نے ایک مرمریں معبد بنوا کر اس کے پھاٹک پر لکھوایا۔

آمار پرانیر آرام
مونیر آنند
آتمار شانتی

اس درخت کے نیچے مہارشی کو خدا مل گیا تھا۔

آج یہ شانتی نکیتن ہند قدیم کی جنگل کی درسگاہوں کی طرز پر بنے ہوئے دار العلوم وشوا بھارتی انٹرنیشنل یونیورسٹی کے نام سے دنیا میں مشہور ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے گاندھی اور واردھا آشرم، نہرو اور آنند بھون اور ٹیگور اور شانتی نکیتن والے ہندوستانی کو قومی جدوجہد کے ایک انتہائی نازک موڑ پر لا کھڑا کیا ہے اور گو شانتی نکیتن کی فضا میں ہمیشہ کی طرح پُر سکون اور نغمہ بار ہیں۔ اور گرو دیو ابھی زندہ ہیں۔ اور ڈاکٹر نندلال بوس اور اپندر ناتھ ٹیگور اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے دوسرے عظیم مصوّر کلا بھون میں موجود ہیں۔ مگر بیرونی دنیا کے معاملات تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں۔

آمار پرانیر آرام
مونیر آنند
آتمار شانتی

ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء کی ایک شام شانتی نکیتن کی ایک نئی طالب علم تھرڈ ایئر کی دیپالی سرکار برگد یچے بیٹھی مرمریں پھاٹک پر منقش اِن سحر انگیز الفاظ پر نظر ڈال کر سوچ رہی تھی۔ کمال ہے یہاں شم ں آسانی سے یہ سب کچھ حاصل ہو گیا تھا۔ مگر مہارشی کبھی بیس برس کے بھی تو رہے ہوں گے۔

اپنی نوٹ بک بند کر کے وہ برگد کے پتوں کی ناؤ بناتے بناتے سوچنے لگی۔ کلپ ترو از زندگی پتے گرتے جا رہے ہیں۔

”الکھ نرنجن۔۔۔!“ دور سے آواز آئی۔ اُس نے چونک کر جنگل کی طرف دیکھا۔ دور ایک ڑی پر چند وشنو بیراگی نعرہ لگاتے تیز تیز چلے جا رہے تھے۔

اور دیپالی کو یاد آیا کہ یہ بیر بھوم ہے۔ چنڈی داس کی سرزمین۔ اس نے جھک کر سرخ مٹی پر لکھ دیا۔ چنڈی داس کی سرزمین۔

وہ کتابیں سمیٹ کر ہوسٹل واپس جانے کے ارادے سے اٹھنے لگی کہ اچانک سامنے پگڈنڈی پہ کھڑکھڑائے۔ اس نے نظریں اٹھا کے دیکھا۔ ایک لمبی سیاہ داڑھی اور سیاہ زلفوں والا وشنو سنیاسی ں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور سنیاسی کو پرنام کیا۔ تب اُس نوجوان بیراگی نے بڑی تگی سے کہا۔ ”دیپالی۔ ہم یہاں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جائیں؟ ہمیں لگتا ہے تمہیں روحانیات کے ں کی اشد ضرورت ہے:“

دیپالی کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ پھر اس نے لے میں سے سیگرٹ نکال کر جلایا مگر فوراً ہی بجھا دیا۔

”بچے۔۔۔ ہم تجھ سے بہت زیادہ خوش ہیں۔ تو نے ہماری بہت سیوا کی ہے۔ اور ہم تیری بہادری کے ت قائل ہو گئے ہیں۔ تو واقعی کمال کی لڑکی ہے۔“

دیپالی نے بھویں جوڑ کر کہا: ”آپ۔۔۔؟“

”ہاں بٹیا!“

دیپالی سراسیمہ ہو گئی۔ ”آپ کو اس قدر ریک لیس نہ ہونا چاہئے۔ اب میں کسی کی آیا وایا بننے نہیں ں گی۔“

”ریک لیس۔۔۔؟ یہ شانتی نکیتن تو اپنا پرانا اڈہ ہے بچے۔“

برگد کے نزدیک مرمریں عبادت گاہ میں کسی نے چراغ جلا دیا۔ پھر قدموں کی چاپ دور ہوگئی۔

"تو پوجا پاٹ نہیں کرتی بٹیا ۔؟"

دیپالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سنیاسی نے پھاٹک پر لکھے ہوئے الفاظ پر نظر ڈالی اور انہیں آہستہ سے دہرایا۔ پھر وہ بھی کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ اب شام کا اندھیرا گہرا ہوگیا تھا۔

"آپ ۔۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں اس وقت یہاں مل جاؤں گی؟" چند لمحوں بعد دیپالی سر اٹھا کر اس سے پوچھا۔

وہ اپنے خیالوں سے چونکا اور دفعتاً ہنس پڑا۔ "اپنے علم کے زور سے ۔۔!" پھر کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔ "ہمیں تیرے متعلق سب معلوم رہتا ہے۔ بچہ۔ ہم جانتے ہیں کہ تو روز شام کو یہاں بیٹھ کر ہوم ورک کرتی ہے۔"

"تو بتلایئے اب میرے لئے کیا کام ہے۔" دیپالی نے ذرا درشتی سے کہا۔

"کیا ہم کسی کام کے بغیر تجھ سے نہیں مل سکتے ۔؟"

سنیاسی نے اطمینان سے جواب دیا اور چبوترے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا رہا۔ اندھیرے میں اُس کی شکل صاف نظر آرہی تھی۔

ہوا کے ایک جھونکے نے شرائن میں لگے ایک درخت کے سُرخ پھول چبوترے پر بکھیر دیئے۔ بہت دور پرسال کے درختوں کے ایونیو میں گرودیو کسی سے باتیں کرتے ہوئے گذر رہے تھے۔

"گرودیو جا رہے ہیں۔" سنیاسی نے اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ دیپالی بھی چبوترے پر سے اُٹھی۔ گرودیو اندھیرے میں غائب ہوگئے۔

دفعتاً دیپالی کو محسوس ہوا کہ یہ شام منفرد ہے۔ پھر کبھی واپس نہ آئے گی۔

سنیاسی نے جھولے میں سے نکال کر گھڑی دیکھی اور پہلی دفعہ سنجیدگی سے کہا۔ "شوکتی[۵]، تو میر ایک کام بتا ہی دیں۔"

دیپالی نے تیوری پر بل ڈال کر اسے دیکھا۔ "میرا نام دیپالی ہے۔"

"ہاں، لیکن تم میری شوکتی ہو۔ دیپالی۔ میں تمہیں شکتی ہی پکاروں گا۔ چلو جلدی سے ایک اور کا

---

[۵] شکتی

ردو تھوڑا سا۔"

دیپالی گم سم کھڑی رہ گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "کہیئے۔" اُس نے پھاٹک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمیں کہیں سے سگرٹ لادو۔ ہمارے پاس یہی ایک سگرٹ بچا ہے اور بہت دور جانا ہے۔"

"بہت اچھا۔ لیکن آپ محض سگریٹ لینے ___"

"ہم نے کہا تو ہم تمہیں درشن دینے آئے تھے بچہ۔"

"سگریٹ کے علاوہ اور کچھ تو نہیں چاہئے؟" دیپالی نے فکرمندی سے دریافت کیا۔ اور سنیاسی کے سنجیدہ لہجے سے بے حد گھبرائی۔

"فی الحال نہیں۔" وہ پھر چبوترے کے کنارے پر ٹک گیا! اور بڑی گمبھیر آواز میں کہنے لگا۔ "دیپالی۔ میں اس لئے آیا تھا کہ میں تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اب تک تم میرے لئے محض ایک اور رابطہ محض ایک اور نام رہی ہو۔ یا دھندلکے میں سنی ہوئی ایک اور آواز۔ تمہارے گھر پر بھی ___"

"میں آپ کا سگریٹ لے آؤں۔" دیپالی نے گھبرا کر اس کی بات کاٹی۔

"ہم سے ڈرو مت بچہ۔ ہم ایک بہت شریف سادھو ہیں۔"

دیپالی ہنس پڑی اور یک لخت اسے اُمارائے کی ڈانٹ یاد آئی۔ اسکول گرل گگلز ___ اور اُمارائے کے خیال نے اسے اچانک بے حد دل گرفتہ اور پریشان کر دیا۔

"تمہارے صاحب اور میم صاحب کیسے ہیں؟"

"اُن کا تبادلہ ہو گیا۔ ان کی جگہ چارلس بارلو آئے ہیں۔ ریورنڈ بنرجی کے ان سے بھی بہت اچھے تعلقات ہیں۔ کیونکہ مسٹر بارلو کی بڑی بہن باریسال میں مشنری ہیں۔ چاٹگام سے تبدیل ہو کر آئے ہیں۔"

"روزی خیریت سے ہے؟"

"جی۔"

"کسی کو اس کے متعلق کوئی شبہ تو نہیں ہوا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"اسے خط لکھ کر پوچھو کہ چارلس بارلو کھلنا کس روز پہنچ رہا ہے۔ چارلس بارلو کے نام کا کوڈ یاد

ہے۔؟" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"جی ہاں۔"

"بتاؤ تو۔"

دیپالی نے بتلایا۔

"ونڈرفل۔" سنیاسی نے خوش ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر گھبرا کر جلدی سے ہٹا لیا۔

"اُدما سے کب سے نہیں ملیں؟" سنیاسی نے دیپالی کا رنگ بدلتے نہیں دیکھا۔ اس نے اُدما کا نام جس انداز سے لیا تھا۔

"آپ لوگوں کے غائب ہونے کے دوسرے ہفتے ہی تو وہ کلکتہ چلی گئی تھیں۔ ابھی تک وہیں ہیں۔ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں بابا کے ساتھ کلکتہ گئی تھی۔ گانے ریکارڈ کروانے۔ مگر اُدما دی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ اور انہوں نے مجھے کوئی خط پتّر کبھی بھیجا نہیں ــــ وہ کلکتے میں کسی کالج میں پڑھا رہی ہیں۔ اپنے بھائی کے ساتھ بالی گنج میں رہتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ چونکہ پارٹی کی باقاعدہ ممبر نہیں اس لئے نہ انڈرگراؤنڈ میں گئیں نہ جیل۔ ٹھیک ہے نا؟ اور سنا ہے کہ ان کے ڈی آئی جی ماموں نے گورنمنٹ کو ضمانت دی ہے کہ وہ گڑبڑ نہیں کریں گی۔ آپ کو تو یہ سب معلوم ہی ہو گا۔"

"ہاں۔ معلوم ہے ــــ" پھر اس نے ذرا توقف سے کہا۔ اچھا جاؤ۔ بھاگو۔ سگریٹ لے کر آؤ۔ جو بھی ملیں۔"

"آپ اس راستے پر جائیے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

"اچھا ــ" سنیاسی چلنے لگا۔ پھر ٹھٹھک گیا۔ "ایک بات اور۔ کینٹ ویل تازہ وارد اور ناتجربہ کار نوجوان تھا۔ بارلو پرانا گھاگ ہے۔ اس کے باپ دادا تک بنگال سویلین تھے۔ اس چیز کا تم لوگ خیال رکھنا۔ بڑا سخت گیر افسر ہے۔ ٹررسٹ تحریک کے زمانے میں کئی نوجوانوں کو پھانسی کے تختے پر بھجوا چکا ہے۔"

دیپالی کو کپکپی سی آئی۔ سنیاسی کہتا رہا۔ "روزی سے کہنا بیحد احتیاط سے کام لے کر ہمیں اطلاعات پہنچوائے اور اپنے باپ کو کسی طرح ناراض یا ناخوش نہ کرے۔ یہ بیحد ضروری ہے۔"

"بہت اچھا۔" دیپالی نے جواب دیا۔ سنیاسی پگڈنڈی پر آگے بڑھ گیا۔ دیپالی بھاگتی ہوئی ں کی طرف چلی گئی۔

چند منٹ بعد وہ واپس آئی اور برگد کے سنسان چبوترے پر ایک نظر ڈال کر سنتال کے یونیو رنا شروع کر دیا۔ سنیاسی سر جھکائے آہستہ آہستہ کلا بھون کے سامنے والی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ ں نے پھولی ہوئی سانس سے اس کے قریب جا کر کہا۔ "لیجئے۔"

سنیاسی نے پلٹ کر دیکھا۔ "اوہ تھینکس۔!" اس نے بڑی خوشی سے سگرٹوں کے پیکٹ جھولے میں گرا دیئے اور مسکرایا۔

اب چاند طلوع ہو رہا تھا۔

بہت دور سے "الکھ نرنجن" کی آواز آئی۔ سڑک کے کنارے سمندر کے سُریلے شور کی مانند بہار ولایتی جھاؤ کی نازک ڈالیاں ہوا میں سرسرا رہی تھیں شیشم کے جھنڈ کے پرے طلباء کے جھونپڑوں شنیاں جھلملائیں

دیپالی سر جھکا کر سڑک کو دیکھنے لگی۔ مٹی میں کانچ کی سرخ چوڑیوں کے چند ٹکڑے چمک رہے اس نے انگوٹھے کی نوک سے ایک ٹکڑے کو چھوا اور ایک قدم پیچھے ہٹی۔ باڑ پر پھیلی بیل پر سے ایک اچھل کر پتّوں کے اندر چلا گیا۔ دوسری سدن میں چند لڑکیوں نے گانا شروع کر دیا تھا۔ سنتالی ڈاکے ئی گوڑ ڈاکے آئی آئی ———

"یہاں اونل کمار داس تم سے رابطہ رکھے گا۔" سنیاسی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

"بہت اچھا۔"

"سنتھال پرگنہ سنیاس لینے کے لئے آئیڈیل جگہ ہے۔ مگر ہم یہاں سے بھی ڈیرا ڈنڈا اٹھا کر لر گئے ہیں۔ اگر ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت پڑی تو تیار رہنا۔ شوکتی۔"

"بہت اچھا۔"

قریب سے چند سنتھالی عورتیں سر پر ٹوکرے اٹھائے گزر گئیں۔ ان کے پیچھے طلباء کی ایک ٹولی ٹہلتی آ رہی تھی۔

"اچھا۔ جیتی رہو۔ خوش رہو۔ ہم جاتے ہیں۔" سنیاسی نے متانت سے اسے آشیرواد دی اور تیزی

سے آگے بڑھ گیا۔

دیپالی اُسے چاندنی کے خنک دھندلکے میں غائب ہوتے دیکھتی رہی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ واپس ہوئی۔ برگد کا چبوترہ اب بھی سنسان پڑا تھا — آج شام — آج شام میں سوچ رہی تھی کہ کاش — اُس نے ایک پتّہ اٹھا کر ناک سے چھوا۔ اور اپنے آپ سے کہا۔ کلپ ترد!

پھر اس نے درختوں کے اس جھنڈ کا چکر لگایا۔ برہمو معبد میں چراغ سکون سے جل رہا تھا۔

آمار پرانیر آرام
مونیر آنند
آتمار شانتی

اس نے چپکے سے دل میں دُہرایا۔ اور دل ہی دل میں مسکراتی مسز روزی بنرجی کو خط لکھنے کے ارادے سے اپنے کمرے کی سمت روانہ ہو گئی۔

۱۱

للی کاٹیج

للی کاٹیج میں سہ پہر کی چائے کے انتظامات بڑے زوروں پر کیے جا رہے تھے۔ الیستھر بنرجی کیک پر سفید اور گلابی آئسنگ کر رہی تھیں۔ ڈیزی آیا سینڈوچ بنانے میں مشغول تھی۔ گلدانوں میں تازہ پھول لگے تھے۔ سٹنگ روم میں کراس اسٹیچ کی نفیس کڑھت کے دھلے ہوئے ٹیبل کلاتھ میزوں پر پڑے تھے۔ چائے کا نیا سیٹ سلہٹ کی بید کی کشتی میں سجا وسطی میز پر رکھا تھا اور اس پر ہری کانچ کے موتیوں کی جھالر والی بڑی جالی ڈھانپ دی گئی تھی۔ ٹی کوزی اور کُشنوں کی کشیدہ کاری قابلِ دید تھی۔

پادری بنرجی سیاہ سوٹ پہنے ذرا متفکر سے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ اور بار بار واسکٹ کی جیب سے زنجیر والی گھڑی نکال کر دیکھ لیتے تھے۔

روزی اپنے کمرے میں دروازے بند کیے چٹخنیاں لگائے قلعہ بند بیٹھی تھی

ٹھیک چار بجے گھوڑا گاڑی سامنے آن کر رُکی اور پادری ہنری لبواس، مسز میری لبواس، اُن کا فرزند

مسٹر لوتھر لبواس اور چھوٹی لڑکی ایڈتھ لبواس نیچے اُترے۔ ایڈتھ لبواس نے ایک اٹیچی کیس اٹھا رکھا تھا۔

ایستھر بنرجی لپکی ہوئی باہر آئیں۔ اور دونوں میاں بیوی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور سٹنگ روم میں لے کر آئے۔ لبواس خاندان ذرا سیلف کانشس سا ہو کر کرسیوں پر ٹکا۔ پادری اور مسز لبواس اور مسٹر لوتھر لبواس صوفے پر ایک قطار میں اس طرح سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ جیسے پہلے زمانے میں لوگ تصویر کھنچوانے کے لئے فوٹو گرافر کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ایڈتھ البتہ اطمینان سے گراموفون کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

مسز لبواس نے ناقدانہ نظروں سے کمرے پر نظر ڈالی جو گھر کی عزت، مگر سلیقہ کا آئینہ دار تھا۔ دونوں کالے پادریوں نے آپس میں اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں۔

"یہ کُشن میری روزی نے کاڑھے ہیں —" ایستھر بنرجی نے مسز لبواس کو صوفے کے کشنوں کا دزدیدہ نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے دیکھ کر فوراً کہا

مسز لبواس اخلاقاً مسکرائیں۔ انہوں نے یہ بھی نوٹس لیا کہ ایستھر بنرجی گلے میں ایک بید پتلی سنہری زنجیر کے علاوہ سونے کا ایک بھی زیور نہیں پہنتے ہیں۔ اور سرخ کنارے والی سفید بنگالی ساڑھی میں ایک جگہ پر باریک کھونپ بھی بھری گئی ہے۔ خود مسز لبواس کروشیا کی چوڑی لیس والے سفید پیٹی کوٹ کے اوپر تیز گلابی جارجٹ کی ساری باندھ کر اور سیاہ ساٹن کا بلاؤز پہن کر آئی تھیں اور سونے کی چوڑیاں ان کے ہاتھوں میں چمچا رہی تھیں شبنک سا رومال ایک آستین میں گھرس رکھا تھا۔ کانوں میں ایک ایک موتی والے بُندے پہنے تھیں۔ پندرہ سالہ ایڈتھ اودے ریشمی فراک میں ملبوس تھی۔ سفید موزے، کالے جوتے بن بیاہی دیسی عیسائی شریف زادیوں کی مانند فراک پر دوپٹہ بھی اوڑھ رکھا تھا۔ پادری لبواس سیدھے سادے آدمی معلوم ہوتے تھے اور ظاہر تھا کہ بیوی ان پر حاوی ہیں۔ لوتھر لبواس ایک منحنی مسکین صورت اور شرمیلا نوجوان تھا۔ دونوں باپ بیٹے پورے سوٹ میں ملبوس تھے۔ پچھلے کرسمس ویک میں آل انڈیا مشنری کانفرنس ختم ہونے کے بعد جب لوتھر لبواس پنجاب واپس گئے تو روزی بنرجی پر عاشق ہو کر واپس گئے تھے۔ وہ لدھیانہ میں مشن اسکول میں سائنس ماسٹر "لگے" ہوئے تھے۔

ایک دو سال بعد سینٹ جانز کالج آگرہ میں لیکچرر ہو کر جانے کا "چانس" بھی تھا۔ انہوں نے لدھیانہ واپس جا کر کچھ عرصے بعد اپنے پاپا ریورنڈ ہنری لبواس کے ذریعے پادری بنرجی کو شادی کا پیغام بھجوایا تھا۔

دیسی عیسائی فرقے میں اچھے لڑکوں کی ہمیشہ سے کمی رہی ہے۔ عیسائی لڑکیاں عموماً اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اسمارٹ ہو جاتی ہیں۔ بیشتر عیسائی لڑکے اسٹینو گرافر یا سیلز مین سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ اس وجہ سے عیسائی لڑکیاں عام طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں سے شادی کر لیتی ہیں۔

چنانچہ جب لوتھر بسواس کا پیغام آیا تو پادری بنرجی خوش ہوئے۔ جب سے روزی بڑی ہوئی تھی انہیں اس کے بیاہ کی فکر نے آگھیرا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی زندگی میں ان کی چہیتی بیٹی اپنے گھر چلی جائے۔ انھوں نے روزی سے تذکرہ کئے بغیر، اپنی بیوی سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد خالص ہندوستانی ماں باپ کی طرح پیغام منظور کر لیا۔ وہ یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ان کی فرماں بردار اور سعادت مند بیٹی کو ان کے انتخاب پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔ پادری بنرجی کی خواہش تھی، روزی کا رشتہ کسی ہم پلّہ برہمن کرسچین خاندان میں ہوتا۔ روزی ماں اور باپ دونوں ہی طرف سے نجیب الطرفین کُلین برہمن زادی تھی۔ مگر آج کل خاندانی لڑکے ملتے کہاں ہیں۔ اور پادری بسواس بھی اچھی ذات کے آدمی تھے (حالانکہ بسواس عموماً شیڈولڈ کاسٹ والوں کا نام بھی ہوتا تھا) اُن کے مشنری باپ دادا بنگال سے جا کر لدھیانے میں سیٹل ہو گئے تھے۔ پادری بسواس کو بنگالی زبان بھی نہیں آتی تھی۔ کیونکہ ان کی ماں پنجابی تھیں۔ خود مسز بسواس بھی پنجابی تھیں اور واقعی اپنے انداز اور وضع قطع سے کچھ چمریشین معلوم ہوتی تھیں۔ مگر بہرحال بہت معقول خاندان تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مشنری کانفرنس کے زمانے میں پادری بنرجی، لڑکے کی عادات و خصائل سے خود واقف ہو چکے تھے۔ لڑکا انہیں پسند آیا تھا۔ شریف، حلیم الطبع اور بیحد مذہبی نوجوان تھا۔ روزی کو بڑے آرام سے رکھے گا۔

پچھلے ہفتے پادری بسواس کا خط آیا تھا کہ وہ اور ان کی بیوی لڑکی کو دیکھنے اور بات پکی کرنے کے لئے ڈھاکہ آ رہے ہیں۔ اور روزی کو جب الیستھر بنرجی نے یہ اطلاع دی تھی تو ایسا لگا تھا، جیسے اس کے اوپر بم کا گولہ آن گرا ہو۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن اس لمحے سے بالکل چُپ سادھ لی تھی۔ (دیپالی اتنی دور شانتی نکیتن میں تھی۔ جس سے وہ اپنا دکھ درد کہہ سکتی۔ جہاں آرا کے پاس وہ اپنا دکھڑا لے کر جانا نہ چاہتی تھی) اس کی اِس خاموشی کو اُس کے والدین نے بچیّوں کی شرم و حیا پر محمول کیا تھا۔ کس لڑکی کو میکے سے اتنی دور کالے کوسوں بیاہے جانے کا غم نہ ہو گا۔

لیکن آج جبکہ بسواس فیملی واقعی آن پہنچی تھی۔ روزی نے بڑا ہی عجیب اور غیر متوقع رویّہ اختیار کر لیا تھا۔ ایک تو وہ ساری رات روتی رہی تھی۔ اور پھر صبح سے اپنا کمرہ اندر سے بند کر کے بیٹھ گئی تھی۔ پادری بسواس مع اپنے

خاندان شہر میں اپنے کسی دور کے رشتے دار کے یہاں اترے تھے۔ اور ٹھیک چار بجے لِلی کاٹیج پہنچ گئے تھے۔ اور ب پادری اور مسز بنرجی کو روزی کے متعلق پہلی بار گھبراہٹ شروع ہوئی۔

ڈیزی چائے دانی لے کر کمرے میں آئی اور الیتھر بنرجی نے رس گلے اور چم چم ملائی جو انہوں نے ود بنا رکھے تھے مہمانوں کو پیش کئے۔ وہ بے چاری ہونے والے داماد کی بے انتہا خاطر کر رہی تھیں اور ابھی سے اُن داس کے بھولے پن اور شرافت پر ممتا بھرا پیار آنے لگا تھا۔ مگر مسز لبواس بڑی خوفناک ساس ثابت وں گی۔ اس کی انھیں پریشانی تھی۔

روزی کا کمرہ ڈائننگ روم کے دوسری طرف تھا اور سٹنگ روم میں سے اس کا بند دروازہ نظر آرہا تھا دری بنرجی مہمانوں سے باتیں کرتے کرتے بے چینی سے اس دروازے پر نظر ڈال لیتے۔ دروازے پر پڑا نیلا پردہ ہوا میں رائے جا رہا تھا۔

"روزی سسٹر کہاں ہیں؟" ایڈتھ لبواس نے نزاکت سے سینڈوچ اٹھا کر "تھینک یو آنٹی" کہنے کے سز بنرجی سے دریافت کیا۔

"ابھی آتی ہے — ذرا اس کی طبیعت —" الیتھر بنرجی نے یک لخت ذرا ہکلا کر بے بسی سے اپنے ہر کو دیکھا۔

"کیا ہوا اُسے —؟" مسز لبواس نے ابرو اٹھا کر سوال کیا۔

"کچھ نہیں بہن۔ دن رات پڑھائی میں لگی رہتی ہے۔ آج صبح سے سر میں درد ہے۔"

پادری بنرجی نے فوراً پادری لبواس کو مخاطب کیا۔

"لدھیانے میں مہنگائی کا کیا حال ہے؟ یہاں تو وار کی وجہ سے —"

لوتھر لبواس نے ٹائی ٹھیک کرتے ہوئے سر گھما کر دزدیدہ نظروں سے نیلے پردے والے دروازے کھا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ روزی کا کمرہ ہے۔ اور مشنری کانفرنس کے دنوں میں روزی نے اسی سٹنگ یں بیٹھ کر ان کے ساتھ کیرم بھی کھیلا تھا۔ اور کیرم کے پاؤڈر کا ڈبہ لانے کے لئے وہ اس کمرے میں بھی ہو تھے۔

"او۔ آنٹی — میں یہ ریکارڈ دیکھ سکتی ہوں؟" ایڈتھ نے چائے کی پیالی ختم کر کے گراموفون کی طرف مڑتے ئے کہا۔

"ضرور ضرور ۔" مسز بنرجی نے کہا۔ وہ بے ساختہ یہ بھی اضافہ کرنا چاہتی تھیں کہ روزی کو میوزک کا بہت شوق ہے۔ مگر وہ چپ ہو گئیں۔ ایڈتھ فرش پر اکڑوں بیٹھ کر میز کے نچلے خانے میں رکھے ہوئے ریکارڈ الٹنے پلٹنے لگی۔ زیادہ تر وہ گھسے پٹے پرانے ریکارڈ تھے۔ جو ایک مرتبہ ڈھاکہ کے ایک انگریز افسر نے ولایت جاتے وقت مشن کمپاؤنڈ بھجوا دیئے تھے۔

ڈیزی نے جا کر روزی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب نہیں ملا۔

اب چھ بجنے والے تھے۔ مسز بنرجی اٹھیں ـــــــــ ڈائننگ روم اور سٹنگ روم کا درمیا دروازہ بھیڑا اور جا کر روزی کے دروازے پر زور سے دستک دی۔ "روزی ۔ روزی بیٹے ـــ بات تو سنو۔" وہ اب روہانسی ہو رہی تھیں ۔

مسز بنرجی چند منٹ تک دروازے پر کھڑی رہیں۔ پھر سر جھکائے سٹنگ روم میں واپس آگئیں اور شوہر کو ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا۔ پادری بنرجی آہستہ سے اُٹھے اور اپنے پیچھے سٹنگ روم کے کواڑ بند کرتے ہوئے روز کے دروازے پر پہنچے اور دھیرے سے دستک دی ۔

"روزی ۔ روزی بیٹا ـــ دروازہ کھولو ۔ میں تمہارا پاپا ہوں ۔ بات تو سنو ۔" انہوں نے بیحد لجاجت سے لیا ۔ روزی نے دروازہ کھولا ۔ پادری بنرجی اندر آ گئے ۔

روزی کندھوں پر بال بکھرائے سفید ساری پہنے تصویر کی مانند سامنے چپ کھڑی تھی ۔ اچانک اُ کی آنکھوں کے سامنے ایک اور تصویر آگئی ۔ بالکل اسی طرح انہوں نے پہلی بار نوجوان ایستھر گری بالا کو دیکھا تھا ۔ ج کندھوں پر لمبے لمبے بال بکھرائے سفید ساری پہنے رائٹ ریورنڈ والفرڈ براؤن کی کوٹھی کے برآمدے میں خاموش کھڑی تھی، جب وہ اس سے ملنے کے لئے بلائے گئے تھے ۔ اُس ایستھر اور اس روزی میں اتنا فرق کیوں ؟ کیا زما اتنا بدل گیا تھا ؟ اُس ایستھر کی آنکھوں میں محض لاج تھی اور سپردگی ۔ اِس روزی کی آنکھوں سے ضد اور اور خود سری کی چنگاریاں سی نکل رہی تھیں ۔ اس خود سری کو آج کل کے زمانے میں خود اعتمادی کہا جاتا مگر وہ تو اپنی لاڈلی بچی کی بھلائی ہی تو چاہتے ہیں ۔ وہ اپنے بوڑھے باپ سے اس قدر خفا کیوں ہو گئی ۔؟

یک بیک روزی آگے بڑھی اور اُن کی ٹانگوں سے لپٹ کر کہنے لگی ۔ "پاپا ـــ پاپا ـــ مجھے کر دریا میں ڈبو دیجئے ۔ مجھے مار ڈالئے جان سے ۔ مگر میں اس چندر سے ـــ اس ـــ اس کالٹین سے ہرگز نہیں کروں گی ۔ مجھے وہ بالکل پسند نہیں ہے پاپا ـــ" اب وہ سسکیوں سے رو رہی تھی ۔

کالیٹین ۔۔۔ ؟ پادری بنرجی ہکا بکا رہ گئے۔ " روزی بیٹیا ۔۔۔" انھوں نے ہڑبڑا کر کہا۔ " میری
ے کا تو خیال کرو۔ میری بچی۔ لوتھر بڑا اچھا لڑکا ۔۔۔ "

" نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ " روزی نے بچوں کی طرح مچل کر روتے ہوئے ان کی بات کاٹی۔

" پھر کیا کرے گی ۔۔۔ احمق ۔" پادری بنرجی کو ایک دم غصہ آ گیا۔ " کسی ہندو سے شادی کرے
؟ یہ ارادہ ہے تیرا۔ ؟ مسلمان سے بیاہ رچائے گی ؟ اپنی ماں کا حشر بھول گئی۔ بدبخت ۔ ؟" انہوں نے
ج کر کہا اور ان کو بالکل خیال نہ رہا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے اور سٹنگ روم تک آواز جا رہی ہے۔ انہیں
پرسکون زندگی میں ایسا قیامت خیز وقت بھی دیکھنا پڑا۔ اور اپنی اولاد کے ہاتھوں۔ خداوند۔ میں نے
ا کیا گناہ کیا تھا۔ خداوند ۔ ؟

پادری بنرجی کو پتہ بھی نہ چلا کہ مسز میری بسواس پیچھے آن کھڑی ہو گئی ہیں۔ اور باپ بیٹی کا سارا مکالمہ
چکی ہیں۔ ایستھر بنرجی سہمی ہوئی ان کے عقب میں کھڑی تھیں۔ مسز بسواس کو دیکھ کر روزی فرش سے اٹھی اور
ی طرح غسل خانے میں گھس کر دروازہ زور سے بند کر لیا۔ پادری بنرجی نے مڑ کر مسز بسواس کو دیکھا اور سکتے
عالم میں کھڑے رہ گئے۔

چند لمحوں تک مکمل سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد مسز بسواس نے زہر میں بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ " اچھا
م کالیٹین ہیں ۔۔۔ ہنری ۔" انہوں نے سٹنگ روم کی طرف مارچ کرتے ہوئے للکارا۔ " ہم اپنی انسلٹ
لنے لدھیانے سے آئے تھے۔ چلو اٹھو ۔"

ایستھر بنرجی روتی ہوئی ان کے پیچھے لپکیں۔ سٹنگ روم میں آ کر انھوں نے کہا۔ " بہن خدا باپ کے
ہمیں معاف کر دیجئے۔ روزی بڑی ضدی لڑکی ہے۔ آج کل کی اولاد ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ
ب سے کیا کہوں ۔"

اس دوران میں پادری ہنری بسواس اور مسٹر لوتھر بسواس "صُمٌ بکمٌ" کھڑے باقی لوگوں کو تک رہے
مسز بسواس بلاؤز کی آستین میں سے رومال نکال کر ناک سنکتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اور شعلہ بار
ہوں سے میزبان خاتون کو گھورا۔ پادری بنرجی اس اثنا میں سٹنگ روم سے گزرتے ہوئے جا کر برآمدے
ایک در میں کھڑے ہو گئے تھے اور سر جھکا کر فرش کو دیکھ رہے تھے۔

اب مسز بسواس نے رومال آنکھوں پر رکھ لیا اور آنسو بہانے پر آمادہ ہوئیں۔

"چلو ڈیر ـــ واپس چلیں ـــ" پادری بسواس نے آگے بڑھ کر نرمی سے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مسز بسواس نے غصّہ سے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور چلاّتے ہوئے بولیں ـ "ہم امیر لوگ نہیں ہیں۔ لدھیانے سے چل کر راجکماری کو دیکھنے آئے۔ آپ نے خود بلایا تھا۔ چار آدمیوں کا انٹر کلاس کا کرایہ ـــ"

"اوہ شٹ اَپ مائی ڈیر ـــ" پادری بسواس نے کوفت کے ساتھ کہا۔ لوتھر بسواس چھت کو تک رہا تھا۔

"چار آدمیوں کا انٹر کلاس کا کرایہ۔ لدھیانے سے ڈھاکے ـــ ہم امیر نہیں ہیں۔ آپ کی طرح چرچ فنڈ کا روپیہ نہیں کھاتے۔"

"اوہ کیپ کوائٹ ماما ـــ" لوتھر بسواس نے انتہائی خفت اور جھنجلاہٹ کے ساتھ وال کو خاموش کرنا چاہا۔

"تم چپ رہو جی ـــ میں ان سے مسز بنرجی سے بات کر رہی ہوں۔ آپ نے ہمیں خط لکھا۔ آ نے مسز برکت مسیح کے ذریعے ہمیں کہلوایا کہ آ کر لڑکی دیکھ جاؤ۔"

"اوشٹ اَپ ـــ ماما ـــ پلیز ـــ" لوتھر بسواس نے پسینہ پسینہ ہوتے ہوئے دوبارہ استد کی ـــ۔

"یو شٹ اَپ ایڈیٹ ـــ ڈیم فول ـ" مسز بسواس اب ہسٹریکل ہونے والی تھیں۔ اُد ایڈتھ نے "اِٹ واز اِن دی آئیل آف کیپری دیٹ آئی فاؤنڈ ہر ـ" کا دقیانوسی ریکارڈ گراموفو پر لگا رکھا تھا۔ جو ریں ریں کیے جا رہا تھا۔ لوتھر بسواس نے اٹھ کر غصّے کے ساتھ ریکارڈ پر سے سوئی ہٹا دی اور بہن کو گھور کر دیکھتا ہوا کرسی پر آن بیٹھا۔

"ہم نے انکوائری کی ـــ" مسز بسواس کہے گئیں۔ "میں نے ڈھاکے اپنی سسٹر اِن لا کو۔ ہنری کے کزن برادر کی وائف کو خط لکھا کہ لڑکی کے حالات معلوم کرو۔ انہوں نے ہم کو لیٹر لکھا۔ می ہنری کو بولا۔ میں نے بولا۔ مارجری سسٹر نے لکھا ہے لڑکی کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ لڑکی کے ہندو فرینڈز ہیں۔ لڑکی کانگریسی اور کمیونسٹ ہو گئی ہے۔"

"اوہ ماما ـ پلیز ـ"

"مگر یہ گدھے کا بچہ — مس صاحب پر لٹو ہو چکا تھا — کیا آگرہ۔ کیا سیالکوٹ۔ کیا لاہور۔ ہر جگہ سے اس کے لئے رشتے آرہے ہیں۔ مسٹر ایڈورڈ منور خاں تو ڈپٹی کلکٹر ہیں میرٹھ میں۔ اُن کی لڑکی آئی۔ ٹی میں پڑھ رہی ہے۔ اس تک کی بات آئی تھی۔ ایسا میرا ہیرا بیٹا ہے۔ آپ کی لڑکی میں ہے کیا — ذرا سُنوں تو — ؟"

پادری بنرجی کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے برآمدے میں کھڑے رہے۔ ایک دم اُن کی کمر جھک سی گئی تھی۔

مسز بسواس کی تقریر جاری رہی — "ہم تو اس گدھے کے بچے کی ضد پوری کرنے اتنی دور چلے آئے۔ ہے کیا آپ کے پاس۔ یہ فقط گھر — میرا بیٹا تو سینٹ جانز کالج میں لیکچرر ہونے والا ہے۔ ایس۔ سی پاس ہے۔ کسی خچر پادری مشن اسکول میں نہیں پڑھاتا۔" (حالانکہ وہ خچر پادری مشن اسکول ہی میں پڑھا رہا تھا۔)

"مائی ڈیر" پادری بسواس نے کہنا چاہا۔

"ماما —" ایڈتھ نے آواز نکالی۔

"دیکھوں تو کون سا آئی سی ایس مل جائے گا آپ کی لڑکی کو، جو ان کے لچھن ہیں ڈھا کے آکر سُن لئے۔"

"میری — کیوں اپنی جیبھ خراب کرتی ہو —" پادری بسواس نے پھر احتجاج کیا۔

"بڑا لِلی کاٹیج کا شہرہ سنا تھا۔ دیکھ لی آکر لِلی کاٹیج — میں تو اپنے گھر میں ایک دن بھی ایسا سڑا ہوا فرنیچر نہ رکھوں اور بھئی ہم کوئی دیسی پادری کی تنخواہ پر گزر تھوڑے ہی کر سکتے ہیں۔ ہماری تو گھر کی زمینداری بھی ہے۔ خدا باپ کا ہر طرح سے فضل ہے۔ مس صاحبہ اگر آئیں ہمارے ہاں نصیبہ کھل جاتا۔ رانی بن کر رہتیں۔" مسز بسواس یہ بالکل بھول گئیں کہ صرف چند منٹ قبل انہوں نے اپنی غربت کا شکوہ کیا تھا۔ مگر اب پھر انہیں اپنا مالی نقصان یاد آگیا۔ اور انھوں نے چِلّا کر کہا۔ "پانچ سو روپیہ خرچ ہو گیا ہمارا۔" اتنے میں لوتھر بسواس جلدی سے باہر جا کر گھوڑا گاڑی لے آیا تھا۔ اس نے اندر آکر پہلی بار غصّے سے بات کی۔

"ماما — کم آن — ڈونٹ کری ایٹ اے سین۔ بی ہیو یور سیلف پلیز — اب بس کرو۔"

اپنی ماما کا ہاتھ پکڑ کر انھیں تقریباً کھینچتا ہوا وہ باہر لے گیا اور گاڑی میں بٹھال دیا۔ پادری بنرجی بسواس

سر جھکائے ان کے پیچھے پیچھے باہر آئے۔ ایڈتھ بسواس نے میز پر سے اٹیچی کیس اٹھایا، جس میں سنہری بیل لگی ریشمی ساری اور منگنی کی انگوٹھی مقفل تھی۔ باہر آ کر وہ اچک کے گاڑی میں سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پادری بسواس واپس پلٹے اور برآمدے کے در میں کھڑے پادری بنرجی سے ہاتھ ملایا۔ "سوری ریورنڈ ۔۔ آئی ایم ویری سوری ۔۔ ناٹ یور فالٹ ۔۔" انہوں نے رسان سے کہا۔ پادری بنرجی ہاتھ پیچھے باندھے سر جھکائے خاموش کھڑے رہے۔ البیتھر بنرجی سٹنگ روم کے دروازے سے لگی کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔ لوتھر بھی بچے تلے قدم رکھتا برآمدے کی سیڑھی پہ آیا اور سر خم کر کے کہا۔

"آئی ایم سوری آنٹی۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ مائی مدر ۔۔ گڈ بائی۔"

"گوڈ بلیس یو مائی سن ۔۔" پادری بنرجی نے آہستہ سے جواب دیا۔

لوتھر جلدی سے واپس لوٹا اور گاڑی میں ایڈتھ کے برابر بیٹھ گیا۔ مشن کمپاؤنڈ کے سارے بچے اور عورتیں گاڑی سے ذرا فاصلے پر جمع ہو گئے تھے۔ ڈیزی کے ذریعہ خبر سارے کمپاؤنڈ میں پھیل چکی تھی۔ کل تک ڈھاکے کی ساری نیٹو کرسچین سوسائٹی میں نشر ہو جائے گی۔

گھوڑا گاڑی لِلی کاٹیج کا چکر کاٹ کر پھاٹک کی طرف بڑھی۔ لوتھر بسواس کھڑکی میں سے سر نکال کر تازہ ہوا نتھنوں میں داخل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب گاڑی کمپاؤنڈ سے باہر جانے لگی تو اس نے دیکھا کہ روزی بنرجی لِلی کاٹیج کے پچھواڑے اپنے غسلخانے کی سیڑھیوں پر سنگی مورت کی مانند ساکت بیٹھی ہے۔ لوتھر بسواس نے احمقوں کی طرح ہاتھ اٹھا کر اسے دیو کرنا چاہا۔ مگر ہاتھ مفلوج سا ہو گیا تھا۔ گاڑی چرخ چوں کرتی کچی سڑک پر آ گئی۔

لِلی کاٹیج کے اندر پادری بنرجی اپنے کمرے میں جا کر ایک کونے میں بیٹھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ انہیں روزی کے انکار سے زیادہ اس انکشاف سے دھکا لگا تھا کہ انہیں معلوم بھی نہیں ہوا اور یہ دنیا بدل چکی ہے۔ ہمیشہ کی طرح صابر و شاکر گری بالا بنرجی آنسو خشک کر کے جار کا سامان منگوانے میں مصروف ہو گئیں۔

۱۲

شانتی نکیتن

اپریل ۱۹۴۰ء۔ دیپالی سرکار سری سدن کے سامنے گھاس پر بیٹھی تھرڈ ایر کے آخری پرچے کی تیاری میں مصروف تھی۔ جب ایک لڑکی نے قریب سے گزرتے ہوئے چند لفافے اس کے سامنے گرا دیئے۔ روزانہ جب ڈاک آتی تھی۔ اس کا دل دھڑک اٹھتا تھا۔ اس شام کے بعد سے وہ ایسا غائب ہوا کہ اس کی طرف سے نہ کوئی خط آیا۔ نہ کوئی سندیش۔ نہ کوئی بادل۔ نہ کوئی راج ہنس اور جب انل کمار داس نے چارلس بارلو کے متعلق دریافت کیا تو وہ کچھ نہ بتا سکی۔ کیونکہ روزی بنرجی نے ڈھاکے سے کسی خط کا جواب نہ دیا تھا۔ اس کے لئے اتنا غم، اتنی فکر، اتنی پریشانی سب بیکار ہے نا۔ آج کتنے مہینے گزر گئے۔ ستمبر میں اس شام کو چھ مہینے گذر گئے۔

دیپالی نے پہلا لفافہ کھولا۔ جہاں آرا کا خط تھا۔ درگا پوجا کی چھٹیوں میں جب وہ ڈھاکے گئی۔ جہاں آرا اپنے علاقے پر فریدپور گئی ہوئی تھی۔ روزی کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ پادری صاحب نے اسے چھٹیاں گذارنے اپنی بہن کے پاس لال منیر ہاٹ بھیج دیا ہے۔ اوما دیبی کلکتے میں تھیں۔ دیپالی نے ساری چھٹیاں اپنے بھائیوں کے ساتھ لوڈو کھیلنے میں گزار دی تھیں۔ اب امتحان کے بعد گرمیوں کی تعطیلات شروع ہوں گی۔ اور پھر وہ چندر کنج واپس جائے گی۔ جولائی میں کالج کھلے گا۔ پھر یہاں آجائے گی۔ اگلے سال بی اے کرے گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا ۔۔؟

جہاں آرار نے لکھا تھا:۔

”روزی کا قصہ تو اب خاصا پرانا ہوگیا ۔۔ جب ملو گی تو پوری داستان سناؤں گی۔ مسز بنرجی امی کے پاس آکر رونا رو رہی تھیں۔ روزی تو اس بات کا بالکل ذکر ہی نہیں کرتی۔ لال منیر ہاٹ سے واپس آکر پڑھائی میں مصروف ہو چکی ہے۔ خیر تھرڈ ایر کی ایسی پڑھائی بھی کیا۔ تم لوگ مجھ پر خواہ مخواہ رعب جھاڑتے ہو۔ بڑی آئیں یہ چاریاں بی اے اسٹوڈنٹس ۔۔ اور بھئی ہم نے جو کہا تھا انٹر کے بعد گھر بیٹھے مزے کر رہے ہیں۔ مزے کیا کر رہے ہیں دیپالی، یہ تو بالکل غلط ہے۔ ابا کا حکم کیسے ٹالا جا سکتا ہے۔ ابا اعلیٰ تعلیم کے

حامی نہیں تو پھر الیف اے تک ہی کیوں پڑھایا تھا۔ پچھلے سال مارچ میں جب ابا مسلم لیگ کے اجلاس کے لئے لاہور گئے تھے نا جب پاکستان ریزولیوشن پاس ہوا تھا۔ تو لاہور سے واپسی پر علیگڈھ ہوتے آئے تھے۔ اور آ کر کہنے لگے کہ میں تم کو بی۔ اے کے لئے علی گڑھ بھیج دوں گا۔ مگر اس کے بعد پھر ارادہ بدل دیا۔ جانے ابا کے دل میں تم لئے کیا پروگرام ہے۔ اُن سے کون پوچھ سکتا ہے۔

“مگر روزی نے کمال کر دیا۔ مسٹر لوتھر بسواس بے چارے کو ہری جھنڈی دکھا دی۔ میں نے روزی سے کہا کہ تم ہیں دونوں اپنے اپنے ماحول کے پروردہ ہیں۔ تم بغاوت کر کے کہاں جاؤ گی۔ اور یہ اونچی ذات کے بنگالی کرسچین اگر قدامت پرست ہونے پر آئیں تو ان کا کوئی جواب نہیں۔ کہنے لگی۔ سولیڈرٹی مجھے سہارا دے گی۔ میں نے اپنے آپ کو سولیڈرٹی کے لئے وقف کر دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اور روزی کس قسم کی باتیں کرتی ہو اور کیا کرنے والی ہو۔ اللہ تم لوگوں کی عقلیں ٹھکانے پر رکھے۔

“باقی ڈھاکے کے حالات بدستور ہیں۔ تمہاری اومارائے کلکتہ ہی میں ہیں۔ ایک خبر یہ ہے کہ نیر بھائی کی منگنی ہو گئی۔ وہ شمسہ خالہ نہیں ہیں۔ امی کی پرانی سہیلی۔ جو سگن بگیچے میں رہتی ہیں ان کے جیٹھ کی لڑکی سے۔

“ہاں اس پر یاد آیا کہ شمسہ خالہ کے پڑوس میں جل پائے گوری سے ایک مولوی صاحب آ کر رہے ہیں۔ مولوی عبدالمجید خاں۔ ان کی لڑکی یاسمین میٹرک میں پڑھ رہی ہے تو بیگم عبدالمجید نے خالہ سے کہا کہ یاسمین کی انگریزی کمزور ہے کوئی استانی اس کے لئے لگوا دیں۔ شمسہ خالہ نے مجھ سے ذکر کیا تو مجھے ایک دم روزی کا خیال آیا۔ اور میں نے روزی سے ان کی بات چیت کرا دی۔ یاسمین میرے ہاں آئی تھی۔ خاصی دلچسپ لڑکی ہے۔ مگر مجھے کچھ خبطی سی معلوم ہوتی ہے۔ جب اس کی امی کمرے سے چلی گئیں تو مجھ سے چپکے سے بولی۔ آپا۔ یہ امی اور ابا بے کار مجھے آگے پڑھانے کی فکر میں ہیں۔ میں تو ڈانسر بنوں گی۔ میں بھونچکی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اور میں نے کہا۔ بی بی۔ اتنا قدامت پرست خاندان تو تمہارے باپ کا ہے تم کس طرح ڈانسر ہو گی۔ ذرا یہ تو بتاؤ۔ اور ڈھاکے میں جہاں ایک ہزار مسجدیں اور بیس ہزار مولوی ہیں یاسمین بی بی تم نے ناچ سیکھ بھی لیا، تو ناچو گی کہاں جا کر۔ مگر وہ سر ہلا کر کہنے لگی۔ آپا۔ دیکھ لینا۔ ایک دن میں ڈانسر بن کر ہی دکھا دوں گی۔ میں سمجھتی ہوں اگر اس کے ابا یہ بات سن لیں تو اس کا گلا ہی گھونٹ دیں۔ واقعی۔ مگر یہ آج کل کی لڑکیاں ہیں بھائی ––– بہرحال تو اب روزی ہفتے میں چار دن سگن بگیچے جا کر یاسمین کو انگریزی پڑھا رہی ہے۔ اچھا ہے اس کا جیب خرچ نکل آیا۔ روزی کے لئے بڑا دل دکھتا ہے۔ چپ چپ سی رہتی ہے اور اکثر بہت پریشان نظر آتی ہے۔

اب تم امتحان دے کر آؤ۔ تو اطمینان سے گپ شپ رہے گی۔"

تمہاری — جہاں آرا

اس خط سے دیپالی کو کچھ اندازہ ہوا کہ اب تک روزی نے اس کے خط کا جواب کیوں نہیں دیا تھا۔

دوسرا خط بابا کا تھا۔

"میں خیریت سے ہوں۔ کھوکھو۔ شونو۔ ٹونو بھی اچھی طرح ہیں۔ تمہاری گھر سے غیر حاضری کی وجہ سے ر نگرانی رکھنے والا کوئی نہیں رہا۔ اس لئے وہ بے حد شیطان ہوتا جا رہا ہے۔

"تم کو پیسوں کی ضرورت ہو تو فوراً لکھ دیا کرو۔ کبھی یہ نہ سوچو کہ میں تمہیں پیسے نہ بھجوا سکوں گا۔

"کل ایک بڑی افسوسناک بات معلوم ہوئی۔ تم کو بھی معلوم ہو کر رنج ہوگا۔ دیدی نے گودام کر دھوپ میں سکھانے کے لئے پرانے کپڑے باہر نکالے۔ ڈیڑھ دو سال سے بڑا صندوق نہیں کھولا تھا۔ ھولا تو تمہاری ماں کی تین بالوچر ساڑھیاں غائب تھیں۔ چور کدھر سے آئے، کب چوری ہوئی۔ کچھ سمجھ میں تا تب مجھے بھی بے حد صدمہ ہوا۔ کیونکہ یہ میری ماں کی ساریاں تھیں۔ جو انہوں نے تمہاری ماں کو دی تھیں یاں تمہیں معلوم ہوگا۔ پرانے خاندانوں میں دلہنوں کو دی جاتی تھیں۔ اور تمہاری بے چاری ماں نے وں بہوؤں کے لئے رکھ چھوڑی تھیں۔ انھیں بُننے والے مرشد آباد کے مسلمان کاریگر کب کے مر کھپ گئے۔ ن بھی ان کے ساتھ گیا۔ اب یہ ساریاں ملتی نہیں ہیں۔ دیدی تو چوری کے غم اور دہشت سے تقریباً بیمار پڑ ا۔ تم جانتی ہو وہ پہلے ہی سے اعصاب زدہ ہیں۔ ان کو فکر ہے کہ چوروں نے گھر دیکھ لیا تو باقی سامان جائے گا۔ اور مجھے یہ اطمینان ہے کہ ہمارے گھر میں اور کوئی شے چوری کے لائق ہے ہی نہیں۔"

بابا کا خط لفافے میں واپس رکھ کر دیپالی گم سم سر جھکائے بیٹھی رہی اور گھاس کی پتیاں توڑا کی۔ نے گھڑی دیکھی اور لائبریری جانے کے ارادے سے یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوگئی۔

شام تک دیپالی لائبریری میں اپنی مخصوص چھوٹی سی کھڑکی میں بیٹھی پڑھنے میں منہمک رہی کھڑکی کی باہر اونچی اونچی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ کتابوں کی الماریوں میں پرانے کاغذوں کی مہک رچی تھی۔ بیشتر ہال سے باہر جا چکے تھے۔ دیپالی کتاب بند کر کے سوچنے لگی۔ صبح ڈاک خانے جا کر ٹکٹ خریدے گی۔ لکھے گی۔ (جہاں آرا کا خط فوری طور پر جواب طلب نہیں تھا) ساریوں کے چوری کے متعلق اپنے ظہار کرے گی۔ مگر یہ دوہری زندگی جو وہ دو ڈھائی برس سے گزار رہی ہے۔ اس کا انت کیا ہے؟

وقتی جوش و خروش گذر جانے کے بعد جب ضمیر ملامت کرتا ہے کہ بابا کو اس طرح دھوکے میں زر
تو اس ضمیر کا کیا علاج کیا جائے؟ ضمیر کیا ہے؟ میں کون ہوں ـــ؟ وشوا بھارتی کی کھڑکی میں بیٹھ
ہوئی یہ لڑکی کون ہے؟ ریحان دادا کون ہیں؟ اوما رائے اور روزی بنرجی کون ہیں؟ گرودیو اور اکشے
اور جہاں آرا۔ ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار؟ آتمائیں؟ پچھلے سنسکاروں کے بنائے ہوئے ذہن؟ کیا ایک
ایک قدم ایک ایک حرکت پہلے سے مقدر ہے یا محض حادثے کا نتیجہ ہے۔" اقتصادی، سماجیاتی تار
عوامل ـــ؟"

ایک مور نہایت غرور سے سر اٹھائے کھڑکی کے نیچے سے گذر گیا۔ عرفانیت اور رومان اور فلس
کے اس گڑھ میں۔ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر اس سرخ آرٹسٹک مکان کے اندر گرودیو ابھی ت
سوالات کا جواب دینے کے لئے موجود ہیں۔

لیکن راستہ کیسے معلوم ہے؟

سولیڈرٹی ـــ! سولیڈرٹی میں جواب ـــ شاید ـــ موجود ہے۔

اٹھو ـــ دیپالی ـــ وہ اکثر، چوبیس گھنٹے وقت کے اندرونی سفر میں خود سے کہتی رہتی۔
اٹھو ـــ اب یہ کام کرنا ہے۔ اب یہاں سے جانا ہے۔ اب یہ پڑھنا ہے۔ اب اس سے بات کرنی
ہے۔ بھاگو مت ـــ

وہ کھڑکی میں سے اٹھی اور کتابیں سمیٹ کر باہر نکلی۔

۱۳

مس روزی بنرجی اور سولیڈرٹی

روزی بنرجی بسوآس فیملی کی گاڑی کمپاؤنڈ سے باہر نکل جانے کے بعد غسل خانے کی سیڑھی پر
ساکت و صامت بیٹھی رہ گئی تھی۔ جس وقت مسز لبواس سٹنگ روم میں دہاڑ رہی تھیں وہ غسلخا
کے کواڑ سے کان لگائے کھڑی تھی۔ اور اس نے سنا تھا۔ "ہم نے انکوائری کی۔ میری سسٹر ان لا نے لکھا
لڑکی کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ اس کے ہندو لوا سے فرینڈز ہیں۔ لڑکی کانگریسی کمیونسٹ ہو گئی ہے

وہ دھک سے رہ گئی۔ یہ خبر کس طرح پھیلی؟ اب پاپا اس کا کس طرح قیمہ اور بھرتہ بنائیں گے۔ ُسے بڑا تعجب ہوا جب اس نے رات کو اپنے کمرے سے باہر نکل کر دیکھا کہ پاپا اور ماما دونوں نے اس ایک لفظ نہیں کہا۔ پاپا روتے رہے تھے (یہ دیکھ کر اس کا دل کٹ کر رہ گیا) اور ماما کی بھی آنکھیں جی ہوئی تھیں۔ مگر وہ دونوں خاموش تھے۔

پادری بنرجی کی یہ خاموشی وقتی نہیں تھی۔ اس روز کے بعد سے انہوں نے اپنی اکلوتی لڑکی سے ل چال تقریباً بند کر دی۔

ریورنڈ بنرجی کی خفگی روزی سے محض اس بنا پر نہیں تھی کہ اس نے نوتھر بسواس اور اس کے ندان کے سامنے ان کو اس بُری طرح شرمندہ کیا۔ انہوں نے دوسرے ہی روز مختلف ذرائع سے روزی سرگرمیوں کے متعلق معلوم کروایا تھا۔ اور ان کو پتہ چلا تھا کہ مسز بسواس کی "ماوجری سسٹر" کی اطلاع ح تھی۔ روزی بنرجی اکثر راتیں برات شہر کے کونوں کھدروں میں چند مفسد، فتنہ پرداز اور حکومت ، باغی اور غدار ہندو اور مسلمان نوجوانوں کے ساتھ دیکھی گئی تھی۔ اس اطلاع نے ریورنڈ بنرجی کا جھکا دیا تھا۔

اِسی دوران میں چارلس بارلو کے متعلق دیپالی کا خط پہنچا۔ روزی نے وہ خط پُرزے پُرزے کر کے رِ آتش کر دیا۔ اور لرز کر سوچا۔ مجھے جیل بھیجا جا سکتا ہے۔ گر کسی کو معلوم ہو جائے کہ میرے یعے دیپالی آیا کے بھیس میں کینٹ ویل کے بنگلے پر پہنچی تھی۔ تو مجھے جیل ہو سکتی ہے۔ میں اپنے سیدھے نیک دل باپ کو کس قصور میں سزا دے رہی ہوں؟ کیا یہ ان کا قصور تھا کہ ماما کو بال دھوانا پڑا۔ پا نے پیٹ کی خاطر مذہب تبدیل کر لیا۔ میری سمجھ میں یہ چند باتیں آگئی ہیں، تو کیا دنیا کے حالات بدل ائیں گے؟

وہ اب خاموشی سے کالج جاتی اور واپس آکر اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ تعطیلات میں ایستھر بنرجی نے شوہر کو سمجھا بجھا کر اس کے لئے لال منیرہاٹ کا ٹکٹ منگوا دیا۔ شمالی بنگال سے واپس آکر وہ پھر اپنی ائی میں لگ گئی۔ کبھی کبھار جہاں آرا کے اصرار پر ارجمند منزل چلی جاتی۔ مگر ارجمند منزل کی امارت اور نش اسے اور زیادہ مضطرب کرتے۔ یہ لوگ اتنے امیر اور با عزت ہیں۔ میں غریب اور کم حیثیت ہوں۔ ٹیا چہر نشین لوگ میرے گھر آکر میرے ماں باپ کو ان کے افلاس کا طعنہ دے کر چلے جاتے ہیں اور میرا

باپ میری خاطر آنسو بہاتا ہے۔ آخر یہ سب کیوں۔ میں اس کا حل کس طرح تلاش کروں۔ پھر جہاں آرا نے اس کے لئے مولانا صاحب کے ہاں سگن بگیچے میں ٹیوشن لگا دیا۔ (وہ لڑکی یاسمین بھی خاصی باؤلی سی تھی۔ جانے ہم لوگوں کا کیا حشر ہوگا) اور وہ شام کو وہاں جانے لگی۔

ایک روز وہ ٹیوشن کا شکریہ ادا کرنے کے لئے جہاں آرا کے یہاں ارجمند منزل گئی تو جہاں آرا نے بڑی حیرت سے اُسے دیکھا۔ شمالی بنگال کی برہمن عورتیں بڑی گوری ہوتی ہیں! اور روزی بھی اپنے سفید اور حسین رنگ و روپ کے لئے مشہور تھی۔ جہاں آرا نے اس سے کہا۔ "روزی۔ تم تو بالکل پیلی پڑ گئیں تم نے ان کو چلتا کیا۔ بہت اچھا کیا۔ اب کیوں کلس رہی ہو؟ سوچو، تم میں اتنی ہمت ہے کہ انکار کر دو۔ مگر جب میری اسی طرح شادی طے کی جائے گی تو میں سر جھکا کر ہاں کر دوں گی۔"

"تمہاری شادی۔ جہاں آرا ـــ؟" روزی نے پوچھا۔

اچانک جہاں آرا گاؤ تکیہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

"جیزس کرائسٹ ـــ تم کو کیا ہو گیا جہاں آرا ـــ" روزی نے گھبرا کر کہا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔" جہاں آرا نے آنسو پونچھ کر کہا اور سیدھی ہو بیٹھی۔

روزی نے پہلی بار جہاں آرا کو تعجب سے دیکھا۔ یہ خوش قسمت، باعزت، پردہ نشین رئیس زادی جو بیرونی دنیا کے خطروں اور مصیبتوں سے محفوظ و مامون اپنی محلسرا میں آرام سے بیٹھی ہے۔ اسے کیا فکر ہے، صرف یہی کہ نہ جانے کیسے آدمی سے شادی ہو گی۔ ساری پردہ نشین لڑکیوں کا محض یہی ایک مسئلہ تھا۔ جہاں آرا، روزی اور دیپالی دونوں سے بڑی تھی۔ اور روزی کو یاد آیا۔ پچھلے سال ایک مرتبہ ماما کہہ رہی تھیں۔ بیگم قمر الزماں اس فکر میں گھلی جا رہی تھیں کہ جہاں آرا چوبیس سال کی ہو گئی۔ اپنے ہم پلہ رؤسا کے لڑکے جاہل اور نکمّے ہیں۔ متوسط طبقے میں بیاہ دینے سے ناک کٹ جائے گی۔ اس کے علاوہ جہاں آرا کی شادی کے سلسلے میں اور کیا مسائل تھے۔ ان کا ذکر بیگم قمر الزماں نے مسز بنرجی سے نہیں کیا تھا خود جہاں آرا نے اپنے نجی معاملات کے بارے میں اپنی سہیلیوں سے آج تک کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا جہاں آرا کی اچھی خاصی شکل تھی گو وہ دیپالی کی طرح دلکش اور روزی کی طرح گوری نہ تھی۔ لیکن وہ سمجھ دار حساس اور خاموش طبیعت لڑکی تھی۔ اس کا ایک بڑا بھائی اور دو چھوٹی بہنیں تھیں۔ لیکن وہ ان سب میں مختلف اور علیحدہ معلوم ہوتی تھی۔

روزی نے آج تک جہاں آرا کی ذاتی زندگی کے متعلق نہ سوچا تھا۔ اسے اور دیپالی کو کالج کے راموں اور اب سیاسی مسائل ہی سے فرصت نہیں تھی۔ ہم سب اپنی اپنی دلچسپیوں اور اپنے آئیڈیلز کے سلسلے ں کتنے خود غرض ہیں۔ روزی کو اس وقت پہلی بار خیال آیا۔ اس نے دوبارہ جہاں آرا پر نظر ڈالی، جو اپنی شاندار وابگاہ میں مسند پر نیم دراز پھر چپکے چپکے رو رہی تھی۔

"جہاں آرا — " روزی نے الجھن سے کہا۔ وہ پچھلے چند مہینوں میں بڑی ہو گئی تھی اور خود کو بوڑھی ورت سمجھنے لگی تھی۔ چند ماہ قبل اگر وہ جہاں آرا کو اس طرح روتے دیکھ لیتی تو فیوڈل رومینٹک ہیروئن، کہہ س کس طرح اسے نہ چڑاتی۔

پھر روزی نے سوچا۔ میں اور دیپالی خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پاس سولیڈرٹی موجود ہے۔ جو ہمارے اتی اور جذباتی مسائل سلجھانے میں ہماری مدد کرے گی۔ مگر بے چاری جہاں آرا، واقعہ یہ ہے کہ اپنے جاگیری ذہبی رجعت پسند تمدنی حصار میں قید ہے۔ اور اسے سہارا دینے والا کوئی نہیں۔ نہ یہ کچھ سمجھنا چاہتی ہے۔

پھر جہاں آرا مسند سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اپنی جامدانی کی ساری کے پلّو کو ایک بازو پر لپیٹتے ہوئے اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "روزی — ذرا اپنی صورت دیکھ آئینے میں۔ تنے دنوں میں ایسی زرد پڑ گئیں تو ابھی سے سوچ لو کس حد تک بغاوت کرو گی۔؟"

"سولیڈرٹی —" روزی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"وہ کس بلا کا نام ہے۔ جہاں آرا نے غصے سے کہا۔ پھر اس نے ملازمہ کو چائے لانے کے لئے آواز دی۔

"میں نے سولیڈرٹی کے لئے خود کو وقف کر دیا ہے۔ وہی مجھے سہارا دے گی۔" روزی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

جہاں آرا نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔

"تم کو کچھ معلوم نہیں جہاں آرا بیگم کہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے۔" روزی نے اب ذرا باہمت آواز میں کہا۔

"تمہیں معلوم ہے؟"

روزی خاموش ہو گئی۔

مالا نعرئی کشتی میں چائے لے کر حاضر ہوئی۔ جہاں آرا کی چھوٹی بہنیں انجم آرا اور اختر آرا شور مچاتی اندر آ گئیں۔ جہاں آرا فوراً ہنس ہنس کے اور مصنوعی بشاشت سے ان کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ روزی چپ چاپ کشتی کے گنگا جمنی نقش و نگار کو دیکھتی رہی

"اور سناؤ روزی۔" جہاں آرا نے چائے بنا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "تمہاری شاگرد اور مستقبل کی مشہور رقاصہ یاسمین مجید کے کیا احوال ہیں۔"

۱۴

آمار پرانیر آرام مونیر آنند —

بی اے پریویس کے امتحان ختم ہو چکے تھے۔ مگر دیپالی موسیقی کے ایک اعلیٰ امتحان کی تیاری کے سلسلے میں مزید چند ہفتوں کے لئے شانتی نکیتن میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ساری درسگاہ تقریباً سنسان ہو چکی تھی۔

آخر مئی کی ایک گرم شام وہ کلا بھون کے باغ میں گھاس میں ڈولے گوتم بدھ کے مجسّمے کے نیچے بیٹھی قدیم راگوں کے ایک "شجرے" پر سر کھپا رہی تھی۔ جب درختوں میں سے نکل کر انل کمار داس اُس کے سامنے نمودار ہوا۔ انل ایک خوش مزاج لڑکا تھا۔ ہر وقت باچھیں کھلی رہتی تھیں۔ سامنے آ کر نمسکار کرنے کے بعد اس نے ایک کتاب دیپالی کو دی۔

دیپالی نے کتاب کھولی۔ اس میں سے حسبِ توقع ایک پرچہ نکلا۔ دیپالی کا دل بڑے زور سے دھڑک اٹھا۔ پرچے میں لکھا تھا۔

"پیاری بچّی۔

معاف کرنا تم کو اتنے طویل عرصے تک کوئی خیر خبر نہ بھجوا سکا۔ (اندازِ تحریر کس قدر منشیانہ تھا۔ کمال کی تکنیک ہے۔ واقعی دیپالی نے سوچا) تم نے اس بارے میں خاصی بری طرح لیٹ ڈاؤن کر دیا۔ مگر ظاہر ہے کوئی زبردست مجبوری رہی ہوگی۔ بہرحال۔ اب انل تم سے جو کہتا ہے اس پر جلد از جلد عمل کرو۔ اس میں تمہارا بہت فائدہ ہے۔ فقط۔"

"ریحان دا دسمبر کے مہینے سے کھلنا اور اس کے بعد سے نواکھالی میں تھے۔ آج کل وہ خاص الخاص بن میں ایک جگہ چھپے ہوئے ہیں۔ میں اُن کے پاس سے کل ہی واپس آیا ہوں۔ ریڈیو کی نئی بیٹری ا تھا ــــ" انل اطمینان سے گھاس پر بیٹھ گیا۔

"مگر ریحان دا نے مجھے کیا کرنے کو کہا ہے؟" دیپالی نے پوچھا۔

"بتاتا ہوں دیدی۔ بتاتا ہوں۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ ڈھاکے واپس گئیں۔ مگر راستے میں معلوم ہوا ابھی ــ"

"اصل بات بتاؤ۔" دیپالی نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔

"بات ــ؟ بات کچھ بھی نہیں۔" انل نے کھیسیں نکال کر جواب دیا۔ "ریحان دا نے آپ کو بن بلایا ہے۔"

"کیا ــ؟"

"ہیں۔ دیدی ۔۔؟"

"مجھے سندربن کیوں بلایا ہے؟ وہاں پہنچنا آسان ہے؟ اور کس لیے؟"

"پہنچنا آسان بالکل نہیں ہے۔ بڑا خطرناک سفر ہے، دیدی اور کیوں بلایا ہے۔ یہ مجھے کیا معلوم۔ نا ہی کہا تھا۔ اپنی دیپالی دی کو فوراً یہ سندیسہ دو کہ ایک بیحد اہم میٹنگ میں ان کی شرکت ضروری ہے۔"

"اور کون کون جا رہا ہے۔"

"دادا نے کہا تھا دیپالی دی کو بتا دینا کہ سریندر دا، محفوظ الرحمٰن میاں، اور ان کی بیوی عائشہ گے۔ باریسال سے۔ یہاں سے آپ ہوں گی اور محمود الحق دا۔ ڈھاکے سے پہنچیں گے۔ کانفرنس ہے۔ ں نے تھوڑی سی چیزیں بھی منگوائی ہیں۔ لیتی جائیے گا۔" انل نے کرتے کی جیب سے ایک فہرست نکال ں۔ فہرست میں چند نئے اخباروں اور برطانوی رسالوں کے نام لکھے تھے۔

"دادا کو بس ان کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے؟" دیپالی نے تعجب سے پوچھا۔ "ان کا دل کھانے کھانے کو بھی تو چاہتا ہوگا۔ میں ــــ"

"یہ کچھ نہیں بتایا۔ لے جائیے ایک آدھ اچار چٹنی۔"

"اور میں جاؤں گی یہاں سے کس طرح؟"

"آپ یہاں سے رانا گھاٹ اسٹیشن تک اکیلی جائیے۔ ریحان دا کا ایک آدمی آپ کو رانا گھا اسٹیشن پر ملے گا۔ وہ آپ کو جیسور کے راستے سے کھلنا تک پہنچائے گا۔ وہاں سے ایک اور آدمی کو باگھیرہاٹ تک لے جائے گا۔ باگھیرہاٹ سے ـــ" اگلے پندرہ منٹ اس نے دیپالی کو ریحان پہنچنے کا پیچدار راستہ سمجھانے میں صرف کیے اور ایک تنکے سے مٹی پر دریاؤں اور ٹرینوں کا نقشہ بنایا دیپالی آنکھیں پھیلائے نقشہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔

پھر انل جلدی سے اٹھا اور مداری کی طرح جیب سے نکال کر دو سو کے نوٹ اسے تھما دیئے۔

"یہ کیا ہے؟"

"ریحان دا نے بھجوائے ہیں کرائے کے لئے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ دیپالی سے کہنا آج کل ہم بہت سخت رئیس ہو رہے ہیں۔ اسی لئے تم لوگ جلدی سے آکر جنگل میں تھوڑا سا جشن منا جاؤ۔ پھر پیسے خ ہو جائیں گے۔ اور اس کے بعد اور بھی نہ جانے کیا ہو جائے۔"

"یہ بیکار کی بات ہے۔" دیپالی نے متانت سے کہا۔ "تمہارے ریحان دا بعض مرتبہ ایسی ڈرامیٹک باتیں کیوں کرنے لگتے ہیں۔" اُس نے نوٹ اپنے بیگ میں رکھ لئے۔

"اچھا اب میں بھاگتا ہوں دیدی۔ آپ کو جس دن روانہ ہونا ہو، مجھے ایک پوسٹ کارڈ ڈا دیجیے گا۔ میں آپ کو یہاں سے رانا گھاٹ جانے والی ٹرین پر بٹھال دوں گا۔" انل سر سے اوپر ہا اُٹھا کر اسے نمسکار کرتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا سڑک کی طرف چلا گیا۔ دیپالی گوتم بدھ کے کا اونچے مجسمے کے پیروں کو غور سے دیکھنے لگی۔ کلا بھون کے جس فنکار نے یہ مجسمہ بنایا تھا وہ وا بڑا زبردست ماہر اناٹومی تھا۔ کیوں کہ پاؤں کی ایک ایک انگلی کا ایک ایک جوڑ اور ناخون بے حقیقی معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے دوسرے شیاملی جھونپڑوں کی دیواروں پر بنے ہوئے سیاہ مجسمے بڑے جاندار سے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میگھ دوت کے اسٹیج پر ور کھڑی ہے اور ڈیکور کی مورتیاں اُسے گھور کر دیکھ رہی ہیں۔ اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سیاہ بادل خلیج اور سندر بن کے اوپر سے بہتے بیربھوم کی سمت بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ اس نے آنکھوں پر زور ڈال کر دھیان سے دیکھا تو سیاہ بادلوں میں ایک سفید بگلا اوپر اڑتا جا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوب ہ مسکرائی اور اس کا چہرہ بھی متبسم تھا۔ پھر اس نے جلدی جلدی ہوسٹل کی سمت قدم بڑھانے شرو

رات کو اپنے کمرے میں لیمپ کے سامنے بیٹھ کر خود سے کہا۔ اب میں اپنے باپ کو ایک اور ست دھوکا دیتی ہوں۔ اُس نے لکھا ــ بابا۔ یہاں سے لوک گیت جمع کرنے والوں کی ایک ٹولی ل پرگنہ کے گاؤں میں جا رہی ہے۔ انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کے لئے کہا ہے۔ کیونکہ یہ ٹور مری ری آف میوزک کے دوسرے پرچے کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوگا۔ میں جلد ہی گھر پہنچنے کی کوشش گی۔ آپ فکر نہ کیجئے ــ آپ کی بیٹی، دیپالی

خط بند کر کے وہ باہر آئی۔ نیم تاریک روشوں اور سنسان باغوں سے گزرتی سڑک تک پہنچی نکھیں بند کر کے خط لیٹر بکس میں گرا دیا۔

۱۵

سُندربن

سندربن کا سلسلہ جنوبی بنگال میں چوبیس پرگنہ سے لے کر باقر گنج اور کھُلنا کے اضلاع تک پھیلا ہے۔ ان گھنے اور پُر خطر جنگلوں میں مشہور عالم رائل بنگال ٹائیگر اور چیتے اور ہرن دوڑتے پھرتے ہیں۔ ن کے وقت رات کا سا اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ لاتعداد ندیوں اور جزیروں اور سمندری کھاڑیوں لدلوں اور سندری درختوں کی اس لرزہ خیز حسین و جمیل کائنات میں اکا دکا مچھیروں اور لکڑہاروں کی ں گھنے جھرمٹوں میں پوشیدہ ہیں۔ سندربن کا یہ وسیع و عریض علاقہ دنیا کے حسین ترین اور خطرناک ترین ں میں سے ہے۔

دیپالی سرکار کی کشتی باگھیر ہاٹ سے روانہ ہو کر ایک نامعلوم منزل کی طرف بہتی جا رہی تھی۔ چاروں طرف کے ہیبتناک حد خوبصورت مناظر کو دیکھ کر سکتے میں بیٹھی تھی۔ اور اس کا دل دھڑک ا۔ وہ ریحان دا سے ملنے جا رہی ہے۔

ریحان دا ــــ چپوؤں کی چپ شپ اور کائنات کی اس آبی اور سبز سمفنی میں یہی نام مرتعش ــــ وہ ریحان دا سے ملنے جا رہی ہے۔

دن بھر چلتے رہنے کے بعد کشتی شام کو ایک گاؤں کے گھاٹ پر پہنچی۔ سنسان جیٹی پر ایک بوڑھا

مسلمان جس کی سفید داڑھی ہواؤں میں لہرا رہی تھی لالٹین ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ دیپالی اپنا اٹیچی کیس (یہ تار اٹیچی کیس!) اور تھیلا اٹھا کر بانس کی جیٹی پر اتری۔ ملّاح نے کھُلنا کی ساحلی بنگلہ میں بوڑھے مولوی سے کوئی کہی۔ مولوی نے لالٹین اٹھا کر دیپالی سے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ بیٹی۔"

کشتی پانی پر واپس چلی گئی۔ دیپالی اب تحیّر کے عالم میں اس ازلی جنگل میں تنہا کھڑی تھی۔ میں کہاں سے کہاں آگئی۔ اس نے حیرت اور خوف کے ساتھ سوچا۔ لیکن ریحان اس راستے کے سرے پر موجود ہیں۔ محفوظ ہوں۔

بوڑھے نے اس کا بکس اور تھیلا اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ وہ اس کے ساتھ جیٹی پر سے اتر کر پگڈنڈی پر آگئی۔ بوڑھا بلا کی پھرتی سے قدم اٹھا رہا تھا۔ شاید اس بوڑھے نے اپنی ساری عمر اسی جگہ پر گزاری ہے اور اسی جگہ اسی حالت میں مر جائے گا۔ ہم نے اس کے لئے کیا کیا ہے اور کیا کر پائیں گے؟ یہ سوچ کر دیپالی حسب عادت نئے جوش کے ساتھ اپنی رفتار تیز کر دی۔

"باقی لوگ آگئے؟" دیپالی نے بوڑھے سے پوچھا۔

وہ چُپ رہا۔ دیپالی کو یکلخت ڈر سا لگا۔ پھر اس نے سوچا۔ شاید یہ میرا شہری لہجہ نہیں سمجھ سکا۔ اس نے اپنا سوال دُہرایا۔ "دوسرے لوگ جو آنے والے تھے؟"

بوڑھے نے نفی میں سر ہلا دیا۔ دیپالی متفکّر ہو گئی۔ مگر ــــ کیا ہو سکتا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر میں اتنی دہشت زدہ کیوں ہو رہی ہوں۔ حد ہے۔ اگر میں نے کوئی حماقت کی ہے تو۔ تو اُسے بھگتنا پڑے گا۔ او ماں ــــ او ماں ــ ماں ــ دیپالی نے بے طرح ہڑبڑا کر دیوی سے دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔

آدھ گھنٹے میں وہ لوگ درختوں کے ایک جھُرمٹ میں پہنچ گئے۔ جس کے ایک طرف ندی رہی تھی۔ سائیکلون کے تھپیڑوں سے شکستہ لیکن خوبصورت بانس کا جھونپڑا سامنے کھڑا تھا۔ برآمدے پر پھولوں کی بیلیں چڑھی تھیں اور طاق میں دیا جل رہا تھا۔ مولوی نے بکس اور تھیلا برآمدے کے کچے فرش پر رکھ کر آواز دی۔ "زینب!"

ایک بوڑھی عورت پیوندوں سے بھری اودی ساری لپیٹے اندر سے نکلی۔ اس نے جھک کر دیپا کو غور سے دیکھا اور مسکرائی۔ "آؤ ــ آجاؤ ــــ"

دیپالی نے اسے نمسکار کیا اور اس کے پیچھے پیچھے تین کمروں کے صاف ستھرے جھونپڑے میں داخل ہوئی۔

"تمہاری کھاٹ میں نے اپنی کوٹھری میں بچھا دی ہے۔ برابر والے کمرے میں مولوی صاحب اور میرے ون بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ دونوں کام سے کھلنا گئے ہوئے ہیں۔"

دیپالی کھاٹ پر بیٹھ گئی۔

"تم کو بھوک لگی ہوگی۔ راستے میں کچھ کھایا تھا۔؟ یہ لو۔۔" بوڑھی عورت نے بھنے ہوئے دال کے میٹھے لڈو ایک رکابی میں رکھ کر اسے پیش کئے اور پانی کا گلاس اس کے سامنے رکھا۔ یہ غربت اور ہمان نوازی۔۔ دیپالی کے حلق میں کوئی چیز آ اٹکی۔ اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر بوڑھی عورت نے کہا۔۔ یہان میاں باہر ندی پر بیٹھے ہیں ادھر۔۔"

دیپالی نے غربت کا دور سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ سفید پوش طبقے کی ناداری سے واقف تھی جو اس پنی ناداری تھی۔ اس نے شہر کے غرباء کا افلاس دیکھا تھا مگر ایسی غربت اسے آج تک نظر نہیں آئی تھی۔ ں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ مولوی صاحب زینب بی بی کے شوہر برآمدے میں چٹائی بچھا کر مغرب کی نماز محو ہو چکے تھے۔ اس نے زینب بی بی سے چند باتیں کیں۔ ایک لڈو دانتوں سے کترا اور لالٹین ہاتھ میں لے پچھلے برآمدے میں نکلی، جس کے عین نیچے ندی رواں تھی۔

ندی کے کنارے، جھونپڑے کی طرف پشت کئے وہ بیٹھا تھا۔

وہ آہستہ سے نیچے اتری اور اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ وہ کشتی پر سر رکھے اپنی سوچ میں ڈوبا ہوا ۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھایا اور مسکرا کر کہا۔ "شوکتی، آ گئیں۔"

"ہاں۔۔"

وہ اسے شاباشی دینے کے انداز میں مسکرایا۔ "گڈ گرل۔ بریلینٹ گرل۔"

اس کے چہرے سے داڑھی غائب تھی۔

"آپ نے۔۔" دیپالی نے اپنے چہرے پر انگوٹھا اور انگلی پھیری۔

"ہاں بھائی۔ دو ڈھائی برس سے کسی طرح اس کمبخت داڑھی سے پیچھا ہی نہیں چھٹتا تھا۔ مسلمان ھی۔ ہندو داڑھی۔ بید جھاڑ جھنکاڑ ہو گئی تھی۔ یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آزادی سے سارے

میں گھومتا ہوں۔ آج صبح تمہارے آنے کی تقریب میں مولوی صاحب کے بڑے لڑکے سے استرا لے شیو کیا۔ دیکھو ٹھیک ہے نا۔" اُس نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے ایک بائیں رخسار پر اُسترے کا خفیف سا زخم تھا اور خون کی بوند جم گئی تھی۔ خون کے اس قطرے کو دیکھ کر وہ اچانک بے حد مضطرب ہو گئی۔

ندی کا رنگ سُرخ ہو گیا۔ دور سے شیروں کے گرجنے کی آواز آ رہی تھی۔ ریحان نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔

"ابھی تمہارے آنے سے پہلے میں سوچ رہا تھا۔" پھر اس نے ٹھٹھک کر پوچھا۔ "تم نے علاول[1] پڑھا ہے؟"

"تھوڑا سا۔"

"کوئی نظم یاد ہے؟"

"رات سُرخ اور تاریک تھی۔؟"

"ہاں۔ ادھر دیکھو۔" ریحان نے دور اُفق کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں سمندر اور دریا اور جنگل ایک ہو گئے تھے۔

"سرخ اور تاریک رات میں ایک سنہری ناؤ۔" اس نے پانی میں انگلیاں ڈبو کر آہستہ آہستہ اپنی خوبصورت آواز میں کہنا شروع کیا۔ "ہلتی۔ ڈولتی، طوفان زدہ، متحیر، خائف، اراکان کے ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی۔"

"لیکن طوفان آیا۔" دیپالی نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن طوفان آیا۔" ریحان کہتا رہا۔ "اور ناؤ ساحل کے بجائے ایک دور دراز جزیرے سے جا لگی اور ناؤ میں سے وہ نوجوان نکلا۔ بھوکا۔ زخمی۔ نڈھال۔ وہ ریت پر پڑا تھا۔ جب وہ لڑکی وہاں پر آئی اور اس نے کہا۔"

"اُس نے کہا۔ میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گی۔ انسان کو بے آسرا اور مایوس نہ ہونا چاہیے۔" دیپا نے کہا۔

"تم انسان ہو نا۔ تاریک تنہا غضبناک سمندر کی روح تو نہیں؟"

---

[1] سید علاول۔ سترھویں صدی بنگال کا عظیم شاعر جس کی کشتی پرتگالی قزاقوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرتی اراکان پہنچی

وہ ٹھٹھک گئی اور ریحان کو دیکھ کر علاؤل کے الفاظ میں سوال دہرایا۔

ریحان نے اقرار میں سر ہلایا۔

"کیونکہ ___" دیپالی کہتی رہی۔ "سمندر اپنے غیظ میں مبتلا سارے کرۂ ارض کے ساحلوں سے ٹکراتا ہے۔ مگر زمین تک نہیں پہنچ پاتا ___ زمین مضبوط ہے۔ اس نے انسانیت کے مظالم کا بوجھ اپنے اوپر اٹھا رکھا ہے۔ سمندر تو ایک چھوٹی سی نوکا کو بھی سہارا نہیں دے سکتا۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑے بڑے میور پنکھی جہاز چاہئیں۔ ایسے بجرے، جن کو چودہ چودہ مانجھی کھیتے ہیں۔"

"اور اس لڑکی نے علاؤل سے کہا تھا ___ دھرتی پر گھر بنتے ہیں۔ آسمان خوبصورت ہے۔ چاند خوب صورت ہے۔ مگر چاند میں گھر نہیں ہے۔ گھر ناریل کے سائے میں بنتے ہیں۔ میں تمہارا گھر بنوں گی۔"

ہوا ساکت رہی۔ کائنات تھم گئی ___ ندی نے بہنا بند کر دیا۔ ایک ازلی، ابدی لحظے کے لئے سارا وجود خلا میں تحلیل ہو گیا۔

پھر ہوا چلی۔ سندری کے درخت سرسرائے۔ ندی بہنے لگی۔ دیپالی اپنی گود میں ہاتھ رکھے اسی طرح ساحل پر بیٹھی رہی۔

"پھر کیا ہوا شونکتی، علاؤل نے اسے کیا جواب دیا؟" ریحان کی آواز سناٹے میں لہروں کے ساتھ گونجی۔

"مجھے پتہ نہیں آگے مجھے یاد نہیں آ رہا۔" دیپالی نے جواب دیا۔ پھر اس نے سادگی سے پوچھا "آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔"

"ایک اہم کانفرنس کے لئے۔" ریحان نے سنجیدگی سے کہا۔

"باقی لوگ ابھی نہیں پہنچے۔ سریندر داد وغیرہ اور لکشتہ آیا۔"

"نہیں، بس اب آتے ہی ہوں گے۔"

"میں آپ کی ساری چیزیں جو منگوائی تھیں لیتی آئی ہوں۔"

"گڈ۔"

دیپالی نے بیگ میں سے دو سو کے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ "یہ آپ کے پاس کہاں سے آ گئے تھے۔"

اس نے چونک کر نوٹوں پر نظر ڈالی: "ہمیں اپنی کتاب کی رائلٹی ملی تھی۔ مگر تم کیسے آئیں

یہاں تک۔"

"ہم بھی رئیس ہو گئے ہیں۔ ہمیں اپنے ریکارڈوں کی رائلٹی ملی تھی۔"

"اوہ۔ تو اس وقت گویا دو سرمایہ دار سندربن میں آؤٹنگ کر رہے ہیں۔" اس نے شگفتگی سے ایک کنکر پانی میں پھینکا۔

دیپالی پھر بڑی متفکر نظر آئی۔ "ریحان دا"

"کہو" وہ کنکر اٹھا اٹھا کر ندی میں پھینکتا رہا۔

"باقی لوگ کہاں ٹھہریں گے؟"

"ارے بھئی۔" اس نے چونک کر جواب دیا۔ "کیا باقی لوگ کر کے بور کر رکھا ہے۔"

"کیوں؟"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دیپالی نے بھونچکی ہو کر اسے دیکھا۔ "تو آپ نے اول سے جھوٹ بولا تھا۔"

"بالکل"

"اور آپ کا خیال تھا۔ میں چلی آؤں گی۔"

"میرا خیال صحیح تھا۔!"

"دیپالی غصے سے دوسری طرف مڑ گئی۔

"شوکتی۔!"

اس نے جواب نہیں دیا! ور ندی کے کنارے چلنے لگی۔

"شوکتی!"

وہ اور آگے بڑھ گئی۔

"ایسے ہی چلتی چلی جاؤ تو سیدھی ڈھاکے پہنچ جاؤ گی۔ مگر ذرا خیال رکھنا۔ وہ تمہارے سامنے ایک عدد آدم خور گھڑیال بیٹھا ہے۔" ریحان نے بشاشت سے آواز دی سامنے ندی کی سطح پر ایک سیاہ لکیر نظر آ رہی تھی، ایک گھڑیال تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دیپالی چیخ مار کر واپس پلٹی۔ ریحان کھلکھلا کر ہنستا ہوا سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ دیپالی اس سے کچھ فاصلے پر دوسری سیڑھی پر آ بیٹھی۔

ندی کا پانی سیاہ ہو چکا تھا! ور دوسرے کنارے پر سنداری کے جھنڈ سرسرا رہے تھے۔ ریحان نے سر اُٹھا کر دیپالی کو دیکھا۔ پھر وہ یکلخت بیحد سنجیدہ ہو گیا! اور اس نے آہستہ سے کہا۔ "شاید مجھے کوئی حق حاصل نہیں تھا کہ میں تم کو اس طرح — اس طرح زحمت دوں۔"

وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ ریحان نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"دیپالی۔ میں تین برس سے، مسلسل، متواتر تین برس سے جرائم پیشہ لوگوں اور ڈاکوؤں کی طرح چھپتا پھر رہا ہوں۔ مدتوں سے مجھے چین کی نیند اور ذرا سی ذاتی مسرت نصیب نہیں ہوئی۔ تمہیں معلوم ہے چارلس بارلو نے قسم کھائی ہے کہ زندہ یا مردہ مجھے گرفتار کر کے رہے گا — ؟ تم — تم مجھے کیا سمجھتی ہو — یں انسان ہوں آخر — فولاد کی مشین گن تو ہوں نہیں۔ یا ہوں۔ بتاؤ۔ ؟" اس نے دوبارہ شگفتگی کوشش کی۔ پھر اس نے کہا "نہیں — دیپالی میں تم سے ملنا چاہتا تھا — شاید مجھے اس طرح غلط بہا رکے تم کو اتنی دور نہ بلانا چاہیئے تھا۔ مگر میں بے حد خود غرض انسان ہوں۔ اور بہرحال اب تو تم آ ہی یں۔ اب کیا ہو سکتا ہے!" اس نے پھر ہنسنے کی سعی کی۔

دیپالی آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگی۔ مختصر سے گھاٹ کی شکستہ سیڑھی پر بیٹھا وہ ایک چھوٹے سے لڑکے کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ اسکول کا چھوٹا سا لڑکا۔ جو استانی کے سامنے اپنی شرارت کی معافی اہ رہا ہو۔ مگر ساتھ ہی کسی دوسری شرارت پر بھی تلا بیٹھا ہو۔ دیپالی کو یکلخت ہنسی آ گئی۔ اسکول گرل گگلز — اس کے کان میں گونجا۔ اور اس گونج کو شکست دیتے ہوئے ایک اینٹ ٹھا کر بھرپور مسرت کے ساتھ دور ندی میں پھینک دی۔

"کھا جائے گا آ کر گھڑیال۔" ریحان نے کہا

وہ زور سے ہنسی — اوما دیدی۔ میری اس ہنسی کو اسکول گرل گگلز کہتی ہیں۔" اس نے کہا اور بسرے مجھے اس نے سوچا میں یہ نام لے کر قسمت کو tempt کر رہی ہوں اور میں دھمی بھی ہنستی جا رہی ہوں۔ رمیرے اس ذہنی زوال کا ذمہ دار یہ شخص ہے۔ ہاہاہا۔ اس نے زور سے پانی اُچھالا

"اوما دیدی۔ ریحان نے سگریٹ جلاتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ "بڑی اچھی آدمی ہیں۔ ان کی ملت رہو گی تو تمہارے اندر بھی عقل آ جائے گی۔"

"ابھی بے عقل ہوں؟"

"بے حد۔ ایک اجنبی آدمی کے بلانے پر تن تنہا اس کے پاس بنوں میں آگئیں۔"

"مجھے اس اجنبی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔؟"

"قطعی نہیں!"

"اور ایسے ناقابل اعتبار آدمی کے ہاتھوں میں صوبے کی تحریک کی باگ ڈور ہے۔ جب ہی تو یہ گت بن رہی ہے تحریک کی۔ ہا ہا ہا۔"

ہا ہا ہا۔ وہ بھی خوب ہنسا۔

اب چاند دلدلی جنگلوں کے سیاہ افق پر آہستہ آہستہ اوپر آ رہا تھا۔

"چلو تم کو اپنے میزبانوں سے ملوا دیں۔"

وہ اس بوڑھے جوڑے کے مسکین اور باصبر چہرے کو یاد کر کے فوراً دکھی ہو گئی۔

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"مولوی ابوالہاشم ۔۔۔ ماہی گیر ہیں اور اس گاؤں کی مسجد کے پیش امام۔ ان کے لڑکے بھی مچھیرے ہیں اور ہمارے ورکر بھی ہیں۔ میں ان کے یہاں دو مہینے سے مقیم ہوں۔ کھلنا میں کافی کام ہو رہا ہے۔ گو رفتار سست ہے۔"

"آپ نے ان دونوں میاں بیوی کو میرے متعلق کیا بتایا ہے؟"

"تمہارے متعلق ۔۔۔؟ کچھ نہیں۔ ان سے کہہ دیا تھا کہ اس ہندو لڑکی کو مسلمان کر کے شادی کرنے والا ہوں۔" ریحان نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"شرم تو نہیں آتی آپ کو۔" دیپالی نے غصے سے سرخ ہو کر کہا۔

"بالکل نہیں۔ چلو ۔۔۔ اٹھو ۔۔۔" ریحان نے بڑے تکلف اور شائستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور لالٹین اٹھالی۔ وہ بانس کی سیڑھیاں چڑھ کر جھونپڑے میں داخل ہوئے زینب بی نے مچھلی بھات ان کے سامنے رکھا۔ دیوار پر پھیلے جھینگے پکڑنے کے جال کے نیچے وہ دونوں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ان دونوں کا سایہ دیوار پر بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اتنے میں مولوی داڑھی والا جھکا جھکا سا سایہ بھی پرچھائیوں میں آ شامل ہوا۔

"بابا ۔۔۔ خالہ ۔۔۔" ریحان نے دونوں بوڑھی پرچھائیوں سے کہا۔ "یہ ہماری کولیگ ہے۔"

گوتم دیپالی ۔"

مولوی نے سر اٹھا کر لڑکی کو دیکھا ۔ اور سر ہلایا ۔

ریحان کہتا رہا ۔ "یہ ہمارے لئے گوتم بھی ہے اور دیپالی بھی ۔ کسی دن میں تم کو سمجھاؤں گا کہ اس دیس میں گوتم اور دیپالی ایک کیسے ہو سکتی ہیں ۔"

بس شروع ہو گئی تبلیغ ۔ ایک منٹ کو بھی پارٹی لائن چلانا نہیں بھولتے ۔ دیپالی نے ذرا الجھن سے سوچا اور یکلخت اسے ایسا لگا کہ سامنے پرچھائیوں میں بنوئے چندر سرکار کا سایہ بھی آ کر کھڑا ہو گیا ہے ۔ یہ میں کیا کر رہی ہوں ۔ وہ سر جھکا کر تندہی سے کھانا کھانے میں منہمک ہو گئی ۔

کھانے کے بعد ریحان نے کہا ۔ "رات بہت آ گئی ہے ۔ تم اتنا طویل سفر کر کے آئی ہو دیپالی ۔ ب آرام کرنا چاہتی ہو گی ۔"

"جی ہاں ۔"

"گڈ نائٹ" ریحان نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا ۔

"گڈ نائٹ ۔"

ریحان اور مولوی ابوالہاشم کمرے سے باہر چلے گئے ۔

اس رات ، سندربن کے عمیق سناٹے میں ، زینب بی بی کے برابر والی کھاٹ پر لیٹ کر دیپالی نے سوچا ۔ ندگی کی کوئی تُک بھی ہے ۔ بہت جلد اسے نیند آ گئی ۔

دوسرے روز صبح سویرے وہ جھونپڑے سے نکلتی ہوئی ایک قریبی کنج میں چلی گئی ۔ جہاں دور سے لین گلدار ہرنوں کی ایک ڈار چوکڑیاں بھرتی گزر رہی تھی ۔ وہ ایک درخت کی شاخ پر ہاتھ رکھ کر ان خوبصورت رنوں کا نظارہ کرنے میں محو تھی ۔ جب کسی نے پیچھے سے کھنکارا ۔

"نہ ہوئی غریب شکنتلا ، اس وقت اس پوز کو دیکھ کر فوراً بے ہوش ہو جاتی اور کالیداس کو ین دوبارہ لکھنا پڑتا ۔ !"

دیپالی نے پلٹ کر دیکھا ۔

"ریحان ۔ آپ اس قدر نون سیریس ہو گئے ہیں کہ مجھے آپ کی طرف سے فکر ہو چلی ہے ۔ آئیے ۔

میں آپ کو آپ کے رسالے دے دوں۔"

"ابھی پڑھ لیں گے رسالے" وہ آرام سے ایک درخت کے کٹے ہوئے تنے پر بیٹھ گیا۔

"مجھے آپ سے جنگ کی تازہ ترین صورت حال ڈسکس کرنا ہے۔"

"وہ بھی کر لی جائے گی۔"

"اچھا تو چل کر ناشتہ تو کر لیجیئے۔"

"ناشتہ۔ اوہ۔ آج کا مینو کیا ہے ہمارے بریکفاسٹ کا؟" ریحان نے شان سے پوچھا۔

"مرغ مسلّم اور پلاؤ۔ یا جو کچھ بھی آپ مسلمان لوگ کھاتے ہیں صبح کو۔"

"ارے بیوقوف۔ مسلمان ناشتے میں مرغ مسلّم نہیں کھاتے۔"

"واہ۔ جہاں آرا کے ہاں میں نے ایک مرتبہ مرغ مسلّم اور پراٹھے کھائے تو اس نے کہا کہ صبح پکے تھے۔"

"جہاں آرا، کون۔؟" وہ دونوں ٹہلتے ہوئے اب جھونپڑے کی طرف لوٹ رہے تھے۔

"میری دوست ہے۔ نواب قمرالزماں چودھری کی لڑکی۔ سخت فیوڈل۔ لیکن بیحد سوئیٹ۔"

"اوہ۔"

وہ جھونپڑے میں داخل ہو گئے۔ زینب بی بی نے رات کا پکایا ہوا پنتھا بھات سامنے رکھا۔

"میں آج ہاٹ جا کر آپ کے لئے کھانے پینے کی سامان خرید لاؤں گی۔" دیپالی نے ریحان سے انگریزی میں کہا۔

"دیپالی تم چند روز یہاں رہ کر میرے لئے بہتر کھانا پکا دو گی۔ مگر ان دونوں کو تو ساری زندگی اس کے علاوہ کچھ میسّر نہیں ہوا۔"

"اوہ۔" دیپالی نادم ہو کر المونیم کی رکابی پر جھک گئی۔ زینب بی بی چولہے پر چائے اوٹنے میں مصروف تھیں۔ چار پینے کے بعد وہ دونوں دوسرے کمرے میں گئے۔ جس میں ریحان کی چارپائی بچھی تھی۔ فرش پر کاغذات کا ڈھیر لگا تھا۔ ایک کونے میں اس کے ٹرنک کے اوپر بیٹری کا ریڈیو رکھا تھا۔ ریحان نے صبح کی خبروں کے لئے ریڈیو آن کیا۔ اے۔ آئی۔ آر۔ دہلی سے میلون ڈی میلو کی آواز گونجی۔

خبریں سننے کے بعد ریحان نے کہا۔ چلو باہر چلیں۔ وہ دونوں باہر نکلے۔ جھونپڑے کے نیچے گھاٹ

مولوی کی ناؤ بندھی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب دن بھر کے لئے کسی کام سے گاؤں جا چکے تھے اور پانی
سطح پر بحری عقاب مچھلیوں پر جھپٹا مار رہے تھے۔

"میں وہ چتکبرے ہرن دیکھنا چاہتی ہوں، جو صبح اتنی تیزی سے بھاگ گئے۔ آگے جا کر جنگل زیادہ خوب
رت ہو جاتا ہے۔"

"زیادہ خوب صورت اور زیادہ خطرناک۔"

"مگر میں وہ ہرن ضرور دیکھوں گی۔ اتنے حسین ہرن میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے۔"

"ٹھیک ہے ـــ مگر سیتا کے انجام سے واقف ہو؟"

وہ ہنستی ہوئی اتر کر کشتی میں بیٹھ گئی ـــ ریحان نے کشتی کھول کر دھارے پر چھوڑ دی۔ وہ اس
اور اس منظر اور اس ماحول کا ایک لازمی اور فطری جزو معلوم ہو رہا تھا۔ دیپالی کو یک بیک خیال آیا کہ
کی زندگی کے پس منظر سے بالکل واقف نہیں۔

ناؤ پانی کی سطح پر روانی سے بہہ رہی تھی۔ ریحان نے آہستہ آہستہ ایک ساری گان گنگنانا شروع
یا۔ پھر چپ ہو گیا۔

کنارے پر جھکے سندری درختوں پر رنگ برنگے پرند ـ چکر کاٹ رہے تھے۔

"تم کو احساس ہے شوکتی کہ ان دریاؤں اور اس دھرتی نے کیسے کیسے دکھ دیکھے ہیں؟ میں ان دکھوں
حصہ ہوں۔"

"کیوں ـ آپ بھی گاؤں کے رہنے والے ہیں؟"

ں، تم نے مولوی ابو الہاشم کو دیکھا ـ میرے بابا مولوی ابو الہاشم کا نمونہ ہیں۔ ایسے ہی صابر،
اور بولے۔"

"اوہ ـ" وہ چپ ہو گئی۔ وہ کرید نہ کرنا چاہتی تھی کہ ایک غریب کسان کا لڑکا لندن اسکول آف
پہنچ گیا۔ یقیناً وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہ جانتی تھی۔

چند لمحوں بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ "آپ لندن کیسے گئے تھے۔"

"لندن ـ؟" ریحان نے چونک کر دہرایا۔ "لندن کا یہاں کیا ذکر ہے؟ یہ اپنا ملک دیکھو اور دیکھو
نے اس کے ساتھ کیا کیا؟" وہ خاموش سا ہو گیا۔ "میں ۱۹۲۵ء میں لندن گیا تھا۔ ـ تم میرے حالات زندگی

جاننا چاہتی ہو؟ میں نے علی گڑھ سے ہائی اسکول اور ایف اے کیا تھا۔"

"علی گڑھ۔"

"ہاں یہ تمہارے لیے تقریباً اجنبی نام ہے۔ مگر یہ ملک اور قوم کی ایک اور بے حد اہم داستان کا ایک حصّہ ہے اور اس داستان سے تم کو واقف ہونا چاہیے ——— پھر میں نے ڈھاکے لوٹ کر بی اے اور کلکتہ سے ایم۔ اے کیا۔ اسی زمانے میں میں نے تمہارے چچا کی کتاب "بنگال کی اقتصادی تاریخ" پڑھی تھی۔"

وہ رک کر کسی سوچ میں کھو گیا۔ اور پھر چپو چلانے شروع کیے اور کہنے لگا "اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ ان کی بھتیجی ——— کوئی سڑیل سی لونڈیا کسی اسکول میں پڑھ رہی ہے اور ایک دن میری زندگی میں سائے کی طرح داخل ہوگی ——— دیکھو کھلنا کی مناسبت سے کیسی برمحل تشبیہ دی ہے۔" وہ اداسی سے ہنسا۔

"بہت خوب! آگے چلیے!!"

"اس کے بعد ——— ایک ——— ایک وظیفے پر لندن چلا گیا۔ وہاں میں اور اُدما اور رکتے اور بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ہمارا بڑا ہی تاریخی قسم کا گروہ تھا وہ!"

"اور واپس آتے ہی کود پڑے انقلاب کے شعلوں میں؟" دیپالی نے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ پھر اس نے کہا: "کلکتہ میں چند سال ہوئے پروگریسو رائٹرز کی دوسری کانفرنس ہوئی تھی۔ اس میں تمہیں آنا چاہیے تھا۔ بڑا ولولہ خیز تجربہ تھا۔"

"آپ بھی لکھتے ہیں؟"

ریحان نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ "ارے تم کتنی جاہل ہو۔ یہ رائٹر مجھے ابھی کس شے کی ہے اور وہ جو میں نور الرحمٰن بنا رسالہ ایڈٹ کر رہا تھا تو کیا گھاس کھود رہا تھا؟ دیپالی کیا تم نے وا میری کتاب نہیں پڑھی؟ اُدما نے تم کو نہیں دی پڑھنے کو؟"

"کیا افسانے لکھتے ہیں؟"

ریحان نے چپو چھوڑ کر آسمان کی طرف احتجاجاً ہاتھ پھیلائے۔ "اوہ لڑکیاں۔ لڑکیاں۔" اس نے فریاد کی۔

"نہیں سچ بتائیے۔"

"میں افسانے نہیں لکھتا ہوں نہ شاعری کرتا ہوں۔ ٹھوس کام کرتا ہوں۔"

"تھوڑا سا انکسار آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائے گا۔" دیپالی نے ہنس کر کہا۔ "آپ کی کتاب کا کیا نام ہے؟"

"انیسویں صدی میں بنگال کی زرعی حالت۔" ریحان نے منہ لٹکا کر کہا۔ "ارے دیپالی تم بڑی جاہل نکلیں ___"

"اور یہ پروگریسیو رائٹرز کیا ہوتے ہیں؟"

ریحان نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور کراہا۔

"نہیں پلیز۔ بتائیے نا۔"

"ابھی جب کالج واپس جاؤ گی تو گرودیو نے جو پیغام کانفرنس کے نام بھیجا وہ پڑھ لینا، سمجھ میں آ جائیگا۔"

"گرودیو نے کیا کہا تھا ___؟"

"انہوں نے کہا تھا کہ میری طرح گوشہ نشیں بن کر کام نہیں چل سکتا۔ ادما دیبی کو چاہیے تھا کہ تمہیں سب باتیں بتاتیں۔"

ادما دیبی۔ ادما دیبی۔

"آپ نے بہت سے لوگوں کو آئیڈیلائز کر رکھا ہے۔"

"ہاں۔"

"کون کون۔"

"بہت سارے ہیں۔ ان میں سے ایک تم بھی ہو۔ دیپالی تم کلچرل فرنٹ پر کام کروگی؟"

"آپ جو کہیں گے کروں گی۔"

کشتی اب درختوں کی سرنگ میں سے گزر رہی تھی۔

"مغرب میں بھی یہی سب ہو رہا ہے؟ جدوجہد؟" دیپالی نے پوچھا۔

"مغرب میں ___؟ اسپین میں ایک خونریز جنگ لڑی جا چکی ہے دیپالی۔"

"مجھے اور بتائیے۔ لندن کے متعلق۔ جب آپ وہاں طالب علم تھے۔"

"جب ہم وہاں طالب علم تھے۔" ریحان چت ایک طرف دیکھ کر نیم دراز ہو گیا ___ وہ واقعی زریں

ہ تھا۔" اس زمانے میں وہاں بڑے معقول لوگ جمع تھے۔ ملک راج آنند اور سجاد ظہیر نے مل کر پی ڈبلیو اے

قائم کی تھی۔"

"آپ انگلینڈ ہی میں تحریک میں شامل ہو گئے تھے؟" دیپالی نے بات کاٹی۔

"ہاں۔ اور واپس آ کر دیکھا کہ ہمارے ساتھی۔۔۔ علی گڑھ اور لکھنؤ۔ اور جامعہ ملیہ اور کلکتہ اور سب جگہوں کے نوجوان ہمارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔ پرانے دہشت پسند بھی اب ہماری طرف آ چکے تھے۔ شوکتی۔ ہم لوگ خوش قسمت ہیں جو اس زمانے میں پیدا ہوئے اور ملک کیلئے کچھ کر سکنے کے اہل ہیں۔"

سرنگ کے اختتام پر پہنچ کر ریحان نے کشتی موڑ لی۔ "آگے گھڑیالوں کی راجدھانی ہے۔ اب واپ چلتے ہیں۔" اس نے کہا۔

واپسی میں ریحان خاموشی سے پتوار چلانے میں مصروف رہا۔ بادل گھر آئے تھے اور سورج کبھی کبھی بادلوں میں سے نمودار ہو کر چمکنے لگتا تھا۔ لقلق اور رام چڑیاں سارے میں اڑتی پھر رہی تھیں۔

گھر پہنچ کر انہوں نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ تیسرے پہر کو ریحان نے دیپالی کے دروازے پر آن کر آواز دی۔ "شوکتی۔ یہاں آنا تو۔" دیپالی کھاٹ پر ساری بچھا کر اور اپنے تھیلے کا تکیہ بنائے بے خبر سو رہی تھی۔ زینب بی بی گھڑا لے کر شام کے پکانے، ریندھنے کے لئے پانی لینے ندی پر گئی ہوئی تھیں۔ ریحان ذرا جھجکتا ہوا اندر آ گیا اور کواڑ سے لگ کر خوابیدہ دیپالی کو دیکھنے لگا۔

"شوکتی!" اس نے چند منٹ بعد پھر آہستہ سے آواز دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"وہ رسالے کہاں ہیں؟" ریحان نے یونہی بے مقصد سوال کیا۔

"ابھی لاتی ہوں۔"

ریحان ذرا احمقوں کی طرح کھڑا سر کھجاتا رہا۔ پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دیپالی اخبار اور رسالے اس کے پاس لے گئی۔

"آؤ باہر روشنی میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔" ریحان نے کہا۔ وہ یہ رسالے حاصل کر کے واقعی بے ح خوش نظر آ رہا تھا۔ جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا ہو۔

برآمدے میں چٹائی بچھا کر وہ سورج ڈوبنے تک رسالوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ ریحان دیپا و مختلف مضامین کے نکات سمجھاتا گیا۔

سامنے گھاٹ پر ناؤ آ کر رکی۔ مولوی صاحب اترے۔

زینب بی بی نے اندر سے آواز دی۔ "کھانا تیار ہے۔"

کھانے کے بعد دیپالی پھر برآمدے میں جا کھڑی ہوئی۔ اور افق پر تیرتے ہوئے چاند کو دیکھنے لگی۔ ن نزدیک کے کھمبے سے ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ رات کا اندھیرا سیلاب کی طرح بڑھتا آ رہا تھا۔

زندگی کا — ایک اور دن ختم ہو گیا۔ ایک انمول دن گذر گیا۔ ایک شعر پڑھا جا چکا۔ ن نے آہستہ سے اپنے آپ سے کہا۔ پھر اس نے مڑ کر دیپالی کو آواز دی۔

"گڈ نائٹ — دیپالی۔" اور وہ اپنے کمرے میں گھس گیا۔

دوسرے دن وہ پگڈنڈیوں پر سے گزر کر گاؤں میں گئے۔ کسانوں اور مچھیروں سے باتیں کرتے ۔ اور رات گئے واپس آئے۔ راستے میں دیپالی کی ساری ایک جھاڑی میں الجھ گئی۔ ریحان اس کی بنے کے لئے زمین پر دوزانو بیٹھ گیا۔ کانٹے نکالتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر دفعتاً پوچھا۔ "ساری آیا۔ تمہاری چوری کا پتہ چل گیا۔؟"

"جی ہاں۔" وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ اور چاند کی روشنی میں ساری کے چاک میں گرہ لگانے نش کرنے لگی۔

"مجھے ان ساریوں کے بکنے کا بڑا رنج ہوا تھا۔" ریحان نے کہا۔ "میں نے سوچا تھا، جو لڑکی اتنی ربانی دے سکتی ہے۔"

"میں نے کیا قربانی دی ہے۔" دیپالی نے جھنجھلا کر بات کاٹی۔

"کیوں۔ کیا میں جانتا نہیں کہ لڑکیوں کو اپنی ساریوں اور گہنوں سے کتنی وابستگی ہوتی ہے۔" وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "امّی کے پاس بھی دو بالوچر ساریاں تھیں۔ جب وہ بیاہ تھیں تو میری دادی اماں نے ان کو دی تھیں — وہ ساریاں میں تم کو دوں گا دیپالی۔"

دیپالی سکتے میں رہ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ وہ گھبرا کر پتھر پر سے اٹھی۔

"کیوں۔ کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" ریحان نے پریشانی سے دریافت کیا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔ گھر چلیئے۔"

وہ اونچے نیچے ٹیلوں، اور جھاڑیوں کو پھلانگتے جھونپڑے کی طرف روانہ ہو گئے۔ دیپالی نے اک دم چپ سادھ لی تھی۔

تیسرے روز وہ دونوں ٹہلتے ہوئے ندی کے ساحل پر کافی دور نکل گئے۔ جب ، اچانک دور ایک لانچ نظر آئی۔ دیپالی سہم کر ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گئی۔ یہ سرکاری لانچ تھی۔ غالباً معمول کے دو پر اس طرف سے گزر رہی تھی یا شاید کچھ سرکاری افسر شکار کے ارادے سے ادھر آئے تھے۔ لانچ شور مچاتی پانی پ گزر کر درختوں کی سرنگ میں غائب ہو گئی۔ دیپالی کا رنگ فق ہو چکا تھا۔

"ارے شوکتی۔ ایک ذرا سی سویلین لانچ سے ڈر گئیں۔"

دور سے گولیاں چلنے کی آواز آئی۔

"او ماں۔" دیپالی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

ریحان ہنسنے لگا۔ "گھبراتی کیوں ہو بھائی! افسر لوگ شکار کھیلنے آیا ہے۔ ہم لوگ یہاں بالکل ہیں۔ یہ دریا اور جنگل ڈیڑھ سو سال سے اپنے بچوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔" ریحان چند لمحوں تک جنگل کے اور گنجان سناٹے کی آواز سنتا رہا اور پھر کہنے لگا۔ "کل ہم جن کسانوں سے ملے تھے۔ اُن کے پُرکھے سنّو سال فرائضی تحریک میں لڑے تھے۔"

"ریحان۔ آپ کو اپنے راستے کے بارے میں مطلق کوئی شبہ، کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے؟" دیپالی تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

"نہیں جب اپنے اصل دشمن اور اس کے ایجنٹوں کو ہم پہچان چکے ہیں تو پھر الجھن کیا ہو سکتی وہ آگے جھک کر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا۔ "سنو دیپالی۔ یہ یاد رکھو کہ برطانوی سرمایہ داری ہندوستا قحط، غلامی، قرضے، ذات بندی اور فرقہ وارانہ کشمکش کی بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے۔ تمہیں معلوم ہے کُھلنا اور نواکھالی، جو اب ڈاکوؤں اور مفلس ماہی گیروں کا دیس ہے۔ مغلوں اور نوابوں کے عہد میں کتنے تجارتی علاقے تھے؟ یورپ میں جو ۲۰۰ برس تک سب سے زیادہ خونریز لڑائیاں لڑی گئیں وہ ہندو کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لئے لڑی گئی تھیں۔"

وہ اب درختوں کے نیچے سے نکل کر ساحل پر آ گئے۔ چاروں طرف پھولوں کی روشنی نے بڑی سہانی عجیب سی خوشبو پھیلا رکھی تھی۔

"تم جانتی ہو نا کہ سترھویں صدی میں ہندوستان کے فولاد کا پروڈکشن سارے یورپ کے فو پروڈکشن سے برتر تھا۔؟"

دفعتاً دیپالی کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔

"کیا ہوا ۔۔؟"

"کچھ نہیں! کوئی اس وقت یہاں آن کر دیکھے کہ اس شدید رومانی ماحول میں ریحان الدین احمد ترہویں صدی کے فولادی پروڈکشن کے متعلق سمجھا رہا ہے۔ اگر میں یہ بات واپس جا کر لوگوں کو کسی کو یقین آئے گا ۔ ؟"

"ہماری جدوجہد کا تدارک کرنے کے لئے ۔" ریحان کہتا رہا۔ "پچھلی صدی میں برطانیہ نے یہ ثابت ماکہ امپیریلزم کے سائے میں اس نے ہندوستان کو کتنا ترقی یافتہ بنایا ہے۔ انگریزی تعلیم اور ہسپتال اور ڈیاں۔ اور مشن کالج ۔"

"ریورنڈ بنرجی ۔" دیپالی نے زیرِ لب کہا۔

"کیا ۔۔؟"

"کچھ نہیں ۔"

"وہ خود کفیل ہندوستانی سوسائٹی جو مہابھارت کے زمانے سے لے کر مغل عہد تک قائم رہی تھی گریزی سرمایہ داری نے تباہ کر دیا۔ کیا سوچ رہی ہو ۔۔ ؟" ریحان نے ٹھٹھک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں اور بتائیے ۔"

"ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا۔" ریحان نے سر کھجا کر بات دوبارہ شروع کی۔ "مگر یورپ میں سرمایہ داری تھ نئی سماجی طاقتیں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ جو ہمارے ہاں پیدا نہیں ہوئیں ۔"

"لیکن کل تو آپ کہہ رہے تھے ہندوستانی گاؤوں کی اکونومی کی برطانیہ کے ہاتھوں تباہی کو کارل مارکس سماجی انقلاب بتایا ہے۔ کیونکہ ذات بندی کی بنا پر ہمارے گاؤں رجعت پسند تھے۔ اور ان میں ی کی گنجائش نہ تھی ۔"

"گڈ کوسیچن ۔۔" ریحان نے کہا اور جھونپڑے کی طرف لوٹتے ہوئے دیپالی کو ان دقیق مسائل کے نکات سمجھانے میں مصروف رہا۔

چوتھا دن۔ ریحان نے دیپالی کو برطانوی سرمائے کے تین ادوار ۔ کمپنی کے مرچنٹ سرمائے، انیسویں صدی ٹرل سرمائے اور جدید فنانس کے سرمائے اور نئے ہندوستانی سرمایہ داروں کے متعلق سمجھانے میں صرف کیا۔

پانچویں دن جب وہ کشتی رانی کے لئے نکلے تو اچانک بےحد ملول ہو کر اُس نے دیپالی سے پوچھا۔ "شوکتی۔ تم کتنے دن یہاں رہ سکتی ہو۔"

"لوک گیت جمع کرنے میں جتنے دن بھی لگ جائیں۔" اس نے ہنس کر جواب دیا۔

چھٹے دن وہ ناؤ کھیتے کھیتے بہت دور نکل گئے۔

پھولوں کے ایک کنج میں سے ناؤ گزرنے لگی تو اس نے اوپر جھکی ہوئی ڈالیوں میں سے چند توڑ کر اس کے بالوں پر برسا دیئے۔ ناؤ ایک گھاٹ کے قریب پہنچی۔

بنگال کے ہندو عوام کا عقیدہ ہے کہ جب رام اور سیتا نے بن باس لیا تو انہوں نے کافی سندر بن میں بھی گزارا تھا۔ کاٹھیاواڑ، وسطی اور جنوبی ہند سے لے کر چاٹگام تک ان علاقوں کے کا اپنے اپنے جنگلوں کے متعلق یہی عقیدہ ہے۔ ان جنگلوں میں رام اور سیتا انھیں اب بھی چلتے نظر آ سندر بن کے اسی تقدس کی وجہ سے نواکھالی اور کھُلنا کے جنگلوں، اور دریاؤں اور سندیپ جزیروں میں پرانے مندروں، مٹھوں اور سنیاسیوں کے جھونپڑوں کی بہتات ہے۔

ریحان نے ناؤ جس جگہ کنارے سے باندھی اس کے قریب بھی جنگل میں ایک پرانا مندر نظر آ تھا۔ کچھ فاصلے پر گاؤں کا بازار تھا۔

"بھوک لگ رہی ہے۔ آؤ کچھ کھا لیں۔" ریحان نے کہا۔ کنارے پر اُتر کر وہ جنگل داخل ہوئے۔ دفعتاً مندر اُن کے سامنے آ گیا۔

دیپالی نے غیر ارادی طور پر آنچل سے سر ڈھک لیا۔

"دسویں صدی [illegible] رہے ہے۔" ریحان نے کائی آلود معبد پر نظر ڈال کر ماہرانہ انداز میں کہا

"اوفوہ۔ [illegible]ت کے حالت خراب۔" دیپالی نے مسکرا کر کہا۔

"آؤ۔ اند[illegible]یتے ہیں۔ یہ تو بہت ہی تاریخی عمارت معلوم ہوتی ہے۔ یہ اسکلپچر دیکھ صریحاً سیتق پیریڈ۔"

ایک بوڑھا اندھا دھندا پجاری اندر سے پرچھائیں کی طرح برآمد ہوا۔ ریحان چپلوں سمیت پر چڑھ کر مورتیوں کی فریز کا مطالعہ کر رہا تھا۔ پجاری کو اپنی طرف تاکتے دیکھ کر اس نے دیپالی سے آ یں کہا۔ "اگر کچھ اعتراض کرے تو کہہ دینا میں تمہارا پتی دلیپ ہوں۔ روبل سرکار۔"

"شٹ اپ۔"

پجاری نے نذرانے کی امید میں مسکرا کر دیپالی کو اندر بلا لیا۔ اور ریحان کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

دوسرے لمحے وہ دونوں دُرگا بھوانی کی مورتی کے سامنے کھڑے تھے۔ ریحان نے چہرے پر مصنوعی عقیدت طاری کرلی۔

پجاری نے دونوں کی پیشانیوں پر تلک لگا کر انھیں پرشاد دیا اور دیوی کے چرنوں میں پڑے گیندے کے دو ہار اُن کے گلے میں ڈال دیئے اور جھکا جھک ٹٹول ٹٹول کر لوبان سلگانے میں مصروف ہو گیا۔۔

"لو بھئی مبارک ہو۔ شادی ہو گئی۔" ریحان نے چلاّ کر انگریزی میں کہا۔

دیپالی شرم سے لال بھبوکا ہو رہی تھی۔

ریحان نے جیب سے نکال کر پجاری کو کچھ روپے دیئے اور دیپالی کا بازو تھام کر اُسے باہر لے آیا ـــ "ارے بھائی ـــ" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہر انڈین فلم میں دیکھا ہے کہ ہیرو اور ہیروئن مندر میں جا پہنچتے ہیں اور پجاری عین اسی طریقے سے ہار پہنا کر ان کا بیاہ کر دیتا ہے۔ بھئی کمال ہو گیا۔"

"ریحان۔ وِل یُو پلیز شٹ اَپ۔" دیپالی نے کہا اور چند قدم چلنے کے بعد ایک شکستہ ستون پر بیٹھ کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

ریحان حیرت سے اُسے دیکھنے لگا اور جب اس ہندو لڑکی کی جذباتی کیفیت اور موقع کی نزاکت کا اسے اندازہ ہوا تو وہ گھبرا کر اس کے قریب دو زانو جھک گیا۔ اور لجاجت سے کہنے لگا۔ "ارے بیوقوف۔ نہیں ہوا بیاہ۔ کون گدھا کہتا ہے کہ بیاہ ہو گیا۔ عجیب بیوقوف لڑکی ہو۔ ارے تم ابھی تک مذہبی توہمات کی قائل ہو۔ مندر اور پجاری ـــ اور ـــ کمال ہے۔" وہ سر کھجانے لگا ـــ ارے احمق لڑکی۔ شادی صرف کورٹ میں ہوتی ہے۔ تم اور میں مندر اور مولوی کے قائل ہی کہاں ہیں۔ اور ـــ اور کوئی ـــ تک بھی ہے بھلا ـــ چلو اٹھو ـــ عجیب بے قوف لڑکی ہو بھئی۔"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر پگڈنڈی پر لے آیا۔ گاؤں پہنچ کر وہ ایک چائے خانے میں گئے اور لکڑی کی بنچ پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور چائے پی۔ دیپالی بالکل چپ رہی۔ ریحان اسے بار بار پریشانی سے دیکھتا تھا۔ پھر وہ چائے خانے میں جمع لوگوں سے باتیں کرنے لگا۔ یکلخت اسے خیال آیا کہ وہ سخت غیر محتاط ہو گیا ہے۔ یہ گاؤں کھُلنا شہر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور پولیس کے سپاہی بھی زیادہ دُور

نہیں ہوں گے۔ چائے ختم کرکے وہ دونوں گھاٹ پر آئے اور کشتی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہو گئے۔

"دیپالی" کشتی ندی کے دھارے پر آئی تو ریحان نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔ میں نے مذاق کیا تھا۔ اگر تم کو بُرا لگا ہے تو مجھے معاف کر دو۔"

وہ ایک دم پھر رونے لگی۔

"او مائی گاڈ ــــ" ریحان نے بازو پھیلا کر آسمان کو دیکھا۔ "حد ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔ اب وہ رو رہی تھی اور ہنس رہی تھی۔ ریحان خاموش رہا۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ اُس کی اور اس لڑکی کی زندگی اس نوکا کی مانند طوفانوں سے بے پرواہ، دریا کے پُرشور دھارے پر کسی نامعلوم ساحل کی طرف بہہ رہی ہے۔ اب وہ ایک دوسرے کے رحم وکرم پر زندہ رہیں گے۔

اب چاند بہت دیر میں طلوع ہوتا تھا۔ سُندربن پر گھُپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس رات جب جھونپڑے میں سب لوگ سو گئے تو دیپالی چپکے سے اٹھی۔ طاق میں رکھے خالی دیوں میں سے ایک دیا نکال کر اُس میں تیل ڈالا۔ اور بتّی لگائی۔ پھر دیا اور کاغذ کا ایک ٹکڑا لے کر باہر چلی گئی۔ اور ندی کے کنارے بیٹھ کر اس۔ کاغذ کی چھوٹی سی ناؤ بنائی۔ دیا جلا کر اس ناؤ میں رکھا اور اُسے پانی میں بہا دیا۔ اور گھاٹ پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بے حد دھیان اور فکر مندی سے اُسے دیکھنے لگی۔ دیا دریا کی دھار پر دور تک بہتا چلا گیا اور پھر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اچانک دیپالی کو احساس ہوا کہ ریحان اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں کھڑا اُسے ندی میں چراغ بہاتے دیکھ رہا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھی اور سیڑھی چڑھ کر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دوسری صبح وہ چولہے کے پاس بالکل نارمل اور بشاش نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

ریحان نے قریب آکر بیٹھتے ہوئے کہا "گڈ مارننگ۔"

"گڈ مارننگ۔"

زینب بی بی اور مولوی صاحب اس سے باتیں کرنے لگے۔ مولوی صاحب اس سے لڑائی کی خبریں پوچھ رہے تھے۔ ریحان نے چائے ختم کرنے کے بعد اپنے کمرے میں جا کر ریڈیو لگایا۔ دیپالی زینب بی بی کے

کے ساتھ کھانا پکانے میں مشغول ہوگئی۔

اچانک ریحان کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ "دیپالی۔"

"کیا ہوا؟" وہ ڈوئی لئے لئے برآمدے میں گئی۔

"ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا۔"

لوک گیت جمع کرنے کی مدت ختم ہوئی۔ دیپالی اور ریحان گھاٹ پر کھڑے تھے۔ قرب و جوار کے ادوں میں بنی ہوئی دلکش حصیر چٹائیاں فروخت کے لئے منڈی لے جانے والے چھتریاں لگائے کاریگروں ہجوم ساحل پر جمع تھا۔ ماہی گیر اپنی کشتیاں لے کر نکل رہے تھے۔ مولوی ابوالہاشم حسبِ عادت خاموشی سے سر جھکائے اپنی کشتی کے بادبان درست کرنے میں منہمک تھے۔ وہ دیپالی کو باگھیر گھاٹ تک پہنچانے لے تھے۔ بہت لمبا سفر تھا۔

رات وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں بالکل چپ چاپ کھڑا اندھیری ندی پر سے گذرتی ہوئی کشتیوں دیکھ رہا تھا۔ دیپالی اس کے ٹرنک پر ریڈیو کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے ریحان سے کہا تھا۔ "آپ کو اب ڈکوارٹرز سے رابطہ قائم کرنا چاہیئے۔ اس نئی جنگ کی وجہ سے سچویشن بدلنے والی ہوگی نا۔؟"

وہ چونک اٹھا۔ "جنگ۔ ؟ کیسی جنگ۔؟" اس نے جھنجھلا کر پوچھا۔

دیپالی نے تعجب اور اداسی سے اس پر نظر ڈالی۔ "آپ حقیقت سے اتنی آسانی سے کٹ جاتے ہیں۔"

"ایسا ۔۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا شوکی۔!" اس نے آہستہ سے جواب دیا اور اسی طرح کھڑا ندی یکھتا رہا۔

"کل۔ اب میں واپس جانا چاہتی ہوں۔" دیپالی نے کہا۔

"کیوں۔ ؟" اس نے غصے سے پوچھا۔

"ارے۔ ریحان۔ میں یہاں ہمیشہ تو نہیں رہ سکتی۔"

"وہ اس کی طرف مڑا۔ "ہاں تم ٹھیک کہتی ہو، تم یا میں ہمیشہ تو یہاں نہیں رہ سکتے۔ شاید کہیں نہیں رہ سکتے۔" پھر چند لمحوں بعد اس نے برآمدے میں جا کر مولوی ابوالہاشم سے دیپالی کی واپسی کے انتظامات متعلق بات چیت شروع کر دی تھی۔

یہ تین دن پہلے کی بات تھی۔ آج وہ سندر بن سے واپس جا رہی ہے باگیرہاٹ پہنچ کر وہ اسٹیمر کے ذریعے باریسال اور فرید پور کے دریاؤں پر سے گزرتی نارائن گنج چلی جائے گی۔

ریحان اب پریشانی کے ساتھ کلکتے کے خفیہ ہیڈ کوارٹرز سے کسی اطلاع کا منتظر تھا۔ پارٹی کے سارے بڑے لیڈر دور تپتے ہوئے راجستھان کی دیولی جیل میں بند تھے۔ ان کے پاس سے اسمگل ہو کر کسی نئے ڈائرکٹو کا کلکتہ ہوتے ہوئے سندر بن پہنچنا ہفتوں کا نسخہ تھا۔ سندر بن پر بارشیں شروع ہو چکی تھیں "میں یہاں جانے کب تک رہوں گا۔" ایسا لگتا ہے کہ جیسے کلکتے کے ساتھی مجھے بھول ہی گئے ہیں۔" اس نے سچ بڑی ملول آواز میں دیپالی سے کہا تھا۔

اور اب دیپالی چھتری کے نیچے چھپی گھاٹ پر کھڑی تھی اور کچھ فاصلے پر چھتریوں کا میلہ سا لگا تھا سب بار بار آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ جھڑی لگتی ہے تو سندر بن کے جنگل اور کھال اور دریا اور ساحل اور سمندر سب پانی میں ڈوب جاتے ہیں۔ جیسے کسی نے ایک بڑے سے واٹر کلر لینڈ اسکیپ کو واش کے بعد پانی کی چلمچی ہی میں چھوڑ دیا ہو۔ اور سارے رنگ پانی میں پھیل کر آپس میں گڈمڈ ہو جائیں۔

ریحان چھتری لگائے دیپالی کے قریب کھڑا تھا۔ اچانک اس نے بڑے غصے سے کہا: "تم بھی جا رہی

"چلو بیٹی کلثوم ـــ" مولوی ابوالہاشم نے اسے آواز دی۔ وہ اور زینب بی بی اسے باضابطہ کلث ہی پکارتے تھے۔ انھیں یقین کامل تھا کہ بہت جلد یہ لڑکی ریحان کے ہاتھوں پر مشرف بہ اسلام ہو کر اس سے نکاح کر لے گی۔ جانے ریحان نے ان دونوں بھولے میاں بیوی کو کیا پٹی پڑھا رکھی تھی۔ زینب بی بی نے تو ایک رات ریحان سے بڑی رازداری سے کہا تھا کہ کلثوم کو مولوی صاحب کلمہ پڑھا دیں اور شربت کے پیالے پر نکاح ہو جائے۔ یوں بھی یہ برسات کا زمانہ اور شادیوں کا موسم تھا۔ ان بیچاری نے برسوں سے سینت کر رکھ ہوئی ایک نئی سوتی ساری بھی نکال کر ریحان کو پیش کر دی تھی۔ یہ ساری انہوں نے اپنی بہو کے لئے رکھی تھی اور جب ریحان نے ان کو سمجھایا کہ پہلے اسے گاؤں جا کر اپنے باپ سے بھی اجازت لینی ہے تب بھی وہ یہ ساری اپنی طرف سے تحفتہً دینے پر مُصر رہی تھیں۔ ریحان کے انکار پر انہوں نے کہا تھا۔ ہمیں غریب سمجھ کر ہم سے یہ تحفہ نہیں لینا چاہتے ہو بھیا اور رونے لگیں تھیں۔ لیکن ریحان بے حد سٹپٹایا تھا۔ اس مندر واقعے کے بعد اب دیپالی سے یہ کس طرح کہے کہ یہ سُرخ ساری بھی لے لو، جسے پہنا کر زینب بی بی تمہیں دل بنانا چاہتی ہیں۔ عجب گھپلا ہو رہا ہے یہ خدا کی قسم۔ اس نے بیحد الجھ کر سوچا تھا۔ مگر زینب بی بی کا دا

رکھنے کے لئے وہ ساری ان سے لے کر ٹرنک پر رکھے ہوئے اخباروں کے نیچے چھپا دی تھی۔ زینب بی بی کے جانے کے بعد دیپالی ریڈیو سننے کے لئے اس کے کمرے میں آئی اور ٹرنک پر بیٹھنے کے لئے اس پر سے اخبار اٹھائے تو نیچے سرخ ساری پر اس کی نظر پڑی اور ریحان خود شرم سے سُرخ ہو کر فوراً کمرے سے باہر بھاگ گیا تھا۔

دیپالی چھتری ذرا اونچی کر کے اس کی طرف مڑی۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں دونوں کیا دیکھتے ہیں کہ زینب بی بی اپنی خستہ چھتری لگائے بغل میں ایک بنڈل دابے افتاں و خیزاں پگڈنڈی پر سے بھاگتی چلی آ رہی ہیں۔ نزدیک آ کر انھوں نے اخبار میں لپٹی ہوئی سُرخ ساری دیپالی کے ہاتھوں میں ٹھونسی اور کچھ کہے سنے بغیر اسی سرعت سے گھاٹ کی بھیڑ میں غائب ہو گئیں۔

چند قطرے ٹپ ٹپ بنڈل کے کاغذ پر گرے۔ دیپالی نے اوپر دیکھا۔ شاید بارش آ گئی۔ مگر وہ ریحان تھا جو اس کے قریب کھڑا تھا۔ یہ آنسو اسی کی آنکھوں سے گرے تھے۔

وہ دونوں چپ چاپ کھڑے دریا کے کنارے منظر کو دیکھتے رہے۔ کشتیوں نے لنگر اٹھا دیئے تھے۔ بادبان کھول دیئے گئے تھے۔ قسم قسم کی کشتیاں سطح آب پر بکھر چکی تھیں۔ مولوی ابوالہاشم نے اپنی کشتی جیٹی سے لگا دی اور دوبارہ پکارا "کلثم بیٹی۔ اللہ کا نام لے کر آ جاؤ۔ اللہ تم دونوں کا نگہبان ہے"

"اللہ" ۔ دیپالی نے چپکے سے دل میں دہرایا اور سرخ ساری کا بنڈل مضبوطی سے بازوؤں میں جکڑ کر آگے بڑھے اور کود کر کشتی میں بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب کا چھوٹا لڑکا جو اب تک چٹائی کی چھت کے اندر دیپالی کا سامان رکھنے میں مشغول تھا باہر نکلا اور دونوں باپ بیٹوں نے چپّو سنبھالے۔ ریحان نے گھاٹ کی سیڑھیوں پر آ کر الوداع کے لیے ایک ہاتھ اٹھایا اور پھر گرا دیا۔

عین اسی وقت ایک نوکا کشتیوں کی بھیڑ میں سے تیزی سے نکلتی سامنے آ کر مولوی صاحب کی کشتی سے لگ گئی۔ مولوی صاحب کا ہم شکل ایک داڑھی والا نوجوان کود کر گھاٹ پر اُترا ۔۔۔ اس نے اپنے باپ کو اور دیپالی کو آداب کیا اور ریحان کے پاس جا پہنچا۔

"ریحان بھائی ۔ ۔ ۔"

ریحان جو اب تک سر جھکائے کھڑا تھا چونک پڑا۔

"تم اس وقت کیسے ؟"

ابوالقاسم نے اپنی تہمد پر بندھی پیٹی کے نیچے سے ایک کاغذ نکالا اور آہستہ سے کہا : ادماوی

نے آپ کو کلکتے فوراً بلایا ہے۔ کل رات میرے پاس ستیندر ـــــ"

دیپالی نے صرف اتنا ہی سنا۔ اُوما دیبی نے آپ کو کلکتے بلایا ہے۔ اُوما دیبی نے آپ کو فوراً ـــ اُوما دیبی نے آپ کو ـــ اُوما دیبی نے آپ کو فوراً ـــ اُوما دیبی نے ـــ

کشتی گھاٹ سے الگ ہو کر پانی میں پہنچ چکی تھی۔

اُوما دیبی نے آپ کو فوراً بلایا ہے۔ اُوما دیبی نے۔

"شوکتی ـــ" گھاٹ پر سے ریحان کی آواز آئی۔ "ٹھہرو۔ میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔"

"میں سیدھی ڈھاکے جاؤں گی۔" اس نے یکلخت ذرا خشکی سے جواب دیا۔

"ہاں۔ ہاں۔ لیکن کچھ دور تک ـــ"

ریحان تازہ انگریزی اخباروں کا پلندہ ابوالقاسم کے ہاتھ سے لے کر اس کے ساتھ آہستہ آہستہ گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ اب وہ دیپالی کے وجود سے بالکل بے خبر ہو چکا تھا۔

وہ چند منٹ تک اسی طرح کشتی میں بیٹھی رہی۔ پھر مولوی ابوالہاشم نے آنکھوں آنکھوں میں اسے اشارہ کیا کہ وہ گھاٹ پر اُتر آئے۔

بوڑھے مولوی صاحب دنیا دیکھ چکے تھے۔

۱۶

ارجمند منزل

نواب قمر الزماں چودھری کا کتب خانہ ارجمند منزل کے بیرونی، طویل برآمدے کے ایک سرے پر تھا۔ اس کمرے کے سیاہ و سفید ٹائلوں کے فرش پر بیش قیمت کشمیری قالین بچھا تھا۔ جس میں بنا ہوا "شجرِ حیات" کا ایرانی نمونہ اب کافی گھس چکا تھا۔ دیواروں کے برابر لحیم شحیم الماریاں ایستادہ تھیں۔ ایک طرف آبنوس کی بڑی میز پر چاندی کا قلمدان اور کاغذ اور کتابیں نفاست سے موجود تھیں۔ بڑے دریچے کے نیچے، جو پہلو کے باغ میں کھلتا تھا۔ نواب صاحب کی آرام کرسی بچھی تھی اور چاندی کی نقشیں پتر چڑھی نیچی چوکی پر پیچوان دھرا تھا۔ دیواروں پر سر سید، حالی، سر سلیم اللہ اور شیر بنگال اے۔ کے۔ فضل الحق کی تصاویر آویزاں تھیں۔ ڈھاکے کے مغل قلعے لال باغ کا بڑا دلآویز واٹر کلر، آتشدان کے اوپر اور بوڑھی گنگا کے کنارے شائستہ خاں کے دور میں بنی ست گنبد مسجد کا واٹر کلر مقابل کی دیوار پر سجا تھا۔ بی بی پری کے مقبرے اور حسینی دالان کی مختصر تصاویر ایک الماری کے اوپر رکھی تھیں۔ جناح صاحب کا دستخط شدہ پورٹریٹ میز کی عقبی دیوار پر آویزاں تھا۔ مسلم بنگال کے پرانے اور نئے بنگلہ اخبار شدھاکر، نوبو نور، بنگو سلمانیر شاہتیہ پتریکا، اسلام پرچارک، المسلم اور میہر کے مجلد فائل اور الہلال، پیسہ اخبار، ہمدم، میندا، اور ڈھاکے سے شائع ہونے والے پرانے اردو رسالوں جادو اور المشرق کے فائل ایک الماری ں مقفل تھے۔ دوسری الماریوں میں بنگلہ، فارسی اور اردو کی کتابوں اور قدیم نسخوں کا اچھا خاصہ خیرہ موجود تھا۔ انگریزی کتابوں کی تعداد مقابلتاً کم تھی۔

جولائی سن ۱۹۴۱ء کے ایک اتوار کی صبح نواب قمر الزماں چودھری اپنی آرام کرسی پر نیم دراز پیچوان نے منہ میں لگائے صوبائی مسلم لیگ کے ماہانہ جلسے کے لئے جو تیسرے پہر کو ارجمند منزل کے بڑے ہال منعقد ہونے والا تھا، اپنی تقریر لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ تازہ اخبارات کا انبار اُن کے نزدیک اخروٹ

کی کشمیری میز پر موجود تھا۔ نواب صاحب آنکھیں بند کئے اپنی بلند پیشانی پر انگلی پھیرتے ہوئے تقریر کا افتتاحی پیراگراف سوچ رہے تھے۔ چند منٹ بعد انہوں نے فاؤنٹن پن اٹھا کر بنگلہ میں تقریر لکھنی شروع کردی۔

نواب قمر الزماں چودھری بڑی بڑی آنکھوں والے ایک وجیہہ و ملیح پچاس سالہ ثقہ، وضعدار ارسٹوکریٹ تھے۔ اُن کے والد نواب نورالزماں مرحوم ضلع فرید پور کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ انھوں ہی نے ارجمند منزل تعمیر کروا کے ایبسنٹی لینڈ لارڈ کی حیثیت سے ڈھاکے میں اقامت اختیار کی تھی۔ نواب صاحب مرحوم نے خود کو نوابین ڈھاکہ کے توڑ کا رئیس سمجھنے کے شوق میں راگ رنگ تھیٹر اور دوسرے رئیسانہ مشاغل پر بے تحاشا روپیہ اٹھایا تھا۔ اس وجہ سے اب بھی ان کے جانشین نواب قمر الزماں کا شہر کے چوٹی کے مسلمان رؤسا میں شمار ہوتا تھا۔ نواب نورالزماں مرحوم کو سیاست سے بھی دلچسپی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں ڈھاکے میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے اوّلین اراکین اور سرپرستوں میں شامل تھے۔ ڈھاکے کے اکثر مسلمان رئیسوں کی مانند نواب صاحب مرحوم کے یہاں بھی اردو کا چرچا تھا اور بچوں کو گھر پر بنگلہ کے ساتھ ساتھ اردو پڑھائی جاتی تھی۔ نواب قمر الزماں کی والدہ نور النساء بیگم دہلی اور لاہور کے زنانہ رسالوں عصمت اور تہذیبِ نسواں کی خریدار تھیں اور "مرسلہ بیگم نورالزماں چودھری ڈھاکہ بنگال" کی طرف سے کبھی کبھی اصلاحِ معاشرت پر ان کے مضامین ان جریدوں میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ان کی بہو یعنی بیگم قمر الزماں کُشتیا ضلع کے ایک خالص "بنگالی اسپیکنگ" زمیندار کی بیٹی تھیں۔ انھیں اردو بالکل نہیں آتی تھی۔ مگر جہاں آرا، اور اس کے بھائی اور بہنوں کو گھر پر اردو پڑھائی گئی تھی۔

اس وقت جبکہ نواب قمر الزماں اپنی خاموش اسٹڈی میں سکون سے بیٹھے تقریر لکھ رہے تھے۔ باہر کافی شور مچ رہا تھا۔ کوٹھی کے وسطی ہال میں لیگ کے جلسے کے لئے ایک قطار میں کرسیاں بچھائی جا رہی تھیں۔ پوربی مالی رحم سرن اسٹیج کی میز پر رکھے گلدان میں پھول سجا رہا تھا۔ باقی دوسرے ملازمین کمرے کی صفائی میں لگے تھے۔

لیکن اندر ستانخانے میں جس قدر چہل پہل اور رونق تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ تین دن بعد نواب قمر الزماں چودھری کے فرزند اور جانشین نواب زادہ نیّر الزماں کی بارات چڑھنے والی تھی۔ شادی کے جوڑے سِل رہے تھے۔ جوہری پھیرے لگا رہے تھے۔ گیت گائے جا رہے تھے۔ فرید پور سے رشتہ دار آنے

روع ہو گئے تھے۔ بارات دیناج پور جائے گی۔

تقریر لکھتے لکھتے نواب صاحب نے اُٹھ کر رسالوں کی الماری میں سے المشرق کا فائل نکالا۔ اہانہ رسالہ تقسیم بنگالہ کے بعد جب لارڈ کرزن نے آسام اور مشرقی بنگال کو ملا کر مسلم اکثریت کا ایک بہ بنا دیا تھا، مسلم بنگال کی ایک مشہور ہستی حکیم حبیب الرحمٰن نے ۱۹۰۶ء میں نکالا تھا تاکہ اردو ذریعہ بقیہ مسلمانانِ ہند سے ذہنی اور سیاسی رابطہ قائم کیا جا سکے۔ یہ پاکستان کی اولین داغ بیل ی۔ نواب قمر الزماں نے اپنی تقریر میں اس رسالے کے پہلے شمارے کے ایڈیٹوریل سے ایک اقتباس نقل ۔ "۱۶ اگست ۱۹۰۶ء اگر غور سے دیکھیے تو کیسی سعید تاریخ ہے کہ اس دن ہم کو زندگی اور موت رض و صحت کا پورا پورا احساس ہوا اور ہم خواب اور نیم خوابی سے گھبرا کر چونک پڑے۔ مسلمانوں کے اب کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ بحیثیت برٹش انڈیا کے ایک مستقل آرگنائزیشن قائم کریں۔ بنگالی اخبارو رزِ تحریر اور درشت لہجے سے اب ہمارا کلیجہ منہ تک آ گیا ہے۔ اور ہم کچھ نہیں جانتے کہ آخر ہماری حالت ہو گی؟ ہم اپنے لیڈروں کے متعلق کون سی پھبتی ہے جو روزانہ نہیں سنتے۔ ہمارے لیڈر کیوں بُرے ہیں۔ لئے کہ وہ بہت سا ذاتی نقصان برداشت کر کے صرف اس لیے پارٹیشن کے مؤید ہوئے ہیں کہ یہ مسلمانوں لئے مفید ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے باوجود ملکی ہمدرد ہونے کے نام نہاد سودیشی تحریک میں جو پارٹیشن ستراد کے لئے ایک آلہ ہے، شرکت گوارا نہ کی کہ اس سے اپنی قوم گھاٹے میں رہتی۔"

اقتباس کا بنگالی ترجمہ کرنے کے بعد انھوں نے فائل بند کیا اور ۱۹۰۶ء سے لے کر اب تک کی اسی جدوجہد کا مختصر تذکرہ قلمبند کرنے کے بعد میز پر بکھرے ہوئے اخباروں میں مسلم لیگ کے ہفتہ خبار ڈان کا تازہ شمارہ تلاش کرنے لگے۔ اس شمارے میں مجوزہ پاکستان کا تفصیلی نقشہ شائع ہوا اور نواب صاحب اس نقشہ کے حوالے سے بنگال و آسام کے متعلق چند اہم نکات اپنی تقریر میں شامل اہتے تھے۔ جب وہ پرچہ نہیں ملا جو کل شام کی ڈاک میں دہلی سے آیا تھا۔ تو انھوں نے ذرا بے دماغ ہو کر بجائی۔

ایک ملازم کتب خانے کے دروازے کا اودا مخملیں پردہ سرکا کر اندر داخل ہوا۔

"تازہ ڈان اخبار —" نواب صاحب نے کہا۔ "نیر میاں سے پوچھو۔ وہ تو نہیں اٹھا لے ان سے کہنا ہمیں پاکستان کا نقشہ چاہیے۔"

"حضور ۔۔۔ پاکستان کا نقشہ تو نیّر میاں نے اس میں سے کاٹ کر باہر برآمدے میں دیوار پر لگا دیا ہے ۔ فرمائیے تو اکھیڑ لاؤں ۔ مگر دیوار خراب ہو جائے گی ۔"

"اوہ ۔۔۔ اچھا ۔ ٹھیک ہے ۔ رہنے دو ۔ جاؤ ۔"

ملازم باہر چلا گیا ۔ نواب صاحب پھر لکھنے میں مصروف ہو گئے ۔

اور اُس وقت عبدالقادر کوچوان کی کھڑکھڑاتی ہوئی گھوڑا گاڑی ارجمند منزل کی برساتی میں داخل ہوئی ۔

دیپالی سرکار گاڑی کے دروازے کی چٹخنی کھول کر نیچے اتری ۔ عبدالقادر کو کرایہ ادا کیا ۔ عبدالقادر حسب معمول سر جھکائے گھوڑے کو ہنکاتا آگے بڑھ گیا ۔ سر جھکائے دیپالی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ گئی لیکن اندر جاتے ہوئے اس کی نظر صدر دروازے کے برابر والی دیوار پر پڑ گئی جہاں پام کے گملے کے اوپر نیّر الزماں نے مجوزہ پاکستان کا نقشہ ڈرائنگ پنوں کے ذریعہ لگا دیا تھا ۔

دیپالی ٹھٹھک گئی اور آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگی ۔ پنجاب ، آسام ، بنگال ، کشمیر ، سرحد و سندھ ۔ بلوچستان ۔ وہ تیوری پر بل ڈال کر بڑے غور سے اس نقشے کو دیکھ رہی تھی ۔ اس وقت تک ملازم ہال میں کرسیاں لگا کر جا چکے تھے ۔ اور طویل برآمدہ خاموش پڑا تھا ۔

اتنے میں ایک گمبھیر ، نرم آواز نے اسے چونکا دیا ۔

"دیپالی بیٹی ۔۔۔ اتنے دھیان سے کیا دیکھ رہی ہو ۔ ؟"

اُس نے مڑ کر دیکھا ۔ نواب قمرالزماں اپنے کتب خانے کے دروازے میں کھڑے شفقت سے مسکرا رہے تھے ۔

اُسے جہاں آرا کے بابا بہت اچھے لگتے تھے ۔ اس قدر مہذب اور نفیس اور خوش اخلاق ۔ گو ان سے باتیں کرنے کا بہت کم اتفاق ہوتا تھا ۔ لیکن وہ خود اپنے باپ کی اتنی منہ چڑھی اور لاڈلی تھی اس لئے نواب صاحب سے بھی بے تکلفی سے بات کر لیتی تھی اور ان سے ذرا خائف نہ تھی ۔ اب اس نے آنکھیں پھیلا کر انھیں دیکھا اور پوچھا ۔ "یہ کیا ہے ۔ کاکا ۔ ؟"

"بیٹی ، تم کو تو جاننا چاہئے ۔ ایک روز بہت جلد ۔ انشاءاللہ جب پاکستان بن جائے گا تو

اکستانی ہوگی۔"

"میں ۔ کاکا ۔" اُس نے اسٹڈی کے دروازے کی طرف جاتے ہوئے دریافت کیا۔

نواب صاحب نرمی سے ہنسے ـــــ اپنی ساری اولاد میں جہاں آرا ان کو سب سے زیادہ ری تھی۔ اس وجہ سے جہاں آرا کی سہیلیوں کا وہ بڑا خیال کرتے تھے۔ علاوہ ازیں دیپالی ان کے نے دوست کی لڑکی تھی

"اتنی دیر میں کیوں آئیں۔ تمہارا صبح سے انتظار کیا جا رہا ہے۔" انہوں نے کہا۔ "اب جاؤ جلدی بر۔ جہاں آرا تمہارے لئے بہت سا کام لئے بیٹھی ہے۔"

"ابھی جاتی ہوں کاکا۔ مگر پہلے آپ سے کچھ پوچھنا چاہوں گی۔" دیپالی نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں۔ ہاں پوچھو بیٹی۔ آؤ۔" نواب صاحب نے پردہ ہاتھ سے ایک طرف کو اُٹھا دیا۔ دیپالی سٹڈی میں داخل ہوئی۔ نواب صاحب جا کر اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ دیپالی قریب ایک صوفے پر گئی۔

"تمہارے باپ کیسے ہیں۔"

"اچھی طرح ہیں۔"

"اچھا ذرا میں یہ کاغذ پتر سمیٹ لوں، پھر تم سے بات کرتا ہوں۔" نواب صاحب نے عینک کیس ں رکھ کر کاغذات ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر سرکار اسکول میں، نواب قمر الزماں کے ہم جماعت تھے۔ ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد کچھ عرصہ ہ ارجمند منزل کے فیملی ڈاکٹر رہے۔ مارے دوستی کے فیس نہیں لیتے تھے۔ اس لئے نواب صاحب نے یس کے بجائے تحفے تحائف اُن کے گھر بھجوانے شروع کئے۔ ڈاکٹر سرکار نے ارجمند منزل ہی آنا چھوڑ دیا۔ اب صاحب کو اُن کی مالی حالت کا خوب اندازہ تھا۔ دُرگا پوجا اور عید کے مواقع پر جہاں آرا نے یپالی کو ساریاں تحفے میں دیں تو اُن کو دیکھ کر ڈاکٹر سرکار کا منا اتر گیا۔ انہوں نے دیپالی سے کہا۔ "جب م اس کو کچھ دے نہیں سکتیں تو اس سے لیتی کیوں ہو۔" لہٰذا یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

"بھئی ہم کیا کریں۔" نواب قمر الزماں نے اخباروں کا پلندہ ایک تپائی پر سرکاتے ہوئے کہ ہمارے یہاں تم جانتی ہو۔ بیماری کا سلسلہ لگا رہتا ہے۔ جہاں آرا کی ماں اختلاجِ قلب کی مریضہ ہیں۔

آئے دن ڈاکٹر کی حاجت۔ مگر تمہارے باپ ایسی الٹی کھوپڑی کے آدمی ہیں۔ مجبوراً ہم نے ڈاکٹر گھوش کو لگا لیا۔ بتاؤ بھلا اگر ڈاکٹر اور وکیل دوستوں سے فیس لینا چھوڑ دے، تو کرے کیا۔"

"آپ ان کو سمجھائیے۔" دیپالی نے کہا۔

"خبطی ہیں۔ اُن کو کون سمجھا سکتا ہے۔ تم بتاؤ بیٹی۔ ایسی پریشان سی کیوں نظر آ رہی ہو اور تمہارا شانتی نکیتن کیسا چل رہا ہے؟"

"ٹھیک ہے کاکا۔"

"بنوئے بابو ایک روز ملے تھے، بتلا رہے تھے کہ تم چھٹیوں میں گھر آنے کے بجائے لوک گیت جمع کرنے سنتھال پرگنہ چلی گئیں۔"

"جی ہاں۔ کاکا۔" دیپالی نے بڑی بے چینی سے مجرموں کی طرح صوفے پر پہلو بدلا۔

"بے چارے بہت سخت پریشان تھے کہ برسات کا زمانہ ہے۔ جانے کہاں ماری ماری پھر رہی ہوگی کہیں بیمار نہ پڑ جائے۔"

دیپالی اپنے آپ سے نظریں چرا کر دریچے سے باہر دیکھنے لگی جہاں کاسنی پھول کھلے تھے۔ کیسا پُرسکون سہانا اتوار کا دن تھا۔ مگر نہ جانے کیوں دل کو پنکھے سے لگ گئے اور پاکستان کا نقشہ —— اس نے بابا کو اتنا بڑا دھوکا دینے کے احساس کو نظر انداز کرنے کی سعی کرتے ہوئے دوبارہ نواب صاحب کو مخاطب کیا۔ "پاکستان واقعی بن جائے گا کاکا —؟"

"انشاءاللہ ——" اب وہ کاغذات ایک طرف رکھنے کے بعد آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر کسی سوچ میں کھو چکے تھے۔ دیپالی نے اُن کے خیالات میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور دیوار پر لگے واٹر کلرز کو دیکھنے لگی —— ڈھاکے کے آثارِ الصنادید —— قلعہ لال باغ۔ ست گنبد مسجد۔ بی بی پری کا مقبرہ۔ حسینی دالان۔

نواب قمر الزماں بنگال کے اس اسلامی ماضی کے وارث ہیں۔ دیپالی نے سوچا۔ اور اسے یاد آیا۔ اُس کی جنم بھوم میمن سنگھ کے وسیع و عریض، سر سبز علاقے میں۔ ہندو اور بودھ بنگال کے پُرفسوں اور لرزہ خیز، کھنڈر بھی موجود ہیں تو میں صرف اس ہندو ماضی کی وارث ہوں؟ اس ماضی اور اس اسلا ماضی کی وراثت کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ——؟

لیکن ریحان نے سندربن میں ایک روز اُس سے کہا تھا۔ تاریخ آپ سے آپ ہمیں سمجھا دیتی ہے
ہم خود تاریخ ہیں۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیاں تاریخ کی مجموعیت کی سب سے بڑی تفسیر ہیں۔
نواب صاحب آنکھیں بند کیے، پیچوان کے آہستہ آہستہ کش لگا رہے تھے۔ اور غالباً دیپالی
ں سے بے خبر ہو چکے تھے۔ دیپالی نے انھیں دیکھا۔ مہذب، نیک نفس، شریف النفس، مسلم
لیڈر۔ لیکن اپنی نیک نفسی اور خلوص نیت کے باوجود اُن کو عبدالقادر کوچوان کے مسائل
ساس ہے؟ عبدالقادر کوچوان پاکستان کے قیام سے مستفید ہوگا۔؟ مجھے یہ سب کون
ے ؟

ریحان نے کہا تھا —— دیپالی — ہندوستان کے نوّے فیصدی انسان مفلس ہیں اور اہلِ
ی کی تلخی، کم مائیگی، کمتری اور بے عزتی کے احساسات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ زندہ رہنے کی
لچر اور اخلاق اور مذہب اور فلسفے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ انسان کو جھوٹا اور گھٹیا اور کمینہ اور
عاری بنا دیتی ہے۔ ہم ہندوستانی اِسی لئے جھوٹے اور کمینے اور کردار سے عاری اور بے
— ماضی سنہرا تھا۔ کیونکہ آبادی کم اور گیہوں اور چاول وافر تھا۔ لیکن کولونیل نظام اور
آبادی نے ملک کا کچومر نکال دیا۔ ہندوستان والوں کو جھوٹا اور بے ایمان بنا دیا۔ ہر کولونیل ملک
ے لامحالہ گھٹیا اور کردار سے عاری ہو جاتے ہیں۔ غلامانہ ذہنیت بے معنی اصطلاح نہیں ہے۔
سورج اب نصف النہار پر پہنچنے والا تھا۔ کتب خانے کے وسیع دریچوں میں سے آتی ہوئی
ل نے شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے بیٹے، صوبے دار بنگال، شہزادہ محمد اعظم کے بنوائے قلعہ
ڑی پینٹنگ کو جھلملا دیا۔ دیپالی مسحور ہو کر اس پینٹنگ کو دیکھا کی۔ ریحان نے کہا تھا۔ (وہ
ے سوچ رہی تھی۔ جس طرح پادری بنرجی بات بات پر اس سے کہا کرتے تھے۔" یسوعؑ
—") ریحان نے کہا تھا، —— ہمارے بنگال کی، ڈھاکے کی مسجدیں۔ قلعے، پرانے محلات،
عات، ہماری سنگیت اور سنگتراشی، یہ سب اس سنہرے، رومانی ماضی کی یادگار ہیں۔
ھاکے شہر کا موجودہ فرقہ وارانہ کھنچاؤ اور افلاس برطانوی کولونیلزم کا ثبوت ہیں۔
ر کھانے کو کم ملے گا وہاں فرقہ وارانہ کشمکش ناگزیر ہے کہ سب ایک دوسرے کے منہ سے
اپنے پیٹ کی آگ بجھانا چاہتے ہیں۔ یہ جنگل کا قانون ہے۔ برطانوی نظام ایک ایسی دوکان

ہے۔ جس کے سامنے کھڑے ہوئے قطار اندر قطار مختلف ہندوستانی فرقے اپنے اپنے کشکول جھولیاں پھیلائے ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھنا چاہ رہے ہیں۔ اور سر پھٹول میں مصروف اور بھوکے فرسٹریٹیڈ، ابنارمل عوام آپس میں فساد کر کے ملک کی قسمت کا آج کل فیصلہ کرر ہیں۔ ——

"ہاں بھائی دیپالی۔ کیا پوچھنا چاہتی تھیں۔" نواب صاحب نے ایک دم زور سے گڑگڑا کر آنکھیں کھولتے ہوئے دریافت کیا۔

دیپالی چونک پڑی۔ پھر اس نے کہا۔ "کاکا۔ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ ملک تقسیم ہو جا۔

نواب صاحب چند سیکنڈ تک پیچوان گڑگڑاتے رہے اور پھر رسان سے کہا۔ "بیٹی تم علوم ہے کہ سارے ہندوستان کے مسلمان تباہ حال ہیں، ایک وقت تھا کہ اسی بنگال کا مسلمان حال اور آسودہ تھا۔ صرف اس صوبے میں ایک لاکھ اسلامی مدارس تھے بیٹی —— ایک لاکھ مدر اب یہاں مسلمانوں کی غربت اور جہالت کی کیا حالت ہے؟ خود تمہارے گرودیو ٹیگور بنگالی م کی اقتصادی پسماندگی اور ان کے ساتھ سماجی بے انصافی کا اعتراف کر چکے ہیں۔"

"مگر کاکا —— آزاد متحدہ ہندوستان میں بھی تو مسلمان خوشحال ہو سکتے ہیں۔"

"متحدہ ہندوستان میں ——؟ ہرگز نہیں۔" انہوں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "اور ہن متحد کب تھا۔ اسے انگریزوں نے متحد کیا —— دیپالی تم میری بچی ہو۔ میں تم سے کیا بحث کروں۔ اب تمہارے بابا سے بھی بحث نہیں کرتا۔ جوانی کے زمانے میں ہم دونوں خوب خوب جھگڑتے جب وہ احمق الذین اپنے باپ دادا کی بچی کھچی زمینیں بیچ کر کانگریس میں گھس گئے تھے۔ جیل ج گئے تھے ——" انھوں نے پھر پیچوان کی نے منہ سے لگائی۔

"کاکا۔ میں بچی نہیں ہوں۔" دیپالی نے الجھ کر کہا۔ "میں آپ سے یہ باتیں ڈسکس کرنا چا

نواب صاحب نے ذرا اداسی سے مسکرا کر اسے غور سے دیکھا اور کہنے لگے —— "میں بھ تھا تم اس سرپھرے بیچارے دینیش بابو کی بھتیجی ہو۔ تم بھی سرپھری ہو گی۔ مگر آج ایک نصیحت کر قومی جدوجہد کے چکر میں تم کسی آفت میں نہ پھنس جانا۔ تمہارے باپ پہلے ہی ایک بہت بڑ چکے ہیں۔"

"قربانی ۔۔۔" دیپالی نے ہنس کر کہا ۔۔۔ "تیاگ اور قربانی تو اس دیس کی پرانی روایت ہے گوتم بدھ سے لے کر مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو تک سب قربانیاں دیتے آئے ہیں۔ تیاگ اور ۔۔۔ تیاگ اور قربانی ۔"

"ہوں ۔۔۔" نواب صاحب ذرا مسکرا کر چپ ہو رہے۔

"نہیں کاکا ۔" دیپالی نے بڑے دکھ سے کہا۔ "ملک کو تقسیم نہ ہونے دیجیے۔"

"بیٹی ۔۔" نواب صاحب نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "میرا اور تمہارا نقطۂ نظر بالکل ہے۔ میں تم سے کیا کہوں ۔" پھر انہوں نے کرسی پر پہلو بدلا اور قریب کی میز پر سے اپنی نامکمل اٹھا کر بے دھیانی سے اس کے اوراق پلٹتے ہوئے دہرایا۔ "بالکل جداگانہ ہے۔ ہم ۱۹۰۶ء کی تقسیم سے خوش تھے۔ کیونکہ اس میں ہمارا اقتصادی فائدہ تھا۔ تم لوگوں نے اسے اپنی سیاسی عزائم پر ضرب سمجھا اور اس کو ختم کرنے کے لئے تشدد کی تحریک شروع کر دی اور بم پھینکنے لگے۔ یہ بم پھینکنے تمہارے ہیرو قرار پائے۔ بیٹی معاف کرنا۔ تم نے ہی یہ ذکر چھیڑا ہے اور تم کہتی ہو کہ تم اب بڑی ہو گئ سمجھ دار ہو۔ اس لئے میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ اسی ڈھاکے میں تقسیم کے خلاف احتجاج کرنے کے انگریزوں پر بم پھینکنے والوں کے پانچ سو خفیہ گروہ تھے۔"

"پانچ سو ۔۔۔ کاکا ۔ ؟" دیپالی نے آنکھیں پھیلا کر دہرایا۔ اور سوچا۔ میں اُس بم پھینکنے و روہ کی روایت کی پیرو ہوں، اور نواب قمر الزماں چودھری مخالف کیمپ میں ہیں۔ ایسا کیوں

۔۔۔ ؟

"بنگال کی مسلم اکثریت کا یقیناً اس تقسیم سے فائدہ تھا۔ تم نے تو بیٹی گاؤں میں ہندو د ن اور ہندو زمیندار کے پنجے میں پھنسے مسلمان کسان کی حالت نہیں دیکھی ۔"

"آپ بھی تو زمیندار ہیں کاکا ۔"

"ٹھیک ہے ۔" نواب صاحب نے ذرا جھنجھلا کر پیچوان کی نے الگ کی اور گھنٹی بجائی۔

میں ملازم ایک تابع فرمان جن کی طرح نمودار ہوا۔ نواب صاحب نے ابرو سے پیچوان کی طرف ہ کیا۔ ملازم چلم تازہ کرنے کے لئے باہر لے گیا۔ نواب صاحب دیپالی کی طرف متوجہ ہوئے۔ "کیا ی کانگریس میں زمیندار اور سرمایہ دار شامل نہیں ۔۔۔ ؟"

"میں کانگریسی نہیں ہوں کاکا۔"

"پھر۔۔۔ پھر کیا ہو۔۔۔؟" وہ دفعتاً چونک اُٹھے۔۔۔ "تم بیٹی کہیں کمیونسٹ تو ہوگئیں؟ بنگال میں آج کل یہ نئی وبا پھیل رہی ہے۔" انہوں نے بڑی آزردگی اور تردّد سے ا نظر ڈالی۔

"جی نہیں۔ میں کمیونسٹ نہیں ہوں کاکا۔"

نواب صاحب کو اس انکار کا قطعی یقین نہ آیا۔ وہ تاسف کے ساتھ سر ہلایا کیۓ دیپالی نے ذرا بے خوفی سے کہا "کاکا میں تو محض دیش کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔ آزادی کی خاطر۔"

"ضرور خدمت کرو بیٹی۔ آزادی حاصل کرو۔ مگر یہ آزادی مسلمانوں کے لئے نہیں ہوگا اتنی تلخی اِن کے خیالات میں ہے۔ دیپالی نے لرز کر سوچا۔ تو ہم لوگ، ریحان اور سارے محض ایک مصنوعی، غیر حقیقی، خیالی دنیا آباد کر رہے ہیں۔۔۔؟

جن تازہ چلم لے کر اندر آیا۔ چلم پیچوان پر رکھی اور چند قدم پیچھے ہٹ کر دروازے باہر نکل گیا۔ کہ نواب صاحب کی طرف پیٹھ کر کے نہ جا سکتا تھا۔ دیپالی نے نواب صاحب سے در کیا۔۔۔ "کاکا۔۔۔ یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ صرف نوابوں اور راجاؤں کی جماعت ہے راجہ محمود آباد۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں۔۔۔ اور جیسے نواب قمر الزماں چودھری۔۔۔" وہ کھا کر ہنسنے لگی۔ نواب صاحب نے تپائی سے ٹکی ہوئی چاندی کی موٹھ والی چھڑی اٹھا کر اسے گویا پیٹے ارادہ ظاہر کیا اور پیچوان کا ایک کش لگا کر بولے "بنوئے چندر نے اپنے لاڈ پیار میں تجھے بالکل برباد کر

"نہیں بتائیے کاکا۔" وہ مچل کر بولی۔

نواب صاحب تیوری پر بل ڈال کر اسے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے آہستہ آہستہ کہا۔ "دی بیٹی۔۔۔ تمہارے ٹھاکر دادا بھی زمیندار تھے اور اُن کی اور میرے والد مرحوم کی آپس میں خاصی دوست دونوں کے ہاں ناچ گانے اور ناٹک کی محفلیں جمتی تھیں اور عیش ہوتے تھے اور یہ دونوں بزر میرے ابا مرحوم اور تمہارے ٹھاکر دا انگریزوں کے وفادار تھے۔" پھر وہ جیسے یکلخت پرانی با سوچنے لگے۔ چند لحظوں بعد انہوں نے کہا "اسکول میں بنوئے چندر اور میں ہم جماعت تھے۔ بن

یہ پانچ چھ سال مجھ سے چھوٹا ہے۔ مگر مسلمان رئیس زادہ ہونے کے کارن میری انگریزی تعلیم خاصی پر دائی اور دیر میں شروع کروائی گئی تھی۔ — خیر —" وہ آنکھیں بند کر کے ابروؤں پر داہنے ہاتھ کی اور انگوٹھا پھیرنے لگے۔ اور پھر کہا۔ "ہمارا ایک اور کلاس فیلو بھی تھا۔ وہ سید مرتضےٰ حسین۔ جو ب بڑا کٹر نیشنلسٹ مسلمان ہے اور تمہارے وشوا بھارتی میں پڑھاتا ہے — خیر — پھر تمہارے باپ رچیا اپنی قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ وہ جس سیاست میں شامل ہوئے، وہ میرے نزدیک مسلمانوں مخالف سیاست ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو مجھے بے چارے دنیش کی شہادت کا صدمہ نہیں ہوا —؟ ب بھی جب اس کی آنکھیں اور شکلیں اور باتیں یاد آتی ہیں — دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ مگر بیٹی مجھے سوس یہی ہے کہ وہ گمراہ تھا اور اپنی جان اس نے بیکار ضائع کی۔ یہ تشدد پسندی اور بم پھینکنا گولی مار دینا۔ اس طریقے سے کیا برطانیہ کی طاقت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟ مگر اب بہر حال اس یک کا زور کم پڑ چکا ہے۔ خیر بھائی دیپالی۔ یہ بڑے گنجلک معاملے ہیں۔ بڑی ہو گی تو سمجھو گی۔ ں نوعمری کا جوش ہے اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگا رہی ہو۔ مگر سر دھڑ کی بازی سوچ سمجھ لگانا چاہیئے۔ اور بی بی تم اس فلاکت زدہ زمانے میں پیدا ہوئیں۔ تم بے چاری نے دیکھا ہی کیا ہے۔ تو سوچ بھی نہیں سکتیں کہ تمہاری چندر کنج نے بھی کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔ میں سمجھتا ہوں اگر ارے ٹھاکر دادا کے زمانے کی امارت تھوڑی سی ابھی تک باقی ہوتی تو شاید تم اس جوش و خروش ، نوابوں اور امیروں کی مخالف نہ ہوتیں۔"

"لیکن اوما رائے تو اب بھی بڑی رئیس زادی ہیں۔" دیپالی نے کہنا شروع کیا۔

"ہاں — میں جانتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ بیرسٹر پری توش رائے کی لڑکی تم سب کی سرغنہ گروہ بن گئی ہے۔ مگر میں اس کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ دیپالی میں پرانی وضع کا آدمی ہوں۔ میرے لات پر تم کو غصہ ہی آئے گا — خیر تو تم مجھ سے ڈسکس کیا کرنا چاہتی تھیں۔؟" وہ پھر مسکرانے لگے۔

"کاکا۔ میں صرف یہ کہہ رہی تھی —" دیپالی نے اب ذرا غیر یقینی لہجے میں کہا۔ "کہ بٹوارے کے ے اتحاد کی بھی کوشش کی جا سکتی ہے۔؟"

"اتحاد — اتحاد ہے کہاں —؟ پنجاب کا آریہ سماج اور مہاراشٹر اور بنگال کی ہندو تجدید اتحاد کی نشانیاں ہیں۔؟"

"میں دوسرے صوبوں کے متعلق تو نہیں جانتی کاکا۔ مگر ہمارے بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانو
کا کلچر تو بالکل ایک ہے۔"

"مانتا ہوں بھائی ــــ یہاں کا کلچر ایک ہے۔ یہاں کی لوک سنگیت، لوک ساہتیہ ہر چیز میں مسلمانوں کا کتنا بڑا حصہ ہے۔ مگر ہندوؤں نے کبھی اس کا اعتراف کیا؟ بنگالی کلچر سے ان کی مراد محض ہندو بنگالی کلچر ہوتی ہے۔ پچھلی صدی میں تو زور شور سے یہ بحث چھیڑی گئی تھی کہ بنگا مسلمانوں کی زبان ہی نہیں۔ بنگلہ ادب اور تہذیب صرف ہندوؤں کا ورثہ ہے۔ ــــ کیا ہم اتحا نہیں چاہتے تھے؟ خدا کی قسم ہم اتحاد چاہتے تھے اور پچھلے آٹھ سو سال کی تخلیق شدہ بنگالی لوک سنگیت اور ادب اس کا مکمل ثبوت ہے ــــ مگر اب مسلمانوں سے اتنی نفرت۔ ان کے لئے حقا کا ایسا رویہ ــــ تم نے آنند مٹھ پڑھا ہے؟"

دیپالی نے نفی میں سر ہلایا۔

"لیکن بنگال کے مسلمان پسماندہ اور مفلس کسان اور ماہی گیر اور ملاح اور کاریگر ہیں۔ اپنی مدافعت میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تمہارا ہندو بنگالی پریس نواب سر سلیم اللہ کو انگریز کا پٹھو کہتا ہے اور یہ جو اتنے بنگالی ہندو نائٹ ہیں۔ یہ انگریز کے پٹھو نہیں ــــ؟"

دیپالی خاموش رہی۔ نواب صاحب نے ذرا جوش سے بات جاری رکھی۔ "تم بنگالی کلچر کے اتحاد کی بات کرتی ہو۔ بالکل صحیح ہے۔ سو ڈیڑھ سو سال قبل تک یہ کلچر واقعی ایک تھی۔ راجہ رام موہن رائے عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ نوابین مرشد آباد کے دور تک ہندو شرفا فارسی پڑھتے تھے۔ تمہارے گرو دیو، جن کا خاندانی نام انگریزوں نے ٹھاکر کے بجائے ٹیگور کر دیا۔ ٹھاکر کا یہ خطاب ــــ اس خاندا کو بنگال کے مسلمان نوابوں ہی نے دیا تھا۔ تم یہ بات جانتی ہو ــــ؟"

دیپالی نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

"ایک زمانے میں یہ ٹھاکر خاندان پیر علی برہمنوں کا گھرانا کہلاتا تھا۔ کیونکہ انہوں نے قنوجی برہم کی ذات پات کی قیود توڑ کر مسلمان نوابوں کے یہاں ملازمت کر لی تھی ــــ خود اپنا نام دیکھو۔ سرکار مجموعہ دار یا مزمدار، تعلقہ دار اور قانون گو۔ یہ سب بنگالی کائستھوں کے مغل عہدے تھے، جو اب تمہا ذات بن چکے ہیں۔" نواب صاحب نے پیچوان کی نے ایک طرف رکھ کر لمبی سانس لی۔

"مگر کاکا ___ دیپالی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ہندو تجدیدیت کے ساتھ مسلم تجدیدیت بھی توشروع ہوئی بنگال میں ___ " سندربن میں اسے ریحان نے ایک شام وہابی تحریک کے متعلق بتایا تھا۔ جس کی زیر قیادت مسلمان مولوی انیسویں صدی میں بنگالی مسلمان کسانوں سے کہتے پھرتے تھے کہ وہ پنے ہندوانہ رسم و رواج ترک کردیں ___" اور پھر لڑوا دیا انگریزوں نے آپس میں۔" اس نے بآواز بلند کہا۔

"ہر بات کا الزام انگریز کے سر تھوپنا بالکل غلط چیز ہے۔ تم لوگ چند مفروضوں کی بنا پر ینی ساری دلیلیں پیش کرتے ہو۔" انہوں نے گھڑی دیکھی اور چونک کر کہا۔ "تمہارے ساتھ س بیکار کی مغز سوزی میں اتنا وقت نکل گیا۔ مجھے ابھی تقریر بھی تو لکھنی ہے۔" انھوں نے تپائی پر سے کاغذ اٹھایا۔

"کاکا ___ مجھے سنائیے اپنی تقریر ___"

"بھاگ جاؤ۔"

"نہیں کاکا ___" اس نے اُن کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا اور نامکمل صفحہ پڑھنے لگی۔

"اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمانانِ بنگال نے عیسائی مبلغین کے خلاف اور ہندو احیاء کی مدافعت یں اخبار اور رسالے نکالے اور ہمارے لیڈر قوم کی بےچارگی پر خون کے آنسو روتے رہے۔ بھائیو اقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے آج تک۔ لاہور سے لے کر چاٹگام اور دہلی سے لے کر مدراس تک کے مسلمان محض خون کے آنسو روتے رہے ہیں۔ مگر اب عمل کا وقت آگیا ہے۔"

دیپالی نے پڑھ کر کاغذ میز پر رکھ دیا۔

نواب صاحب المشرق کا فائل الماری میں واپس رکھنے کے لئے آرام کرسی سے اٹھے ___ یپالی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم نے مسلم احیاء کے متعلق کسی کانگریسی کی کتاب پڑھی ہوگی۔"

"جی نہیں کاکا۔" ریحان کا نام اس کی زبان پہ آتے آتے رہ گیا۔ "ایسے ہی بس اِدھر اُدھر سے سنا ہے۔"

نواب صاحب الماری کھول کر کتابوں کا جائزہ لینے لگے۔ دیپالی نے دریچے سے باہر جھانکا ریحان نے کہا تھا۔ (یسوع مسیح نے کہا تھا) آج سے دو سو برس قبل تک بہت سے بنگالی صوفی گورکھ دتے جیسے ناموں کی کتابیں لکھتے تھے اور وشنو پد گاتے تھے۔ بہت سے صوفیوں کے سلسلے

تنترک یوگ تنتر کے ہم شکل تھے۔ بنگالی خانقاہوں میں ایک اچھا خاصا "مسلم یوگ ساہتیہ" تخلیق ہو چکا تھا۔ مدار شاہ کے فقیر اور ہندو یوگی تقریباً ایک جیسے تھے۔ اور یہ مداری فقیر اور ہندو سنیاسی ۱۷۷۰ء کے بھیانک قحط کے بعد کمپنی کی افواج سے لڑتے بھڑتے پھرے تھے۔ اور ریحان نے بتایا تھا کہ ایک مرتضیٰ شاہی فقیروں کا سلسلہ تھا۔ جن کے گرو سید مرتضیٰ آنند نے یوگ قلندر اور وشنو جھجنول کی ایک کتاب لکھی تھی۔ ایک شادی شدہ برہمن زادی ان پر عاشق ہو کر اُن کی چیلی بن گئی تھی۔ اس کا نام آنند مایا دیبی تھا۔ اسی لئے وہ مرتضیٰ آنند کہلاتے تھے۔ مثال کے طور پر ــــ ریحان نے کھنکار کر اضافہ کیا تھا۔ جس طرح اس خاکسار کو باؤل فقیر سید ریحان دیپالی کہا جائے گا! دریچے میں کھڑے کھڑے دیپالی کو یہ بات یاد کر کے ہنسی آگئی۔ "You and I — we two are the stuff all human love is made" ۔ ریحان نے کہا تھا۔

"اب سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے سارے باؤل مغنی عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی اور انسانیت کے عشق کے متعلق کیا گاتے پھرتے تھے؟ شیخ مدن باؤل، شتولن شاہ، حسن رضا، لالن شاہ ــــ یہ سنگیت کار درویش جن کی شاعری اور موسیقی نے اتنی شدت سے گرودیو کی شاعری اور موسیقی کو متاثر کیا ــــ کیا یہ مشترکہ ورثہ نہیں؟" ــــ اور دیپالی نے خود اپنے گاؤں میمن سنگھ میں دیکھا تھا۔ کہ برہما دتیہ فقیر جو مسلمان تھے۔ منتر پڑھ کر اور گھنٹیاں بجا بجا کر مسلمان کسانوں کی مرادیں پوری کرنے کا تپ کرتے تھے اور مسلمان کسانوں کے ہاں شادی کے موقع پر منگل چنڈی و جے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ خود ریحان کا عرف رونو میاں تھا۔ ولو ہندوؤں کا نام بھی تھا۔ کیا یہ سب تہذیبی مماثلت یا اتحاد کے بے حد سطحی مظاہر ہیں، یا ان کے پیچھے کوئی ایسی گمبھیر، تاریخی، نسلی اور نفسیاتی معنویت بھی پنہاں ہے؛ جو سیاسی تبدیلیوں سے بلند تر اور ماورا رہے گی؟ دیپالی بہت زیادہ الجھ کر دریچے سے مُڑی۔ نواب صاحب الماری بند کر کے لکھنے کی میز کی طرف جا رہے تھے۔

"یہ سب طبقاتی سیاست ہے۔" دیپالی نے ریحان کے الفاظ دہرائے! اور اونچی آواز میں کہا۔ "اب میں جاتی ہوں کاکا۔"

نواب صاحب نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اور شاہانہ وقار سے چلتے ہوئے اس کے نزدیک آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تم بٹیا۔ مجھے آج تک معلوم نہ تھا کہ اتنا زیادہ پڑھ لکھ گئی ہو۔ مجھے تمہاری

طرف سے بہت تشویش ہو گئی۔ لڑکیوں کے لئے اتنا پڑھ لکھ جانا بہت مضر ہے۔ اسی لئے میں نے جہاں آرا کو کالج سے اٹھا لیا۔ تمہارا اصل فرض وہ ہے، جس کے لئے اندر تمہارا انتظار کیا جا رہا ہے۔ جاؤ جا کے اپنے بھائی نیّر کی بری کے جوڑے ٹانکو۔ جاؤ۔ بھاگو۔"

"جی کاکا ——" دیپالی نے ہنس کر کہا۔ اور تقریباً دوڑتی ہوئی کتب خانے سے باہر نکل گئی۔ نواب صاحب کیس میں سے عینک نکال کر بڑی میز پر جا بیٹھے۔

ارجمند منزل کے پائیں باغ کے وسط میں سنگِ سرخ کا بڑا خوبصورت تالاب تھا۔ جس کے چاروں طرف اونچی، کنگورے دار منڈیروں کے ساتھ ساتھ سنگی بنچیں نصب تھیں اور بیرونی سیڑھیوں کے دونوں جانب حسنہ حنا کی جھاڑیاں تھیں۔ تالاب کے کنارے سیمل کے نیچے کئی لڑکیاں ایک تخت پر جمع سلائی میں مصروف تھیں۔ قریب ہی گھاس پر سیتل پاٹیاں بچھی تھیں اور بڑی سرگرمی سے جوڑے سل رہے تھے۔ تالاب کی دوسری جانب گلابِ خاص کے گھنے سائے میں ایک شکستہ سا "شاہی تخت" بچھا تھا۔ جس پر انجم آرا اطلسی دلائی پھیلائے اس پر گوٹے کا چوکھا جال بنانے میں مصروف تھی۔

یہ "شاہی تخت" اس زمانے کی یادگار تھا جب نواب نورالزماں مرحوم کے ہاں ارجمند منزل کے باغ میں جاترا والوں کی منڈلیاں آکر ڈیرے ڈالتی تھیں۔ لوک ناٹک کھیلے جاتے تھے۔ بنگالی تھیٹر کمپنیاں تاریخی، سوشل اور سیاسی ڈرامے اسٹیج کرتی تھیں اور شہر کے ہندو اور مسلم امراء جمع ہو کر "شاہجہاں" "ٹیپو سلطان" "سراج الدولہ" "میر قاسم" "کرانی جیون" اور "خودی رام باسو" سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ (خودی رام باسو، جو ایک دہشت پسند نوجوان تھا اور جسے مظفر پور کے انگریز جج کنگز فرڈ پر قاتلانہ حملہ کرنے کے جرم میں ۱۹۰۸ء میں پھانسی ہوئی تھی۔ ہزاروں ہندو گھروں میں اس کی راکھ تبرک کی طرح تقسیم کی گئی اور لوگ اس کے تعویذ بنا بنا کر پہننے لگے۔ اس کے متعلق مقبول ڈرامہ بھی ارجمند منزل میں کھیلا جا چکا تھا) یہاں گریش چندر اور ٹیگور کا چرچا رہتا تھا۔ اور بنگلہ سنگیت ناٹکوں کی موسیقی گونجی تھی۔

ڈھاکے میں اردو تھیٹر ۵۷ء سے پہلے سے قائم تھا۔ اور اواخر انیسویں صدی تک یعنی جب نواب نورالزماں فریدپور سے آکر وہاں سکونت پذیر ہوئے۔ شہر میں متعدد تھیٹر کمپنیاں موجود تھیں۔ جن کے

نٹنی اور ایکٹریسیں لکھنؤ سے منگوائے جاتے تھے۔ اور ایکٹرسیں مردانہ پارٹ کرتی تھیں ۱۸۶۷ء تک، جب نواب قمر الزماں کے دادا پہلی بار فرید پور سے ڈھاکے آن کر رہے تھے۔ شہر میں جو نتیس تھیٹر کمپنیاں قائم تھیں۔ اور اس زمانہ سے لے کر آج تک ارجمند منزل میں ناٹک کا سلسلہ جاری تھا۔ بنگالی زمینداروں کو تھیٹر کا از حد شوق تھا۔ اپنے گھروں میں اسٹیج کئے جانے والے ڈراموں میں اکثر وہ خود بھی ایکٹنگ کرتے تھے۔ "جلسہ گھر" زمینداروں کے مکان کا لازمی حصہ تھا۔ ارجمند منزل کے جلسہ گھر میں اب سیاسی میٹنگیں بھی ہوتی تھیں۔ مگر اس کی اسٹیج اور دیگر ساز و سامان جوں کا توں موجود تھا۔ نواب نور الزماں کے چھوٹے بھائی نواب زادہ فخر الزماں مرحوم نے خود ایک تھیٹر کمپنی کھولی تھی۔ خواص و عوام سبھی اسٹیج کے رسیا تھے۔ کلکتہ میں مدتوں سے ریوالونگ اسٹیج موجود تھی اور "ترکی حور" ناٹک میں پہلی بار بیک گراؤنڈ میں فلم کے مناظر سے کام لیا گیا تھا۔ کلکتہ، ڈھاکہ اور دوسرے شہروں کے ہر محلے کی اپنی ناٹک منڈلی تھی۔ دیہات میں جاترا والے گاؤں گاؤں گھومتے تھے۔

اسی دور کے "سین سینیریوں" کے پردوں، اونچی اونچے چینی کے گملوں، فرنیچر، "شاہی" ملبوسات، نقلی تاج، داڑھی مونچھوں، کاٹھ کی تلواروں اور دیگر لوازمات کا انبار ارجمند منزل کے شاگرد پیشے کے ایک گودام میں مقفل تھا۔ اور جب کبھی کالج میں ڈرامہ ہوتا تو دیپالی اور روزی فوراً ارجمند منزل کا رخ کرتیں۔ نواب زادہ نیر الزماں گودام کھلواتے اور وہ اپنے مطلب کی چیزیں نکال کر لے جاتیں۔

نواب زادہ فخر الزماں مرحوم نے "راجہ بھوج" کے عنوان سے خود ایک سنگیت ناٹک بنگلہ میں تصنیف کیا تھا۔ اس کے لئے ننھے منے آئینوں اور رنگ برنگے نقش و نگار سے مزین و کرم آدتیہ کا روایتی سنگھاسن بنوایا گیا تھا۔ جس میں ساری میں لپٹی چار مورتیاں چاروں پایوں کی جگہ تخت سر پر اٹھائے کھڑی تھیں۔ بقیہ اٹھائیس مورتیاں سنگھاسن کے سہ طرفہ جنگلے میں نصب تھیں۔ یہ "شاہی تخت" اسٹیج کے دوسرے فرنیچر کے انبار کے نیچے مدتوں سے دبا پڑا تھا۔ اور آج صبح ملازموں نے باہر نکال کر جھاڑ پونچھ کے گلابِ خاص کے نیچے بچھا دیا تھا۔ تاکہ صاحبزادیاں آرام سے بیٹھ کر رسی پر و سکیں۔

سنگھاسن کے مقابل میں سیمل کے نیچے مہر آرا مشین پر کچھ سی رہی تھی۔ تین چار خادمائیں

تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھی پان چبا رہی تھیں۔ ایک سیتل پاٹی پر ہارمونیم رکھا تھا اور ایک لڑکی بیاہ کے گیت الاپنے میں مصروف تھی۔

نواب قمر الزماں چودھری کو کتب خانے میں لیگ کے ماہانہ جلسے کے لئے تقریر لکھتا چھوڑ کر دیپالی سرکار طویل گیلری میں سے گزرتی کشادہ چوبی زینے پر پہنچی۔ اور دوسری منزل پر جا کر جہاں آرا کے کمرے میں داخل ہوئی۔ مگر کمرہ خالی پڑا تھا۔ تخت اور مسہری پر بنارسی ساریوں کے خالی ڈبے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں مٹھائی کے گلابی کاغذوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ساری کوٹھی کی طرح اس کمرے میں بھی شادی کا ماحول نظر آ رہا تھا۔

نیچے سے ہارمونیم کی آواز بلند ہوئی۔ دیپالی دریچے میں گئی جو پچھلے باغ پر کھلتا تھا۔ اس نے جھانک کر نجمہ اور مہر آرا کو دیکھا۔ مونگیا ساری پہنے ایک اور لڑکی، جس کی پشت کوٹھی کی طرف تھی۔ بڑی تندہی سے مشین کا ہینڈل گھمانے میں مصروف تھی۔ بادل گھر آئے تھے۔ مگر ابھی بارش کے آثار نہیں معلوم ہو رہے تھے۔ بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ ایک ملازمہ تالاب کے دوسرے سرے کی اندرونی سیڑھی پر بیٹھی چاندی کے برتن صاف کر رہی تھی۔ کتب خانے کے پریشان کن، کربناک ملکی سیاست کے تذکرے کے بعد یہ منظر کس قدر پُرسکون اور نظر فریب تھا۔

باورچی خانے کی سمت سے جہاں آرا خراماں خراماں چلتی تالاب کی طرف آئی۔ دیپالی نے دریچے میں سے اُسے آواز دی۔ جہاں آرا نے اسے سر اٹھا کر دیکھا — "دیپالی — اتنی دیر لگا دی — جلدی آؤ —"

"آتی ہوں بھائی —" اُس نے جواب دیا۔ اور تیزی سے نیچے چلی گئی۔

"آہا — دیدی آ گئیں —" "راج سنگھاسن" پر بیٹھی انجم آرا نے نعرہ لگایا۔ دیپالی تقریباً دوڑتی ہوئی سیمل کے نیچے پہنچی۔ مونگیا ساری والی اجنبی لڑکی نے پلٹ کر اور بالوں کی ایک لمبی چوٹی زور سے پشت پر پھینک کے دیپالی کو دیکھا اسے آداب کیا۔ اور پھر ہینڈل گھمانے میں جُٹ گئی۔ دیپالی تخت کے کنارے بیٹھ گئی۔

"آج صبح سے بارش نہیں ہوئی۔ ہم لوگوں نے کارخانہ باہر ہی جما رکھا ہے۔" جہاں آرا نے بیش قیمت

چینی ریشم کی پستئی ساری کا ڈھیر اس کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔ "لو اس پر یہ بیل ٹانک دو۔" دیپالی نے سورت کی جگمگاتی بیل اور ساری کے ہمرنگ دھاگے کی ریل نیچے سیتل پاٹی پر سے اٹھاتے ہوئے سوچا۔ پاکستان، کمیونسٹ تحریک، ہندو مسلم آویزش، عالمی جنگ۔ ان سب جھگڑوں سے بے پروا جہاں آرا اپنے بھائی کی بری تیار کر رہی ہے کیسی خوش قسمت ہے۔ میں خواہ مخواہ دنیا کی فکر میں کیوں ہلکان ہوتی ہوں۔ یہ سوچ کر اس نے فوراً بشاشت اور زندہ دلی اپنے اوپر طاری کر لی اور جہاں آرا اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ بے فکری سے ہنسنے بولنے میں مصروف ہو گئی۔

"روذی آپا ابھی تک نہیں پہنچیں" ایک لڑکی نے کہا۔

"آج اتوار جو ہے۔ گرجا میں دیر لگے گی۔ پھر سنڈے اسکول پڑھائیں گی۔" اختر آرا نے جواب دیا۔ "اب آتی ہی ہوں گی بے چاری۔" "تم بھی سویرے سے آجاتیں تو یہ بیل اب تک ٹنک گئی ہوتی۔" جہاں آرا نے دیپالی سے کہا۔

"میں باہر کاکا سے بحث میں لگ گئی تھی۔"

"کیسی بحث۔" اختر آرا نے پوچھا، جو دیپالی کی ہم عمر تھی

"کچھ نہیں۔ پاکستان کے متعلق۔"

"کیا کہا تم نے؟"

"میں انھیں سمجھا رہی تھی کہ پاکستان انگریزوں کا منصوبہ ہے۔"

"تم ابا سے جھگڑ رہی تھیں؟" جہاں آرا نے حیرت سے پوچھا۔

"اب اگر ہمارے بزرگ غلطی پر ہوں تو انھیں سمجھانا تو چاہیے ہی۔" مونگیا ساری والی لڑکی نے مشین چلاتے چلاتے منہ اٹھا کر کہا۔ دیپالی نے چونک کر اسے دیکھا۔

جہاں آرا ہنس پڑی۔ "ارے دیپالی۔ یہ یاسمین ہے باؤلی۔ میں نے تمہیں اس کے متعلق خط میں لکھا تھا نا۔" اس نے بڑے پیار سے کہا۔ جہاں آرا کے دل میں ساری دنیا کے لئے محبت تھی۔

سولہ سترہ سالہ ذرا وحشی آنکھوں والی یاسمین مجید نے دیپالی کو دوبارہ آداب کیا۔

"یہ تمہاری روذی آپا کی اور ہماری ہمجولی ہیں۔" جہاں آرا نے اس سے کہا۔

"آں ہاں۔ دیدی۔ میرے پاس تو آپ کے تینوں ریکارڈ موجود ہیں۔ اور ایک گیت پہ دیں اپتی

ی ہوں ۔"

"ہاں بھائی ۔ ہمیں یاد ہی نہیں رہتا کہ تم اتنی مشہور مغنیہ ہو۔ اور لوگ تم کو پہلے سے غائبانہ ہی نتے ہیں! بھئی ہم کیا کریں۔ ہمارے لئے تو تم وہی ہمیشہ کی دیپالی ہو۔ بقول ہماری امّی بنو نے بالو کی خبطی نڈیا ۔۔۔" جہاں آرا نے ہنس کر کہا۔

"آپ تو مجھے بھی خبطی سمجھتی ہیں آپا۔" یاسمین شگفتگی سے بولی۔

"یہ جہاں آرا، جو ہیں نا۔ ان کے خیال میں سب دیوانے ہیں۔ بس یہی سب سے زیادہ ہوشمند ں۔ بڑی بی۔" دیپالی نے کہا۔

"روزی آپا آگئیں ۔" انجم آرا چلائی۔

روزی سائیکل پر فراٹے بھرتی سیدھی تالاب کے کنارے پہنچی اور سائیکل تالاب کی منڈیر لگا کر تخت پر آن بیٹھی اور فوراً سلائی میں مصروف ہو گئی۔

دوسری منزل کے ایک دریچے میں سے نیّر الزماں نے سر نکال کر جھانکا۔ "بھئی واہ۔ دیکھو ہماری ی اور دیپالی کتنی سگھڑ ہیں۔ کون کہتا ہے کہ آج کل کی لڑکیاں سینا پرونا نہیں جانتیں۔" اُس واز دی۔

جہاں آرا نے سر اٹھا کر بھائی کا منہ چڑایا۔ روزی اور دیپالی نے اُسے نمسکار کیا۔

"کتنا تنگ کرو گے نیّر بھائی۔" یاسمین چلّائی۔

"جتنا چاہو لو ۔۔۔" بیگم قمر الزماں نے دریچے میں بیٹے کے پیچھے سے آ کر کہا۔

"اے ہے۔ اللہ رکھے۔ ماشاءاللہ کیسا اچھا لگ رہا ہے۔" سگن بگیچے والی شمسہ خالہ نے قریب ہا۔ "لے کچھ گاؤ بھی تو۔ لڑکیو! اے فریدہ۔ تو کیوں چپ ہو گئی۔؟ دیپالی تم کچھ گاؤ بیٹی۔"

نیّر الزماں دریچے سے ہٹ کر اندر چلے گئے۔

"بہت اچھا خالہ۔" دیپالی نے جواب دیا

بیگم قمر الزماں اور شمسہ خالہ بھی باتوں میں مصروف دریچے میں سے غائب ہو گئیں۔

نیچے سیمل کی ڈالیوں میں مینائیں شور مچا رہی تھیں۔ تالاب کے کنارے سلطانہ چمپا کا درخت مہک چھ فاصلے پر ساگوان کے جھرمٹ میں سفید پھول کھلے تھے۔

"دیدیا نذرل کا کوئی گیت سنائیے۔" یاسمین نے کہا۔

"نذرل کا۔۔ اچھا۔" دیپالی سر جھکا کر سلائی کرتی رہی پھر گنگنانے لگی۔

"نورگس باگ میں۔ نورگس باگ میں۔
بہار کی آگ میں۔"

یاسمین تخت پر سے اُٹھ کر اس گیت کے ساتھ منی پوری طرز کا ہلکا پھلکا رقص کرنے لگی۔ واقعی وہ بہت اچھی رقاصہ تھی۔

"بہار کی آگ میں۔ بھرے دل داگ میں۔"

جہاں آرا سر جھکائے سلائی کرتی رہی۔

"بہار کی آگ میں۔ کہاں میرے پیارے۔" دیپآلی نے گایا۔ یاسمین نے گردن ہلا ہلا کر ناچ جاری رکھا۔

"درد دل زور۔" دیپآلی نے گایا۔

جہاں آرا یک لخت اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

"ہرا دھاگا ختم ہوگیا۔" روزی نے اختر آرا سے کہا۔

"دیدی۔" اختر آرا نے دیپآلی سے کہا۔ "ذرا پلیز اوپر جا کر آپا کی الماری میں سے ہری اور نی ریلیں نکال لائیے۔" اُس نے تخت پر بکھرے کپڑوں کے نیچے جہاں آرا کا موتیوں کا بٹوہ تلاش کیا اور اس میں سے کنجیوں کا گچھا نکال کر دیپآلی کو تھما دیا۔ "یہ بیچ والی کنجی ہے۔ چاکلیٹ کے بڑے ڈبے میں ریلیں ہوں گی اور آپا کا سوئینگ باکس اگر مقفل نہ ہو تو اس میں سے ڈی ایم۔ سی کا کاسنی لچھا بھی نکالتی لائیے۔"

"اچھا۔" دیپآلی نے جواب دیا اور کنجی لے کر پہلو کے زینے کی طرف روانہ ہو گئی۔

جہاں آرا کے کمرے میں پہنچ کر اس نے لمبی چوڑی وکٹورین وضع کی الماری جس کے ایک پٹ پ قدِ آدم آئینہ لگا تھا کھولی۔ چاکلیٹ کا ٹین اور سوئینگ باکس چوڑیوں کے ڈھیر کے پاس ایک درمیا تختے پر سامنے ہی رکھے تھے۔ دیپآلی نے چاکلیٹ کے ڈبے میں سے مطلوبہ ریلیں نکال لیں۔ بید کا باکس بھی کھلا ہوا تھا۔ اس کا ڈھکنا اٹھا کر اس نے کاسنی لچھا تلاش کرنا شروع کیا۔

ریشم کے لچھوں، ریلوں اور کشیدہ کاری کے دوسرے لوازمات کے نیچے اسے ڈی ایم۔ سی۔

ٹ کی جھلک نظر آئی۔ اُسے نکالنے کے لئے دیپالی نے باقی چیزیں ایک طرف سرکائیں تو بکس کی تہہ

لی ایک تصویر دکھلائی پڑی۔

دیپالی سُن سی رہ گئی۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے تصویر باہر نکالی۔

یہ آج سے چند برس پہلے کے ریحان الدین احمد کی تصویر تھی۔

تصویر کی پشت پر بنگالی میں لکھا تھا۔

شہزادی جہاں آرا بیگم کے حضور میں۔

اُن کے ادنیٰ غلام بے دام کی طرف سے۔

کلکتہ۔ ۱۶؍ اپریل ۱۹۳۵ء

اِس تحریر کے نیچے ایک اردو شعر لکھا تھا۔

دیپالی کی آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا چھا گیا۔ چند لمحوں تک وہ تصویر ہاتھ میں لئے مفلوج ی رہی۔ اتنے میں برابر کے کمرے میں کسی نے زور سے دروازہ بند کیا۔ اور وہ ہوش میں آکر چاروں دیکھنے لگی۔ کمرہ وہی تھا۔ ساگوان کی مسہری۔ بنارسی ساریوں کے ڈبے۔ ان گنت "طاقچوں" اور زوں والی وکٹورین سنگھار میز۔ مسند۔ قالین۔ کتابوں کی الماری۔ کشمیری کڑھت کے پردے۔ چیز بھی نہیں بدلی تھی۔ دریچے کے باہر جولائی کی مدھم دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور نیچے تالاب کے کنارے ڑکیوں کے قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔

دیپالی نے جلدی سے تصویر سوئینگ باکس کی تہہ میں واپس رکھ کر الماری بند کی اور قدِ آدم آئینے ے اپنی دہشت زدہ، جوگی کی شکل نظر آئی۔ اس کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا اور اس کی ٹانگیں کانپ تھیں۔

دھاگوں کی ریلیں اور لچھا مٹھی میں بھینچ کر وہ کمرے سے باہر نکلی اور زینہ اتر کر سیمل کے نیچے پہنچی۔ سوس ہوا کہ ازل سے ابد تک کا فاصلہ طے کر کے لوٹی ہے۔

نور گسو، باگ میں ـــ بہار کی آگ میں۔

دردِ دل زور ـــ

اب شمسہ خالہ کی لڑکی فریدہ ہارمونیم پر زور زور سے گا رہی تھی اور یاسمین پھرکی کی طرح

ناچنے میں مشغول تھی۔ اختر آرا اور روزی سیمل کے نیچے سلائی کر رہی تھیں۔ انجم آرا، گلاب خاص نیچے "راج سنگھاسن" پر سے ڈلائی سمیٹ کر اُٹھ رہی تھی۔ یاسمین ناچتے ناچتے جا کر اس بیٹھ گئی۔ دیپالی کو دیکھ کر انجم آرا نے آواز دی۔ "دیدی۔ ادھر آؤ۔"

دیپالی اختر آرا کو دھاگے دینے کے بعد جا کر "شاہی تخت" کے کنارے پر ٹک گئی۔

"دیدی ذرا سنبھل کر بیٹھنا۔ اس کا ایک پایہ ٹوٹا ہوا ہے۔" یاسمین نے کہا۔

"اچھا۔" اس نے احمقوں کی طرح ہنس کر جواب دیا۔

"آستینوں کی تُرپائی۔" انجم آرا نے اسے بروکیڈ کا ایک اَدھ سِلا بلاؤز تھما دیا اور خود ا کر کے کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئی۔

نزدیک ایک سیتل پاٹی پر فرید پور سے آئی ہوئی ایک رشتہ دار لڑکی نے گلابی کریپ ڈ کا ایک ٹکڑا بچھا کر بلاؤز تراشنے کے لئے اسے ماپنا شروع کیا۔ مالا ملازمہ اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گئی باغ چاروں طرف ڈول سا رہا تھا۔ دیپالی نے بروکیڈ کے بلاؤز کی ایک آستین کا کنارہ مو کھونپی۔ جہاں آرا باورچی خانہ سے لوٹ کر کب آئی اور اس کے نزدیک بیٹھ کر کب سلائی کرنے لگی ا بھی نہ چلا۔ باغ بجرے سے جہاز کی طرح ڈول رہا تھا۔

سیمل کے نیچے سے روزی اُٹھ کر گلاب خاص کے نیچے "سنگھاسن" پر آن بیٹھی۔ یاسمین بندریا کی طرح تخت کی پشت کے برابر اکڑوں بیٹھ کر جنگلے میں بنی مورتیوں پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

سیتل پاٹی پر بیٹھی لڑکی نے دلہن کا بلاؤز تراشنا شروع کیا۔

"اللہ کرے اب جلدی سے جہاں آرا بی بی کے جوڑے بھی سِلیں۔" قریب بیٹھی ملازمہ ما ایک انگلی سے کپڑے کا کونا دباتے ہوئے کہا۔ جہاں آرا نے سر اٹھا کر غصے اور کرب سے اس ڈالی اور اپنی سلائی پر جُھک گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ جنہیں اس نے چپکے اپنی ساری کے سُرخ کنارے سے پونچھ لیا۔

دیپالی نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"اپنی شادی کے ذکر پر نہ جانے کیوں اس کا یہی ری ایکشن ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ میرے بھی رونے لگی تھی۔ جانے کیا بات ہے۔ کبھی کچھ بتاتی بھی نہیں۔" روزی نے چپکے سے اس کے

لہا۔ دیپالی اپنے ہاتھوں کا رعشہ چھپانے کے لئے ذرا دوسری طرف کو مڑ گئی۔ مگر اس طرف گلابی
ب ڈی شین کے بکھرے ٹکڑوں میں سے کھلنا میں بنی سیتل پاٹی پر چھپا ہوا گلدار ہرن اُسے
نکنے لگا۔

فریدہ ہارمونیم بند کر چکی تھی۔ باغ پر ایک دم بڑا سناٹا سا چھا گیا۔ ساری لڑکیاں سر
ے اپنے اپنے کام میں مصروف تھیں۔

چند منٹ بعد باتونی اور بے چین یاسمین نے اس خاموشی کو توڑا۔ "کیسا funny سا تخت
" اس نے جنگلے پر طبلہ بجاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

"سنگھاسن بتیسی ـــ!" گھاس پر بیٹھی ملازمہ مالا نے کھیسیں نکال کر کہا۔

"کون جینز ـــ؟" یاسمین [illegible] پوچھا۔

"راجہ بکرم جیت کا سنگھاسن۔" فریدہ نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

"اوہ ـــ" یاسمین نے مورتیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

سیتل پاٹی پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں نے بھی دفعتاً باتیں شروع کر دیں۔

"امی ایک جوڑا فرشی پائجامے کا بھی رکھ رہی ہیں۔" اختر آرا فریدہ سے کہہ رہی تھی۔

"ادھر ہندوستان میں تو صرف غرارہ ہی پہنا جاتا ہے۔ ابا بتا رہے تھے۔" انجم آرا نے جو
سے واپس آ چکی تھی۔ گھاس پر دوزانو بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپا کے پاس تو کئی فرشی پائجامے ہیں ـــ ہیں نا آپا ـــ؟ مگر آپا پہنتی ہی نہیں" اختر آرا نے کہا۔

"اب بڑھاپے میں کیا خاک پہنوں گی۔" جہاں آرا نے تلخی سے کہا۔

"اے لو ـــ اور سنو ـــ" فریدہ نے ذرا کھوکھلی آواز میں بُرا مانا۔

"یاد ہے ایک دفعہ آپا نے عید پر غرارہ پہنا تھا ـــ؟ جب ہم لوگ سب خالو جان کے ہاں
گئے تھے۔" اختر آرا نے انجم آرا سے کہا۔

اُس عید پر اس نے کلکتہ سے حسبِ معمول شرارتاً ایک بیہودہ واہیات سا عید کارڈ بھیجا
پر ہلال، کھجور کے درخت اور اونٹ کے منظر کے نیچے دو ہاتھ (ایک نسوانی ایک مردانہ)
ہے تھے اور برابر میں دو موٹے مسخرے نفیریاں بجا رہے تھے۔ کارڈ کی پشت پر اس نے اردو

میں ایک سخت بازاری شعر لکھا تھا ـــ "عید کا دن ہے، پتہ نہیں کیا ـــ مجھے مصرعہ یاد نہیں ـــ گلے مل لو صاحب ۔ رسم دنیا بھی ہے ۔ موقع بھی ہے دستور بھی ہے"۔ اس کی اردو رائٹنگ کتنی کچی اور بچکانہ تھی ۔ جہاں آرا ایک گھٹنے پر سر رکھ کر سلائی میں مصروف رہی ۔)

"چھوٹی لڑکیو ۔ دسترخوان لگ گیا ۔" برآمدے میں سے ایک بوڑھی ملازمہ نے پکارا

"آتے ہیں ـــ" اختر آرا نے جواب دیا ۔

روزی "سنگھاسن" سے اتر کر چیزیں سمیٹنے کے لئے سیمل کے نیچے چلی گئی ۔

یاسمین ابھی تک سنگھاسن بتیسی کے تصور میں محو تھی ۔ اس نے اچانک سر اٹھا کر جہاں آرا اور دیپالی کو مخاطب کیا ۔

"آپا ـ آپا ـــ دیدی ۔ تم دونوں اور میں اس تخت پر بیٹھے ہیں نا ۔ تو یہ Pretend کرو کہ ہم تینوں پایوں والی مورتیاں ہیں جو راجہ بھوج اس لائق نہ ہوگا ہم اسے اس تخت پر قد کبھی نہ رکھنے دیں گے ۔"

"کیا دیوانی لڑکی ہے!" جہاں آرا نے ہنس کر کہا ۔

دیپالی بلاؤز ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی ۔ تب جہاں آرا نے پہلی بار اس کی وحشت زدہ شکل دیکھی ۔ اس نے گھبرا کر کہا ۔ "ارے دیپالی تمہیں کیا ہو گیا ۔ ؟"

"کچھ نہیں بھائی ۔ میرے سر میں بڑا سخت درد ہو رہا ہے ۔" اس نے شدید اکتاہٹ اور تکان کے ساتھ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا ۔

"ارے تو اوپر جا کر ذرا لیٹ رہو ـــ کھانا پھر کھا لینا ۔"

"نہیں ۔ میں اب گھر جاؤں گی ۔"

"ابھی سے ؟ تمہیں ہو کیا رہا ہے بیٹھے بٹھائے ؟"

"جہاں آرا" دیپالی کی آواز میں التجا تھی ۔ "مجھے اب گھر جانے دو ۔ اتوار کو بمبئی جانا ہے ۔ اس کے لئے پیکنگ بھی ـــ" وہ بات پوری کئے بغیر تھک کر چپ ہو گئی ۔

"ایک تو اتنے دنوں بعد آئیں ۔ ساری چھٹیاں جانے کہاں کہاں سیر سپاٹے کرتی پھریں اب بھاگی جا رہی ہو ۔ یہ کیا دھاندلی ہے ۔ اطمینان سے بیٹھ کر آج گپ بھی نہیں ہو سکی ۔" جہاں آ

دیپالی پر دوبارہ نظر ڈالی ۔ "تم واقعی بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ چلو جلدی سے چل کر کھانا لو۔ پھر چلی جانا۔ مالا ۔" اس نے ملازمہ کو آواز دی ۔ "ڈرائیور سے کہو۔ موٹر ادھر لا کر لگا دے۔ لی بی بی جلدی گھر جانا ہے۔ آؤ ۔" اس نے دیپالی سے کہا۔

باقی لڑکیاں کام سمیٹ کر کوٹھی کے پچھلے دالان تک پہنچ چکی تھیں۔ بوندا باندی شروع ہو گئی ں کے پہلے قطرے تالاب کی سطح پہ ننھے منے بھنور بنا رہے تھے۔

روزی بھاگی ہوئی دیپالی کے پاس آئی۔ "کیا ہوا ۔ کیا ہوا جہاں آرا ؟"

"کچھ بھی تو نہیں ۔" دیپالی نے ذرا درشتی سے کہا۔ "یہ میں کیا اپنا تماشہ بنا رہی ہوں۔ اس نے یں کہا۔ اور "راج سنگھاسن" سے اتری ۔ چلو دیپالی اٹھو ۔ اس نے حسب عادت خود کو ب کیا ۔ اور پھر لوپو پہ پہنچنا ہے۔ چلو دیپالی سرکار دوسرا قدم آگے بڑھاؤ۔

وہ جہاں آرا اور روزی کے ساتھ کوٹھی کی سمت روانہ ہو گئی۔

۱۷

گوڑ ملہار

جل تھل۔ نیہر۔ تال۔ بن۔ اُپ بن۔ ندی۔ نالے۔ گڑی۔ گوہا۔ سب ہی کچھ۔ سارا بنگال دیس رت میں، ایک بیکراں دریا بن چکا ہے۔ شہر کی گلیوں میں نوکائیں چل رہی ہیں۔ کالے بادلوں کے فانی ندیاں بہتی ہیں۔ کائنات پھیل کر وسیع تر ہو گئی۔ فصلیں بونے اور بالیدگی اور تجدید اور شادابی م۔ پٹ سن کٹنے والا ہے۔ تنکے کی نوکیلی چھجے دار ٹوپیاں اوڑھے کسان کھیتوں میں دھان بو یں۔ محلوں دو محلوں، مکانوں اور جھونپڑوں میں ڈھولک بج رہی ہے۔ آبی راستوں کے چومکھے جال پر باراتیں رواں ہیں۔ بانسریاں بجتی ہیں۔ امراء کی دلہنوں کی پالکیاں کشتیوں اور اسٹیمروں ھائی جا رہی ہیں۔ غریب باراتی شکستہ چھتریاں لگائے گاتے بجاتے شمپانوں میں لدے ایک گاؤں سے ے گاؤں جا رہے ہیں۔ برکھا رت، شادیوں کی رت ہے۔ ہر برسات کی مانند اس برس بھی کتنے بندھن ۔ ان سب دلہنوں کی قسمتوں میں کیا لکھا ہے۔؟

گھر کی لکشمی، ہزار برس کی نیو بہوؤں نے سندھیا کال اپنے آنگنوں میں لکشمی کی اوتار کے گملوں کے سامنے چراغ جلا دیئے۔

پچھلی صدیوں کی وہ سداسہاگنیں جو زبردستی ستی ہونے چلیں اور اپنے گھروں کے درو پر ریت کے مطابق لاکھ کے رنگ میں ڈبو کر اپنے داہنے ہاتھ کا نشان لگاتی گئیں۔ اندھیرے جنگلو میں، دور افتادہ گاؤں میں پرانے بوسیدہ مکانوں کے دروازوں کی چوکھٹوں پر ان کے چھو سے پنجے کے سُرخ نشان ٹمٹما رہے ہیں۔ تاریک بنوں میں ان بے چاری ستی ساوتریوں کی سما کے گول، نیچے لرزہ خیز گنبد، بارش میں بھیگتے ہیں۔

شعراء کی موضوعِ سخن، افسانہ نگاروں کی ہیروئن۔ جذباتی چترکاروں کی تصویر ــــ

بنگال کی عورت۔ سدا دکھ سہنے والی۔ صابر و شاکر۔ بے چاری۔

سیندور اور مہندی کی سُرخی۔ لاکھ کے رنگ کی سُرخی۔

بوندوں کی لڑیاں۔ زندگی۔ موت ــــ زندگی کی پھول مالا گوندھتی جا رہی ہیں۔

جب بارش تھمتی ہے تو بادلوں کے اودے شامیانے کے نیچے مور ناچنا شروع کر دیتے ہیں کنجوں میں جوتھیکا کھلی ہے۔ بنوں میں سال کے پھول مہک اٹھے۔ بھیگی، گھُپ اندھیری رات جگنو چمک رہے ہیں۔ جن کی روشنی میں کبیوں نے کہا۔ ابھیسارِیکا۔ اپنے محبوب سے ملنے جاتی ندی کنارے بید کے پھول کھلے ہیں۔ ہرے اور سیاہ پروں والی مرغابیاں چلا رہی ہیں ــ ہرا درختوں کے نیچے چپ چاپ کھڑے ہیں۔ جھینگر ٹھنکنے لگے۔

پودے بڑھ رہے ہیں۔ کھیت لہلہا اُٹھے۔ بانس کے سرسراتے جھنڈ میں ہاتھی بارش سے بچنے کے کھڑے کان پھٹپھٹا رہے ہیں۔ بگلے مچھلیوں کے تعاقب میں ہیں جن سے تال اور ندیاں لبریز ہو گئیں۔

پروائی میں کیتکی مہک رہی ہے۔ بانس کے جھرمٹ میں سانپ سوتا ہے۔

ندی پر سے بارات آ رہی ہے۔ بارات آنگن کے دوار پر اُتر گئی۔ تلسی کے سامنے چرا جل رہا ہے۔

یہ کس کا گھر ہے اور دولہا کون ہے؟ اور کہاں ہے؟ کس کی دلہن ہے جو اٹاری پر بال بکھرائے پریشان سوتی ہے۔؟

۱۸

میگھ رنجنی راگنی

آدھی رات کے بعد بارش تھمی۔ سیمل کے خنک پتّوں میں سے ٹپ ٹپ گرتی بوندیں باغ کی رسی مٹّی پر گرتی رہیں۔ مینڈکوں کا شور ایک دم تیز ہوگیا۔ محل میں روشنیاں جل اٹھیں گیما سی مذاق۔ شور۔ قدموں کی چاپ۔

دوسری منزل کی طویل گیلری میں سے گزرتی انجم آرا لہک لہک کر ٹیگور کا گیت الاپ رہی ہے۔

استھولے جولے نبھا استھولے بنے اُن سنے ندی نادے۔ گری گوہا یارابارے
آشاڑھے نو لیوا آنندو اُتشبو نو لیو۔
اتی گمبھیرانی گمبھیر نیل ادمبرے ڈمرو بلجے

وہ بے چینی سے مسہری پر کروٹ بدلتی ہے۔ شنکری ناچے۔ شنکری ناچے۔ پن ملّار گیت گاہی بھار راتے — آواز دُور چلی جاتی ہے۔

لیکن سینے میں گیت جاری ہے۔

کورے گرجن نیرجھرنی سگھنے۔ اُٹھے ردب بھیرب تانے بتانے

سینے میں وہ گا رہا ہے

جبکہ وہ بال بکھرائے برجی نقش و نگار کے چھپرکھٹ پر بے چینی سے سوتی ہے۔ وہ سیمل کے نیچے کے شکستہ سنگھاسن کے کنارے کھڑا گائے جا رہا ہے۔ وکرمادتیہ کے زرد عقیق کے تخت میں سے سبز شعاعیں چھوٹ رہی ہیں۔ انصاف کا تخت ایک دم جگمگانے لگا۔ وہ گا رہا ہے۔

دیکھے دیکھے کتنو بانی نو لیو نو لیو کتھو بھاشا۔ جھورو جھورو جھورو روشو دھارا۔

جھورو — جھورو — اتی کہتی ہیں۔ مالا کہتی ہے سیمل کے سفید اور زرد پھولوں میں بجرے کی طاقتیں پوشیدہ ہیں۔ جادو ٹونے۔ معجزے۔

”بی بی ۔۔ بی بی ۔ اٹھیئے ۔ وہ آگئے ۔“

وہ ایک دم چونک کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ہے ۔

مالا مسہری پر جھکی اسے جگا رہی ہے۔ چھت کا برقی پنکھا تیزی سے گھوم رہا ہے۔ کھلے ہو دریچوں اور دروازوں میں سے تازہ، سہانی ہوا اندر آ رہی ہے ۔

چنبیلی کے پھولوں کی اور برسات کی رات کی مہک ۔

”کون آگئے ۔ ؟ کون ۔۔ ؟“ اُس کا دل اُچھل کر حلق میں آگیا ہے۔ رنگ سفید پڑگیا پاؤں میں سنسنی ۔

”بی بی ۔“ مالا سرہانے ریشمی جھالردار لیمپ کا سوئچ دبا کر اطمینان سے کھیسیں نکالتے ہو جواب دیتی ہے: ”اجی وہی سب ۔ سگن بگیچے والے ۔ دو ٹھو موٹر بھر کر ۔ دیناج پور چلنے خاط سب جنے تیار ہیں ۔ جہاج ٹھیک سات بجے چھوٹے گا ۔ آپ ابھی تلک سو رہی ہیں ۔ یہ اندھیر

”اوہ ۔۔۔“ وہ بال سمیٹ کر آنکھیں موند لیتی ہے ۔ میرے خوابوں سے تمہارے خوابوں اب قیامت تک کا فاصلہ ہے ۔۔ اچھا بھائی ۔۔ جو تمہاری مرضی ۔

”جلدی کیجیئے بی بی ۔“

”اچھا ۔ اچھا ۔“

مالا بڑی مصروفیت سے دروازے کا پردہ اٹھا کر باہر نکل جاتی ہے ۔

وہ مسہری سے اتر کر ننگے پاؤں بڑے دریچے میں جاتی ہے ۔ نیچے باغ پر گھرے، بادل چ کھڑے ہیں ۔ یہ برسات بھی گزرنے والی ہے ۔ گزر جائے گی ۔

بجلی چمکتی ہے ۔

ان مادنی سودامنی رونگ بھرے زرتیہ کو رے ۔۔۔ امبر تلے ۔۔۔ انجم آرا کی سُ آواز اب نچلی منزل سے آ رہی ہے ۔ فریدہ اور دوسری لڑکیوں کے قہقہے ۔

وہ آگئے ۔۔۔ وہ چند لمحوں قبل کی اپنی حماقت پر تلخی سے مسکراتی ہے ۔ اتنے برس ۔ اتنے ا ئے خزائیں، اتنے بھادرو، اتنے موسم نکل گئے ۔ وہ اب کبھی نہیں آئیں گے ۔ اب کیا آئیں گے ۔

دریچے سے ہٹ کر وہ غسلخانے میں جاتی ہے ۔ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپکے مار کر واپس

ہے۔ الماری کی طرف بڑھتی ہے۔ الماری کے قد آدم آئینے میں اپنے بھیگے ہوئے چہرے کا عکس دیکھتی ہے۔ یہ میں ہوں۔

وہ الماری کا پٹ کھولتی ہے۔ مرشد آبادی ریشم کی ایک بیش قیمت گلابی ساڑھی نکال کر باندھتی ہے۔ پھر وہ سوئینگ باکس کھولتی ہے۔ (یہ سوئینگ باکس اسے دن میں کتنی بار کھولنا بند کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو فولاد کی طرح مضبوط بنا لیا ہے) اس میں سے وہ برما کے گلابی موتیوں کا ہار اٹھا لیتی ہے — جو شام اس نے امی کے سیف میں سے نکلوایا تھا۔ تصویر کو اس نے مختلف چیزوں کے نیچے اچھی طرح چھپا کر رکھا ہے۔ برسوں سے وہ تصویر اسی طرح بید کی اس صندوقچی کی تہہ میں رکھی ہے۔ اتنی مدتوں بعد بھی، اسے یقین ہے کہ اگر اس پر اُس کی نظر پڑ گئی تو اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔

وہ بال گوندھ کر، گہنے پہن کر کمرے سے مسکراتی ہوئی نکلتی ہے اور نیچے قہقہوں اور شادمانیوں کی دنیا میں شامل ہونے کے لئے اپنے مہندی لگے ہاتھ کو جنگلے پر لٹکاتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگتی ہے۔

آشاڑھے نو بو آنند و آتشبو نو بو ۔
میری ہر لحظہ، ہر آن جلتی ہوئی چتا کس نے دیکھی ہے؟
نواب قمر الزماں چودھری کی بڑی صاحبزادی جہاں آرا بیگم ۔

نیچے برساتی میں سترہ سالہ یاسمین مجید خوش اور بشاش، جارجٹ کی ہری اور لال چُنری ساری پہنے، دو چوٹیاں گوندھے، زیور پہنے، موٹر سے اتری ہے اور برآمدے میں کھڑی فریدہ اور جہاں آرا کے ساتھ قہقہے لگا لگا کر نیّر الزماں کو تنگ کر رہی ہے۔ خوش اور بشاش۔

اُس کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟

اور وہ اجنبی، بھولی لڑکی، جوان پُرشور، دریاؤں، طوفانی راستوں کے اس پار، دیناج پور کے ایک دور افتادہ گاؤں میں اجنبیوں کے اس قافلے ایک اجنبی انسان کی آمد کی منتظر ہے۔ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟

دھان کے پودوں کی آواز سنو۔ جو بہرے سناٹے میں آہستہ بڑھ رہے ہیں۔

۱۹

بھیرَبی کا خواب

کس کی دلہن ہے یہ بیکراں، بھیانک رات نے پوچھا۔ جو بھیرَبی کی طرح بال بکھرائے، پریشان سوتی ہے؟

بوندوں کی لڑیاں مسرّی سدن کے باغ پر ٹپ ٹپ گرتی سُرخ مٹّی میں جذب ہو گئیں۔ عمارت کے ایک کمرے میں، کھڑکی کے نیچے، پلنگ پر وہ بے چینی سے کروٹ بدلتی ہے۔ سارا باغ جگنوؤں سے جگمگا رہا ہے۔ وہ بھوج پتروں کے ڈھیر پر چڑھی بیٹھی ہے۔ میں جگنوؤں کی روشنی میں زعفران سے تمہیں خط لکھوں گی اور پون دوت کے ذریعے بھجواؤں گی جس طرح ہم اپنے الفاظ ہوا کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اگر نہ پہنچیں تو کیا ہو۔؟ جگنو اور بھوج پتر اچانک غائب ہو گئے۔ گورکھا ملی کا ٹیڑھی میڑھی شاخوں والا خوفناک درخت اس کے سر پر جھولے جا رہا ہے۔ بھوانی کا بوڑھا مندر جڑ سے اُکھڑ گیا! اس سال بڑا بھاری سائیکلون آیا تھا بھائی۔ کتب خانے میں دروازے نہیں ہیں۔ صرف دیواریں۔ صرف دیواریں۔ کوئی راستہ نکلنے کا نہیں۔ کھڑ کھڑ کھڑ ــــ بھوج پتروں کے نیچے سے وہ نمودار ہوتا ہے۔ بڑی چالاکی سے، چوہے کی طرح چلتا وہ سامنے آگیا۔ بھکشو۔ سر منڈا۔ عینک لگائے۔ کھڑاؤں پہنے۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔ کھیسیں نکال کر وہ ایک بھوج پتر اس کے حوالے کر دیتا ہے۔

(یہ بھکشو چائنا بھون میں پڑھاتا ہے) وہ غور سے پڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بڑی عجیب زبان ہے۔ سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ فائنل امتحان اسی زبان میں ہوگا۔ بجلی کڑکی۔

بھکشو بھی غائب۔ وہ چائنا بھون کے برآمدے میں کان لگا کر سُن رہی ہے۔ "میری آواز تمہاری کڑک۔ میرے آنسو تمہاری مسلسل جھڑی۔ میرے من کی آگ تمہاری بجلی۔ میرے دل میں اس کا چہرہ ہے اور تمہاری آغوش میں چاند۔ میں اور تم یکساں ہیں۔ بھائی بادل۔ پھر مجھے کیوں تنگ کرتے ہو۔"

بڑا مدھم، سہانا اجالا سارے میں پھیل گیا۔ پھول بن میں چمپک کے شگوفوں کا چراغاں سا ہو رہا ہے۔ ندی کے کنارے کنارے چلتا وہ خراماں خراماں اس کی سمت آ رہا ہے۔

وہ چکوروں کا محبوب لمبے بالوں، کالی آنکھوں والا، ہاتھ میں کنول سنبھالے، انگلیوں سے امرت گراتا۔ اولوکتیشور۔ پدم پانی۔

وہ کلا بھون کے باغ میں موجود ہے۔ مسرور۔ محفوظ۔ نندلال بوس۔ برآمدے میں ترکی ٹوپی اوڑھے نقرائی پیچوان گڑگڑا رہے ہیں۔ ہر طرف تصویریں ہی تصویریں۔ جوان گھاس پر چلتا اشوک کے پھولوں کا تاج پہنے وہ اس کی جانب آ رہا ہے۔ لوک ناتھ۔ لوکیشور

وہ خوشی سے کھلکھلا کر ہنستی ہے۔ وہ بین کی طرح منہ اٹھا کر بانسری بجاتا ہے۔ وہ چاندی سے بنا۔ سیاہ بادلوں سے نکلتا سورج۔ امیتابھ۔ منجوشری

بیکراں نور۔ بیکراں رحم۔ بیکراں محبت۔

بالکل قریب آ کر اس نے عینک اتار لی اور گھور کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر آنکھیں ہی نہیں تھیں۔ آنکھ۔ ناک۔ منہ۔ کچھ بھی نہیں۔ خالی چہرہ۔ بالکل خالی چہرہ —— انڈے جیسا۔ اس چہرے و جیسا چاہو بنا لو۔ بھکشو نے غرّا کر کہا۔ وہ دہل کر چیخی۔

یہ لو۔ بھکشو نے کہا۔ اور خالی ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

یہ کیا ہے؟

دودھ کا گلاس۔ جاؤ جا کر پرستش کرو۔ کیسی کمیونسٹ ہمدرد ہو۔ پوجا پاٹ نہیں کرتیں ہیں بیٹی تم کمیونسٹ تو نہیں ہو گئیں؟

کس کی پرستش؟

اپنی۔ ہم سب اپنی اپنی پرستش کرتے ہیں۔

مگر آج تو ناگ پنچمی ہے۔

ہاں۔

کون سی؟ کس صدی کی ناگ پنچمی ——؟

ازل سے ابد تک۔ محض ایک لمحہ —— وہ انگلی اٹھا کر مسخروں کی طرح ناچنا شروع کر دیتا ہے

وہ خالی ہاتھ اِس طرح اُٹھائے گویا انجلی تھامے ہو۔ وزنی قدموں سے پھر گورکھ املی کی سمت چلی۔ جنگل کا جنگل جگمگا رہا ہے۔

او جگمگانے والو۔۔۔ جاگو۔۔۔ تھرڈ ایر کی لڑکیوں نے قطار میں کھڑے ہو کر پڑھنا شروع کیا۔ وہ حسبِ معمول ڈائرکٹ کر رہی ہے۔۔

او جگمگانے والو۔ چبوترے پر کھڑی دبلی پتلی اور نوعمر اور حسین سروجنی دیبی کی آواز۔ جاگو۔۔۔ کہ ہم گپھاؤں اور ٹیلوں! اور مقدس برگد کی جڑوں میں چھپے تمہارے مندر ڈھونڈتے آئے ہیں۔ ابدی خرد کے مراقبے سے اپنے پھن اٹھاؤ۔ جاگو۔ بانسری کی دھن پر وجد کرو۔ ہم تمہارے لئے دودھ اور باجرہ اور جنگلی انجیر اور سنہرے شہد کی انجلی لائے ہیں۔ ہم نے عود و لوبان سے فضا کو متبرک کیا ہے۔ ہماری لاچار زندگیوں اور باصبر مشقت اور ہماری نیندوں اور ہماری مضطرب تمناؤں کی حفاظت کرو۔ ندی کی طرح تیز اور شبنم کی طرح خاموش، بجلی کی طرح سُبک اور آفتاب کی طرف درخشاں۔۔ عارفو۔۔ تم کہ اس قدیم خاموشی کی علامت ہو، جس میں موت و حیات، رنج و غم ایک ہو۔۔۔ اسٹیج دھڑام سے گر پڑی۔ گورکھ املی کی شاخیں زور زور سے سرسرانے لگیں۔۔

سینکڑوں برس پرانا، بوڑھا جوگی درخت اُس کے سر پر پھڑکھڑا رہا ہے۔۔۔ پریتوں کا بسیرا۔۔۔ "پچھلے آٹھ سو برس کی ہماری تہذیبی تخلیق۔۔۔" اُداس روحوں کا مسکن۔ بوڑھے مندر کے کنارے مندر کا اندھا پروہت (یہی ہے، اس نے میرا بیاہ کرایا تھا) منڈیر پر کھڑا دہاڑ رہا ہے۔ شری رام اور سیتا مہارانی۔ بندھیاچل کے بنوں میں کھو گئے۔ ہری ہر۔ ہری ہر۔ ہری ہر۔ دُہائی ہے۔ دُہائی۔۔۔ گورکھ املی نے زور کا ہنکارا بھرا۔ اس کی ڈراؤنی چھاؤں میں کپالی بیٹھے ہیں۔ کپالیوں کی آل انڈیا کانفرنس۔ ڈائس پر تنترک عملیات کا عود سُلگ رہا ہے۔ آن گنت کپالی۔ ایک کپالی کھڑکی میں سے اندر کود آیا۔ لو دم لگاؤ۔ نو۔ تھینک یو۔ میں نے آج تک سگریٹ بھی نہیں چکھا۔ سگریٹ پیا جاتا ہے۔ چکھا نہیں جاتا۔ بے وقوف۔ لو ایک سُوٹا۔ لگے دم۔ مٹے غم۔ معاف کیجئے گا آپ مداری ہیں یا ویشنو، الکھ نرنجن۔ آمار پرانیر آرام مونیر آنند۔ آتما رہتّیا۔ اکسکیوزمی۔ آپ کی داڑھی تو بالکل پٹ سن کی معلوم ہوتی ہے۔ ہاہاہا۔ نقلی۔ سادھو۔ نقلی راجہ۔ نقلی سنگھاسن۔ آآآ سب جگ نقلی۔ سب جگ دھوکا۔ ساری دنیا گورکھ دھندا۔ اُلجھن میں لے کام سمجھ سے۔ کھل جائے گا پھندا۔ ہارمونیم

خوب زور سے بج رہا ہے۔ مائی نیم مس بہری مٹی۔ سارے کپالی کھوپڑیوں کی مالائیں پہنے، ترنگے، ہرے اور لال پھریرے اڑاتے، گھنٹیاں بجاتے، انڈر گراؤنڈ مٹھ میں اتر گئے۔ تم نے آنند مٹھ پڑھا ہے؟ ترکی ٹوپی والا جوکر۔

چلتی چلتی وہ دریا پر آ گئی۔ سامنے سُرخ لہروں پہ ہری ناؤ بنا پتوار بہے جاتی ہے۔ ناؤ پر نگریزی میں لکھا ہے۔ "ایس۔ ایس۔ علاؤل" بھئی واہ۔ ناؤ بہے جا رہی ہے۔ بے آواز منظر میں سے ساؤنڈ غائب۔ بھیانک۔ وہ خود کشتی میں بیٹھی ہے۔ اچانک دھماکہ۔ اب ونگ میں سے لالن شاہ گاتا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ لالن شاہ جادوگر۔ سینکڑوں برس ہوئے مر گیا۔ پھر بھی گا رہا ہے۔ دھندلی نکل۔ ہیولا۔ کتنا ہی غور سے دیکھو۔ صاف نظر نہیں آئے گا۔ میں عشق ہوں۔ ناقابلِ فہم۔ غیر مرئی۔ گرفت سے باہر۔ لالن شاہ ڈائیلاگ بول رہا ہے۔ اس کے دھوان ایسے ہاتھ میں کدم کا پتہ ہے۔۔ ل کی شکل والا کدم کا پتہ۔ کیا گاتا ہے لالن شاہ کہ میرے پاس شیشے کا ایک گھر ہے۔ اس میں میرا ڑوسی رہتا ہے۔ اسے میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ میرے اور اس کے درمیان گہرا دریا حائل ہے۔ س دریا کو کیسے پار کروں۔ کاش وہ خود ہی میرے پاس آ جائے۔

او بھائی رے۔

اب وہ دوسری طرف کروٹ بدلتی ہے۔ سامنے گھڑیال ہی گھڑیال۔ گھڑیالوں کی فوج۔ ہر گھڑیال ں پشت پر ایک ایک سیلولائیڈ کا کام دیو[1] سوار ہے۔ جاپانی کام دیو۔ بوگس۔

تاریک طویل رنگ برنگی سُرنگ۔ اندھکار۔ سمندر۔ میں اس دریا میں ڈوب جاؤں تو مجھے جل مادھی دینا۔ ہے بن[2] مالی۔

پتوار بغیر ناؤ کے بہہ گئی۔ ناؤ بغیر ندی کے رواں ہے۔ چراغ بنا لَو کے روشن ہے۔ لَو بنا راغ کے جل رہی ہے۔

جنگل کا جنگل چل رہا ہے۔ ندی کے مانند بہتا ہے۔ اور ندی ساکت ہے اور انسان درختوں طرح جمے کھڑے ہیں

---

[1] ہ گھڑیال کام دیو کی سوار؟) [2] ۲۔ کرشن۔

ہاتھی۔ سیاہ ہاتھیوں کی قطار۔ متّی کا کالا ہاتھی، سُرخ تالاب کے کنارے کھڑا احمقوں کی طرح کان ہلا رہا ہے۔ دھماکہ۔ ونگ میں چھپا لالن شاہ پھُس پھُسی آوازیں (گاتے گاتے اس کا گلا بیٹھ گیا) کہتا ہے۔ جہاں آرا، آدھی رات کو اسی تالاب میں ڈوب کر مر گئی۔ اب لالن شاہ انگریزی میں اناؤنس کر رہا ہے۔ نواب زادی جہاں آرا بیگم کو قتل کر دیا گیا۔ مرڈر اِن کولڈ بلڈ۔ زندہ ہے مگر جیتے جی مر گئی۔ ایک اور دھماکہ۔ رعد کی کڑک۔

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ باہر زور سے بجلی چمکی۔ بادل گرج رہے تھے۔ اُس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ اُس نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ دہشت سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ اس کی رُوم میٹ آیانی دوسری کھڑکی کے نیچے اپنے پلنگ پر بے خبر سو رہی تھی۔ وہ چند منٹ تک ساکت وِسامت بیٹھی رہی۔ باہر تاریک آسمان پر بادل پھٹے اور چاند کی جھلک دکھائی دی۔ پھر چاند کھڑکی میں سے اس طرح جھانکنے لگا۔ جیسے بادلوں میں سے پھسل کر کمرے میں آن گرے گا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید چاند مجھے کوئی جواب دے۔ رات کوئی فیصلہ سنائے۔ اس نے رات کی گرجدار سمفنی پر کان لگا دیئے۔ نہیں۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔ نہیں۔ میں اپنے جسم، اپنے دماغ، اپنے پریشان خوابوں میں مقیّد ہوں۔

روانگی کے وقت اُس نے باگھیر ہاٹ پر کہا تھا۔ شوکتی۔ تم اکیلے میں زندگی سے ڈرنا ہرگز نہیں۔ شوکتی۔ یاد رکھو۔ مرد موت کا مقابلہ موت سے۔ مگر عورت موت کا مقابلہ زندگی سے کرتی ہے۔

ہا ہا ہا۔۔۔ وہ دل میں شدید تلخی سے ہنسی۔ اور پلنگ پر سر جھکائے بیٹھی اپنے داہنے پاؤں کے انگوٹھے کو غور سے دیکھا کی۔ زندگی! اس نے سوچا۔ زندگی! تو نے میرے ساتھ یہ کیا کیا۔؟

وہ صبح ڈھاکے سے شانتی نکیتن واپس پہنچی ہے سوچتے سوچتے اس کا دماغ ماؤف ہو چکا ہے۔ رات کو اسے بھیانک سپنے دکھلائی دیتے ہیں۔ دن میں وہ گم سم رہتی ہے۔ ایسا میرے ساتھ کیوں ہوا؟

چار سو بیس۔ دھوکے باز۔ ٹھگ۔۔

میری بڑی خوفناک غلطی یہ تھی۔ اس نے بال سمیٹتے ہوئے خود سے کہا کہ قومی اور بین الاقوامی جدوجہد کو نظر انداز کر کے، میں ایک ذاتی جذباتی جھمیلے میں پڑ گئی۔

شرمناک۔ افسوسناک۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں پونچھیں اور دبے پاؤں اُٹھی کھڑکی میں رکھی صراحی میں سے پانی انڈیل کر پیا۔ گلاس صراحی پر واپس رکھ کر باہر جھانکا۔ چاند بادلوں

میں کہیں بہہ چکا تھا۔

ساری عمر بات نہیں کروں گی۔ پہچان کے نہیں دوں گی۔ دھوکے باز۔

دھوکے باز ـــ باغ بہت سنسان ہے۔ رات چیتے کی آنکھ کی طرح مجھے گھور رہی ہے۔ عمر بھر بات نہیں کروں گی۔ ارے آپ کی اصلیت تو مجھے اب معلوم ہوئی بچہ جی۔ کُردک۔

برآمدے میں مدھم بلب روشن تھا۔ مرے ہوئے برساتی پتنگوں کا مختصر سا ڈھیر بلب کے عین نیچے فرش پر پڑا تھا۔ برآمدے کے باہر کرشن چوڑا کی ڈالیاں ٹھنڈی ہوائیں سرسرا رہی تھیں۔ مینڈک خاموش ہو چکے تھے۔ کبھی کبھی جھینگر چلّا اٹھتا۔

اسے ایک دم سردی سی لگی۔ وہ کھڑکی میں سے ہٹ آئی۔ نیم تاریکی میں ہاتھ بڑھا کر سرہانے کی میز پر رکھا ہوا اٹیچی کیس کھولا۔ اور ٹٹول ٹٹول کر ایک مٹی کا ہاتھی نکالا۔

ہاتھی تکیے پر رکھ کر اسے بڑی بہادری اور دھیان سے دیکھنے لگی۔ چھوٹا سا بے چارا مسخرا۔ سرخ اور زرد نقش و نگار والا مٹی کا ہاتھی۔

ابوالقاسم کی آمد کے بعد وہ مولوی ابوالہاشم کے کہنے پر کیا جھٹ پٹ کشتی سے اتر آئی تھی۔ اسے ایک ایک بات بڑی تفصیل سے یاد ہے۔ ایک ایک بات۔ اس رات وہ اور ریحان ٹہلتے ہوئے ایک بستی کی طرف گئے تھے تو وہاں ـــ وہاں کمہار کی دوکان پر مٹی کے کھلونوں کی قطار میں سجا یہ ہاتھی کتنا کیوٹ لگا تھا۔ وہ ٹھٹھک کر اسے دیکھنے لگی۔ تو ریحان نے خرید کر اسے دیتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ جب تم بہت دکھی ہو اسے الہ دین کے چراغ کی طرح گھسنا۔ میں فوراً آجاؤں گا۔ سنبھال کر رکھنا اسے تبرک کی طرح۔

اور ریحان نے کہا تھا۔ عاشق۔ بچّے۔ وحشی۔ یہ سب فطرت سے بے حد قریب ہوتے ہیں اور تصنّع اور مہذّب ریا کاری کے پردوں میں اپنے اصل جذبات نہیں چھپا سکتے۔ اور ان سب کو ٹوٹم، منتروں اور تعویذوں کی ضرورت بھی رہتی ہے۔ بچے اپنا پسندیدہ کھلونا سرہانے رکھ کر سوتے ہیں۔ وحشی تعویذ پہنتے ہیں۔ عاشق بھی اسی قسم کی احمقانہ حرکت کرتے ہیں۔ پرانے خطوط، پرانی تصویریں، نشانیاں، یادگاریں۔ محبت کرنے والوں کے ٹوٹم اور تعویذ ہیں۔

لہذا شوکتی! مولوی صاحب کے جھونپڑے کی طرف آتے ہوئے اس نے کہا تھا تم ایک چھوٹی

سی بچی ہو۔ تمہیں حفاظت کی ضرورت ہے۔ میں تمہارا تعویز ہوں، جو تمہیں ہر خطرے، ہر دکھ سے بچائیگا میں کہ ایک کپالی بیراگی ہوں، قوم کو مایا جال سے نکالنے کے لئے تپ کرنے والا مٹھ دھاری گوسائیں تم میری شوکتی ہو۔

یہ علامت۔ ہر تصور بے حد با معنی ہے۔ پیاری بچی۔۔ پھر اس نے بڑی گمبھیر آواز میں کہا تھا۔ تمہارا یہاں آنا بے حد خطرناک بات تھی۔ مگر میں نے مجرمانہ بے احتیاطی سے کام لے کر تم کو یہاں بلایا۔ کیونکہ مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں نے اگر تم کو جلد از جلد نہ دیکھا تو واقعی میں مر جاؤں گا۔ تم میرے اس جرم کا باعث ہو۔ لیکن چونکہ تم میرا طلسم ہو۔ اس لئے مجھے معلوم ہے کہ کوئی مصیبت نہیں آئے گی

شاید میں بے حد کمزور انسان ہوں۔

بے احتیاطی ـــ؟ اس نے دفعتاً بے انتہا سراسیمہ ہو کر پوچھا تھا۔

ہاں۔ کچھ عرصہ سے بڑی فاش غلطیوں کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر جب پہلے روز تم اودا سے ووڈلینڈز میں ملیں تو ان کو تمہیں ہرگز یہ نہ بتانا چاہیے تھا کہ نورالرحمن میاں دراصل یہیں ہیں۔ اگر تم کو پکڑ کر ایذا پہنچائی جاتی اور ـــ

اوہ نو ـــ اس نے دہل کر کہا۔

تم صرف سریندر اور راؤنل سے واقف ہو اور وہ بھی کچھ نہیں جانتے۔ اوما رائے بھی کچھ نہیں جانتیں۔

دفعتاً وہ اسے بے حد خوفناک نظر آیا۔ راکھشس۔ پاتال میں رہنے والا ناگ دیوتا۔ راسپوٹین یا ایسا جادوگر۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ اندھیرے سندر بن میں مہذب دنیا سے سینکڑوں میل دور اس پراسرار اجنبی کے ساتھ موجود تھی۔ نوعمری میں انسان ایسا DARE DEVIL کیوں ہو جاتا ہے۔ اب کیا ہوگا؟ پولس اور تھرڈ ڈگری۔

اچانک وہ ہنسا۔ اور کہنے لگا۔ چنانچہ شوکتی ـــ میں تم کو ہیرے جواہرات تو تحفے میں اور نشانی کے طور پر دے نہیں سکتا تم مٹی کے اس حقیر کھلونے کو ہی احتیاط سے رکھنا۔ یہ تم کو ہر آفت سے بچائے گا۔

دیپالی اس ننھی کو تکتی رہی۔ پرانے خط۔ تصویریں۔ نشانیاں۔ محبت کرنے والوں کے ٹوٹم ہیں۔ اس نے غم غصے سے ریحان کے الفاظ دل میں دہرائے۔ بید کی ایک صندوقچی میں رکھی ہوئی ایک پرانی تصویر بھی تو ٹوٹم ہے تم اسے بھول گئے۔

دوسری رات وہ تاریک دریا پر برستی بارش میں ہاٹھیرہاٹ کی سمت روانہ ہو گئے تھے۔ اس، پہلے
ز کے بعد سے ریحان نے شیو نہیں کیا تھا۔ بال بڑھا لئے تھے۔ کھلنا کے داڑھی دار مچھیرے کا بھیس بدل کر وہ
پ اندھیری رات کے سمندر میں ایک بار پھر غائب ہو گیا۔ اسی طرح اندھیری راتوں میں سفر کرتا وہ کلکتے پہنچا ہوگا
ہاں کہیں بھی پہنچا ہو۔ اب اسے معلوم ہو چکا تھا اب تک جو کچھ بھی وہ جانتی تھی۔ انڈر گراؤنڈ کے اصل
لات اس سے بالکل مختلف تھے۔ ایسی پُرخطر زندگی۔ کون کس پر بھروسہ کرے گا۔

کیا تمہاری آئیڈیالوجی بھی کہیں ایک اور ٹوٹم تو نہیں؟

اس نے ہاتھ تکیے کے نیچے سرکا دیا۔ اور لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد اسے نیند آگئی۔

عجیب عجیب شکلوں والے آدمی گھاٹ پر پھر آن کھڑے ہوئے۔ ایسے انسان، جن کے چہرے ہی نہیں
دریا پر براتیوں سے لدے اسٹیمر بھونپو بجا رہے تھے۔

پالکی چولے — پالکی چو لے ہو — ہو — قدموں کی تال کے ساتھ گاتے اگیا بیتال کہارو
اکر گھاس پر پٹخ دی۔

پالکی خالی ہے۔

جہاں آرا سامنے کھڑی ہے۔

اسٹیمر بھونپو بجا رہا ہے۔ اسٹیمر چھوٹنے والا ہے۔ اسٹیمر کا نام "عمرِ رواں" اندھیرے میں فاسفورس
رح چمکتا ہے۔ "عمرِ رواں" کیسا بھیانک نام ہے۔ "عمرِ رواں"۔ نام ایک دم چمک کر غائب ہو گیا
چلنا شروع کیا۔ جہاں آرا غائب ہو گئی۔ پالکی خالی رکھی ہے۔

رونا مسلسل رونا۔ رونے کی آواز — دور جاتے اسٹیمر کی سیٹی سے اونچی ہو گئی۔ تارا منڈل میں
دولہا ہاتھی پر بیٹھا ہے۔

صبح ہو گئی — سہانی، ابر آلود۔ آساڑھ کی صبح دور تک پھیل گئی۔

باہر باغ میں سے اقیہ مالی کی چھوٹی بچی کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ جہاں آرا، تو تو یقیناً یہاں
تعاقب نہیں کر سکتی۔

جہاں آرا۔ میری سکھی۔ میری بہن۔ میں نے تجھ سے تیرا آدمی چھینا۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ آپا۔ اب نہیں چھینوں گی۔ واپس کر دوں گی۔ مجھے معاف کر دینا۔ اس انجانی غلطی کو معاف کر دینا آپا

"ارے دیپالی۔" ابانی نے غسلخانے کی طرف جاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ "صبح صبح ر کیوں رہی ہو۔ کیا ہوا؟ گھر پہ تو سب خیریت ہے؟ تم تو بالکل کسی بھیرنی کی ایسی ہونق معلوم ہو رہی ہو۔"

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا چہرہ اور تکیہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔

"سب خیریت ہے ابانی۔" اس نے جلدی جلدی آنسو پونچھ کر ناک سنکتے اور بال سمیٹتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ اور ذرا آگے جھک کر سنگھار میز کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ بھیرنی۔ بال بکھرائے کی جوگن۔ !! "ہر علامت ہر امیجری بے حد با معنی ہے۔ پیاری بچی۔" کپالی بیراگی کا بچہ — ڈیم — ڈیم — ڈیم —

اُس نے پلنگ سے پاؤں اتار کر چپلیں اپنی طرف سرکائیں۔

زندگی کی ہر نئی صبح آفاقی رات کے اتھاہ سمندر کے کنارے ایک نیا اجنبی ساحل ہے۔ جس پر ہم اپنے خوشگوار یا اذیت دہ خوابوں کی کشتی سے مسرور یا مغموم، بشاش یا خوفزدہ، اُترتے ہیں۔

یہ نیند کی نوکا رات کے دریا پر ساری زندگی بہتی رہتی ہے۔ ہم اپنی عمرِ عزیز کے کئی برس بغیر پتوار کی اِس نوکا میں گزار دیتے ہیں۔ عمرِ رواں کی ہر نئی صبح جب ہم جاگتے ہیں۔ ہمارے خوابوں کی نوکا ایک دم غائب ہو جاتی ہے اور دوسری رات تک کے لئے ہماری منتظر جا کر پھر اپنے ساحل سے لگ جاتی ہے۔ نیند کی پُرسکون طوفانی ندیا پر خوابیدہ انسانوں کے سپنوں کی اَن گنت نوکائیں رواں ہیں۔ ایک دوسرے کے پاس سے گز جاتی ہیں۔ ایک دوسرے سے ٹکرا کر ڈوب جاتی ہیں یا کبھی کبھی دو نوکائیں اکٹھی گھاٹ کی سمت بڑھتی ہیں جہ مقدر کی زینت بی بی اپنے کالے سوکھے مضبوط ہاتھوں میں سرخ ساری کا بنڈل سنبھالے دلہن کی منتظر

چپلیں پیروں میں ڈال کر اُس نے اپنی رسٹ واچ اٹھانے کے لئے تکیہ سرکایا اور تب اس کی نظ متّی کے ہاتھی پر پڑی۔ اس نے ایک لمبا سا سانس لیا۔ ہاتھی کو اٹھا کر کھڑکی میں گئی۔ چند لحظوں تک ٹھٹھکی رہی ایک دم بڑے زور سے اُسے باہر پھینک دیا۔ پل کے پل میں وہ بے چارا کھڑکی کے نیچے اُگی ہوئی برساتی گھا

میں غائب ہوگیا۔ ہاتھی ڈباؤ گھاس۔ اس نے مسکرا کر دل میں کہا اور بانہیں پھیلائیں۔ اب میں آزاد ہوں۔ میں ہر جادو ٹونے۔ ٹوٹم، ٹوٹکے، تعویذ اور طلسم کے اثر سے مطلق آزاد ہوں۔ ہُرّے۔ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرنے کی سعی کرتی ہوئی وہ برآمدے میں چلی گئی۔

۲۰

ہرے بنگال کا "آنند کانن"

پاٹ کے پیلے پھول مرجھانے لگے۔ کھیتوں میں درانتیاں چل رہی ہیں۔ گٹھے پانی میں ڈبو دیئے گئے۔ کمر کمر پانی میں کھڑے کسان ریشہ علیحدہ کرنے میں جٹے ہیں۔ یہ ریشہ دھویا اور سکھایا جائے گا۔ جھونپڑے میں چرخے اور کرگھے چلیں گے۔

بنگال کے کسان نے اس ریشے کی خاطر سال بھر اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ بارش میں بھیگ کر دھوپ میں جل کر یہ شاندار فصل تیار کی ہے۔ کیچڑ اور بدبو کے سمندر میں ڈوب کر سونا اگالا ہے۔

اب یہ "طلائی ریشہ" کارگو کے مہیب فولادی جہازوں پر لد کر طویل دریاؤں پر سے گزرتا جوٹ اسٹیشنوں پر پہنچے گا۔ چاند پور اور مدار کی پور اور نرائن گنج میں اتارا جائے گا۔ کلکتے کے تاریک کارخانے اور اسکاٹ لینڈ کے جگمگاتے بینک۔ بنگال کے اس سنہرے دھن کی منزل ہیں۔

پاٹ کے سڑتے سڑتے برکھا رت بھی بیت چلی۔ گھاٹ اور گلیاں دو تارے کی جھنکار سے گونج رہی ہیں۔ سارے میں دھان کے گہرے سبز پودے لہلہاتے ہیں۔ چوپال میں مرشدی گان کی محفلیں ہیں۔ شیخ مدن باؤل اور درگائی فقیر اور پگلا کنائی۔ گاؤں کے نت نئے مندر سے گھنٹوں اور کیرتن کی آواز بلند ہوئی۔ رادھا کرشنا۔ رادھا کرشنا۔ رادھا کرشنا۔ رادھا کرشنا

چنڈی داس کی رادھا۔ رام پرشاد کی کالی۔ درگائی فقیر کا اللہ۔ اللہ رے۔ اللہ رے۔ اللہ رے۔

بادل بوڑھے ہو گئے۔ رات نے چاند نیک شگون کے گھڑے کی طرح آسمان کے آنگن میں رکھ دیا۔ بگلوں کی پرواز جھیلوں میں اسی طرح منعکس ہے جیسے ان گنت سفید کنول کھل جائیں۔ امیروں

لے ہاں بے تحاشہ کھانے والے برہمنوں کو اب گرمی محسوس ہو رہی ہے۔ گاؤں کے کبی نے کہا۔

پھر اشٹمی کی تیز دھوپ پانیوں پر پھیلی۔ سیندور ایسے سُرخ سورج کی گرمی نے نازک بدن بگلوں کو دُکھی کیا۔ نرسلوں میں چمکنے والے پرند اور پن کُکڑیاں اداس ہوئیں۔ ایکدم پلک گئی۔ اب ہیبتناک دریا اپنی پرانی رفتار پر واپس آ رہے ہیں۔ سیلاب اتر گیا۔ درخت سطحِ آب سے نمودار ہوئے۔ ٹیلوں پر بنے جھونپڑے ننھے منے زمردیں جزیروں کی طرح پانی میں کھڑے ہیں۔ ہر طرف ڈونگیاں چل رہی ہیں۔ ریت کی لہروں پر راج ہنس کے پنجوں کے نشان پڑے ہیں۔ زرخیز بھیگی دھرتی پر نئی فصلیں بوئی جاتی ہیں۔ جھونپڑوں کی مرمت کی جا رہی ہے۔

درگا پوجا کے لئے منڈپ اور بازار سج گئے۔ سارا دیس سنگیت سے گونج رہا ہے کہ درگا میکے آنے والی ہے۔ بیاہی بیٹی کے سواگت کے لئے گھر گھر تیاری کی گئی ہے۔ ہر ہندو گرہستن درگا کی ماں اور ہر گرہست گری راج ہے۔ گیتوں میں درگا کی ماں نے کہا۔ اوما کو میکے کب بلاؤ گے گری راج؟ جاڑے نکلے، برسات بیتی۔ خزاں آ گئی۔ مگر گوری اب تک نہیں آئی۔ اسے تم نے کیسے خبطی سناسی کے پلّے باندھ دیا۔ اس کا نو رنگ بھی کالا پڑ گیا ہوگا۔ جب کہتی ہوں گوری کو کیلاش سے لے آؤ تم ٹال جاتے ہو گری راج — میں اسے لینے کیسے جاؤں — میں تو لوک لاج سے مری جا رہی ہوں۔ ایسا ہے نکما بھکاری داماد۔

شنکر نے بڑی مشکل سے چار دن کے لئے گوری کو میکے بھیجا ہے۔ ہر سو تہوار کی دھوم مچی ہے۔ وجے گاتے ہوئے دیبی کو گھروں سے وداع کیا گیا۔ دیبی سجے ہوئے بجروں میں دریاؤں پر پہنچ پانی میں ڈبو دی گئی۔

کارتک میں رات کو آسمان کی شفاف جھیل پر چاند کا خزاں آلود کنول تیرا تیرا ابھرتا ہے۔ کچی سڑک پر گنے کے چھلکے بکھرے پڑے ہیں۔ ہوا میں زعفرانی گرد اڑتی ہے۔ جو کی بالیوں پر طوطے بیٹھے ہیں۔ تیز چاندنی میں مچھیروں نے اپنے جال دریاؤں پر پھیلا دیئے۔ ان کی بانسریوں کے سُروں نے پردیس جانے والے مسافروں کو مضطرب کیا۔ فضا میں آسمان کا دریا بہہ رہا ہے۔ اڑتے بگلے اور سفید بادل اس کے ریتیلے ساحل ہیں اور ستارے اس کے نیلوفر۔ ندی کنارے ٹھنڈی کیچڑ میں چرواہا سوتا ہے۔ گاؤں کے کبی نے کہا۔

اگھران مہینے میں دھان تیار ہو گیا۔ منڈیوں میں قیامت کی چہل پہل ہے۔ گانے کے مقابلے کئے جا رہے ہیں۔ گھر گھر نئے چاول کی کھیر پک رہی ہے۔

چاول۔ چاول۔ چاول۔

کر "سنہرا بنگال" سال میں تین بار چاول اُگاتا ہے اور بھوکا رہتا ہے۔

گلابی جاڑوں میں سپاری کے سڈول درخت گلابی سپاریوں سے لد گئے۔ پُوش کی چاندنی راتوں میں مچھیروں کے جال روپہلی مچھلیوں سے بھرے۔ کٹی ہوئی فصلوں کی رکھوالی کے لئے مچان بنائے گئے۔ الاؤ کے گرد غازی گان کی مجلس جمی۔ جھونپڑوں میں پرال بچھائی جانے لگی۔ رات کو گیدڑ جنگلوں سے باہر نکل آتے۔ سرسوں پھولی۔ دریاؤں پر کشتی رانی کے مقابلے شروع ہوئے۔ ساری گان کے جوشیلے سُر آبی راستوں پر پھیل گئے۔

ماگھ کی طویل راتوں میں بندر سردی سے کانپ رہے ہیں۔ کتا چولہے کے پاس بیٹھا ہے۔ لڑکیاں چراغ کی روشنی میں سوزنیاں کاڑھنے میں مصروف ہیں۔ پردیسی مسافر گاؤں والوں سے پرال اور بھوسہ مانگ رہے ہیں۔ غریب بڑھیا آگ تاپتی اپنی کٹی سے باہر نہیں نکلتی۔ دھان کے کھیتوں کے پاس اُپلے جل رہے ہیں۔ آپس میں جھگڑتے مسافر چوپال کے الاؤ کے پاس اکڑوں بیٹھے ہیں۔ اماوس کے سرد اور تاریک اندھیرے میں چڑیلوں اور جادوگرنیوں نے اپنے اپنے چولہے جلا لئے۔

صبح کا دھندلکا سارے گاؤں پر چھا جاتا ہے۔ دُور افق پر سرخ پھول پہنے، گھونگھٹ کاڑھے اوشا سسرال جاتی نظر آتی ہے۔ بھیریاں کی سُرخی کی طرح لال۔ جنیو پہنے، تلک لگائے، کندھے پر لال انگوچھا ڈالے سوریہ ٹھاکر برگد کے پیچھے سے جھانکتے ہیں۔ لو بھائی۔ وہ مالی اور سنار اور تیلی کے چھپروں تک پہنچ گئے۔ مالی کی لڑکیاں باغ میں پشپ انجلی کے پھول چنتی ہیں۔ تیلی کی لڑکی تالاب پر برتن مانجھتی ہے۔ صبح تڑکے سوُریہ ٹھاکر کرنیں بیل کی پیٹھ پر برستی ہیں جو سرسبز چر رہا ہے پر سرسوں کے پھولوں سے لدا آرام سے لیٹا ہے اور کہرا اس پلکوں پر جم گیا ہے۔ گدڑیاں اور پیوند بھری رضائیاں اوڑھے یاتری گلیوں میں بیٹھے رادھا کرشن نغمے گا گا کر بستی والوں کو جگا رہے ہیں۔ کولہو چلنے لگے۔ گڑ کی بھیلیاں بنیوں کی دوکانوں پر ہنسیں ـــــ گاؤں کے کبی نے کہا۔

اور اب جنگلوں میں پلاش کے پتے جھڑ رہے ہیں۔ بنوں میں شیر دہاڑتے ہیں۔ شیشم کے خنک اند کے نیچے پہاڑی راستوں پر اور کدم کھلے ہیں۔ سرسوتی پوجا کے لئے مورتیاں گھڑ کر دھوپ سکھائی جا چکیں۔ سرسوں پک گئی۔

پھالگن میں بانس کے ہرے بھرے جھنڈوں میں سے گذرتی، شہد کی مکھیوں کو جلو میں لئے پہنچی۔ دکھن کی سہانی ہوائیں چلیں۔ لڑکیوں نے بالوں میں کلیاں سجائیں۔ رنگین کشتیاں

لے کر ماجھی دریا پر نکلے۔ پشپ بنوں میں بھونرے گونجنے لگے۔

پھول بن میں آدھی رات کو آنا رے بھونرے۔ میں چاند کی بتی جلاؤں گی اور شبنم سے باتیں کروں گی اور سپنوں کی پگڈنڈی پر چلتی تمہاری اور آؤں گی۔ بہت دھیرے سے آنا رے بھونرے۔ کہیں تمہارا گیت ختم نہ ہو جائے۔ میری نیند نہ ٹوٹ جائے۔ پھول اور ڈالیاں نہ جاگ اٹھیں رے بھونرے۔ گاؤں کے کبی نے کہا۔

ہرجائی ہوا جنگل جنگل منڈلاتی پھر رہی ہے۔ چاروں طرف رنگ ہی رنگ بکھر چکے ہیں۔ رنگین ناؤ کا ماجھی اودی موجوں پر اپنی سبک کشتی کھیتا ہے۔ بل کھاتے دریا کی موڑ پر اسے سرخ رنگ کا جھونپڑا نظر آیا۔ ندی کے کنارے ہری گھاس پر نیلی ساری سوکھتی ہے۔ شام کی پرچھائیوں میں چھپی کالی باڑی کی سمت سے پائل کی آواز آرہی ہے۔ چھم چھم کرتی وہ گھاٹ پر آکر اپنا رنگین گھڑا پانی میں ڈبو دیتی ہے۔ اس کی شکل کی ایک جھلک نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ سورج لہروں میں ڈوبتا جا رہا ہے اور میں اپنی ناؤ کھے رہا ہوں۔ بھٹیالی کے مغنی نے کہا۔

چیتر کے شہد ایسے مہینے میں پلاش پھولوں سے لد گئے۔ گل مہر کی پتیاں جھڑنے لگیں۔ جنگلوں میں زرد اور سرخ پتوں کے فرش بچھ گئے۔ آم کے کنجوں میں کوئل کوکی۔ طوطے کی چونچ ایسے سرخ سورج ماما کا غصہ پل پل بڑھتا جا رہا ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کا ہنگامہ شباب پر آیا۔ کشتیوں کی مرمت کی گئی۔ میلے لگے۔ خلقِ خدا جاترا کے تماشوں سے محظوظ ہوئی۔ ندیوں اور جھیلوں پر بنسیاں اور جال سنبھالے دیہاتیوں کی بھیڑ جمع ہے۔ جگمگاتی مچھلیوں کے انبار ہر سو لگ گئے۔

بوئی شاک میں شیفالی مہکی اور مادھبی اور بکل۔ اشوک اور مہوے اور املتاس اور شیشم اور لاکد کی شاخوں پر پھول کھلے۔ پاٹ کی نئی فصل بوئی جا رہی ہے۔ خوشگوار ہوائیں آندھیوں میں تبدیل ہونے لگیں۔

جوئی شٹو کی دھوپ میں تال اور پوکھر سوکھنے لگے۔ نرسلوں کے پرندے، بگلے اور دریائی بار پر پھیلا کر اڑتے جا رہے ہیں۔ خوفناک طوفان، تیز و تند جھکڑ۔ چھپر اڑ گئے۔ جھونپڑیاں گر گئیں۔ بادبان بکھر گئے۔ ہواؤں کی غارت گری۔ جھکڑ نے دھرتی پر پھلوں کی بارش کر دی۔ بازار اور ہاٹ آم سے پٹ گئے۔

اب جارل کھل چکے ہیں۔ اور چمپا اور رجنی گندھا نے راتیں معطر کر دی ہیں۔ تباہ حال کسان پھر جھونپڑوں

اور جالوں کی مرمت میں جٹ چکے ہیں۔ برسات کے انتظار میں نئے جال بنے جا رہے ہیں۔ شدید دھوپ وحشت۔ خشک سالی۔ اللہ میگھ دے میگھ دے رے۔ اللہ میگھ دے۔ اللہ رے اللہ۔

تب بنگال کی کھاڑی سے آشاڑھ کے ورشا کالین بادلوں کے لشکر آگے بڑھنا شروع ہوئے۔ ینتکی کے زرِ گل کا بھبوت مل کر، کھوپڑیوں کے بجائے بگلوں کی قطار کی مالا پہنے سیاہ بادلوں کا جوڑا باندھ کر، دھنک کی چھڑی اور بجلی کی جھنڈیوں والا عصا سنبھالے برہمنوں کو ڈرانے کے لئے موسم نے پھر جادوگر کا روپ دھارا۔ آسمان بارش کا تاریک درخت بن گیا۔ جس کی داڑھی زمین تلک آ رہی ہے۔ سانپوں کے بھوکے مور بنوں میں چلانے لگے۔ گلابی کلیوں سے لدا درخت اپنے پتوں کا چلو بنا کر بارش کا پانی پی رہا ہے۔ بید کے پھولوں سے مہکتی ندی جامن کے درختوں کے نیچے رواں ہے۔ مچھلی کے تعاقب میں بگلا لرزاں پتوں کو پُر امید نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ مفلس کسان کی بیوی سر پر چٹائی اوڑھے، ہر طرف ٹپکتے جھونپڑے کا بچاؤ کرتی پھر رہی ہے۔ جنگلوں کے آدی واسی کانن درگا کی پوجا کے لئے درختوں کی جڑوں میں خون چھڑک کر بلوا کے پیالوں میں تاڑی پی رہے ہیں ـــــ گاؤں کے کبی نے کہا۔

دریا چڑھے۔ میگھنا اور برہم پتر۔ پدما اور مدھومتی۔ بھیرب اور بھاگیرتی۔ شب نیتری اور کرنا فلی۔ سُرما اور دھالیشوری ـــــ سرابن کے پانچویں دن ناگ پنچمی منائی گئی۔ جنگلوں میں ہاتھی چنگھاڑ رہے ہیں۔ ندیوں کے ساحلی کیچڑ اور کائی اور کینچوؤں اور دلدل کی راجدھانی بن گئے۔ سانپ بلوں سے نکل آئے۔ اوجھوں کا کاروبار چمکا۔ چھتریاں لگائے لوگ جلدی جلدی گھاٹ پر اترتے ہیں۔ بانس کے پلوں پر سے گزر رہے ہیں۔ تیتریوں کی ایسی نازک کشتیوں کو طوفانی دریا نگل گئے۔ دریا گاؤں اپنے ساتھ بہا لے گئے۔ درخت جڑ سے اکھڑے۔ مویشی اور انسان غرقاب ہوئے۔

" میری قسمت ہی خراب ہے۔ سیلاب میں سب کچھ بہہ گیا۔ اللہ تو نے دنیا بنائی! اور پھر مجھ سے میرا پاٹ، میرا دھان سب کچھ چھین لیا۔ میری قسمت میں کتنے دکھ ہیں رے اللہ۔ میں پاٹ بیچ کر تیرے لئے سونے کی نتھ لاؤں گا۔ میں نے اُس سے کہا تھا۔ پاٹ تو سیلاب میں بہہ گیا۔

او ماجھی رے کتنے منش۔ کتنے ڈھور ڈنگر طوفان کی بھینٹ چڑھے۔ اللہ رے۔ اللہ رے۔ اللہ رے۔

گاؤں کے کبی نے کہا۔

۲۱

اگست اندولن اور پیپلز وار

آشاڑھ۔ بھادرد ۱۳۴۹[1]

کال کے گھٹا ٹوپ اندھیارے میں مناظر غیر مرئی تصاویر کی طرح روشن رہیں گے۔ کیونکہ ہر منظر جو معدوم ہوا، باقی ہے۔ ان سارے گھروں، روشن کمروں کا تصور کرو جو لمحہ گزرنے کے باوجود، وقت میں شامل، موجود ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے لوگ، ٹیبلو گروپ۔ ان کی آوازیں۔

چندر کنج اندھیرا پڑا تھا، جب وہ تین اس کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔ وہ برآمدے میں آکر بیٹھک خانے کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ برآمدے کے سرے پر چادر میں سر منہ لپیٹے ایک داڑھی والا بوڑھا بے خبر پڑا سوتا ہے۔ اب نووارد برآمدے سے اتر کر گھاس میں سے گزرتے پچھواڑے ڈیوڑھی کی کنڈی بجا رہے ہیں۔

رسوئی گھر کی کھڑکی کھلتی ہے۔ گھاس پر روشنی کا راستہ سا بن گیا۔ کھڑکی میں سے کسی نے جھانکا۔

"دیپالی"

"ارے تم لوگ" دیپالی ذرا خشکی سے کہتی ہے مگر فوراً باہر آکر ڈیوڑھی کا دروازہ کھولتی ہے۔ وہ تینوں اس کے ساتھ پچھلے برآمدے میں آجاتے ہیں۔ دیپالی بیٹھک خانے کا دروازہ کھولتی ہے، جس میں شدید حبس طاری ہے۔

وہ تینوں برآمدے میں پڑے ہوئے تخت پر ٹک جاتے ہیں۔ محمود الحق تالی بجا کر ایک مچھر مارتا ہے۔ جیوتر موئے دتّا نے سگریٹ سلگانے کے بعد ماچس کی خالی ڈبیا نشانہ باندھ کر سامنے حوض میں پھینک دی۔ روزی بنرجی تیوری پر بل ڈالے آنگن کے درختوں کو دیکھ رہی ہے۔ تینوں خاموش ہیں۔ دیپالی بھی خاموش ہے۔

---

[1] بنگالی سن مطابق ۱۹۴۲ء

"ادھر آؤ — دیپالی۔" روزی اچانک ذرا درشتی سے کہتی ہے اور دیپالی کے آگے چلتی اس کے کمرے
داخل ہوتی ہے۔

کمرے میں مچھر بھنبھنا رہے ہیں۔ دیپالی نے روشنی جلائی۔

"تمہارے بابا سو رہے ہیں۔"؟ روزی کا سوال

"بابا اور پشپی ماں فرخ پور گئے ہیں۔ پشپی ماں کے دیور کی لڑکی کی شادی ہے۔ اس میں بابا کی شرکت
ری تھی۔ رات کو عبدالقادر برآمدے میں سوتے ہیں۔ کل یا پرسوں میں بھی چلی جاؤں گی۔ شادی اتوار کو
کھوکھو بیمار پڑ گیا تھا اس لئے میں بابا کے ساتھ نہ جا سکی۔" وہ پلنگ پر ٹک جاتی ہے روزی دروازہ
ر دیتی ہے۔

باہر محمود الحق اور جیوتر موئے دتا چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ اچانک اندر سے روزی کی گرجدار آواز آتی
ے۔

"غدار —"

محمود الحق تاسف سے سر ہلاتا ہے۔

اندر کمرے میں روزی بنرجی عین اسی جگہ کھڑی ہے جہاں آج سے ڈھائی سال قبل دیپالی نے
سے حلف اٹھوایا تھا۔

"ٹوڈی —" روزی کی دوسری گرج۔

"پارٹی ڈائریکٹو —" دیپالی کا جوشیلا، برافروختہ، توضیحی لہجہ۔

"برٹش ایجنٹ —" روزی کی پھنکار۔

"فاشسٹ —" دیپالی کا ترکی بہ ترکی جواب۔

جیوتر موئے دتا اُٹھ کر دروازے پر دستک دیتا ہے۔ آگ بگولہ روزی اور دیپالی باہر نکلتی ہیں۔
نک بارش شروع ہو جاتی ہے۔ ایک زوردار بوچھار نے سارا برآمدہ شرابور کر دیا۔ وہ چاروں بیٹھک
ے میں چلے جاتے ہیں۔ دیپالی بتی جلا کر کھڑکیاں کھولتی ہے۔ کرسیوں پر ٹک کر وہ چاروں زور شور
میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ غل سن کر کھوکھو اپنے کمرے سے آنکھیں ملتا چھینکتا سلیپر گھسیٹتا بیٹھک
ے میں آ ملتا ہے۔ وہ اب بڑا ہو چکا ہے۔ اور کالج میں پڑھتا ہے۔ وہ بھی تندہی سے تکرار میں شامل ہو گ

اب یہ لوگ دہشت پسند شہداء کا ذکر کر رہے ہیں۔

دیپالی جلدی سے اٹھ کر باہر چلی جاتی ہے۔ آسمان پر زور سے بجلی چمکی۔ وہ چند لحظوں تک چپ چاپ کھڑکی سے اندر جھانک کر اپنے چچا کی تصویر کو دیکھتی رہتی ہے۔ کالی گھٹا ہرے بھرے آنگن پر اتنی نیچے آئی ہے، لگتا ہے اگر ہاتھ بڑھائے تو گرفت میں آجائے گی۔

"کنک لتا بروا —— کل شہید ہوگئی۔ ——" اندر محمود الحق کہہ رہا ہے۔

"امپیریل ہوٹل میں ریحان دا اور اوما دی —— "جیوترموئے دتا کہہ رہا ہے۔ دیپالی چوکنّی ہوگئی۔

"اُوما دی جو کلچرل فرنٹ پر کام کر رہی ہیں —— فاشزم کے خلاف —— ہا ہا ہا ——" قہقہہ بلند۔

"سریری توشش رائے کی صاحبزادی؟" محمود الحق کا تجاہلِ عارفانہ۔

"ڈیڈی کو نائٹ ہُڈ مل گئی ——؟ ہُرّے" جیوترموئے دتّا کا نعرہ۔

اب ساری آوازیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔

"ڈنر اڑاؤ ——"

"چرخہ چلاؤ ——"

"پیپلز وار میں مضمون لکھو ——"

"ہُرّے —— ہُرّے ——"

"ہم جاتے ہیں دیپالی ——" روزی کی آواز۔ "تمہیں یاد رکھیں گے۔ بائی بائی۔ گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ دیپالی۔" محمود الحق اور جیوترموئے دتّا کی آوازیں۔

وہ تینوں پھٹ سے کواڑ کھول کر سامنے کے برآمدے میں نکل جاتے ہیں۔ دیپالی پچھلے برآمدے میں دیوار سے لگی کھڑی ہے۔ اس کے پاؤں فرش پر جم سے گئے ہیں۔ وہ دنیش چندر سرکار کی تصویر پر نظر ڈال کر جلدی سے پلکیں جھکا لیتی ہے۔

رات کا اندھیرا اور بارش باہر ان تینوں کو نگل لیتی ہے۔

کھوکھو باہر کا دروازہ بند کر کے چھینکتا ہوا بیٹھک خانے میں واپس آتا ہے۔ کیا یہ بھی، یہ تو اندر میں شامل نہیں ہو گیا ——، وہ اسے کچھ بھی نہیں بتاتا۔ عجیب گُھنّا، تلخ سا لڑکا بنتا جا رہا ہے۔ وہ خاموش

پنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔

باہر بارش کی بوچھار سے عبدالقادر کا آدھا بستر بھیگ چکا ہے۔ وہ اس کے باوجود گہری نیند ہے۔ جب بارش کا چھینٹا اس کے چہرے پر پڑتا ہے تو نیند میں بڑبڑاتے ہوئے وہ کروٹ بدل لیتا ہے۔ دور سے بم پھٹنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ یہ منظر بھی وقت میں تحلیل نہیں ہوگا۔

۲۲

بدروحیں

بھادرد کی موسلا دھار جھڑی کی وجہ سے روزی بنرجی نے اپنی سائیکل لِلی کاٹج کے ایک یں مقفل کر کے کھڑی کر دی ہے۔ وہ گھوڑا گاڑی میں گھر واپس پہنچی ہے۔ گاڑی اسے مشن کمپاؤنڈ منے اتار کر برگد تلے جا کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے دونوں مرگلے گھوڑے ہنہنا ہنہنا کر کیچڑ میں اپنے سُم ہے ہیں۔

روزی بنرجی بی اے میں فرسٹ ڈویژن لانے کے بعد یونیورسٹی میں ایم اے کے لئے داخل ہو چکی یرنڈ بنرجی اس سے بے حد خوش ہیں، تعلیم میں اس قدر منہمک دیکھ کر ان کو یقین ہے کہ وہ اپنی ی حماقتیں ترک کر چکی ہے۔ وہ اس پر سخت نازاں ہیں۔ میری قابل، ہونہار، بے مثال بچّی، وہ پچھلی سال کی حماقت اور بدتمیزی بھی معاف کر چکے ہیں۔ اور سوچتے ہیں ایک اعلیٰ خاندان عیسائی ی کی تلاش از سرِ نو شروع کر دی جائے۔ اس مرتبہ وہ قطعی روزی کی پسند یا ناپسند کا خیال رکھیں ۔ وہ اس سلسلے میں وہ اس سے ابھی کچھ نہیں کہتے، یوں بھی وہ اس قدر مصروف ہے۔ پوسٹ ٹ پڑھائی کی وجہ سے دیر تک اسے یونیورسٹی لائبریری میں رہنا پڑتا ہے۔ شام کو وہ سگن بگیچے جا کر شن کرتی ہے (اس کی شاگرد دیا تمین ہائی اسکول پاس کر کے اب ایف اے کے لئے اس سے انگریزی ی ہے) اس طرح روزی عموماً صبح کی گئی گئی رات پڑے للی کاٹج واپس آتی ہے۔ یوں بھی اگر وہ دیر وٹے تو پادری بنرجی باز پرس نہیں کرتے۔ وہ اب بڑی ہو چکی ہے اور انھیں اس پر مکمل اعتماد مانہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ جنگ نے پرانے معاشرے کی بہت سی فصیلیں ڈھا دیں۔ جنگ دقیانوسی

اور پابند وضع ڈھاکے تک پر اثر انداز ہو چکی ہے۔ پادری بنرجی اپنے اتوار کے وعظوں میں اس اخلاقی کجروی کی طرف بڑے دکھ سے اشارہ کر چکے ہیں، جو کلکتے جیسے گناہگار شہر کی مانند یہاں بھی عام ہو جائے۔ ۱

ٹھیکیداروں اور تاجروں کا نو دولتا طبقہ تیزی سے اُبھر رہا ہے۔ لڑائی اس وقت بنگا
عین پڑوس میں لڑی جا رہی ہے۔ کلکتے پر ہلکی سی بمباری ہو چکی ہے۔ جاپان نے مشرق میں بر
ایمپائر کی بنیادیں ہلا دیں۔

۵ فروری کو سقوطِ سنگاپور کے بعد ریورنڈ بنرجی نے گرجا میں رحم کی دعا کے لئے اسپیشل
منعقد کی، کوائیر نے ROCK OF AGES ایسے جذبے سے گایا کہ بڑے بڑے شقی القلب ا
پرستوں کی (پادری بنرجی کے حلقے میں اینٹی برٹش بھیڑوں کی اب کمی نہیں) آنکھوں میں آنسو آ گئے
اور —

O GOD OUR HELP IN AGES PAST
OUR HOPE IN YEARS TO COME
OUR SHELTER IN THE STORMY BLAST
AND OUR ETERNAL HOME.

روزی بچپن سے کوائیر میں گاتی آئی ہے۔ مگر اس روز غائب تھی۔ خیر

A THOUSAND YEARS IN THY SIGHT
ARE LIKE AN EVENING GONE
SHORT AS THE WATCH OF NIGHT
BEFORE THE MORNING SUN.

لیکن مارچ میں جاپانیوں نے سارے برما پر قابض ہو گئے۔ رنگون سے بھاگ کر پیدل بنگا
تک پہنچنے والے پناہ گزینوں کے حالات سن سن کر پادری بنرجی کا دل لرز گیا۔ ڈھاکے آنے والے ا
برمن، ہندوستانی اور برمی عیسائی قافلوں کے لئے مشن کمپاؤنڈ میں خیمے لگائے گئے۔ پادری بنرجی د
رات مریضوں اور زخمیوں کی تیمارداری اور دلجوئی میں جُٹے رہے۔

اب بنگال کی چھاؤنیوں میں برطانوی اور امریکن فوجیوں کی ریل پیل ہے، جو برما کے جنگلوں

ی موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں۔ موت اور تباہ کاری کا بازار ساری دنیا میں گرم ہے۔

ریورنڈ بنرجی کو سوا چند امریکن مشنریوں کے، امریکنوں سے اب تک سابقہ نہیں پڑا تھا۔ مگر لوں انہوں نے اس اجنبی، بے تکی، انوکھی، ایمپیورم قوم کے عام افراد کو پہلی بار قریب سے نب امریکن افسروں کی ٹولیاں جیپ گاڑیوں میں لد کر مشن کمپاؤنڈ آنے لگیں۔ انہوں نے بیش ائف عیسائی غربا میں بانٹے، اور پادری بنرجی سے بڑی بے تکلفی اور بھائی چارے سے باتیں کیں۔ ئی چارے کے ساتھ انگریز ان کے ساتھ کبھی پیش نہیں آئے

ملایا میں برطانوی شکست کے بعد بنگال کے فوجی ہسپتال زخمیوں سے بھر چکے ہیں۔ ایک ی بنرجی نے اسٹیٹسمین میں پڑھا کہ بہت سے ہندوستانی فوجیوں کو ملایا میں جاپانیوں نے جنگی لیا۔ سبھاش بابو کے متعلق بھی آئے دن خبریں چھپا کرتی ہیں۔

لیکن پادری بنرجی نے کسی اخبار میں یہ نہیں پڑھا کہ بنگال کے انقلابی، پرانے پاپی، اندھیری راتوں ازشیں کر رہے ہیں۔

روزی پچھلے چند روز سے رات کو کافی دیر میں گھر آتی ہے۔ کیونکہ لائبریری مشن کمپاؤنڈ سے صلے پر ہے۔

گھوڑا گاڑی سے اتر کر روزی سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ لیکن مسز بنرجی حسبِ معمول کھانے کی میز پر صبر کے ساتھ اس کے منتظر تھے۔ آج اس نے بہت یر لگا دی۔

اپنے کمرے میں جا کر پانی سے بھیگی ساری تبدیل کرنے کے بعد وہ جلدی سے آ کر میز پر بیٹھ گئی۔ مسز کچن سے گرما گرم لوچیاں لے کر آئیں۔

یورنڈ نے ماتھے پر انگلی رکھ کر گریس کی دعا کے لئے سر جھکایا۔ ان کی بیوی نے بھی سر جھکایا۔ بھی۔ مگر کن انکھیوں سے اپنی رسٹ واچ دیکھتی رہی۔

اے ہمارے آسمانی باپ۔ تو جس نے اپنے فضل و کرم سے یہ نعمتیں ہمارے سامنے رکھیں تیری اسی طرح اس میز پر اور اس گھر پر بستی رہے۔ آمین۔ پادری بنرجی نے گریس پڑھ کر سر

اٹھایا۔ الیتھر بنرجی نے پوریاں پیش کیں۔ ریورنڈ نے لقمہ بناتے ہوئے روزی کو دیکھا جو کھانا خت کرنے کے بجائے ذرا بے چینی کے ساتھ چمچے سے کھیل رہی تھی۔

"کھانا کھاؤ بیٹی۔"

"جی ہاں پاپا۔"

اس نے جلدی جلدی کھانا شروع کیا اور پانچ چھ نوالے نگلنے کے بعد کرسی سے اٹھنے لگ پادری بنرجی نے اسے ٹوکا۔

"کیا بات ہے؟"

"بھوک بالکل ہے ہی نہیں پاپا۔ یونیورسٹی کینٹین میں بہت سے سموسے کھا لیے تھے۔"

"سارے ملک میں ان بدمعاشوں نے آگ لگا رکھی ہے۔ ایسے پُرآشوب زمانے میں تم اتن گئے گھر لوٹتی ہو۔ جوزف ہی کو ساتھ لے جایا کرو۔"

"نہیں پاپا۔ گرودلیو کا انتقال ہو گیا ہے نا بے چارے کا۔ تو یونیورسٹی میں ہم لوگ ان میں ایک بڑا زبردست پروگرام کرنے والے ہیں۔ اس سلسلے میں میٹنگ تھی۔ میٹنگ کے بعد آ جائیے۔ حسبِ معمول اڈہ شروع ہو گیا۔"

"آج کل اڈے کا زمانہ نہیں ہے۔ ہر طرف گولیاں برس رہی ہیں، احتیاط رکھو۔"

"بہت اچھا پاپا۔" وہ کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

اچانک ریورنڈ بنرجی کو ایک خیال آیا۔ یونیورسٹی تو اس بدبخت بغاوت کی وجہ سے بند ہو ہے۔ یہ پھر مجھے دقیانوسی احمق بڈھا سمجھ کر بے وقوف تو نہیں بنا رہی؟

"روزی ادھر آؤ۔" انہوں نے کڑک کر کہا۔

وہ ٹھٹھک گئی۔

"بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے حکم دیا۔

وہ اطمینان سے واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تم پھر ان ——— ان غداروں سے جا ملی ہو؟"

اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"روزی"، ریورنڈ بنرجی نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر ٹوٹی ہوئی آواز میں ایک بار پھر کہنا
رع کیا —— "جس سرکار نے ہمیں جنگلی سے انسان بنایا۔ بت پرستی کے جہنمی راستے سے نکال کر ——"

"اوہ نو پاپا —— نوٹ اگین ——" روزی نے یک لخت جھنجھلا کر میز پر مکہ مارا۔ پانی کا
چھلک گیا۔ الیستھر بنرجی نے جھاڑن اٹھا کر پھرتی سے میز صاف کرتے ہوئے اسے ڈانٹا۔ "روزی۔"

"سوری ماما۔" پھر وہ اپنے پاپا کی طرف مڑی۔

"پاپا۔ سنئے۔ سی۔ ایف اینڈریوز تو نہ صرف پکے عیسائی تھے بلکہ اصل نسل انگریز بھی تھے۔
پ سے کہیں زیادہ بڑے پادری۔ آپ نے جا کر کبھی ان کو یہ سب کیوں نہ سمجھایا۔؟" اس نے ہنستے
ائی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کویٹ انڈیا۔ کویٹ انڈیا ——" پادری بنرجی طیش کے عالم میں کرسی سے اٹھ کر کمرے میں
لگے۔ "احمقو۔ گدھو۔ انگریز چلا گیا تو ہم پھر اسی بربریت، بے ایمانی اور بے انصافی کے دور کی
۔ لوٹ جائیں گے۔ جس سے انہوں نے ہمیں نجات دی۔"

روزی نے دوبارہ ذرا پریشانی سے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پادری بنرجی اب ایک کرسی کی پشت پر ہاتھ
رنہایت برافروختہ آواز میں اس سے مخاطب تھے۔ "کویٹ انڈیا کی بچی، ہندوؤں اور مسلمانوں کی
ڈینگیں پڑھ پڑھ کر پاگل ہو گئی۔ یہ ہندوستان کی سنہری قدیم تہذیب! سنہری قدیم تہذیب یہ تھی کہ
پوری کرنے کے لئے ہندو اپنے بچوں کو گھڑیالوں کے سامنے پھینک دیتے تھے۔ ہندو لڑکیوں کو مار
جاتا تھا۔ مسلمان ٹھگ مسافروں کا گلا گھونٹتے تھے۔ انڈین کلچر! انڈین کلچر! کتنے انگریز مشنریوں نے
عورتوں کو چتا سے نکالا۔ اور جب وہ ان بدنصیبوں کو بچانے کی کوشش کرتے، عین وہیں شمشان گھاٹ
ادہو جاتا تھا —— خود میری پردادی کو —— جانتی ہے احمق؟ میری اپنی پردادی کو ستی ہونا پڑا۔
و کلچر۔ ہندو کلچر ——"

روزی کو باپ کا اس قدر شدید غصہ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا "مگر پاپا۔
لے مہذب مسیحی یورپ میں بھی تو ہزاروں بے گناہ عورتوں کو جادوگری کے الزام میں صدیوں تک زندہ جلایا
بلا۔ اور جس زمانے میں ہندوستان میں ہندو مسلمان مزے سے اکٹھے رہ رہے تھے اس وقت آپ کے
یورپ میں INQUISITION ہو رہا تھا۔ ہا ہا ہا —— :"

"روزی — چپ —" ایستھر بنرجی نے سہم کر باپ بیٹی کی تکرار ختم کرانی چاہی ۔

"اور سنئے پاپا ۔" روزی مزے سے کہتی گئی ۔ "یسوع کے پجاریوں نے سارے یہودیوں کو اٹھا کر GHETTOS میں ڈال دیا ۔ (میری اور بے چارے پاپا کی ڈیبیٹنگ سوسائٹی ! اس نے دل میں سوچا) اور یہ جو پاپا آپ اچھوتوں کی بات کرتے ہیں تو کیا آپ کے انگلینڈ میں ایک چمنی سوئیپ یا اُسے کیا کہتے ہیں — — بیار و من — یہ کسی لارڈ کی میز پر اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں ؟ — ہا ہا ہا — !"

"کج بحثی مت کرو روزی ۔" پادری بنرجی نے ڈانٹا ۔

روزی کو ایک اور نکتہ یاد آیا (گو اس بحثا بحثی میں آدھ گھنٹہ برباد جائے گا) "یہ جو آپ ہمیشہ ہندوستان کے پرانے مطلق العنان حکمرانوں کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں — خصوصاً سراج الدولہ کو، جو میرا ہیرو ہے — تو کیا آپ کے ایلزبیتھن انگلستان میں بات بے بات لوگوں کے سر قلم نہیں کر دیئے جاتے تھے ؟ جسے دیکھو ٹاور آف لندن میں پڑا چھینک رہا ہے اور دوسرے روز کھٹ سے سر غائب ۔ وہاں عام آدمی کے لئے کوئی انصاف تھا ؟ صرف سو برس پہلے تک آپ کے انگلستان میں ایک بھیڑ کی چوری کی سزا موت تھی ۔ اب یہ "لا اینڈ آرڈر" کا کس منہ سے ہم پر رعب ڈالتے ہیں ۔ یہ انگریز کے بچے کمینے — ہماری دولت لوٹ کر تو خود کو مہذب بنایا ان کمینوں نے "

پادری بنرجی عینک اتار کر اسے صاف کرتے ہوئے پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے ۔ بد تمیز، گستاخ، زبان دراز، ذہین بچی ۔

"اور بتاؤں آپ کو پاپا —" روزی اب صریحاً بے رحمی پر اتر آئی تھی ۔ "آپ کے وہ جو ایک کٹر رومن کیتھولک دوست ہیں ۔ ڈاکٹر فرانسس باٹسو ۔ جب ان کی بڑی لڑکی نے ایک مسلمان سے شادی کی جو بے چارہ ایک اعلیٰ خاندان کا بنگالی ہے تو انہوں نے فوراً بیٹی کو عاق کر دیا ۔ اور آپ بھی کس قدر خفا ہوئے تھے ۔ ماتوہ ۔ اور ابھی پچھلے دنوں ان کی چھوٹی لڑکی نے ایک معمولی امریکن فوجی سپاہی سے بیاہ رچایا تو انکل باٹسو فخر سے پھولے نہیں سمائے حالانکہ — حالانکہ وہ رومن کیتھولک تو کیا عیسائی ہی نہیں سرے سے یہودی ہے ۔ اور جناب آپ نے بھی فوراً للیتینا کو مبارک باد کا تار بھیجا ۔ تو پاپا یہ تھی غلامانہ ذہنیت اور گوری چمڑی کا رعب ۔"

"بس کر روزی ۔" ایستھر بنرجی نے سراسیمگی سے کہا اور چپکے سے اشارہ کیا کہ کمرے سے چلی جائے ۔

وہ گہرا سانس لے کر کرسی سے اٹھی ۔

"اچھا۔ اچھا۔ بیٹی۔" پادری بنرجی نے ملول آواز میں جواب دیا۔ "نکال دو انگریزوں کو ستان سے پھر دیکھنا کیا حشر ہوتا ہے۔ تم سب الٹرا نیشنلسٹوں کا۔ جوں ہی یہ ہٹے تمہارے لے ہندو مسلمانوں میں وہ جوتا چلے گا، وہ بھیانک خانہ جنگی ہوگی کہ دیکھ لینا۔ تب تمہیں اس بوڑھے پادری کی باتیں یاد آئیں گی۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

روزی نے بڑی نرمی سے کہا۔ "پاپا۔ میں تو یونہی آپ سے تفریحاً بحث کر رہی تھی۔ آخر مجھے ی ڈبیٹوں میں یونہی ٹرافیاں ملتی رہی ہیں، معنت اس قوم پرست تو یقیناً ہوں پاپا مگر آج کل جو تباہ مچ رہی ہے میں خود اس کے خلاف ہوں۔"

"تم جانتی ہو بیٹی کہ ایسے نازک موقع پر جبکہ برطانیہ ہر محاذ پر ہار رہا ہے ——"

"ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے —— بالکل —— بالکل۔" روزی نے جوش سے ان کی پوری کر دی۔

"اچھا بس ہو گئی تم لوگوں کی ڈبیٹ۔ اب پاپا کو جا کر سونے دو روزی۔" ایستھر نے اطمینان کا لیتے ہوئے کہا۔

"یس ماما۔" روزی نے دروازے میں جا کر باہر جھانکا۔ مینہ تھم چکا تھا۔ "افوہ کتنی گھپ اندھیری ہے ماما۔ دیکھنا سبزی باڑی پر جگنو کیسے چمک رہے ہیں۔ پاپا۔" اس نے مڑ کر پادری بنرجی سے دوبارہ "کیا آپ واقعی خفا ہو گئے؟ میں تو آپ کو TEASE کر رہی تھی۔ سچ مچ پاپا۔" کرسی کے پیچھے آکر بڑے لاڈ سے ان کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ پادری بنرجی خوش ہو گئے۔ عینک اتار کر اسے رومال سے لیا۔

"سچ مچ پاپا۔ یونیورسٹی تو بند ہو چکی ہے، مگر ہماری لٹریری سوسائٹی ٹیگور کا تعزیتی پروگرام کر رہی جلسہ ہوگا بڑا۔"

"دیپالی اس جلسے میں شامل ہے؟ وہ بھی آئی تھی؟"

"جی نہیں —— جی ہاں —— پاپا۔ رابندر سنگیت کا پروگرام اس کے بغیر کیسے مکمل ہو سکتا ہے۔"

"ہوں۔" انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"گڈ نائٹ پاپا۔" اس نے جھک کر ریورنڈ بنرجی کا سر چوما۔

"گڈ نائٹ ماما۔"

"گڈ نائٹ۔ گوڈ بلیس یو مائی چائلڈ۔" والدین نے تقریباً ایک زبان ہو کر کہا۔

روزی ایک لحظے کے لئے ٹھٹھکی۔ ان دونوں پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

ریورنڈ بنرجی کرسی سے اٹھے، اور دوبارہ ٹہلنے لگے۔ سائیڈ بورڈ پر رکھے گلدان کو چھوا۔ "گوڈ بلیس آور ہوم۔" کے طغرے پر نظر ڈالی جس کے مقابل میں یسوع ؑ کے "آخری طعام" کا بڑا سا رنگین پرنٹ دوسری دیوار پر آویزاں تھا۔ وہ چند سکنڈ تک اس تصویر کو دیکھا کئے۔ پھر حسب عادت کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے سر جھکائے، مطمئن اور خداوند تعالیٰ کے مشکور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

کوئی پون گھنٹے بعد مسز بنرجی نے گھر کے سارے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد حسب معمول اوولٹین کی دو پیالیاں تیار کیں، ایک پیالی طشتری سے ڈھانپ کر سائیڈ بورڈ پر رکھی اور دوسری لے کر روزی کے کمرے میں گئیں۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔ انہوں نے پیالی میز پر رکھ دی، اور غسلخانے کی طرف مڑ کر آواز دی۔ "روزی بٹیا۔ صبح کو دھوبی آئے گا، اپنے کپڑے نکال ———" وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکیں کیونکہ نہ جانے کیوں آپ سے آپ ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ نہ جانے کیوں ان کو خیال آیا کہ روزی بھاگ گئی۔ وہ اپنی جگہ پر منجمد رہ گئیں۔ پھر انہوں نے نوٹس کیا کہ غسل خانہ اندھیرا پڑا ہے۔ اور تیز ہوا اندر آ رہی ہے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ غسل خانے کا باہر کی رُخ کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔

شاید وہ جگنو پکڑنے سبزی باڑی میں اتر گئی ہو۔ مسز بنرجی نے دروازے میں جا کر آواز دی۔ "رو ——— روزی بیٹے ———" پھر وہ چھتری لگا کر اندھیرے اور کیچڑ میں باہر نکلیں۔ ڈیزی سر شام سے جا کر اپنے کوارٹر میں سو رہی تھی۔ اُسے کیا معلوم ہو گا۔ انہوں نے پورے کمپاؤنڈ کا چکر لگایا۔ سارے کوارٹروں میں سنا پڑا تھا۔ گرجا کی برساتی میں روشن بلب پر پتنگے چکر کاٹ رہے تھے۔ سارے میں ہُو کا عالم طاری تھا۔ بچی۔ ایسی بھیانک رات میں تو کہاں چلی گئی ——— یہ کیا ہوا ۔۔؟

وہ گھر میں واپس آئیں۔ کیچڑ میں لت پت چپلیں پائیدان پر اتار کر آہستہ آہستہ چلتی سامنے کمروں میں گئیں دروازے بند کئے۔ بتیاں بجھائیں۔ اور پھر اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئیں جہاں ان کے شوہر شب خوابی کا لبا

دو لیمن کے منتظر غنودگی کے عالم میں بید کی کرسی پر بیٹھے تھے۔ نیند میں ان کا سر سامنے کو جھک آیا تھا۔
ں کی آہٹ پر وہ چونکے۔ اور ان کی طرف دیکھے بغیر عادت کے مطابق پیالی کے لئے ہاتھ بڑھایا۔
الیسٹھر بنرجی نے ان کے قریب جا کر آہستہ سے کہا۔ "پال —— ہماری لڑکی گھر سے بھاگ گئی"۔
پادری بنرجی نے سر جھکا، پلکیں ملیں اور بیوی کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ ان کے صرف ہونٹ ہلے۔
سے آواز نہیں نکلی۔

الیسٹھر گری بالا نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ ان کے قریب فرش پر دو زانو بیٹھ گئیں۔
باہر بجلی زور سے چمکی اور شکست خوردہ میاں بیوی کے ٹیبلو کو روشن کر گئی۔ (مناظر وقت
معدوم نہیں ہوں گے)

پادری بنرجی چند منٹ تک بالکل چپ، ساکت، منجمد بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے لرزاں ہاتھوں
، عینک ٹٹولی۔ الیسٹھر نے میز پر رکھے سیاہ کیس میں سے عینک نکال کر ان کو دی۔ پادری بنرجی نے
، پلنگ کے سرہانے سے انجیل مقدس اٹھائی۔ الیسٹھر ان کے نزدیک دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں اور
ل سے سر ڈھانپ لیا۔

"LET US PRAY" پادری بنرجی نے آہستہ سے کہا۔

اس ساری رات پادری بنرجی حضرت ایوبؑ کی گریہ زاری کا باب پڑھتے رہے۔

اور دیکھو۔ کہ دنیا کے سارے مقدس صحیفوں کے یہ سارے ابواب کتنے ہزار ہا برس سے
ان گنت انسانوں کی مصیبت کے وقت میں پڑھے گئے ہیں۔ اور وہ چند الفاظ اسی طرح
جود ہیں۔

وقت اور الفاظ انسان کے شکاری ہیں۔

۲۳

گنگا اور برہمپتر

ڈیک چیر پر ذرا آگے کو جھکا ہوا نوجوان مضطرب سرگوشی میں کہہ رہا تھا ـــــ "ہم نے روپوشی سے باہر آنے کے بعد تم کو اتنے خط لکھے۔ ہر تیسرے روز، ہر ہفتے، ہر پتے پر، اتنے تار دیئے اتنے سندیسے بھجوائے۔ تم نے ایک کا ـــــ حد ہے، ایک خط کا جواب نہ دیا۔ ہماری شدید پریشانی کا بھی تمہیں خیال نہ آیا۔ ہمیں طرح طرح کے اندیشوں نے بدحواس کر دیا تھا۔ شاید تم پکڑی گئی ہو۔ شاید بچے بابو نے تمہیں گاؤں بھجوا دیا ہو۔ شاید زبردستی تمہاری شادی کر دی گئی ہو۔ پھر ادیل کے ذریعے معلوم ہوا کہ تم خیریت سے ہو۔ اس کے بعد تمہارے چپ سادھ لینے کی وجہ بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔

"ہماری عقل حیران ہے ـــــ" چند لحظوں کے وقفے کے بعد نوجوان نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ہماری عقل حیران ہے کہ تم نے یہ رویہ کیوں اختیار کیا۔ ناراض ہو تو صرف دو سطروں میں ناراضگی کی وجہ ہی بتلا دیتیں۔ ہم نے بار بار تمہیں لکھا کسی وجہ سے خفا ہو گئی ہو تو بتلا دو۔ اور معاف کر دو۔ آخر یہ تم کو ہوا کیا؟"

نیم تاریک اور سنسان ڈیک کے سرے پر صرف سگریٹ کی روشنی چمکتی رہی۔ ڈیک کا فرش بھیگا ہوا تھا۔ کچھ دور پر ایک خلاصی ایک بنچ پر محوِ خواب تھا۔

"ہم شروع شروع میں تفصیل سے تمہیں کچھ نہیں لکھ سکتے تھے" سگریٹ ایک جھٹکے سے پدما میں جا گرا۔

"پچھلی جولائی سے ـــــ کھلنا کی اس اندھیری رات سے لے کر نومبر دسمبر تک ہم ادھر اُدھر روپوش رہے۔ سندربن میں تم سے ملاقات کے اس خطرناک ایڈونچر کے بعد ہم بہت محتاط ہو گئے تھے۔ اس لیے تمہیں کوئی دو حرفی پیغام بھی نہ بھجوا سکے۔ اور اتنے مصروف رہتے کہ غمِ جاناں کے متعلق سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ دیولی والوں کو دسمبر میں رہائی حاصل ہوئی اور ہم ـــــ کدھر دیکھ رہی

،کیا ہماری آواز بھی ناگوار ہے ؟"

دیاسلائی کا مختصر سا شعلہ لپکا۔ دوسرا سگریٹ، زیادہ مضطرب، آزردہ لہجہ۔ "کیا تم اس لئے خفیں کہ ہم دسمبر کے بعد تم سے ملنے بنگال نہ آسکے ؟ ہمیں معلوم نہ تھا واللہ کہ تم اس قدر دیوانی لڑکی —— "

دوسرا سگریٹ بھی تین چار کش کے بعد اندھیرے مہیب دریا میں جا گرا۔

" اگر ہمیں ایک ضروری کام سے اچانک یہاں نہ بھیج گیا ہوتا تو شاید اب بھی نہ آسکتے، تم —— تم دوسرے گروپ سے جا ملی ہو، اس وجہ سے مجھے بغیر "ٹرائل" کے "عاق" کر دیا۔ یہ کیا نا ہے ؟ "

جہاز نرم روی سے آگے بڑھتا رہا۔

"کیا مجھے تم سے خفا نہیں ہونا چاہیئے ؟ میرے ساتھ یہ رویہ اختیار کرنے کی آخر —— ڈیم یو —— "

تیسرے سگریٹ کے لئے ماچس جلانے کی کوشش، مگر ماچس سیلی ہوئی تھی۔

"کیا تم کو —— کسی اور سے —— کسی اور —— کوئی اور —— " ذرا کانپتے ہوئے ہاتھ۔ ،کی ڈبیا بھی دریا برد ہوئی۔

"شٹ اپ ۔" دوسری ڈیک چیر پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے یک لخت تلملا کر جواب دیا۔

وہ اور آگے جھکا۔ لڑکی کی شکل دھیان سے دیکھی اور آہستہ سے مسکرایا۔ "شکر ہے۔"

"کیا شکر ہے ؟" وہ بلی کی طرح غرائی۔

دریا پر تیز ہوا چل رہی تھی۔ لڑکی نے سردی کی وجہ سے کندھے سکیڑ کر ساری کا آنچل جسم سے رح لپیٹا۔ نوجوان نے کھادی ریشم کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس نے چادر اتار کر لڑکی کے کندھوں پر ڈالی۔ ھر کے توقف کے بعد بڑی نرمی اور احتیاط سے لپیٹ دی۔ لڑکی ذرا سا کپکپائی۔

بے چاری بے وقوف، نالائق بچی۔

"آپ کو —— آپ کو سردی لگ جائے گی " لڑکی نے دھیرے سے کہا۔

"تم سے مطلب ؟ مر گئے تو شہیدِ محبت کہلائیں گے، قسم خدا کی تین ساڑھے تین سال سے کیا

تھیٹریکل عشق چل رہا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔"

کروک، چاو مو مین، دھوکے باز۔

"بی اے پاس کر لیا؟" نوجوان نے پھر بات کی۔

"کر لیا۔"

"فرسٹ ڈویژن؟"

"جی۔"

"ارے واہ شاباش۔ مبارک ہو۔ تو اب گویا تمہاری شادی کا اشتہار اخباروں میں دیا جاسکہ

س نے کھنکار کر کہا۔ "بی۔اے پاس، امورِ خانہ داری میں ماہر، ہندوستانی سنگیت کی استاد، کائستھ کنیا ——

ڑکا برسرِ روزگار ہونا ضروری ہے۔ کم از کم پی سی ایس کو ترجیح دی جائے گی ——"

کمینہ، بے ہودہ، لوفر۔

وہ اٹھنے لگی، نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پھر کرسی پر بٹھا دیا۔ "آپ اب کہیں بھاگ کر

جا سکیں۔"

"آپ کا دماغ خراب ہے" لڑکی نے آہستہ سے کہا بعد پھر اٹھنے لگی۔

"یہ تم بھاگی کہاں جا رہی ہو؟"

"عبدالقادر جالی کے ادھر جوہر کئے بیٹھے ہیں، اگر آپ کی اس —— کیا کہنا چاہئے ——

تکلفی پر ان کی نظر پڑ گئی ——"

"پچھلے سال لگ بھگ اسی موسم میں آپ کہاں تشریف رکھتی تھیں، غالباً یاد ہو۔ لیکن زیادہ شد

قسم کا AMNESIA لاحق ہو گیا ہے تو ——"

"ایک مرتبہ حماقت کی تھی، اب دوبارہ نہیں ہو گی۔ گڈ گریشس —— خیال آتا ہے تو رونگٹے

کھڑے ہو جاتے ہیں ——"

"تم واقعی بدل گئی ہو۔"

"جی ہاں۔"

اب وہ خاموش ہو گیا۔

شاید قصہ واقعی ختم ہو چکا ہے۔ ایک سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ یا شاید محبت ختم ہونے کی کوئی منطقی وجہ نہیں ہوتی، میں بیکار اس لڑکی کا تعاقب کر رہا ہوں، یہ وہ لڑکی ہی نہیں ہے۔

کئی منٹ گزر گئے۔ اچانک وہ بولی: "آپ ـــــ آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ ـــــ آپ نے آخر اس جہاز پر مجھے کیسے پکڑ لیا ـــــ"

وہ خوش ہو گیا۔ نہیں۔ یہ وہی لڑکی ہے۔ ابھی کچھ نہیں بدلا۔

"کس طرح پکڑ لیا ـــــ؟" اس نے بشاش لہجے میں جواب دیا۔ "اس طرح کہ میں ڈھاکے میں بیٹھا آپ کے گھر پہنچا۔ جو سنسان پڑا تھا۔ چکر کاٹ کر شاگرد پیشے کی طرف گیا۔ وہاں آپ کی ریاست کے منیجر مولوی عبدالقادر کی اہلیہ نے ضروری معلومات فراہم کیں کہ بچّے کوئی سترآبابو میں ان کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔ آپ کسی خاندانی شادی کے لیے عبدالقادر کے ہمراہ فرید پور تشریف لے گئی ہیں اور فلاں تاریخ کو عبدالقادر کے ساتھ ہی واپس آ جائیں گی۔ کموکھو کی بیماری کی وجہ سے۔ چنانچہ میں نے فی الفور فرید پور کا ٹکٹ کٹایا۔ میں فرید پور ـــــ فرید پور کے لوگوں سے واقف ہوں۔ آپ کی پشتی ماں کے گھر والوں کو بھی جانتا ہوں۔ یہاں چپکے سے پتہ لگانا بہت آسان تھا کہ آپ کس روز، کس وقت نرائن گنج کے لیے روانہ ہو رہی ہیں۔ چنانچہ اسی جہاز کا ٹکٹ اس ناچیز نے بھی خرید لیا۔ باقی حالات آپ نے پردۂ سیمیں پر خود ملاحظہ فرمائے۔"

"آپ ڈھاکے میں میرا انتظار کر سکتے تھے۔"

"نہیں کر سکتے تھے، آپ کے سلسلے میں ہم منطقی نہیں ہیں۔"

دونوں دھندلے سائے ساکت بیٹھے رہے۔ چاروں طرف بادل اور دریا ایک ہو گئے تھے۔ ڈیک چیئر سے کچھ دور لمبی سفید داڑھی والا مسلمان بوڑھا کپتان اپنے کھلے کیبن کے سامنے جنگلے پر جھکا کھڑا تھا۔ اس کے نزدیک لگی ہوئی بے حد طاقتور سرچ لائٹ نے دریا کو حدِ نظر تک روشن کر رکھا تھا۔

"روزی کیسی ہے؟" کچھ دیر بعد نوجوان نے دریافت کیا۔

"روزی ـــــ محمود دا ـــــ یہ سب لوگ ـــــ آپ کو نہیں معلوم ـــــ؟"

"ہاں۔ سریندر نے ڈھاکے میں مجھے بتایا ـــــ ان لوگوں کو کچھ سمجھایا نہیں جا سکتا ـــ" اس نے گہری سانس لی۔ "اچھا کہیں سے ماچس لے کر آؤ۔"

کس مزے سے حکم چلاتے ہیں، میں کنیز ہوں ان کی زرخرید۔ جنموں کی داسی ـــ کتنے ہی کامریڈ بن جائیں

اصلیت میں رہیں گے وہی نخالص ہندوستانی لارڈ اینڈ ماسٹر ــــــ میں نہیں لاتی ماچس واچس۔

"ارے بھائی ذرا بھاگ کر ایک ماچس لے آؤ نا کہیں سے ــــــ عبدالقادر میاں سے مانگ لو۔ وہ ضرور بیڑی پیتے ہوں گے۔"

"میں ان سے جا کر کہوں کہ ذرا دیا سلائی دینا جو میرے ایک عزیز دوست کو چاہئے جو مجھے بھگا لے جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔"

"جب تم (عنقریب انشاء اللہ) بھاگوگی تو بندے بابو لامحالہ یہی شبہ کریں گے کہ ان کے ذریعہ ہی تم ایک میاں بھائی کے ساتھ اڑنچھو ہوئیں۔"

"اس خیال میں بھی نہ رہئے گا۔ عبدالقادر میاں میں انتہائی فیوڈل وفاداری ہے۔ وہ آپ کے مولوی ابوالہاشم نہیں ہیں ــــــ" دفعتاً وہ چپ ہوگئی۔

"وہ ــ وہ ہم نے ایک سہانا ــ ناقابلِ یقین خواب دیکھا تھا نا ــــــ"

"ہاں ــــــ" لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

کچھ دور پر فوجیوں سے لدا نیم تاریک اسٹیمر گزر رہا تھا۔

"عجیب بات ہے" لڑکی نے پھر جلدی سے موضوع تبدیل کیا۔ "جب کامریڈ رندھیوے کا بیان چھپا پہلی بار کہ یہ جنگ اب عوامی جنگ ہے ــــــ تو یہ قوم پرست اتنی شدت سے پارٹی کے خلاف کیوں ہو گئے۔ خصوصاً روزی ــــــ وہ تو بہت ہی امیچیور نکلی۔ میں نے اسے کئی بار ــــــ کئی بار سمجھایا ــ کہ ــــــ آپ نے ایک بار لکھا تھا نا خط میں کہ کمیونسٹ انٹرنیشنل اس بے جگری سے نازیت اور فاشزم کا مقابلہ ــــــ"

"بہت خوب، آپ کا جواب نہیں۔ ہمارے عریضوں کے ذریعے آپ اپنے دوستوں کو ایجوکیٹ کرتی ہیں۔ مگر ہمیں دو سطریں لکھنے کی آپ نے زحمت گوارا نہ کی۔ اب بھائی ہمیں یقین ہو گیا کہ تمہارے دماغ کی ایک چول ضرور ڈھیلی ہے۔"

"کمال ہے ــــــ" لڑکی نے مزید گڑبڑا کر بعید سنجیدگی سے سیاسی گفتگو جاری رکھی۔ "مرتاریخ کو کانگریس بھی سی۔ پی۔ آئی سے علیٰحدہ ہو گئی۔ حالانکہ ــــــ حالانکہ ــــــ

— پنڈت نہرو ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے فاشزم کے خطرے کو پہچانا تھا —" لڑکی نے اس انداز میں بات ختم کی گویا اخبار کا ایڈیٹوریل پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے چہرہ پھیر کر بے نیازی سے دریا کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

"جی ہاں۔ آپ بالکل صحیح فرماتی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی سیاسی سوجھ بوجھ اور بالغ ظری ترقی پر ہے۔"

دریا کی متلاطم لہریں اسٹیمر سے ٹکرایا کیں۔ کبھی کبھی پانی کی چھینٹیں اڑ کر اوپر آ جاتی تھیں۔ ڑکی کے بال بھیگ گئے۔ رات تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ نوجوان نے گھبرا کر گھڑی پر نظر ڈالی۔

دفعتاً لڑکی نے سوال کیا: "آپ یہاں کس کام سے آئے ہیں؟ یا — راز کی بات ہے؟"

"نہیں۔ کوئی راز کی بات نہیں ہے۔ ہمیں پراونشل مسلم لیگ کے لیڈروں سے بات چیت کرنے ے لئے بھیجا گیا ہے۔"

مسلم لیگ — نواب قمر الزماں چودھری — ارجم — جہاں آ —

جہاز دریا کی گدلی موجوں پر ڈولنے لگا۔ اس کے انجن کی آواز ایک دم اونچی ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں نڈے پڑ گئے —

"جیوتی دا، روزی، محمود دا، یہ سب بھی مجھ سے بے حد خفا تھے، روزی نے تو مجھے غدار اور لوڈی ا — حد ہے —"

"تم نے ان کا ساتھ کیوں نہ دیا —؟ تم تو دنیش بابو کی بھتیجی ہو —"

"آپ نے جو اتنی سختی سے منع کر دیا تھا۔"

"کب۔؟"

"اپنے پچھلے خط میں۔"

"مائی گڈنس۔"

لڑکی نے اور زیادہ ہڑبڑا کر سر جھکا لیا۔ "حالانکہ مجھے اتنی شرمندگی سی تھی کہ میں کاکا کو LET DOW کر رہی ہوں۔"

"مائی گڈنس —" نوجوان نے دہرایا۔ پھر اس نے آگے جھک کر پوچھا۔ "اب بتلاؤ ہم

سے کیوں خفا تھیں۔ ہمارے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیتی تھیں؟"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوجوان بھی اٹھا۔ اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ "اس پُرسکون جہ کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت سارے دیس میں آگ لگ رہی ہے۔" اس نے ملول آواز میں ک

لڑکی جا کر سرچ لائٹ کے نزدیک کھڑی ہوگئی۔ وہ بھی اس کے برابر آگیا۔

"شاید میں بزدل ہوگئی ہوں۔" لڑکی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

وہ خاموش رہا۔ سرچ لائٹ دریا پر روشنی کا ایک اور دریا بہا رہی تھی۔

"آپ کتنے دن رہیں گے؟"

"پتہ نہیں۔ جتنے دن بھی لگ جائیں۔ معاملات کافی گنجلک ہیں۔ مسلم لیگ ایک عوامی ت بن چکی ہے، اس کی نئی طاقت کو نظر انداز کرنا حماقت ہوگی۔"

بوڑھے ناخدا نے کان کھڑے کئے۔ اور ذرا نزدیک ہو کر دلچسپی سے بات سننے لگا۔ اور ایک دفعہ کر نوجوان کو دیکھا۔ نوجوان نے مسکرا کر اسے "سلام علیکم" کہا اور بات جاری رکھی۔ "بنگال مسلم اکثریت کا صوبہ ہے۔ یہاں کی مسلم جنتا پروگریسو لیڈرشپ کی منتظر ہے ——"

"نواب لوگ تو پروگریسو لیڈر نہیں ہیں۔"

"پروگریسو لیڈرشپ ہماری ہوگی۔ ہمیں لیگ کے قریب آنا ہوگا۔ یہ پیشین گوئی میں آج اگس سنہ ۴۲ء کی اس رات کر رہا ہوں۔ گرہ میں باندھ لو!"

نواب قمر الزماں —— یہ ارجمند منزل جائے گا۔ ارجمند منزل جائے گا —— اس کا دل ز زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ ریلنگ پر جھک کر نیچے لہروں کو تاکنے لگی۔ پچھلے سال جولائی کی اس رات ہری سدن میں جو وعدہ میں نے اپنے آپ سے کیا تھا اس پر قائم نہ رہی۔ اُسے چکر سا آگیا۔ اس نے جنگلہ مضبو سے پکڑ لیا۔ جنگلے کا لوہا بالکل یخ تھا۔ میں نے ساری رات اس سے باتیں کرنے میں گذار دی۔ اب نہیں اب کچھ نہیں۔ اب آئندہ بالکل پہچان کر نہ دوں گی۔ آخر سال بھر تک کس مضبوطی اور بے جگری سـ اپنے وعدے پر قائم رہی ہوں کہ نہیں۔ ایک سال گذر گیا۔ اس طرح باقی عمر بھی گذر جائے گی۔ اب نہیں یہ آخری ملاقات ہے۔ دیکھ لینا۔

بوڑھا پہیے پر جھک چکا تھا۔ اسٹیمر تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

"ڈھاکے میں آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟" لڑکی نے بالکل نارمل آواز میں دریافت کیا۔

"اُوما کے ہاں۔" وہ ہنسا۔ "ایک زمانہ تھا کہ ووڈلینڈ میں ہمارے فرشتے تک نہ بھٹک سکتے تھے۔ نہیں خیر۔ ہمارا ایک فرشتہ تو بھٹکا تھا۔" اس نے پیار سے لڑکی کے بالوں کو چھوا۔ وہ جھنجھلا کر پرے سرک گئی۔ وہ کہتا رہا۔

"اب ہم مزے سے عین سرپری توش رائے کے گیسٹ روم میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ ! آملہ سے تم کب سے نہیں ملیں؟"

"مدتیں ہوگئیں۔"

"آؤ ان سے ملنے۔ وہ دلّی سے میرے ساتھ ہی آئی ہیں آج کل ان کے والدین کلکتے گئے ہوئے ہیں اس لئے سارے دوستوں کا اڈّہ بے فکری سے وہیں ہوتا ہے۔"

"دلّی میں آپ امپیریل ہوٹل میں ٹھہرے تھے؟"

"ہم ـــــ ؟ نہیں تو۔ اُوما وہاں مقیم تھیں۔ ہم ایک دوست کے یہاں تھے، کیوں؟ تم کو کیسے معلوم ہوا؟"

"آکاش بانی آئی تھی ـــــ" لڑکی نے خشکی سے جواب دیا۔ نوجوان نے اسے غور سے دیکھا۔

"تم واقعی بدل گئی ہو ـــــ ایک سال میں بدل گئی ہو۔ تم میں تلخی آگئی ہے۔ تم اتنی سیدھی سادی بھولی تھیں، تمہیں کیا ہوگیا۔ کون تمہاری اس تبدیلی کا ذمے دار ہے؟" اس نے لجاجت سے کہا۔

ماں۔ مجھے مضبوط بنا۔ مجھے فولاد کی طرح مضبوط بنا۔ لڑکی آنکھیں میچ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ لیکن ہر سمت دریا کا دھندلکا طاری تھا۔

"تم دن بھر گھر پر رہتی ہو؟"

"جی ہاں"

"میں کسی وقت تمہارے ہاں آسکتا ہوں؟"

"کسی وقت نہیں۔"

"کیوں؟"

"ایسے ہی۔ میری مرضی۔"

"اچھا۔"

اسٹیمر اب دریا کے موڑ سے گزر چکا تھا۔ ملاّح نے پہیہ گھمانا ختم کر دیا۔ سامنے روشنی کا راستہ بے حد وسیع ہو گیا۔ وہ دونوں جنگلے پر جھکے دریا کی منوّر لہروں کو تکتے رہے۔ گہرا متلاطم دریا۔ منوّر پانی، حدِ نظر تک روشن۔ چاروں کھونٹ پانی۔ ابتدا میں خلا تھا، اور تاریکی۔ اور خدا کی روح پانیوں پر ڈولتی تھی۔ یہ تخلیقِ کائنات کی رات تھی۔ اور خدا نے کہا روشنی اور روشنی ہو گئی۔ اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے۔ اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جدا کیا۔

اور آدم و حوّا کو بنایا۔ اور ایک دوسرے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ (آدم و حوّا، اسٹیمر کے جنگلے پر جھکے کھڑے ہیں۔ استعارے کو اور آگے لے جاؤں تو یہ بزرگ کپتان حضرت نوح ہیں جو ہم دونوں کو نہ جانے کون سے ارارات کی سمت لئے جا رہے ہیں۔ نوجوان زیرِ لب مسکرایا)

روشنی اور تاریکی، موت و حیات، دکھ اور سکھ، فراق اور وصال، جنوں اور خرد —— سنگم تو گوالندو گھاٹ سے پرے، بہت دور رہ گیا۔ گنگا اور برہم پتر کی لہروں سے بنا یہ دریا —— اس کے پانیوں میں گنگا کون سی ہے اور برہم پتر کون ہے؟

لڑکی کو زور کی چھینک آئی۔ وہ اس کی طرف مڑا۔ وہ سوں سوں کر رہی تھی۔

"تمہیں سردی لگ جائے گی۔ چلو اندر چلیں۔" نوجوان نے متفکر ہو کر کہا۔

"نہیں۔ میں تو یہیں کھڑی رہوں گی۔" لڑکی نے ضد سے جواب دیا۔ پھر وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ پھر فوراً سنجیدہ ہو گئی۔ وہ اسے ہنستا دیکھ کر مسرور ہوا۔ اور خود بھی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے ریلنگ پر رکھے ہوئے لڑکی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

لڑکی نے اپنا ہاتھ نہیں ہٹایا۔

ساحلی بتّیاں دھندلکے میں ٹمٹما کر گزر چکی تھیں۔ نرائن گنج کی روشنیاں قریب آتی گئیں۔ اسٹیمر مصروف بندرگاہ کے اجالے میں داخل ہوا۔ نرائن گنج سامنے جگمگا رہا تھا۔ نرائن گنج —— اس کی گلیوں کی نہروں پر چلتی کشتیاں، جوٹ اسٹیشن، گہما گہمی، باہر اندھیرے میں چھپی کچی سڑکیں، نیم شکستہ مغل پل، کھیت، طویل اندھیری شاہراہ جس کے سرے پر ڈھاکہ ہمیشہ کی طرح منتظر ملے گا شفیق، محفوظ، مانوس۔ ہر دنیا متزلزل ہو چکی تھی، مگر شاید موجود تھی۔ مسرت کا وجود بھی تھا۔ ملنا ممکن تھا۔ آخر دنیا

ں ایسے لوگ بھی تو موجود ہوں گے جنہیں چین اور خوشی میسر ہے؟ اور مسرت کے حصول میں خود غرضی گناہ ہے؟

لڑکی نے ہوا سے بچنے کے لئے کھادی سلک کی دوہری چادر مضبوطی سے اپنے شانوں کے رد لپیٹ لی۔

۲۴

چارلس بارلو، بنگال سویلین

• نغماتِ ہند از الف جیم

پیارے بیٹے جم کے لئے۔ انیسویں سالگرہ پر

تمہارا ڈیڈ

میمن سنگھ، ۱۸۹۶ء

چارلس بارلو نے بیئر کا مگ تپائی پر رکھ کر سنہری مجلد کتاب کا احتیاط سے ورق الٹا۔ یہ بڑی ر کتاب تھی۔ جو خود مصنف نے جو "الف، جیم" کے قلمی نام سے ہندوستان کی برطانوی سوسائٹی بنٹولا الف کے متعلق بیحد پُرلطف اور طنزیہ نظمیں لکھتا تھا، گرینڈ ڈیڈ کو دی تھی۔ یہ اپنے زمانہ کا مقبول ف جیم" دراصل ٹ احصار کا کیپٹن یلڈھیم تھا۔ گرینڈ ڈیڈ کا جگری دوست، گرینڈ ڈیڈ ان دنوں ل میں ڈویژنل کمشنر تھے۔ انہوں نے ڈیڈ کو یہ کتاب ان کی سالگرہ پر دی تھی۔ ڈیڈ آکسفرڈ سے ہوں پر اپنے والدین سے ملنے بنگال آئے ہوئے تھے۔ اور بہت جلد خود بھی اپنے والد کی مانند بنگال یلین بننے والے تھے۔

ماضی کی وہ افسانوی ہستی —— بنگال سویلین!

چارلس بارلو نے اداس، زیرِ لب تبسم کے ساتھ پہلی نظم پر نظر ڈالی، اس مجموعے میں وہ سارے

Lays of Ind by ALIPH CHEEM

کردار موجود تھے جو ماضی کے بنگال سویلین کی زندگی کا لازمی جزو رہ چکے تھے ۔

پہلی نظم ——— "ریورنڈ مک فرسن کا خیال تھا کہ "انڈین ناچ" شیطانی گورکھ دھندا ہے ۔ ایک روز راجہ نے ساری چھاؤنی کو ناچ کے لئے مدعو کیا ۔ باغ قمقموں سے سجایا گیا ۔ میم صاحبوں کے لئے خیمے لگے ۔ بڑھیا شرابیں، پلاؤ، عطر گلاب، سارا اسٹیشن مدعو تھا ۔" تماشا شاندار ملوٹ اچھا" تھا ۔ راجہ جھک جھک کر صاحب لوگ کو سلام کرتا ۔ عجیب عجیب زیور ناک میں پہنے ناچ گرلز آئیں اور ڈوم ڈوم کی جنگلی تال پر تھرکیں ۔ سازندوں کے وحشیانہ ساز چیخے ۔ ان کے چوبدار عود دان اور مشعلیں سنبھالے پیچھے کھڑے تھے ۔ چیف رقاصہ رآما رآما کہہ کر ناچنے لگی ۔ ریورنڈ مک فرسن کو یہ معلوم نہ تھا کہ رآما ایک دیوتا ہے ۔ ورنہ انہیں تعجب نہ ہوتا کہ شیطان کی چیلی ایک دیوتا کو پکارتی ہے ۔ ان معاملات سے جو ان کے پریچ سے متعلق نہ تھے ، ریورنڈ مک فرسن لاعلم تھے ——— ۔"

آج بھدرا لوگ کی لڑکیاں کلکتہ اور شانتی نکیتن کے اسٹیج پر ناچ رہی ہیں ۔ بے چارے الف چیم! تم مجھے اپنے بلیرڈ روم ، چُرٹ ، بسمارک اور فرانکو جرمن وار کی باتیں کرنے والے فوجی افسروں ، اپ کنٹری ، مفصل ، بینڈ اسٹینڈ ، گزٹ ، پائنیر ، ٹفن اور چھوٹا حاضری کی حکایات سنائے جاؤ ۔ کہ اس گمشدہ دنیا کے تذکرے سے ہی مجھے تقویت حاصل ہوتی ہے ۔

دوسری نظم ——— "چاندنی رات ، جب دور سے نیٹوز کے ڈوم ڈوم کی بھیانک آواز سنائی دیتی ہے ، بازار کی مکھیوں ایسی بھنبھناہٹ ۔ چوکرا سگار لاؤ ۔ میں برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوں ۔ باہر سرو کے درختوں کے پیچھے سے چاند نکل رہا ہے ۔ چوکرا شراب انڈیلتا ہے ۔ اوہ انڈیا! سہانی شاموں کی سرزمیں ۔ پتوں پر لرزاں تیری چاندنی ، تیری واحد دیوانگی نہیں ۔"

چارلس بارلو نے پل کی پل کو آنکھیں بند کرلیں ۔ پھر بیئر کا مگ اٹھا کر ایک صفحہ اور پلٹا ۔

"میرا چالاک منشی محمد دین ، روزانہ مجھے اُردو پڑھانے آتا ۔ گپّی ۔ وہ انگریزی بولتا ۔ "نیٹو بات" بہت کم ہوتی ۔ سرکنڈے کے قلم خرید کر لاتا اور روز دو چار آنے چرالیتا ۔ مجھے کتنی نفرت تھی اس درس و تدریس سے ، منشی گپیں ہانکتا اور میں چپ چاپ بیٹھا چُرٹ پیا کرتا ۔ مگر جب میں نے امتحان پاس کیا تو ایسی اُردو بولی کہ کوئی سالار جنگ بھی کیا بولے گا ۔"

ایک اور نظم ——— "راجہ کرشنا ہاؤ ڈو یو ڈو ——— ہند کے اس خطے میں جہاں تیلگو

جاتی ہے۔ راجہ کرشنما ہاوڈی ڈُور رہتا تھا۔ جو اس سال افسوس کہ پرلوک سدھارا، راجہ ان میں سے تھا، اگر جن کا رنگ صاف ہوتا تو وہ سیدھے سیدھے انگریز بن جاتے۔ اس کی عادتیں صاف ی تھیں۔ نہ بھنگ پیتا تھا، نہ مرچیں کھاتا تھا نہ پان۔ تیلگو لہجے میں انگریزی خاصی بول لیتا تھا۔

پانی" پار ولایت ہو آیا تھا۔ بلیرڈ کھیلتا تھا اور اپنے ساتھ ولایت سے تصویریں اور (نقلی) ہ کے بنڈل لایا تھا۔ جو اُن احمق عورتوں نے اُسے دیئے تھے جو ایک دولتمند اور نیٹِو کو دیکھ کر خواہ جذباتی ہو جاتی ہیں۔ راجہ پولکا ناچتا تھا۔ چپل کے بجائے بُوٹ اور ٹوئیڈ کا سوٹ، اس ج بھی مثالی تھا۔ اپنی ریاست کو متمدن کر چکا تھا۔ ہیلتھ کمیشن، ویکسی نیشن، ایڈمنسٹریشن، ریلوے تعلیم، یہ اور وہ، اس کی ریاست اتنی عمدہ ہو گئی تھی کہ ہم نے اس سے کہا تھا کہ ہم کبھی اس کا الحاق نہ کریں لارڈ وائسرائے نے اس سے کہا کہ وہ ہمارا بہترین فرزند دلبند ہے اور ایک ٹھوستر گولوں کی سلامی کا اُسے دار بنایا۔

"راجہ گو اتنا مغربی ہو چکا تھا۔ مگر دل سے اصلیت میں ایک دم بلیک نیٹو تھا۔ دھوم دھڑکے سیا، ہزاروں خوشامدی، حوالی موالی، ناچ گرلز، سازشی مصاحب، بھکاری، پروہت، گھوڑے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ گو فلیوٹ بجانا سیکھ چکا تھا مگر اپنے ملک کے وحشیانہ ڈھول اور بانسری ہیج دیتا تھا۔ پلم پڈنگ کا مداح تھا مگر کری اینڈ رائس پر مرتا تھا۔ ان خصائل سے اس کے کردار کی طی ظاہر ہوتی ہے کہ راجہ کرشنما ہاوڈی ڈور در اصل مرتے دم تک اپنے وطن اور اپنے دستور کا ار رہا ——"

اتوار کی صبح تھی، چارلس بارلو نے گھڑی پر نظر ڈالی اور آرام کرسی پر دراز اطمینان سے اگلا رپلٹا۔ کتاب اسے بے حد دلچسپ معلوم ہو رہی تھی۔

ایک اور نظم —— "اولڈ ٹائمز لکھتا ہے: فرانس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مشرق اولڈ ٹ کی ذمہ داری ہے۔ کہ فرانس کے لئے چندر نگر اور پانڈیچری ہی کافی ہیں۔ نا قابل یقین! کہ فرانس اود ہ کی لالچ کرے۔"

پانچ چھ صفحات کے بعد ایک نظم نے چارلس بارلو کو متوجہ کیا۔ —— "صبح کی شہ سواری، جب ں کے مرغے بانگ دیتے اور گائیں ڈکراتیں، کاہل چرواہے سو رہے ہوتے، تب میں اور اسمتھ مولسون

کی ہوا کی طرح جنگل میں سے گھوڑا دوڑاتے نکل جاتے، مندر، ناقوس پھونکتے برہمن، وحشیانہ جنگ و جدل کی یادگار قلعوں کے کھنڈر، گاڑی بانوں کے ہجوم، بیلوں کی گھنٹیاں، پنگھٹ، کسی نیٹو رئیس کی گاڑی، لکڑہارے، برابر سے گزر جاتے، گھنٹی بجاتا ڈاک کا ہرکارہ چمڑے کے تھیلے میں ڈاک لئے پاس سے گزرتا تو معلوم ہو جاتا کہ اسٹیشن قریب آ رہا ہے، صبح کی بندوق دغتی، منڈی، نیٹو، ہجوم، رنگین پردوں والی بہلی میں سے جھانکتی ناچ گرلز صاحب لوگوں کو دیکھ کر بیباک قہقہے لگاتیں۔ پھر ایک صاحب اور اس کی لیڈی گھوڑوں پر گزرتے، دور سے آبادی نظر آتی۔ ندی، مسجد کے مینار، گنجان نیٹو شہر، دھندلکا، حسین مناظر، اور اسمتھ جو اونٹیل معاملات میں جذباتی نہ تھا کہتا ——— یہ غلیظ نیٹو شہر تم کو حسین نظارہ معلوم ہوتا ہوگا، مجھے تو ———"

"صاحب ——— "عبدالغفور نے اندر آ کر کہا۔ چارلس بارلو نے کتاب پر سے سر اٹھایا۔ عبدالغفور نے تازہ اخباروں کا پلندہ قریب کی میز پر رکھا، اور واپس چلے گئے۔ چارلس بارلو نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

"پولس والوں کا ڈنر ——— کلکٹر ملک کال، جونئر اس کا معروف کمپی ٹیشن والا سب، ٹوم کنز سول اور سیشن جج، نرم دل ڈاکٹر شارپ سول سرجن جس نے کالرا کے دنوں میں جب جیل کالرا والوں سے بھر گیا تھا دن رات کام کیا۔ اب ڈنر کے بعد ذرا اونگھ رہا ہے۔ ریورنڈ مائیکل وائن اداس بیٹھے ہیں۔ یہ سب بڑے معقول لوگ ہیں۔ مگر مجھ پولس والے کو سال میں دو دفعہ ان کی دعوت کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ باتیں شروع ہوتی ہیں۔ مونسون آنے والی ہے جانے کب آئے گی۔ دھان کی فصل شاید اس بار بھی فیل ہو جائے۔ ملک کال کہتا ہے۔ بارش آئے تو چیتے کا شکار شروع ہو۔ پھر شکار کے قصے، لیکن کمپی ٹیشن والا شکار کے بجائے ذرا انٹلیکچول باتیں کرنا چاہتا ہے۔ شیری اور جنجر کے بعد خاموشی، بڑے بڑے چرٹ سلگائے گئے۔ تاش ہوا۔ ڈاکٹر اب خراٹے لے رہا تھا۔ برانڈی پانی کا دور چلا۔ پھر ہم سب "ڈسٹرکٹ گپ" سے بور ہو کر اپنے اپنے گھر چلے گئے ———"

"اجاڑ بنگلہ ——— سرنگا پٹم میں، کاویری کے کنارے ایک بنگلہ، جس سال ٹیپو گرا تب سے ویران پڑا ہے۔ باغ میں درخت آہیں بھرتے ہیں۔ لنگور شور مچاتے ہیں۔ الّو بولتے ہیں۔ دریا کے کنارے قلعہ کی فصیل ہے جو اولڈ انگلینڈ کی طاقت سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گئی۔ آنے والی نسلوں کے لئے ایک سبق! وہ زمانہ جب ہمارے جری نوجوان شیر کی کچھار تک پہنچ گئے تھے، اور اس بنگلہ کے نزدیک وہ معرکہ ہوا تھا۔ محاصرے کے بعد اس

یں ایک کرنل اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میں اب بھی تصور میں اس وقت کا نظارہ کر رہا ہوں، رت بنگلہ، بچیوں کے قہقہے، صبح کی شہ سواری، جب کرنل اس جگہ سے گزرتے ہوئے اس پھاٹک کو ہوگا۔ جہاں ٹیپو گرا تھا۔ شہسواری کے بعد درختوں کے نیچے بریکفاسٹ، خس کی ٹٹیوں کے پیچھے دن گزارنے ٹفن اور گرینڈ پیانو کی آواز۔ اور پھر ایک شام کالرا نے دروازہ کھٹ کھٹایا اور ماں اور بیٹیاں اس تھ چلی گئیں۔ دل گرفتہ کرنل نے اس بنگلہ کو خیرباد کہا۔ اب ان کمروں میں کائی جمی ہے۔ اسّی برس سے وہ سنسان ہیں۔ پیانو اور قالین اور مسہریوں کے پردے گل چکے۔ کاویری کے کنارے ——! جہاں تھا ——"

اور آگے —— "آج کا اہم سوال ——"

" —— کیا روس کا اولڈ پیٹر ہم کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے؟ کمزور خیوا فتح کر کے اتنا اکڑ گیا۔ اولڈ یا وہ سمجھتا ہے کہ ہمارا سکھ فوجی خیبر پر ہم سے نمک حرامی کرے گا؟ کیا اس نے غدر کے حقائق سے کوئی نہیں لیا؟ کیا اولڈ پیٹر سمجھتا ہے ہمارے راجگان اس سے جا ملیں گے؟ آنے دو —— ذرا ستان سے گزر کر آنے دو۔ ہمارے سکھ کی تلوار خیوا کی تلوار سے زیادہ مضبوط ہے۔ ہم جو روس سے رچکے ہیں، پھر اُسے شکست دیں گے۔ جس قوم پر حکومت کرنا خدا نے ہمیں سونپا ہم اس خدائی امانت تھ بددیانتی کرتے تو ہمیں ڈر تھا۔ اگر ہم اس ملک پر روس کی مانند کوڑے سے حکومت کرتے، اگر اس ہم نے روندا ہوتا، اس کی آبادی سے محبت نہ کی ہوتی۔ سیاہ و سفید میں عدل نہ قائم کیا ہوتا۔ قحط وں میں اپنی محبت نہ بوئی ہوتی۔ تب ہم دشمن سے ڈرتے، چالاک روس! اس سے قبل کہ تم ہمارے ن کوتاکو خود اپنے ایشیائی قبائل کی حالت سدھارو۔ ان کو محسوس کرنے دو کہ ان پر حکومت کی جا ، ظلم نہیں۔ اپنے اہلِ خیوا اور اہلِ بخارا پر ثابت کر دو کہ تم طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ انصاف پسند ، وسط ایشیا کے ایسے نئے آقا ہو جو ماضی کے وحشی قبائلی ایشیائی سرداروں سے مختلف ہو۔ جو اُن کو سکھائے۔ اگر ہماری اور تمہاری فتوحات کا مقصد یہی ہو تو ہم مشرق میں تمہارے دوست ہیں —— قی کے نقیب، دونوں خوابیدہ اقوام کو جگانے والے، لیکن اگر تمہارا مقصد کچھ اور ہے تو یاد رکھو، ہاتھ میں شمشیر ہے۔ ہمیں خداوند تعالیٰ پر بھروسہ ہے۔ جو بہادروں اور منصفوں کے ساتھ رے مغرور عقاب کو مٹی میں ملا سکتا ہے ——"

ایک اور نظم ——— "انگلینڈ ہو۔! بمبئی کی بندرگاہ پر سورج چمک رہا ہے۔ گیلو
ٹرد پر گھڑیال پر میری رجمنٹ واپس جا رہی ہے۔ گیارہ برس بعد! ہم چھ سو آئے تھے، تین سو واپس جا
رہے ہیں۔ باقی وباؤں نے کھا لئے۔ مشرق پر حکومت کی قیمت ہم بیماری اور موت کے ذریعے ادا کرتے ہیں۔
ہندوستان نیلاہٹ میں ڈوب رہا ہے، جہاں میرے تین سو دوستوں کی قبریں ہیں۔ میں اپنا ٹوپ ہلاتا ہوں۔
ہم گھر جا رہے ہیں، ہم ہند کو بھول جائیں گے، خدا حافظ دوستو، وباؤں نے تمہیں کھا لیا۔ انگلستان
خاطر تم نے اپنی جانیں دیں۔ الوداع۔ سورج کے دیس، ہماری جلاوطنی ختم ہوئی ———"

اگلی نظم ——— "اوٹی میں ٹہلتے ہوئے کونسل کا ممبر پیٹر اسٹریٹ جان مک ڈو سے کہتا
— پیٹر ہم کو خدا نے یہ ملک اس لئے دیا تھا کہ ہم اسے متمدن بنائیں، اور جب ہمارا یہ ارفع مشن ختم ہو جا
تو واپس چلے جائیں۔ لیکن ہم کر کیا رہے ہیں؟ ہم نیٹوز کو کالج جانے کے لئے کہتے ہیں، اور پھر ان کو ایسی نو
دیتے ہیں، جن کے لئے تعلیم کی ضرورت نہیں۔ ہم انہیں شراب نوشی کو منع کرتے ہیں، مگر افیون کی کاشت کر
ہیں۔ ہم کہتے ہیں تم نگر لوگ اپنی عورتوں کو آزادی دو، اور وہ پوچھتے ہیں کیوں؟ اور طنز سے ہماری خوا
کی آزادی کی طرف اشارہ کرتے ہیں ——— پیٹر اسٹریٹ جب ہم اپنی لڑکیوں کو ایماندار نیٹو جنٹلمین سے شاد
کرنے کی اجازت دیں، جب با اثر بابوؤں کو معقول عہدے دیں، کونسل والوں کی تنخواہیں کم کر
تب ہی اس ذمہ داری کو نبھا سکیں گے، جو خدا نے ہمارے کندھوں پر ڈالی ہے ———

"تب پیٹر اسٹریٹ نے کہا: ـ تمہارا یہ پروگرام ممکن ہے بہت خوشگوار ہو، مگر مجھے تو یہ سد
بکواس معلوم ہوتی ہے جو آپ نے فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں ہم کچھ عرصے کے لئے اس ملک کے امین ہیں۔ م
جناب عالی حقیقت یہ ہے کہ جب تک ممکن ہوگا ہم اس کو اپنے قبضے میں رکھیں گے ———"

"ہمیشہ آگے جاؤ ———

"ہیمنتی ڈمتی فرمیٹی چندر، عاقل برہمن زمانے کی ترقی سے نالاں اور متحیر تھا۔ کیا ویدوں اور شاس
میں پہلے سے سارا علم موجود نہیں؟ مصلحین ماضی سے متنفر ہیں۔ اور ذات پات کے بندھن توڑنا چاہتے
فرنگی استادوں اور ان کی ایجوکیشن گرانٹس پر لعنت! انہیں کیا معلوم ہندو کی ضروریات کیا ہیں؟ ان بر
سماجیوں پر لعنت جو کہتے ہیں خدا کا میدان بہت وسیع ہے کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں۔ یہی سب لو
کالج میں پڑھتے ہیں ——— یہی بات کیشب چندر سین کہتا ہے ———!

بابو تمیل بمل بندر بھی ایک برہمن تھا۔ مگر ترقی کا جوشیلا حامی۔ وہ اور چندر شام کو دروازہ میں حقّہ پیتے اور باتیں کرتے۔ بازار کا بھاؤ، چاول کی قیمت اور کبھی کبھی زیادہ سنجیدہ موضوع، ذات دھرم وغیرہ اور اپنے متضاد خیالات پر بحث کرتے کرتے جھگڑنے لگتے۔ ایک روز بندر نے کہا۔ ایک ودھوا سے بیاہ کرنے والا ہوں۔"

"گھاس تو نہیں کھا گئے ہو؟ حقّہ پانی بند کر دیا جائے گا۔" چندر نے کہا۔

"زمانہ بدل چکا ہے، اب تہذیب ہمیں نئے راستے دکھا رہی ہے۔ تمہیں معلوم نہیں ندوستان کا نعرہ ہے ـــــ ہمیشہ آگے جاؤ۔" بندر بولا۔

"بکواس۔" چندر نے چادر سنبھال کر کہا۔ "برہمن ہو تم؟ غدار؟ ودھوا سے بیاہ؟ لعنت ہو۔" کر اس نے بندر کی چپّل پر ٹھوکر لگائی تو وہ نیچے بہتی گندی نالی میں جا گری۔ بندر نے چندر ـ دبوچ لی۔ دونوں چیختے چلّاتے ایک دوسرے کو زدوکوب کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ایک انگریز فوجی نے ن کو چھڑایا اور چوکی لے گیا۔ اور ان کے احتجاج پر محض اتنا کہا "آگے جاؤ۔"

چارلس بارلو بیساختہ ہنس پڑا۔ یہ بنگالی کی سچی تصویر تھی، لیکن "سر علی بابا" نے بابو کے متعلق جو ؤئی کی تھی وہ بھی آج لفظ بہ لفظ صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ بابو مغربی علوم اور مغربی خیالات سے ر کے اب دولتی جھاڑ رہا تھا۔ چارلس بارلو نے کاہلی سے سر اٹھا کر الماریوں پر نظر ڈالی لیکن اُسے ۔ "سر علی بابا کا سفرنامہ" مدتیں گذریں ڈیڈ نے نواب انوار الزماں کو تحفتہً دیدیا تھا۔

گرینڈ ڈیڈ، ڈیڈ۔ مما دونوں چچا سڈنی اور کرسٹفر۔ پھر گریٹ آنٹ میبل۔ آنٹ ماڈ، آنٹ ن۔ آنٹ مٹیلڈا۔ خالص وکٹورین نام۔ بھولی بر خود غلط وکٹورین ہستیاں ـــــ پورا بارلو اسٹڈی کے آتش دان اور دیواروں پر اپنی اپنی تصویروں کے بیش قیمت چوکھٹوں کے اندر محفوظ و وجود تھا۔

جبکہ باہر دور دور بم پھٹ رہے تھے۔

گرینڈ ڈیڈ اور ڈیڈ سلطنت کی اس تباہی پر اپنی اپنی قبروں میں کروٹیں بدل رہے ہوں گے۔ رکھلنا کے انگریزی قبرستان، بارش میں بھیگتے کتبے، قبروں کے کتبے، سارا ہندوستان انگریزوں ـعریض قبرستان ہے اپنی جانیں دے کر ہم نے اس ملک کو سنوارا۔

گرینڈ ڈیڈ ہیلی بری سے ٹریننگ لے کر اڑیسہ آئے تھے۔ انہوں نے ایڈمنسٹریشن میں ا
سے ٹریننگ لی تھی، جن کی اپنی جوانی میں محمد رضا خاں اور شتاب رائے زندہ تھے۔ کلائیو، ہیسٹنگز
کارنوالس، ولیم بینٹنک، میکالے ———

کس جانفشانی اور محنت اور محبت سے گرینڈ ڈیڈ اور ان سے پہلے اور بعد کی پیڑھیو
سویلینز نے اس ملک کی حکومت کو دنیا کی بہترین حکومت بنایا۔ جلتی دھوپ، لو، بارشوں، سیلابو
کی پروا کئے بغیر سینکڑوں میل کے فاصلے گھوڑوں، پالکیوں اور کشتیوں کے ذریعہ طے کر کے یہ عظیم
آراضی کا بندوبست کرتے، مقدمے فیصل کرتے، درختوں کے نیچے بیٹھ کر کسانوں کی فریادیں سنتے
ان کو مائی باپ کہتے۔ کمپنی کے اولین دور میں بے شک کرپشن تھا۔ مگر اس کے فوراً بعد ——— ؟ اور کرپ
اس ملک کی پرانی روایت نہیں تھی؟ نذرانہ اور رشوت؟ اب پہلی بار اہلِ ہند کو احساس ہوا ہے کہ
اور صوبجاتی حکومت قتل و غارت، لوٹ مار اور زبردستی کا نام نہیں، بلکہ یہ رعایا کی بھلائی اور
کے لئے قائم ہے، مغلوں کا ایڈمنسٹریشن ——— ؟ آکسفرڈ میں وہ مسعود علی سے بحث کیا کرتا
اشوک، شیر شاہ، اکبر ——— ٹھیک ہے۔ مگر ان کے بعد؟ اور یہ لوگ بھی قانون کے تص
ناآشنا تھے۔ سارا مشرق قانون کے تصور سے ناآشنا ہے۔

سلطنت روم کی وارث مسیحی یوروپین تہذیب کے بہترین نمائندے برطانیہ نے پہلی با
ہند کو قانون عطا کیا۔

اولڈ کارنوالس نے تھانوں اور پولیس چوکیوں کا جال بچھا دیا۔ کلیولینڈ نے آدی با
کو انسان بنایا۔ اٹھارویں صدی میں جیسور کا ایک کلکٹر نیکل اس قدر شفیق تھا کہ عوام نے اس کی م
بنا کر اس کی پوجا کی۔ نکلسن کو پنجاب کے کسان پیار سے نکل سائیں کہتے تھے۔ جوناتھن ڈنکن
میں دختر کشی کے خلاف مہم شروع کی۔ جیمز گرانٹ نے دن رات کی انتھک محنت کے بعد ایک دیا
اور انصاف پسند ایڈمنسٹریشن قائم کیا۔ یہ دو سو سال کی قربانیاں، عرق ریزیاں، جانفشانیاں
رائیگاں جائیں گی ——— ؟ اس عظیم کارنامے "برطانوی ہند" کو ہم لاقانونیت اور جذبا
حوالے کر دیں گے؟ کورٹ انڈیا اِن ڈیڈ ——— !

انڈیا ہے کہاں؟ نہرو کے شاعرانہ تخیل میں۔ انڈیا کو ایک بار اشوک نے متحد کیا۔ ا

(کوشش کی مگر فیل ہوگیا) اور اب واقعی اُسے ہم نے متحد کیا ہے۔ پنجاب میں مقیم لیڈی ولسن نے
ے نصف صدی قبل بالکل صحیح لکھا تھا۔ کہ یہ ملک لکڑیوں کا ایک گٹھا ہے۔ ہر لکڑی چاہتی ہے
ری کو توڑ دے۔ ان سب کا بیرونی اتحاد محض برطانوی پرچم کے ذریعے قائم ہے۔

گرینڈ ڈیڈا اپنی اس تصویر میں جو شملہ کے ایک مشہور فوٹو گرافر نے ۱۸۸۱ء میں کھینچی تھی قلم ہاتھ
ہ کچھ لکھ رہے ہیں۔ یہ تصویر آتشدان پر رکھی ہے۔ گرینڈ ڈیڈ —— ایڈورڈ بارلو، برطانوی
رکی اس شاندار روایت کی ایک مثال تھے جنھوں نے اپنی شدید مصروف زندگی کے باوجود اس
ے بارے میں ہزارہا محققانہ اور عالمانہ کتابیں لکھیں۔ یہ ہندوستانی جو آج کل "انڈین کلچر" کا نعرہ
ے ہیں۔ ان کی یہ "انڈین کلچر" ان ہی بیچارے وکٹورین بڈھوں نے دریافت کرکے دنیا کے سامنے
ی تھی۔ آج ہم ان وکٹورین بڈھوں کو بددماغ، برخود غلط، سمجھتے ہیں۔ اور غالباً وہ ایسے تھے
یا قدیم رومن باقی دنیا کو وحشی نہیں سمجھتے تھے؟ انیسویں صدی کے برطانیہ کا ایک فرد ہونا
تھوڑا ہی رہا ہوگا۔ برٹش امپائر —— ! پوری انسانی تاریخ میں اس سے زیادہ عظیم الشان،
ت سلطنت پہلے کہیں قائم نہ ہوئی تھی! چنانچہ یہ بڈھے۔ گرینڈ ڈیڈا اور ڈیڈا اور ان کے ساتھی
غ اور ذرا خبطی سے تھے۔ مگر کیا دولت اور طاقت کے بل بوتے پر امریکہ بددماغ اور برخود
یں ہوگیا؟ اور مزید ہوتا جائے گا —— جب کہ اس کے پاس تہذیب بھی نہیں ہے؟

امریکہ —— وائلٹ —— وائلٹ اس وقت کیا کر رہی ہوگی۔ تمہاری صحت
ے —— چارلس بارلو نے مگ اٹھا کر چند گھونٹ بھرے۔ پھر ایڈورڈ بارلو کی تصویر
ما۔

گرینڈ ڈیڈ، پَر کا قلم ہاتھ میں لیے، سیاہ ریشمی ڈورے والی عینک لگائے شدت کی
ے سے کیا لکھ رہے ہو —— ؟

گرینڈ ڈیڈ نے بنگال کے کتنے اضلاع کے امپیریل گزیٹرز پر کام کیا تھا۔ شام کو تھکے ہارے
سے لوٹ کر پھونس کے چھپر والے کسی بنگلے کے برآمدے میں بیٹھ کر، لیمپ کی روشنی میں تم یہ سب
تے ہوگے۔ چوکرا۔ سگار لاؤ۔ چاند نکلتا ہوگا۔ مچھر بھناتے ہوں گے۔ تم تنہا بنگلے میں بیٹھے
گزیٹر کی جلدوں میں ایک جلد ایک باب کا اضافہ کرنے میں جٹے رہتے ہوگے۔ اور آسام کے

ناگا قبائل" گرینڈ ڈیڈ کی مشہور کتاب تھی۔

برابر کی تصویر میں گرینڈ ما بیٹھی ہیں۔ اونچا سا جوڑا باندھے۔ درشت چہرہ۔ بیاہ ک
ہندوستان میں برطانوی سوسائٹی کی ایک فراموش شدہ ستون۔ ان کے برابر میں گریٹ آنٹ
کی تصویر رکھی ہے۔ (بوڑھا وفادار عبدالغفور جو ٹیم کینٹ ویل سے ترکے میں ملا ہے، کس احتر
خیال سے روزانہ ان ساری تصویروں کی جھاڑ پونچھ کرتا ہے) گریٹ آنٹ میبل جو گرینڈ ڈیڈ کی
تھیں۔ انہوں نے ساری زندگی چرچ آف انگلینڈ کی "زنانہ مشنری سوسائٹی" کا کام کرنے میں
کردی۔ جو ڈیڈ بتلاتے تھے۔ ایک روز گوالندو گھاٹ سے تن تنہا اسٹیمر پر بیٹھیں اور دور دراز
مغربی صوبجات[1] کے ایک دورافتادہ ضلع میں مشن قائم کرنے کے لئے یسوع کا نام لے کر چل پڑ
گوالندو سے مونگھیر۔ پٹنہ۔ بکسر۔ غازی پور۔ بنارس ـــ (ہر نام کا اپنا رومان تھا) بنارس
خوفناک صنم کدے سے وہ اودھ کے شہر سیتا پور پہنچیں۔ وہاں مشن کمپاؤنڈ میں اسکول اور ہسپ
قائم کیا۔ اور بیچاری جوانی کے عالم ہی میں وہاں ہیضے کا شکار ہو گئیں۔ آج کی یہ تعلیم یافتہ قوم پ
ہندوستانی لڑکیاں آنٹ میبل جیسی بہادر عورتوں کی شکر گزار ہیں جنہوں نے تعلیم کی روشنی
تک پہنچائی۔

کوئٹ انڈیا! بلڈی فولز

اب چارلس بارلو کا سر بھاری سا ہو رہا تھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ نن
میں مجھ پر ماضی کی یاد کے دورے زیادہ پڑنے لگے ہیں۔ اور یہ اچھی بات نہیں۔

ڈیڈ کا آئل پورٹریٹ۔ جو لندن کے کسی دوسرے درجے کے مصور نے سنہ ۱۹۰۱ء میں بنایا تھ
تھوڑے سے ڈینڈی تھے۔ ایلن ٹیری اور آسکر وائلڈ اور آبری بیرڈزلے کے دور کے فیشن ایبل نو
جو جب فرلو پر لندن جاتے تو اپنا سارا وقت تھیٹر اور اوپیرا اور بیلے میں گزارتے۔" IY NINETIES
کے ہنگاموں کے رسیا۔ واپس آتے اور بنگال اور اڑیسہ کے غیر دلچسپ پس ماندہ اضلاع میں اپنے فرائض
میں جٹ جاتے مگر اپنے لندن کے انٹلکچوئیل دوستوں سے خط و کتابت جاری رکھتے۔ کتنے برطانو
صحافیوں اور شاعروں سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ ڈیڈ کو علم نباتات کا شوق تھا۔ انہوں نے بھی گر
ڈیڈ کی مانند ہندوستان کے متعلق لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھا۔ آسام کے آرکڈز کی ان گنت اقس

---

[1] موجودہ یوپی

بنائیں اور بنگال اڑلیسہ اور آسام کے پودوں اور پھولوں اور درختوں پر ایک مستند اور ضخیم کتاب الی ۔

ڈیڈ کتاب لکھتے تھے اور مما جنہوں نے اپنی شادی سے قبل کچھ عرصہ تک پیرس میں مصوّری سیکھی ان پھولوں اور پتّوں کے انتہائی سبک اور نفیس اسکیچ بنائیں ۔

مما کی تصویر ۔ صوفے پر بیٹھی ہیں ۔ ڈیڈ پیچھے کھڑے مسکرا رہے ہیں ۔ اس تصویر میں ڈیڈ کی کرزن کی مونچھیں ہیں، مما پیرس کے تازہ ترین فیشن کے گاؤن میں ملبوس ہیں ۔

یہ لوگ سب مر گئے ۔

گرینڈ ڈیڈ نے اپنے ہندو بنگالی منشی سے فارسی پڑھی تھی، اور بنگلہ جانتے تھے ۔ ڈیڈ بھی سے واقف تھے ۔ ریٹائر ہونے کے بعد ان کا ارادہ تھا کہ وہ اپنا زیادہ وقت لندن میں انڈیا آفس لائبریری رف کریں گے ۔ مگر لندن جانے سے پہلے ہی وہ سندر بن میں شیر کا شکار بن گئے ۔

ان سے گاؤں والوں نے درخواست کی تھی کہ اس آدم خور شیر سے بچائیں جو بہت سارے لکڑہاروں ار کر چکا تھا ۔ ڈیڈ بے خوفی سے بندوق سنبھال کر اُسے مارنے کے لئے اندھیرے جنگل میں گھسے اور زندہ واپس ے ۔

انہوں نے اپنی قیمتی جان دی تاکہ یہ نیم وحشی لکڑہارے زندہ رہیں ۔

گرینڈ ڈیڈ کا انتقال ۱۹۰۷ء میں ہوا ۔ جب بنگال میں قتل و غارت شروع ہو چکا تھا ۔ انہوں نے لمبی عمر پائی ۔ نوجوان وکٹوریہ کی تخت نشینی، کمپنی کی ملازمت ۔ غدر، وکٹوریہ کی موت اور آخری میں خودی رام سب ہی کچھ دیکھ لیا ۔ ان کو پنشن لیتے کافی عرصہ گزر چکا تھا ۔ وہ ریٹائر ہونے کے بعد وطن واپس نہیں لوٹے، دارجلنگ اور کلکتے میں بیحد خوبصورت کوٹھیاں بنوالی تھیں اور اپنا وقت علمی مصروفیات میں صرف کرتے کلکتہ یونیورسٹی کی سنیٹ ۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۔ یہ اور وہ ۔ چند برہمو مصلحین بھی ان کے دوست گو یہ واقعہ ہے کہ وہ نیٹوز سے برابری کی سطح پر کبھی نہ ملے ۔ اور حاکم و محکوم کی شعوری دیوار قائم رکھی ۔ ر کی سلامتی اسی میں مضمر تھی ۔

رینڈ ڈیڈ کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں ۔ وکٹورین دستور کے مطابق بہت بڑا کنبہ تھا ۔ مگر صرف یہ سات دستان کے ملیریا اور دوسری بیماریوں سے زندہ بچے تھے اور دستور کے مطابق (تاکہ ہندوستانیوں کی بُری

خصلتیں نہ سیکھ لیں) چھ چھ سال کی عمر میں انھیں تعلیم و تربیت کے لئے انگلستان بھیج دیا گیا۔ بڑے ہوکر کے سب سے بڑے بھائی فوجی افسر بن کر ہندوستان لوٹے، لیکن کابل کے مارچ میں کھیت رہے۔ منجھلے نے لنکا میں چائے کی کاشت شروع کی اور وہاں کے متمول پلانٹر بنے۔ ڈیڈ جوان دونوں سے زیادہ ذ انڈین سول سروس کے مقابلے میں آ گئے اور اس کے فوراً بعد ہی مما کو بیاہ کر ہندوستان لوٹے۔

آنٹ ماڈ کی تصویر۔ روکھی پھیکی شخصیت، سفید گاؤن۔ ہاتھ میں بائبل۔

آنٹ جیرلڈین کی تصویر۔ خوش شکل متبسم، شریر آنکھیں، فیشن ایبل گاؤن، گلے میں موتیوں کا گود میں کتا، ہاتھ میں پنکھا، ——

آنٹ میٹیلڈا کی تصویر —— متبسم بھولی صورت، یہ تینوں تصویریں ایک ایک بک شلف پر رکھ یہ تینوں وکٹورین خواتین ڈیڈ کی بہنیں تھیں۔ تینوں ہارطلیسہ کے مختلف اضلاع میں پیدا ہوئیں۔ آنٹ ماڈ سد بڑی۔ شادی نہیں کی۔ یہ بھی پھوپھی میبل بارلو کی مانند اہل مشرق کی روحیں بچانے میں جٹی رہیں۔ گریٹ آنٹ میبَ اس سلسلے میں صرف گوالندو گھاٹ سے سیتاپور تک کا سفر کیا تھا۔ آنٹ ماڈ نے چینیوں کی روحانی نج کی خاطر گن بوٹ سیاست اور مشرقی ایشیا کی کولونیل جنگوں کے پُرخطر زمانے میں تنہا کینٹن تک کا سفر کیا۔ بر وہاں رہیں اور باکسر بغاوت کے زمانے میں جب باغیوں نے ان کے مشن کمپاؤنڈ پر حملہ کیا۔ وہ چند برطانو بلجین اور امریکن مشنری خواتین سمیت جیزس کی خاطر شہید ہوئیں۔ سرزمین چین میں ان کی قبر بنی۔

آنٹ جیرلڈین —— خوبصورت اور فلرٹ۔ لندن میں ایک بیرسٹر سے شادی کر لی۔ آنٹ میٹیلڈا بھی خوب صورت اور پیاری سی تھیں۔ ڈیڈ کی پسندیدہ بہن۔ دارجلنگ میں ایک فوجی افسر (بنگال لانز اُن پر عاشق ہوا۔ مگر منگنی کے بعد ان کو دغا دے کر بھاگ گیا۔ دل شکستہ آنٹ میٹیلڈا بھی مذہب کی طرف راغ ہوئیں۔ گارو ہلز میں نیا مشن کھولا، گرینڈ ڈیڈ کو ناگا قبائل سے بہت محبت تھی، انہوں نے آنٹ میٹیلڈا کی ہم افزائی کی۔ آنٹ میٹیلڈا اب بوڑھی ہو چکی ہیں اور لندن میں آبائی مکان میں رہتی ہیں۔

ڈیڈ اور مما کے ہاں تین بچے زندہ رہے۔ ایلس۔ چارلس اور رچرڈ۔ وہ تینوں بھی بچپن میں بھیج دیئے گئے۔

ایلس بارلو۔ عجیب بات ہے۔ وکٹورین انگلستان مذہبی نہیں تھا۔ انگریز زیادہ مذہب پر کبھی نہیں رہا۔ مگر مشرق میں آکر سب پر مذہب کا جوش سوار ہو جاتا تھا۔ غالباً یہاں کے عجیب و غریب لیکن د

اہب سے غیر شعوری مدافعت۔ ایلیس کو مشنری بننے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ ایلیس جدید زمانے کی لڑکی تھی۔ کوئی ر پیشہ اختیار کر سکتی تھی۔ اسے گریٹ آنٹ میبل اور آنٹ ماڈ اور آنٹ میٹلڈا کی روایات سے متاثر ہونے کی ضرورت یا تھی؟ یہ میری سمجھ میں کبھی نہ آیا۔ غریب ایلیس شادی کر سکتی تھی۔ بہت ہی معمولی شکل تھی پھر بھی یقیناً اس کی شادی وسکتی تھی۔ وہ پچھلے بیس برس سے گارو کی پہاڑیوں میں، آنٹ میٹلڈا کا قائم کیا ہوا مشن چلا رہی ہے۔ ناگا قبائل اس کی ساری کائنات ہیں۔

مشنری عورتوں کو اس ایثار اور قربانی کا صلہ کیا ملتا ہے؟ افریقہ کے جنگل، ایشیا کے جنگل، صائب، پریشانیاں اور آخر میں تنہائی اور بڑھاپا۔ یا کسی وحشی کے ہاتھوں موت ــــ کیوں؟ ایسا یہ گ کیوں کرتی ہیں؟ کیا ان کو واقعی یقین ہے کہ آسمانی بادشاہت ملے گی؟

بارلو خواتین کا تو بہر حال سینٹ پیٹر استقبال کرتے کرتے بولا جائیں گے۔ میبل۔ ماڈ۔ میٹلڈا۔ ایلیس۔

چارلس بارلو کمرے کا چکر لگا کر پھر اپنی آرام کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ اتنی دیر سے اپنے خاندانی تصاویر مطالعہ کر رہا تھا، مگر ایک گروپ فوٹو جو اس کے ساگوان کے ڈیسک پر رکھا تھا۔ اس کی طرف سے اس نظریں چرالیں۔ وہ تینوں اسے زور زور سے پکار رہے تھے۔ اس کی بیوی وائلٹ۔ اس کے بچے ٹام ر کیرل۔ وہ تینوں اس وقت ڈھاکے سے ہزاروں میل دور جنگ کے مہیب شعلوں میں گھرے انگلستان موجود تھے۔

بوڑھی اور بہادر آنٹ میٹلڈا ابھی جون ۱۹۴۰ء کی بلٹز کے زمانے میں اطمینان سے اپنے پلنگ پر سویا تی تھیں (وائلٹ نے لکھا تھا)

آبائی مکان کی تصویر۔ نمبر ۱۴ اینڈر لیوز کریسنٹ ــــ (یہ تصویر بہت چھوٹی سی ہے اور ٹام نے پنے بے بی براؤنی سے کھینچ کر اسے بھیجی تھی۔ آنٹ میٹلڈا پورچ کی سیڑھیوں پر بلی گود میں لئے کھڑی ہیں۔ کیرل ریب ہی کتے سے کھیل رہی ہے (وائلٹ تصویر میں نہیں ہے) یہ تصویر لکھنے کی میز پر بلاٹنگ پیڈ کے کونے ں اڑسی ہوئی دو سال سے اسی طرح رکھی ہے، ان دو سال میں لندن پر کیا قیامت گزر گئی۔

آبائی مکان۔ ریجنسی طرز کا یہ مکان گرینڈ ڈیڈ کے والد نے جو سٹی میں سولسٹر تھے ۱۸۱۲ء میں خریدا ھا ــــ

مکانوں کی زندگی۔ انسانوں کی زندگی۔

اب میں پھر ماضی کی طرف واپس لوٹتا ہوں۔ چارلس بارلو نے لمبا سانس بھر کر "نغماتِ ہند" دوبارہ اٹھائی۔ کتاب کے پیلے ورقوں میں سے جو پرانی مہک آ رہی تھی وہ اسے بہت اطمینان بخش معلوم ہوئی۔ ماضی محفوظ ہے۔

یوروپین اور امریکن ہمیشہ متعجب رہتے ہیں کہ انگریز اتنا غیر جذباتی ہوتے ہوئے بھی اتنا ماضی پرست کیوں ہے۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ ہم لوگ کتنے جذباتی ہیں اور دوسری بات یہ ——— اس نے بوتل سے مگ میں بیئر انڈیلی ——— کہ ہمارا ایسا ماضی اور کسی قوم کا ہے ہی نہیں۔ لاجواب، بے مثال، درخشاں۔ ایسا درخشاں بھی نہیں۔ ذرا ہندوستانیوں سے پوچھو۔

دہاٹ دی ہل۔

اب مما بے طرح یاد آ رہی ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے واٹر کلر ڈرائینگ روم میں سجے ہیں۔ بنگال کے دہ مناظر ——— سنہری پاٹ سے لدی ہوئی کشتی، دور دھندلکے میں مسجد کا مینار اور برگد تلے کھڑا کالا کھجنگ کسان سامنے الماری میں مما کے واٹر کلرز کا البم رکھا ہے اور اسکیچ بک ——— دارجلنگ کے چیتھڑوں میں ملبوس پہاڑی بچے۔ اور کیڈ کا ایک گچھا۔ فرن کے پتے۔ کرشن چوڑا کی شاخ۔ اپنے وفادار نیٹو ملازموں کے اسکیچ۔ اپنے تینوں بچوں کی تصویریں۔ ایلس عمر پندرہ سال، چارلی عمر گیارہ سال، ڈک عمر دو سال۔

ڈک ——— ونگ کمانڈر رچرڈ بارلو ——— ڈیشنگ۔ بشاش۔ خوب صورت۔ سنہری آر۔ اے۔ ایف مونچھیں۔ یونیفارم پر تمغوں کی قطار۔ یہ ایک اور تصویر ہے جو سامنے میز پر رکھی ہے۔ جسے میں نہیں دیکھنا چاہتا "ونگ کمانڈر رچرڈ بارلو ——— پرانے بنگال سویلین ایڈورڈ بارلو مرحوم کا پوتا۔ جیمز بارلو مرحوم کا چھوٹا بیٹا۔ مسٹر چارلس بارلو، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مرشد آباد کا چھوٹا بھائی۔ عمر اٹھائیس سال۔ جرمنی پر بمبار طیاروں کی قیادت کرنے کے لیے گیا اور زندہ واپس نہ آیا" پچھلے سال اسٹیٹسمین میں شائع ہوا تھا۔

ماضی کی طرف لوٹو چارلی۔ ماضی محفوظ ہے۔ پُرامن۔ پُرسکون۔ چارلس بارلو سر ہلا کر تلخی سے ہنس پڑا۔ سامنے کے بُک شیلف میں پچھلی جنگوں کے متعلق سنہری مجلد کتابیں ایک قطار میں رکھی تھیں ——— فرسٹ اینگلو فرنچ وار ۱۷۴۴ - ۱۷۴۸ء، کرناٹک وارز، پلاسی، فتح مسولی پٹم، بکسر، فرسٹ میسور وار، روہیلہ وار، فرسٹ اینگلو مرہٹہ وار، سیکنڈ میسور وار، تھرڈ میسور وار، فورتھ میسور وار، سیکنڈ اینگلو مرہٹہ وار، اینگلو گورکھا وار، پنڈاری وار، تھرڈ اینگلو مرہٹہ وار، فرسٹ برمیز وار، فرسٹ افغان وار، فرسٹ اینگلو سکھ وار، سیکنڈ

اینگلو سکھ وار، سکنڈ اینگلو برمیز وار، سنتھال بغاوت، سپاہی میوٹنی، معرکہ انبالہ، بھوٹان وار، سکنڈ اینگلو افغان وار، تھرڈ اینگلو برمیز وار، منی پور بغاوت، سرحدی بغاوت ——

یہ تو صرف پچھلے دو سو سال میں برطانیہ کی مشرقی فتوحات تھیں۔ ہزاروں، لاکھوں کرسٹوفر اور رچرڈ بارلو ان معرکوں میں کھیت رہے۔ یورپ کی جنگوں میں کتنے رچرڈ ——

"عبدالغفور۔" چارلس نے دفعتہً گرج کر آواز دی۔

عبدالغفور چند سکنڈ میں نمودار ہوئے۔

"گوسل کا پانی لگاؤ۔"

"جی صاحب۔" عبدالغفور غائب ہو گئے۔

بہت خون بہایا میرے آباء نے۔ چارلس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ پرانے رومنوں کی مانند، مگر پرانے رومنوں کی مانند انہوں نے علم و فن کو بھی مالا مال کر دیا۔

مارس اور منروا کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

اس نے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ پرانی کتابیں اور پرانی تصویریں، یادوں کا قبرستان۔

اڑتیس سال میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ کیونکہ میری عمر اڑتیس سال نہیں ہے۔ میرے عقیدے کی عمر انیس سو بیالیس سال ہے۔ ذہنی اعتبار سے ڈھائی ہزار سال، تاریخی اعتبار سے ڈیڑھ ہزار سال اور نسلی یادداشت کی عمر کتنے ہزار سال ——؟ ہر سوچنے والے یوروپین انسان کی یہ سب عمریں ہیں، ہر ہندوستانی کی عمر کتنی ہے؟ غالباً لامحدود۔

پھر ہم اپنے نام رکھتے ہیں۔ ایڈورڈ، جیمز، چارلس، ٹامس، خاندانی نام بارلو۔ جو ہمیں ایک پرانے دھندلکے سے جا ملاتا ہے اور جس کی وجہ سے ہمیں مستقبل میں بھی اپنے پاؤں جمائے رہنے کی خوشگوار امید ہے۔

یہودیوں اور عربوں کا دستور ہے —— فلاں ابن فلاں۔ کیا خود پسندی ہے۔

سچے گیانی میں اتنی خودی بھی نہیں کہ وہ اپنا نام تک لکھے۔ کس اپنشد میں ہے؟

ڈیڈ بتاتے تھے کہ مونیر ولیمز نے کسی گاؤں کے برہمنوں سے دستخط کرنے کے لئے کہا، انھوں نے جواب میں صرف نمو بھگوتے اور اوم لکھ دیا ——

"صاحب پانی تیار ہے۔" عبدالغفور نے اطلاع دی اور غائب ہو گئے۔

چارلس سر جھکائے بیٹھا رہا۔

آخر میں سب مر جاتے ہیں۔

ڈیڈ کو ہندوستان کے متعلق انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے پہلے ایڈیشن جمع کرنے کا شوق تھا۔ ان الماریوں میں وہ ساری کتابیں موجود ہیں۔ گرینڈ ڈیڈا اور ڈیڈ کا کتب خانہ۔ ان کتابوں کے مصنف —— جان کمپنی کے افسر، انڈین سول سروس کے افسر، فوجی، مشنری، ماہرینِ تعلیم، پلانٹر، ان کے بھوت پھونس کی چھتوں والے بنگلوں میں اب بھی منڈلا رہے ہوں گے ——

یہ کتابیں —— زراعت اور جنگلات۔ آرکیالوجی، رسل و رسائل اور سول انجینئرنگ، تعلیم، ایتھنولوجی اور سوسیولوجی ("آسام کے ناگا قبائل از ایڈورڈ بارنو آئی۔ سی۔ ایس۔" چارلس نے فخر سے سوچا۔ نام مستقبل کے گرد آلود کونوں کھدروں میں بہرحال محفوظ رہے گا۔ کتاب کی جلد پر لکھا ہوا نام، اور قبر کا کتبہ۔ نام) قانون، ایڈمنسٹریشن، طب، فلسفہ، نیچرل ہسٹری، سفرنامے، جغرافیہ ——

کلکتے کا جیمز پرنسپ جس نے خروشتی میں یونانی نام دریافت کئے اور اشوک کے کتبوں کی عبارت پڑھی کننگھم۔ جان مارشل، جیمز فرگسن، ہیول، گرانٹ ڈف، کرنل ٹاڈ، ونسنٹ اسمتھ، مورلینڈ، جیمز مل، وارن ہیسٹنگز، ولیم جونز، گراہم بیلی، چارلس ایلیٹ، ولسن گریفتھ، جارج سیل —— آرٹ ہسٹری، لسانیات، مذاہب ——

اور وہ دلچسپ ناول جو اب مضحکہ خیز لگتے ہیں، اور جدید ہندوستانیوں کے ہاتھ میں پڑ جائیں تو وہ ان کو نذرِ آتش کر دیں —— جن کے ہندوستانی کردار "نیٹو اور نگر" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ ہنٹی (گڈ اولڈ، ہنٹی) میرین کرافرڈ، ماڈ ڈائیور، کرنل میڈوز ٹائیلر کے ناول —— "ایک ٹھگ کے اعترافات"۔ "سیتا"۔ "تارا"۔ "ٹیپو سلطان"۔ فلورا اینی اسٹیل۔ ایف۔ ڈبلیو بین —— ہر اسٹیشن کے کلب کی لائبریری میں یہ ناول موجود ہوتے تھے ——

اور بچوں کے لئے کتابیں جو ہم سب نے بچپن میں پڑھیں۔ "لیٹل آرتھر اور اس کا ہیرو"۔ "لیٹل آرتھر کی ہسٹری"۔ "لیٹل آرتھر ——"

غدر کے متعلق کتابوں کے انبار، اور پھر کپلنگ ——!

لاہور اور پشاور کی پراسرار گلیاں، چنڈو خانے، گنگا داس اور سدھو، اور ولی داد اور لالن طوائف۔

ہور کی لالٹن طوائف غالباً کپلنگ کا علامتی کردار تھی ـــــ مغرب کے لئے علامتی کردار ـــــ ایک خطرناک کشش، بے ایمان موت ـــــ ہندوستان۔ جو انگریز اس جادوگرنی کے ہلاکت خیز سحر کا شکار ہوا وہ بہت لد اپنا کردار کھو بیٹھا۔ پھیچر ہو گیا۔ اس لئے ہمیشہ الگ تھلگ رہو۔ اس تاریک اور بھیانک جنگل میں ایمپائر کے اسٹینڈرڈ کو قائم رکھو۔ (اسی وجہ سے گرینڈ ڈیڈ اور گرینڈما ڈیڈ اور مما اڑیسہ اور آسام کے ویران ڈاک بنگلوں میں شام کو باقاعدہ اس طرح کپڑے بدلتے تھے گویا لندن کے سوائے میں ڈنر کھانے جا رہے ہوں)

چارلس بارلو اٹھ کر دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ یہ ڈی۔ ایمز ہاؤس، اس کے ملازم، اس کا باغ، یہ سب چیزیں اسی مستحکم نظام اور روایات کا ایک جزو ہیں۔ یہ سحر انگیز اینگلو انڈین دنیا جو ۲۰۰ دو سو سال سے اس ملک میں باد ہے ـــــ اس کے جانے بوجھے کردار اور جزئیات۔ کلکتہ، شملہ، ہل اسٹیشن، مفصل، اضلاع، صوبے، ر صوبے کا سویلین خود کو اس صوبے سے مماثل کرتا تھا۔ پنجاب سویلین، سندھ سویلین، بنگال سویلین، سندھ لب، بنگال کلب۔

یہ مضبوط اور مستحکم اینگلو انڈین؎ معاشرہ۔ یہ کسی لفٹ ونگ ہندوستانی انٹلکچوئیل نے سچ کہا ہے کہ گریز ہندوستان کو کنٹری اسکوائر یا زمیندار کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہندوستانی صوبے گویا ان انگریز حاکموں کی اتی زمینداریاں تھیں جس میں ہم پلہ لوگ یا انسان دوسرے یورپین تھے۔ اہل برطانیہ ہندوستان میں ملازمت ہنے والے اپنے ہم وطنوں کو "انڈین" "انڈین سویلین" یا "انڈین باکس والا" یا "انڈین آفیسر" کہتے تھے ندوستانی محض "نیٹو" تھا۔ اور اس قابل نہ تھا کہ اس کا تذکرہ کسی مہذب سیاق و سباق میں کیا جائے ـــــ

"پنجاب کا اولڈ جارج کل مجھے جم خانہ میں ملا تھا ـــــ" بالکل جس طرح ڈیوک اپنی ریاستوں سے نل کئے جاتے ہیں اور جس طرح انگلستان کا کنٹری اسکوائر اپنی رعیت کا خیال رکھتا تھا۔ اسی شفقت اور ال سے ہم لوگ اپنی رعیت سے یہاں پیش آئے۔ زیادہ دلسوزی اور محبت سے، کیونکہ یہ رعایا بچوں کی طرح ق اور جانوروں کی طرح جنگلی تھی۔ نسلاً بعد نسلٍ ان سب سویلینز کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے ایک بڑی عظیم لاقی اور روحانی ذمہ داری ان کو سونپی ہے ـــــ برطانوی ہند کی حکومت! (غدر کے متعلق ہربرٹ ایڈورڈ

؎ انیسویں صدی میں ہندوستان میں رہنے والے یا یہاں ملازمتیں کرنے والے انگریزوں کو اینگلو انڈین جاتا تھا، مخلوط نسل والا طبقہ "ہاف کاسٹ" یا یوریشین کہلاتا تھا۔

نے کہا تھا کہ یہ خدا نے ہم کو اس غفلت کی سزا دی ہے کہ ہم نے عوام کو عیسائیت کے اصولوں سے آشنا نہیں کیا) اور خدا کی قسم ہم نے اس ذمّے داری کو بہت خوب نبھایا۔ ہم تاریخ سے شرمندہ نہیں ہیں۔

کوئنٹ انڈیا ——!

اسی اخلاقی برتری اور دیانت داری کے بل بوتے پر ہم مُٹھی بھر انگریز چالیس کروڑ ہندوستانیوں پر اطمینان سے حکومت کر رہے ہیں۔

گو کبھی کبھی ہماری ماؤں کو رات کے وقت ہمیں برآمدوں میں مچھر دانیوں کے اندر سلاتے ہوئے یک لخت یہ دہشت آدبوچتی تھی کہ اندھیرے میں سے نمودار ہو کر ڈوم ڈوم بجاتے نیٹو حملہ نہ کر دیں ۵۷ء کی طرح۔ یہ واقعہ ہے کہ غدر کی یاد ہمیں ہمیشہ HAUNT کرتی رہی ہے۔

اور گو یہ حقیقت تھی کہ اہل ہند برٹش راج کی برکتوں کے معترف تھے! اور ایک عام ہندوستانی عدالت میں ایک ہندوستانی جج کے فیصلے کے مقابلے میں انگریز جج کے فیصلے کو ترجیح دیتا تھا۔ مگر یہ بھی واقعہ تھا کہ غدر کے بعد ہنری لارنس نے کہا تھا کہ ہندوستانی اپنے دیوانے بادشاہوں کے زیر حکومت خوش تھے، اصول پرست کمشنروں کے زیر نگیں خوش نہیں۔

کوئنٹ انڈیا ——

یقیناً ہم نے بھی غلطیاں کی ہیں، شاید امپیریلزم بذاتِ خود سب سے بڑا جرم ہے، مگر ہماری جیسی بابرکت امپیریلزم —؟ فرانس، ہالینڈ اور بلجیم کی کولونیوں کی کیا ناگفتہ بہ حالت ہے، ناقابل یقین۔

بہرحال "الف جیم" والا زمانہ تو مدتیں ہوئیں، پچھلی جنگ عظیم سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

غدر سے پہلے اضلاع میں سوشل زندگی کے مرکز یورپین چرچ اور اسمبلی رومز تھے، یوریشین طبقہ اپنی اچھوت حیثیت پہچانتا تھا اور الگ رہتا تھا۔ پھر یہ اسمبلی رومز "کلب" میں تبدیل ہوئے۔ ڈانس، بلیرڈ، شوقیہ ڈرامے، گرینڈ ڈیڈ کا ہندوستان، ڈاک گاڑیاں، کتے گاڑیاں، بگھیاں، پالکیاں، (پالکی بردار PALANQUIN BEARER بیرہ بن گیا) کلکتہ کا ایڈن گارڈن جہاں شام کو بینڈ بجتا تھا۔ پارسیوں کی دوکانیں۔

اسٹیشن کے چند افسر ایک دوسرے سے ہی ملتے رہتے۔ میمیں دن بھر ایک دوسرے کو چٹھیں بھیجا کرتیں۔ بیڈمنٹن، ٹینس، پولو۔ شکار۔ انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان اتنا دلچسپ ہو چکا تھا کہ ہوم سے اکثر لوگ چھٹیاں گزارنے یہاں آتے، گو ہندوستان سے ان کی مراد یہاں کی برطانوی سوسائٹی تھی۔

جاڑوں میں گرینڈ ڈیڈ دورے پر جاتے۔ جب گرینڈ ڈیڈ اور دوسرے صوبوں میں ان کے ساتھی افسر ے پر نکلتے تو عہدِ رفتہ کے مغل صوبے داروں کے لاؤ لشکر کا گمان ہو سکتا تھا۔ (یہ واقعہ ہے کہ ہم نے ں سے حکومت چھین کر تزک و احتشام میں ان کی نقل کرنے کی پوری کوشش کی۔ وائسرائے کی شان و شوکت !) بنگال میں کشتیوں اور اسٹیمروں پر اور دوسرے صوبوں میں بیل گاڑیوں اور اونٹوں پر لد کر سارا ساز و سامان میں ساتھ جاتا۔ بھاری فرنیچر، تصویریں، چاندی کے ظروف، ہر چیز۔ تاکہ سلطنت کے نمائندے کا دبدبہ عب جنگل اور دیہات میں بھی قائم رہے۔ لشکر میں کتے، گائیں، بکریاں، مرغیاں، سواری کے گھوڑے بھ شامل نہ ہوتا۔ بڑے صاحب کے خیمے قالین تصویروں اور گلدانوں سے سجائے جاتے۔ خورد و نوش کی بار ٹین کے ڈبوں میں بمبئی کے آرمی اینڈ نیوی اسٹورز سے آتیں۔ کچھ فاصلے پر نیٹو افسروں کے خیمے لگتے اور والے آکر وہاں اپنا بازار لگاتے۔

سال نو پر ڈپٹی کمشنر کا دربار لگتا۔ دربار میں زمیندار نذریں پیش کرتے، جن کو صاحب ہاتھ لگا کر واپس ا۔ بڑے صاحب کے دربار میں کرسی ملنا نیٹو جنٹلمین کے لئے بیحد عزت کی بات تھی۔

کلکتے اور شملے میں قیصر کی جرمن ایمپائر کے سفیر رہتے۔ جرمنی اور برطانیہ کی تجارتی جنگ شروع ہو چکی جرمن مصنوعات کی ہندوستانی بازاروں میں ریل پیل تھی لیکن نوآبادیوں سے فائدہ اٹھانے کی اس ریس یک ۱۹۱۴ء کی جنگ کی صورت میں رونما ہونے میں ابھی بہت عرصہ باقی تھا۔

نیٹو سوسائٹی سے علیحدگی کی ایک فصیل اینگلو انڈیا نے اپنے گرد کھڑی کر رکھی تھی، مگر خود اس فصیل کے طانیہ جیسی شدید کلاس سسٹم نہیں تھی۔ انڈیا ایک آؤٹ پوسٹ تھا اور یہاں سب کو ایک دوسرے تھ مرنا جینا تھا۔ زندگی زیادہ بے تکلف تھی۔ برطانیہ اپنے بہترین نوجوان یہاں حکومت کرنے کے لئے ۔ مگر وہاں کے بدترین نمونوں کو یہاں قسمت آزمانے کے لئے بھیج دیا جاتا۔ عموماً اونچے خاندانوں کے یہ لڑکے، زیادہ ایڈونچرس ہوتے۔ ملک میں امن و امان، ترقی و خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ اور ایک عام ہندو "ملکہ ٹوریہ" کو دیوی ماتا سمجھنے لگا تھا۔ (مرنے سے پہلے وکٹوریہ نے لارڈ کرزن سے کہا تھا:۔

(BE KIND TO MY POOR INDIA

اس ملک کی قدیم روایت تھی کہ بادشاہ پرجا کو درشن دیتا تھا۔ اور پرجا اس سے فریادی ہوتی تھی۔ جہ سے اکثر ہندوستانی امرا اپنا سارا اثاثہ فروخت کر کے، صعوبتیں اٹھا کر، اپنے مقدموں کی اپیل کے

لئے لندن جاتے تاکہ ملکہ سے خود فریادی ہوں۔ زیادہ تر نامراد لوٹتے یا غریب الوطنی کے عالم میں مرجاتے۔ ہ کے حکم کی اطاعت اور صاحبان آقتدار کا خوف اس ملک کے عوام کی سرشت میں داخل ہے۔ لہٰذا کیا تعجب ہے کہ اہل ہند ہماری اطاعت گزار رعایا بن گئے اور ملکہ کو اپنی ماں سمجھنے لگے۔

غدر کے بعد انڈین سول سروس قائم ہوئی اور "کمپٹیشن والا" اینگلو انڈین منظر پر نمودار ہوا۔ مغر خود پسند، ہیلی بری کے بجائے اوکس برج کا تعلیم یافتہ، جو "باکس والا" یعنی اپنے ہم قوم تاجر کو بھی ذرا حقیر سمجھتا تھا۔ یہ نیا سویلین خالص امپریلیسٹ تھا۔ غدر سے پہلے کی زیادہ روادار برطانوی روایات اور ہندوستا کی اس دلکش نیٹو تہذیب سے بالکل ناواقف جو غدر کے بعد ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ ڈیڈ یہ نئے سویلین تھے اور ہندوستان کی برطانوی سوسائٹی کی نئی اور شدید کٹر کاسٹ سسٹم کے ایک فرد۔ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے نمائندے اور دنیا کی ارفع ترین ملازمت کے رکن، مغرور، خردماغ، لیکن جو حقیر لکڑ ماروں کی جانیں بچانے کے لئے اطمینان سے لقمۂ اجل بن گئے۔ انسانی فطرت کے۔ برطانوی کردار کے یہ تضاد ——

چارلس بارلو دریچے سے ہٹ آیا۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔

شملہ برطانوی دیوتاؤں کا مسکن تھا۔ اضلاع کے کلکٹر اور کمشنر عموماً اپنے اپنے صوبوں کے پہاڑوں پر جاتے تھے، دارجلنگ میں ہماری دلفریب کوٹھی، پہاڑ ہمیں اپنے وطن کے مناظر اپنے وطن کی خوشگوار سرز کی یاد دلاتے تھے۔ ہمارے حسین [illegible] اسٹیشن، ہمارا پیارا ہندوستان۔

یہ واقعہ ہے کہ ہم سب، ہماری ساری قوم اس ملک کے سحر سے نہیں بچ سکی۔ اس کی گرمی، غلاظت اور کمینگی کے باوجود۔

ہماری یہ مخصوص دنیا۔ وطن واپس جاکر بھی جس کی یاد ہمیں ستاتی رہتی ہے۔ یہ مخصوص زبان، جو ہم نیٹوز کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، بندوبست، شاباش، سب برابر، کڈب مالوم ہائے۔ کپتر داریو سور۔ شاندا بوٹ اچھا۔ بڑا کھانا۔ بڑا تماشا۔ ایڈورڈ لیر کی نظمیں ——

بیک وقت نفرت و محبت کا یہ عجیب و غریب رشتہ۔ لارڈ مورلے نے صحیح کہا تھا۔ میں مغربی ہوں مشرقی نہیں۔ میں بہت زیادہ مشرقیت کبھی اختیار نہیں کر سکتا۔

یہ بھی واقعہ تھا کہ عموماً انگریز میل جول میں مسلمانوں کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ مہذب تھا۔ ہندوؤں کو ہمارا یہ ترجیحی سلوک قدرتی بات ہے کہ بہت برا معلوم ہوا۔

اوکسفرڈ میں مسعود علی اور راما ناتھن سے ہندو مسلم سوال پر کتنی لمبی لمبی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔

صبح سے تازہ اخبار آئے رکھے ہیں۔ میں نے ابھی تک کچھ نہیں پڑھا۔ سرخیاں دیکھتے ہوئے آج ڈر ک رہا ہے۔ برطانوی ہمت اور بہادری۔

وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ پائپ جلایا، اب غسل کے لئے جانا چاہیے۔

مسعود آج کل پنجاب میں کلکٹر ہے راما ناتھن مراٹھا کنٹری میں کہیں تعینات ہے۔ دونوں اپنی ں میں ظاہر کرتے تھے کہ برطانوی حکومت سے متنفر ہیں۔ اور دونوں کی شدید تمنا تھی کہ آئی سی ایس لے لئے جائیں۔ دونوں اس وقت اس برطانوی حکومت کے ارفع ترین ملازمت کے اراکین ہیں۔ اپنے وطنوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور زمین پر قدم نہیں دھرتے۔

آہ —— ہندوستانی کردار ——! ہندوستانی کردار!

مگر وہ انقلابی جو اس حکومت کی بیخ کنی کے درپے رہے ہیں، مجھے وہ بھی مضحکہ خیز لگتے ہیں۔

اصلیت غالباً یہ ہے کہ مجھے صرف اپنے نوکر، بھشتی اور خدمت گار، رینگتے سلام کرتے، "مائی ، غریب پرور" کہتے۔ کسان اور جاہل اور قابل رحم ہندوستانی اچھے لگتے ہیں۔ پچھلے دو تین سو سال میں ل سے چین تک اہل مشرق کی پسماندگی اور جہالت کا بھرپور تجربہ کر چکنے کے بعد ہم انھیں اپنے جیسا ن سمجھنے کے لئے غالباً ابھی تیار نہیں۔

جب چارلس بارلو سول سروس میں شامل ہوا اس وقت دہشت پسند تحریک ایک بار پھر پڑ چکی تھی۔ پچھلی صدی کے لبرل مصلحین کے مقابلے میں سامنے آنے والے جوشیلے قوم پرستوں کی "عوامی جہد" کی اپیل نچلے متوسط طبقے، اور بیکار نوجوانوں میں پہنچ چکی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ہم نے یہ یونیورسٹیاں قائم کیں؟ چارلس نے پائپ سلگایا اور پھر دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ دہشت پسند قوم پرست اور ان ر قوم پرست اور یہ اور وہ ـ اس جوالا مکھی پر قابو پا کر اسی سکون کے ساتھ اس برصغیر کا ایڈمنسٹریشن تے جانا سول سروس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

اوکسفرڈ سے تازہ تازہ آیا ہوا نوجوان چارلس بارلو انقلابیوں کے پرانے گڑھ باریسال میں جوائنٹ ٹ تھا۔ یہ ان لوگوں کا بنگال ہے۔ یہ میرا بنگال بھی تو ہے۔ گرینڈ ڈیڈا اور گرینڈ ما، ڈیڈا اور مما، بیل اور آنٹ ماڈ کا بنگال، مجھے اس سے کتنی محبت ہے، میں اسے تباہ ہونے دوں گا؟ وہ باریسال

کلب کے برآمدے میں وہسکی پیتے ہوئے BROOD کرتا۔ اس نے دہشت پسند تحریک کا مطالعہ کی
انقلابیوں کے حالات سے تفصیلی واقفیت حاصل کی۔ ان کی لکھی ہوئی ورناکیولر کتابوں کے ا
اقتباسات ترجمہ کروا کے پڑھے۔ (مثلاً بسمل شاہجہانپوری کی سوانح حیات جو انھوں نے پھانسی
سے تین روز قبل لکھ کر ختم کی تھی) اس نے دنیش چندر سرکار کی کتاب کا بغور مطالعہ کیا، کہ اوکسفرڈ میں
اقتصادیات ہی اس کا مضمون تھا۔ مگر اس قدر مفسدانہ، بالشویک خیالات ان انقلابیوں کے خصو
دنیش چندر سرکار کے تھے، اس نے ہندوستانی نفسیات پر عموماً اور بنگالی نفسیات پر خصوصیت کے سا
غور کیا کہ بنگالیوں کی شکتی پوجا کا ان کی تخریب پسندی سے کتنا گہرا نفسیاتی تعلق ہے۔ دراوڑو
منگولوں اور آریوں سے قبل کے قدیم ترین وحشی قبائل کا خون ان کی رگوں میں جوش مارتا ہے، تو کس آ
سے مار دھاڑ پر اتر آتے ہیں۔ آدی واسی قبائل کی دیوی ماں کا عقیدہ اب تک ان کے دلوں میں را
ہے۔ اسے ان کے بنکم بابو نے کس چالاکی سے "مدر انڈیا" سے مماثل کر دیا۔ بندے ماترم — ماما
ماتا خون کی قربانی چاہتی ہے۔ مسلمان کا خون، انگریز کا خون، ——— ارے ان چالاک بابو
کی سائیکولوجی سے تو ہم واقف ہیں۔ ان کے فلسفی اپنی "روحانیت" اور "اساطیری علامات"
متعلق ہمیں کیا سمجھائیں گے۔

مگر ہماری قوم میں بھی احمقوں کی کمی نہیں۔ وہ ایلس جیسی خبطی ایک مارگریٹ نوبل آئی
وہ کالی کی پرستار بن گئیں۔ ان کو سسٹر نودیتا بنا کر ان ہندوؤں نے جھنڈے پر چڑھا دیا۔
عورتوں کی دراصل صحیح عمر میں شادی ہو جانی چاہیے۔

دیویکا نند، سنا ہے بے حد وجیہہ تھا۔ سب یورپین اور امریکن عورتیں اس کی مقنا
آنکھوں پہ عاشق ہوتی تھیں۔

اہل ہند سسٹر نودیتا اور اینی بسنٹ کے کیا کیا گن نہیں گاتے۔ کہ دیکھو تمہارے جیسے سفی
فام بھی ہماری روحانی عظمت کے قائل ہو گئے ——— ہا ——— بیچاروں کا احساس کمتر
اس احساس کمتری میں ہم ہی نے انھیں مبتلا کیا۔ بڑھیا سے بڑھیا ہندوستانی انگریز سے دو
کر لینا فخر سمجھتا ہے۔ ہائے کس قدر قابلِ رحم قوم ہے۔ کس فخر سے کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ چھری
سے کھاتے ہیں۔ انگریزی بولتے ہیں۔ دنیا کا عظیم ترین، مثالی، کولونیل سماج!

اور پھر پچھلی صدی کے بے تکے مسخرے۔ ان کے ہارمونیم اور پیانو۔ ان کی خواتین کی گاؤن نما ساریاں۔
ں کے جوتے اور موزے۔ ان کے انگلستان کے سفر، ان عورتوں نے پردہ ترک کر کے زنانہ اور
یم کے رومان کا بھی خاتمہ کر دیا۔

بے چارہ الف جیم۔

ٹیگور بھی ہماری نقال تہذیب کی پیداوار ہے۔ ہم نہ آئے ہوتے تو نہ رام موہن پیدا ہوتے نہ
، اسی طرح آپس کے کشت و خون میں اور کئی صدیاں نکل جاتیں۔ آخر دیکھو افغانستان وغیرہ
ت ہے۔ ٹیگور نے شیلی اور کیٹس نہ پڑھا ہوتا تو ایسی شاعری نہ کرتا

ے چارہ اوپری طبقہ کا ہندو۔ پہلے مسلمان حکمرانوں کی نقالی میں لگا رہا۔ اب ہماری تقلید
تے۔

ر دوسری بات یہ ہے کہ سارے ہندوستانی ریاکار ہیں۔ شانتی شانتی رٹتے ہیں مگر تشدد
ی گھٹی میں پڑی ہے۔ مذہبی جنون اور ملکی سیاست کا اس ملک میں ہمیشہ سے گہرا تعلق ہے
سے پہلے شیووں، شاکتوں، برہمنوں، بودھوں، جینیوں میں جنگیں ہوا کیں، جس عہد کا جو
ہوا اس کے حکمرانوں نے دوسرے فرقوں پر ظلم توڑے۔ اب مسلم پیریڈ پر آئیے۔

"عبدالغفور —————"

یک منٹ میں عبدالغفور دروازے پر نمودار ہوئے۔

صاحب؟"

کچھ نہیں جاؤ۔"

عبدالغفور واپس چلے گئے۔

مسلم دور ——— ساری مسلم پیریڈ کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ سارے مسلمان
فخریہ غازی کہتے تھے اور بت شکن، کافروں کو مارو۔ مندر گرا کر مسجدیں بنا دیں۔

ٹانوی دور کو لیجیے ——— سنیاسیوں اور مولویوں کی بغاوتیں، جہاد کے فتوے۔ اور حال میں
ھ کے سوامی وویکانند کے ساتھی اور چیلے چانٹے جو بنگال کے اولین دہشت پسندوں میں
انقلابیوں کو اپنے مٹھوں میں پناہ دیتے، خود انڈر گراؤنڈ میں کام کرتے۔ اٹھارویں صدی کے

سنیاسیوں کی معنوی اولاد ——— تاریخ کس طرح اس ہلاکت خیز ملک میں متواتر اپنے آپ کو دہراتی ر
اور جو ہندوستانی بم نہیں پھینکتے انہیں تقریریں کرنے کا مرض ہے۔ ساری قوم اس عا
میں مبتلا ہے کپلنگ کو ۱۸۸۸ء میں پائنیر نے الہ آباد سے غلاظت اور تعفن اور بھیانک را تو
شہر کلکتے بھیجا۔ وہاں بابو لوگ جنھیں ہم نے لوکل سیلف گورنمنٹ سونپ دی تھی۔ اپنے شہ
صفائی کے بجائے تقریریں کر رہے تھے۔ میونسپل بورڈ اور بنگال لیجسلیٹو کونسل کے نیٹو ممبر دھو
دھار تقریریں کر رہے تھے۔ نظریات کے بجائے ان حضرات کو کدال اور پھاوڑے سنبھالنے
کپلنگ نے انتہائی نفرت سے کہا تھا۔ یہ بات آج تک صحیح ہے۔

تقریریں کرتے ہیں اور بہت ذہین ہیں، اس لئے دماغ قانونی موشگافیوں میں بھی خوب چلا
کاکوری ڈکیتی۔ صرف دس نوجوانوں نے چلتی ٹرین روک کر سرکاری خزانہ لوٹ لیا۔ کمال ہے۔ اس
ملزمین کے دفاع میں موتی لال نہرو کی جرح میں نے خود سنی تھی۔ پٹنہ اور الہ آباد کے یہ سارے طر
قانون داں جو لندن سے قانون پڑھ کر آتے تھے اور آکسبرج کے تعلیم یافتہ لیڈروں کے مقد
رہے تھے۔ یہ ہماری بابرکت امپیریلزم کا نتیجہ ہوا۔

انقلابیوں کے گیت ——— "بسے گا ہند پیچھے کو بسے گا انڈمان آگے۔" نا
کے طوفانی گانے۔ ڈرامے، عوامی ناٹک، گرینڈ ڈیڈا اور رائیڈورڈ بارلو کا بنگال ان آتشیں او
سے گونج رہا ہے۔

یہ انقلابی واقعی بڑے جری لوگ تھے۔ اپنی تحریک کے قانون کے مطابق صرف
چھٹانک چاول اور ڈو چھٹانک چنا اُن کو روزانہ پیٹ بھرنے کے لئے ملتا تھا۔ اور حیرت انگی
اٹھا کر یہ ہم سے لڑ رہے تھے۔

اشلوک رٹتے اور نمازیں پڑھتے ہوئے دار پر چڑھتے تھے

سوال یہ ہے۔ چارلس بارلو نے پائپ کا گہرا کش لگا کر سر پیچھے ٹکایا کہ آئرش با
بھی تو ہمارا ناک میں دم کر دیا تھا۔ ان کو ہم اتنا مجرم نہیں سمجھتے، محض اس لئے کہ وہ گور
ستمبر ۱۹۳۹ء میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ نافذ کیا گیا کہ یورپ میں ہم ہٹلر کے مقا
بالکل تنہا تھے اور ہندوستان میں ہمیں باغیوں اور مفسدوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ گرینڈ ڈ

ذرخش ہوں گر کہ میں نے اپنی بساط بھر اس قومی کرائسس کے موقع پر اپنے فرائض ادا کیے۔

میں نے اپنے اضلاع میں کمیونسٹوں کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی۔ بے چارہ پل کینٹ ویل ایک لیڈر ریحان احمد کو نہ پکڑ سکا اور اس کی سزا میں اسے دور دراز رنگا ماٹی تبدیل کر دیا گیا۔ کامریڈ ریحان کو میں بھی کبھی نہ پکڑ سکا۔ میں خوش ہوں کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ یہ واقعہ بھے ان لوگوں کو مجرموں کی طرح پکڑنا اچھا نہیں لگتا۔ مگر فرض فرض ہے۔

خدا کرے ایلس خیریت سے ہو۔ گارو ہلز میں ہمیشہ سے مشنریوں کا اثر رہا ہے۔ مگر کمیونسٹ وہاں ر پکڑ چکے ہیں۔ اور وہاں کے جنگلی کمیونسٹ اور سوشلسٹ کے باریک فرق کو نہ سمجھ ں گے۔

بلیا میں باغیوں نے آزاد سرکار قائم کر لی۔ یو۔ پی کی سڑکوں پر لڑکے "ہمارا بادشاہ کون — ؟ م آزاد !" کے نعرے لگاتے پھر رہے ہیں۔ آسام میں گولیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ سبھاش چندر نے رنگون میں بہادر شاہ ظفر کے مزار پر جا کر قسم کھائی ہے کہ وہ ہندوستان کو آزاد کرا کر دم ے۔

جیزس کرائسٹ !

چارلس بارلو نے زور سے انگڑائی لی۔ بہت جلد کیا میں بھی کرنل بلمپ کی طرح ایک کردار، ب میں تبدیل ہو جاؤں گا ؟

اوکسفرڈ میں ایسے ہی ایک اتوار کی خاموش صبح دریا کے کنارے ٹہلتے ہوئے حسب معمول انڈر ن بحث ہو رہی ہے۔ میں ٹوری نوجوان ہوں، فریڈ کارٹر بالشویک ہے۔ مسعود علی اور ن ہندوستانی قوم پرست۔

"ہماری قدیم تہذیب۔" راما ناتھن گرج رہا ہے۔

" سر — ؟ آپ کی قدیم تہذیب ؟ وہ بھی حکمراں طبقے اور پروہتوں تک محدود تھی۔ اور اشوک کلچر یا شاہجہاں کے عہد کی کلچر کی طرح آج کی برٹش یا مغربی کلچر بھی آپ کے مٹھی بھر طبقے تک ہی ے" میں جواب دیتا ہوں۔

"یورپ میں تعلیم عام ہوئی۔ کیونکہ وہ آزاد تھا۔ ہم غلام تھے۔ اس لئے جاہل اور پسماندہ رہ گئے۔"

سعود علی کہتا ہے ۔

"خوب! آپ کا مغل دور تو آزادی کا دور تھا ۔ اس وقت اسکول اور یونیورسٹیاں تھیں
تھے کہ جب گرینڈ ڈیڈ اڑیسہ پہلی بار گئے! اس وقت وہاں ایک چھپی ہوئی کتاب موجود نہیں تھی ۔
سے سنو ۔ سارے صوبے میں ایک چھپی ہوئی کاغذ کی کتاب موجود نہ تھی ۔ پر بہت لوگ تاڑ کے پتّو
لکھ وکھ لیا کرتے تھے ۔"

"یہ جہالت فیوڈلزم کی کارستانی تھی ۔" بالشویک فریڈ جواب دیتا ہے ۔

"بکواس ۔" میں بات جاری رکھتا ہوں ۔ "اور سنو ۔ جب کلکتے میں ہم نے کتابیں چھاپ
کیں تو اسٹیمروں پر لدے ہوئے ہندو طلبہ چلاّ چلاّ کر ان کتابوں کا مطالبہ کرتے تھے ۔ مکالے نے کہا
یورپ کی کسی لائبریری کا ایک شیلف ہند اور عربستان کے سارے نیٹو لٹریچر پر حاوی ہے ۔"

میری سنی ان سنی کر کے راما ناتھن اپنا وظیفہ شروع کر دیتا ہے ۔ "انیسویں صدی کے پہلے
ین سات قحط پڑے جس میں پندرہ لاکھ لوگ مرے ۔ دوسرے نصف میں چوبیس ، قحط پڑے ، جن م
کروڑ انسان مرے ۔" پھر سیاہ فام راما ناتھن بڑی شیرینی سے مسکرا کر مجھ سے پوچھتا ہے ۔ "ہا
ہندوستان کی یونیورسٹیوں کا کیا ذکر تھا ۔ ؟

"کبھی نالندہ اور ٹیکسلا کا نام سنا ہے ؟" اور اس کے سفید دانت جھلملاتے ہیں ۔

جیت لی ۔

ہم تینوں ناؤ میں جا بیٹھتے ہیں ۔ مسعود علی پتوار سنبھالتا ہے ۔

اب راما ناتھن کہہ رہا ہے ۔ "اگر تم لوگ نہ آئے ہوتے تب بھی ہندوستان مغربی علوم
زر ہو جاتا ۔ ٹیپو سلطان شہید اور راجہ رام موہن رائے دونوں فرانس کے مدّاح تھے ۔"

"گاڈ آل مائٹی ۔ ٹیپو صاحب تو سخت اینٹی ہندو تھا ۔ اب ہمارے مقابلے پر ایک ہیرو
نسوس ہوئی ، تم چالاک لوگوں نے اسے اور سراج الدولہ کو ہیرو بنا لیا ۔ دونوں اینٹی ہندو
عاف کرنا مسعود ۔ اولڈ چیپ ۔"

"ہماری تاریخ تم لوگوں نے مسخ کی ہے ۔" راما ناتھن غرّاتا ہے ۔ "ہم نے تمہیں انگریز
کے ذریعے متحد کیا ۔" میں جواب دیتا ہوں ۔ "تم اور مسعود ایک دوسرے سے انگریزی میں بات

ــ؟ ··کنارے پر کھڑی ایک حسین لڑکی ہاتھ ہلاتی ہے۔ وائلٹ! ہم کشتی کھیتے ہنستے بولتے کشتی خ اس کی طرف موڑ لیتے ہیں ــ وائلٹ جو میری بیوی ہے

خدا کرے وائلٹ خیریت سے ہو۔

وہ اب آہستہ سے اٹھ کر میز تک گیا اور تصویر دیکھنے لگا۔ ڈارلنگ۔ تم اس وقت ناریک لندن کے کس پب میں کس فوجی کے ساتھ بیٹھی ہوگی۔ بیر کا مگ تمہارے ہاتھ میں بھی ںگا۔ مگر کس کی معیت میں؟

یہ حسین عورت مجھ سے تین بار بے وفائی کر چکی ہے۔ آوٹی میں، فلورنس میں، ہیمٹ ڈمیں۔ وائلیٹ مائی لو۔ تم یہ بھی جانتی ہو میں نے تم سے کتنی بار بیوفائی کی۔

ماڈرن میرج۔

اور یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ اور جنگ میں سب کچھ روا ہے۔ اس محفوظ و مامون ہماری رگی میں اچانک کیسا زلزلہ آگیا۔ جنگ، بغاوت، تباہی۔

ٹام۔ ٹام نو سال کا ہو گیا۔ میرا پیارا بیٹا۔ کیا میں تم سب کو زندہ دیکھ سکوں گا؟

امریکن بہت دلکش ہوتے ہیں۔ برطانوی عورتوں کے لئے۔ وائلٹ تم ہمیشہ سے فلرٹ رہی ہو س یورلسٹل ہارٹ، WAC کے یونیفارم میں کتنی بھلی معلوم ہو رہی ہے میری بیوی۔ این یرمڈن کی طرح دلفریب۔

اس وقت کیا کر رہی ہو، ڈارلنگ؟ سینٹ جانز ووڈ کا کوئی میوز؟ کوئی کنٹری اِن ــ ہمارے اپنے گھر کا ــ ۱۴ اینڈریوز کریسنٹ کا بیڈ روم ــ؟

یہ سب جانتے ہوئے بھی تم پر عاشق ہوں، جانِ من۔ اور تم بھی میری اس کمزوری سے واقف ہو۔

اس نے بیر کا مگ زور سے میز پر پٹخ دیا۔ باہر بارش کا زور بڑھ چکا تھا۔

بنگال کی برسات، ملیریا، مچھر، کیچڑ، تعفن، طوفان، سانپ، مینڈک۔ اس برسات کے ٹیگور اور سارے بنگالی شاعری کرتے کرتے مرے جاتے ہیں۔

اس وقت میں بیحد اینٹی انڈین ہو رہا ہوں۔

وائلیٹ۔

لاچار غصّے سے پھر میرا خون کھول رہا ہے۔ مجھے اس سے اتنی نفرت ہے۔ اتنا عشق ہے۔ یہ آ تک معلوم نہ تھا۔

کمبخت خط بھی نہیں لکھتی۔ شاید میں اس کے لئے مر چکا ہوں۔ شاید وہ یہ سمجھتی ہے کہ باغیو نے مجھے بھی قتل کر دیا ہوگا۔

مما۔ آنٹ میٹی

اُس نے آنٹ میٹلڈا کی تصویر پھر اپنے سامنے رکھی اور سر ہلانے لگا۔

آنٹ میٹی تم نے بھی اتنے دنوں سے خط نہیں لکھا۔ مگر اُن کے ہاتھ میں رعشہ ہے۔ ٹھیک سے قلم نہیں پکڑ سکتیں۔ آنٹ میٹی تم ایک زمانے میں کتنی خوب صورت تھیں۔ اپنی یہ پرانی تصویر دیکھو۔

وائلیٹ۔ ایک دن تم بھی بوڑھی ہو جاؤ گی۔ یہ نہ بھولو۔ تم نے آنٹ میٹی کو کسی ہوم میں ڈال د تاکہ آزادی سے عیش کرو۔ میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گا۔ میں ہندوستانی ہوں۔ میں سخت دل انگریزو کی طرح کبھی بوڑھے ماں باپ اور رشتے داروں کو گھر سے نکال کر کسی ہوم میں پھینکنا برداشت نہیں کر سکتا۔

اب اس کے آنسو بہنے شروع ہوئے۔ اب تک وہ کتنی شراب چڑھا چکا تھا۔

خداوندا۔ اگر تو واقعی کہیں موجود ہے، وائلیٹ کو، ٹام اور کیرل کو، آنٹ میٹی کو، ایلس کو، ان سب کو اپنی حفاظت میں رکھ۔

اولڈ پیپلز ہوم۔

کسی دن شاید میں بھی، مجھے بھی ٹام اور اس کی بیوی گھر سے نکال کر اولڈ پیپلز ہوم میں ڈال دیں گے۔ بیچارہ بڈھا جو ہر وقت ہندوستان کے متعلق بڑبڑاتا اور آہیں بھرتا ہے۔ (نرسیں آپس میں کہیں گی)

تم آنٹ میٹی کی طرح مفلوج اور بوڑھی ہو جاؤ گی۔ اور تمہاری بہو تمہیں ہوم میں پھینک دے گی۔

اسی برسات میں، میں نے وائلیٹ کے ساتھ اپنی لانچ پر پدما کے کیسے رومانی سفر کئے ہیں۔ اسٹیمر
ہم ہنی مون کے لئے سندر بن گئے تھے۔ اسٹیمر کا کیا نام تھا —— ؟ کِنگ فشر۔

آج ہماری شادی کو پورے گیارہ سال ہو گئے۔ یارک شائر کی تازہ وارد لڑکی، شروع شروع میں
ں حیرت سے یہاں کی ہر چیز کو دیکھتی تھی۔

سنہ ۳۱ء ہماری شادی کا پہلا سال، باریسال میں، جہاں میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑوایا۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑوایا۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑوایا۔

میری سروس کا سب سے نمایاں کارنامہ۔

سیاہ آنکھوں والا دلکش، میرا ہم عمر نوجوان، میرے سامنے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ ممکن تھا کہ
ء اوکسفرڈ میں میرا ہم جماعت ہوتا۔ کشتی کھیتے ہوئے مجھ سے بحثیں کرتا۔ مگر وہ کال کوٹھری میں جانے سے
بل میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ بڑا جید انٹلکچول ہے۔ میں اس سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔

جس روز اس کی اپیل ہائی کورٹ سے مسترد ہوئی مجھے بے حد۔ کتنا — بیحد دکھ ہوا تھا۔
ہوں؟ وہ بالآخر میری قوم کا جانی دشمن تھا۔ اگر میں نے اسے نہ پکڑا ہوتا تو اس نے مجھے ہلاک کر دیا ہوتا۔
—— مجھے اس کی اپیل مسترد ہونے کا بڑا رنج ہوا تھا۔

جس روز علی پور جیل میں اُسے پھانسی ہوئی، اسی روز ہمارے یہاں ٹام پیدا ہوا تھا۔
منجو آیا، وائلیٹ کی منہ چڑھی اس سے کہنے لگی۔ میم صاحب۔ ہم ہندو لوگ آواگون میں
لیو کرتا ہے۔ شکر ہے کہ دنیش بابو کی پھانسی کے دو گھنٹے پہلے ٹام بابا پیدا ہوا۔ اگر تھوڑا منٹ بعد
یدا ہوتا تو بہت سا ہندو لوگ بولتا کہ دنیش بابو نے بدلہ لینے کے لئے آپ کے گھر میں جنم لیا ہے۔

واٹ اے ہوربل تھوٹ —— بے چاری وائلیٹ نے ذرا سا کانپ کر کہا تھا۔

اور یہ واقعہ ہے کہ آیا کی اس عجیب و غریب بات کے بعد لاشعوری طور پر میں نے اطمینان کا
انس لیا تھا کہ ٹام دنیش سرکار کی پھانسی سے دو گھنٹے قبل پیدا ہوا —— کرائسٹ اس دیوانے،
ہی ملک میں رہ کر انسان خود دیوانہ ہو جاتا ہے۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو ——

اور ایک اور بھیانک خیال:۔

جفٹ کک کی بتائی ہوئی خبر تازہ ترین خبر ہے وہ تو کل ہی لندن سے یہاں پہنچا ہے۔ اکنے
ریکن افسر سے ملاقات بھی کی ہے۔

نمبر ۱۴۔ اینڈریوز کریسنٹ میں ایک امریکن کرنل BILLET کر دیا گیا ہے۔ اس میں وائلیہ
اکیا قصور ؟

اس امریکن کا نام کرنل ڈونلڈ جے ٹیل ہے۔ بہت خوب صورت طرحدار جوان ہے۔ میں طرحدار کہ
ہوں۔ موٹا بھدا، اتنی موٹی ناک، وائلیٹ میری جان، میں ہرگز تمہارا مستحق نہیں تھا۔ مگر تم نے بھی تو مر
عہدے سے شادی کی تھی۔

مارچ سنہ ۳۹ء اس پرامن دنیا میں ہم آخر بار برطانیہ گئے تھے۔ کاش وہ بچوں کا داخلہ کرانے
کے بعد میرے ساتھ ہی واپس آگئی ہوتی۔

اب میں پھر الف جیم کی تلاوت کرتا ہوں۔

وہ آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ صدمے، رنج، پچھتاوے، بہت کم ایسا ہوتا ہے جب انسان
کو اتنی مہلت ملے کہ وہ یک سوئی سے اپنی ساری زندگی کا جائزہ لے۔ اپنے اندر جھانکے۔

اب اُسے نیند سی آرہی تھی۔ ماضی محفوظ ہے۔ یادوں کا قبرستان محفوظ ہے۔ اس نے کاؤ
نے نغماتِ ہند اٹھائی اور اس کے صفحے پلٹتا رہا۔ نیم وا آنکھیں، ذرا سی کھول کر اونگھتے اونگھتے کتاب کے
آخر میں دوسری کتب کے اشتہاروں پر نظر ڈالی۔ ایک شفیق تبسم اس کے ہونٹوں پر بکھرنے لگا۔

"نیل کی کاشت ـــــ ایک پلانٹر کی زندگی کا دلچسپ مرقع"

"پرانے کلکتے کی آوازِ بازگشت" از ڈاکٹر بسٹیڈ۔ سرورق پر بلیک ہول کی تصویر۔

فہرست مضامین:۔ فلپ فرانسس کا دور، نن کمار، فرانسس اور ہیسٹنگز کا ڈوئیل،
وغیرہ وغیرہ۔

"انگلش ایٹی کیٹ فار انڈین جنٹلمین۔ سوشل اینڈ آفیشل" از:۔ ڈبلو ٹریگو ویب۔
بنگال ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ۔

"بہار کی پرانی یادیں" ایک پرانے پلانٹر کے قلم سے۔

"جسٹس اونوکول چندر مکرجی آنجہانی۔" از ا۔ ایم مکرجی۔ انڈین انگلش یا بابو انگلش کا بڑا مزیدار نمونہ ـــ قارئین سے درخواست ہے کہ اس جنٹلمین کی سوانح حیات جو اُن کے بھتیجے نے لکھی ہے، ضرور پڑھ کر تفریح حاصل کریں۔

"آسام میں ایک ٹی پلانٹر کی زندگی" از جارج بارکر۔

"انڈین ریسنگ کی چند یادیں۔"

"گھوڑے، آدمی اور اسپورٹس"

"سیونی" ست پُڑہ پہاڑیوں میں کیمپ لائف۔

"بنگلے کے پیچھے" از "ایہا" مزاحیہ کتاب۔

ابواب:۔ بوائے کو ملازم رکھنا، ڈوگ بوائز، مشعلچی، حمال، ہری درزی، بٹلر۔"

عبدالغفور ـــــ ابھی بنگلے کے پیچھے میرا بٹلر عبدل زندہ ہے۔ میں محفوظ ہوں، بیچارہ کیا بادلو نے اونگھنا شروع کر دیا اور پھر کرسی کے ہتھے پر سر رکھ کر سو گیا۔

خاصی بوسیدہ چھتری لگائے، بارش میں بھیگتے حواس باختہ ریورنڈ بنرجی دُور پھاٹک میں داخل ہو رہے تھے، اس وقت دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔ اور ڈی ایمز ہاؤس کے برآمدے کے ایک در میں کھڑے عبدالغفور ہیڈ چپراسی سے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

"صاحب چھوٹا حاضری کے بعد سے دروازے بند کئے اسٹڈی میں بیٹھا ہے۔ بیر پہ بیر پیئے چلا جا رہا ہے۔ اللہ جانے کیا معاملہ ہے۔ شاید ولایت سے میم صاحب کی کوئی خیر خبر نہیں آئی۔"

چپراسی نے متانت سے سر ہلایا، اتنے میں اس کی نظر پادری صاحب پر پڑی جو برساتی میں پہنچ چکے تھے۔

پادری بنرجی نے سیڑھیاں چڑھ کر جلدی جلدی پائیدان پر جوتے رگڑے، اور برآمدے

میں آئے، چھتری بند کی تو اس میں سے پانی کی بوندیں فرش پر گریں۔ شفاف فرش خراب ہو گیا۔ اور وہ اور زیادہ گھبرائے۔ اور دہشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ عبدالغفور نے لپک کر چھتری ان کے ہاتھ سے لی، ہیٹ ریک کے کونے میں لٹکا دی اور سلام کیا۔

”صاحب کہاں ہے؟“ پادری بنرجی نے ہیبت زدہ آواز میں دریافت کیا۔ عبدالغفور ان کی اس حالت پر متعجب ہوئے۔

”صاحب کتاب والے کمرے میں ہے پادری صاحب۔“

”صاحب کو بولو، مہربانی ہوگی، ایک دم ضروری بات کرنا ہے۔ مہربانی ہوگی۔“

عبدالغفور نے سر ہلایا اور اندر گئے۔ لائبریری کا دروازہ دھیرے سے کھٹ کھٹایا اور کواڑ آہستہ سے کھول کر کمرے میں داخل ہوئے۔ آرام کرسی کے پاس جا کر ذرا سا کھنکارے۔

چارلس بارلو نے آنکھیں کھولیں۔

”صاحب۔ کالا پادری آیا ہے۔“

”کون؟“ چارلس نے ذرا چونک کر آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

”کالا پادری۔ بنرجی بابو۔“

”اوہ ــ کیا کام ہے؟“

”صاحب۔ وہ ایک دم ضروری بات کرنا مانگتا ہے۔ گول کمرے میں بٹھا دوں؟ بے چارہ بہت گھبرایا ہوا دکھتا ہے ــ“

چارلس نے سر اونچا کیا۔ ”ایں ــ؟ کیا ــ؟ نہیں، ادھر ہی بھیج دو۔“

”ادھر صاحب؟“ لائبریری صاحب کا بیحد ذاتی کمرہ تھا۔

”یس، یس، یو ایڈیٹ۔“ چارلس نے گرج کر کہا۔ عبدالغفور کان دبا کر غائب ہو گئے۔

چارلس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ سر میں درد، خیالات میں انتشار، دل میں دکھ، کیا کروں، اب اس کالے پادری کی فریادیں سنوں۔ میں کہ ہندوستانیوں کا مائی باپ ہوں، مائی باپ، غریب پرور۔

جب اس نے آہٹ پر آنکھیں کھولیں، پادری بنرجی سولا ہیٹ دونوں ہاتھوں میں لئے مسکینی سے کمرے میں داخل ہو رہے تھے ــــ

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور خوش خلقی سے مسکرایا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"گُڈ آفٹر نون مسٹر بارلو۔"

"ہلو ـــ پادرے ـــ گڈ آفٹر نون ـــ گڈ ہیونز ـــ کیا دوپہر ہوگئی ؟"

پادری بنرجی لجاجت سے مسکرائے، مگر مسکراہٹ نے فوراً ساتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ پھر ہیبت زدہ نظر آرہے تھے ــــ

"کیا بات ہے پادرے آپ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ ڈُو ہیو اے ڈرنک، اوہ یو ڈونٹ ڈرنک، ڈُو سِٹ ڈاؤن پادرے۔"

"نو، یس، مسٹر بارلو۔" پادری بنرجی ہکلائے اور ایک کرسی پر ٹِک گئے۔ ہیٹ گود میں رکھ لی۔ کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ چارلس نے مگ میں بیر انڈیلی، مگ اٹھا کر کہا "ٹُو وِکٹری ــــ"

پادری بنرجی نے اسی بھونچکے انداز میں سر ہلایا۔ چارلس پھر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب ساری چیزیں دھندلی دھندلی سی معلوم ہو رہی تھیں۔ آئی ایم ڈرنک، ہُتوے۔ سامنے کالا پادری بیٹھا تھا۔ مجھے ہمیشہ یہ حیرت رہی ہے کہ انسان اپنا آبائی مذہب کیسے بدل لیتا ہے۔ اپنی کھال اتار کر دوسری کھال کیسے منڈھ لیتا ہے (مثال کے طور پر اگر میں مسلمان ہو جاؤں۔ ہا ہا ہا) سیاہ سُوٹ پہنے، سفید کالر لگائے پالی میتھو بنرجی بھی مضحکہ خیز ہے۔ جس طرح ایڈورڈ بارلو مضحکہ خیز تھے ــــ ریحان الدین احمد مضحکہ خیز ہے۔ میں مضحکہ خیز ہوں، سارا ہندوستان، ساری دنیا، ساری انسانیت ساری زندگی اتنی مضحکہ خیز ہے کہ اس پر آنسو بہانے چاہئیں۔

"مسٹر بارلو ــــ"

وہ چونکا۔ میں اپنے فرض میں کوتاہی کر رہا ہوں۔ بیٹھو پادرے، فریاد لے کر آیا ہے۔ عدل چاہتا ہے۔ ہا ہا ہا۔

"مسٹر بارلو۔"

"اوہ جسٹ ون منٹ پادرے۔" اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی، اور اٹھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا، بھاری بھاری، اونچا اونچا، جھکا جھکا سا کمرہ عبور کر کے ریڈیو کے پاس گیا! اور دھم سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ریڈیو کی سوئی گھمانے لگا۔

"دِس از بی۔ بی۔ سی لندن۔" ایک دم آواز گونجی۔

پادری بنرجی چونک پڑے۔

ہزاروں میل پرے۔ ڈبکنی کشتیوں سے معمور سمندروں، گرم صحراؤں میں پھٹتے بموں، جلتے ہوئے یورپ کے اس پار، جلتی ہوئی آکسفورڈ اسٹریٹ کے ایک تہہ خانے میں بیٹھا ہوا اناؤنسر ٹائپ ایرہ لیپ کے ساتھ اپنے ہم قوم چارلس بارلو سے مخاطب تھا۔

دس منٹ تک وہ چارلس بارلو کو بتاتا رہا کہ اتحادی کہاں کہاں فتحمند رہے ہیں۔ اور برطانیہ میں کہاں کہاں بمباری ہوئی ہے۔ پھر ونسٹن چرچل کے تازہ ہمت افزا بیان کے اقتباس کے بعد خبریں ختم ہوئیں گوڈ سیو دی کنگ بجا۔ چارلس بارلو فوراً اٹینشن کھڑا ہو گیا۔ پادری بنرجی بھی کھڑے ہو گئے۔

ریڈیو بند کر کے دائیں چھنگلی پلکوں پر پھیرتے ہوئے چارلس بارلو واپس اپنی کرسی پر آن بیٹھا اب جا کر پادری بنرجی نے کانپتے ہاتھوں سے اخبار جیب سے نکالا۔ اخبار بھی بارش میں بھیگ چکا تھا۔ انھوں نے اُسے ذرا احتیاط سے مسٹر بارلو کے سامنے پیش کیا۔ ایک خبر پر سرخ نشان لگا تھا۔

چارلس بارلو نے جُھک کر خبر پڑھی، تیوری پر بل ڈالا۔ پادری کو دیکھا۔ ہونٹ کاٹے۔

"مجھے بڑا افسوس ہے، پادرے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کی لڑکی بھی ——"

"میں بالکل مجبور اور لاعلم تھا مسٹر بارلو ——"

"آپ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں؟"

"میری بچی —— میری بچی —— گمراہ ہے۔ مسٹر بارلو۔ اُسے بچا لیجیے۔" پادری نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے

وہ جھنجھلا گیا۔ اب اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا، وہ اپنی ذاتی اندرونی دنیا سے واپس آ کر اپنے فرضِ منصبی پر مستعد ہو چکا تھا۔ "آپ کی لڑکی بالغ اور سمجھ دار ہے، جان بوجھ کر اس غنڈہ گردی میں شامل ہوئی ہے۔ بہت جلد اس رومان پرستی سے اس کا جی بھر جائے گا یا ممکن ہے وہ

اری عمر اسی میں لگی رہے۔ آئیڈیلزم، خدمتِ قوم، اور خدمتِ خدا کا جنون انسان کو عجیب و ریب طریقوں سے اپنی زندگی تجنے اور تباہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میری بہن —— " اب اس نے تھ پھیلائے۔ " میری بہن ایلس پچیس سال سے ناگا جنگلوں کی خاک چھانتی پھر رہی ہے اور غالباً ہت مسرور ہے۔ آپ کی بیٹی بھی جیل میں خوش رہے گی۔ اور خود کو مجاہد سمجھے گی۔"

" مسٹر بارلو ——"

"یاد رہے ——" چارلس نے دفعتہً بے حد چڑ کر کہا: "اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ روزی کے بیٹے نے کسی کی جان لی ہے تو اسے عمر قید ہوگی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

پادری بنرجی کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو ڈبڈبانے لگے۔ چارلس دوسری طرف دیکھنے لگا۔ یہ ایستہ اشارہ تھا کہ اب ملاقات کا وقت ختم ہوا۔ مگر پادری بنرجی ڈٹے رہے، ایک آخری کوشش اور ——

"مسٹر بارلو —— مجھے معلوم ہوا ہے کہ مس بارلو آج کل کسی کام سے پٹنہ میں آئی ہوئی ہیں۔ اگر آپ ان کو نک کال کر دیں، کہ —— کہ وہ جیل کے ہسپتال میں روزی کو جا کر دیکھ لیں —— اور —— اور —— میں نے یہ ط بھی ان کو ——" انہوں نے جیب سے ایک خط نکال کر چارلس کو تھما دیا، اور ملتجی اور پرامید نگاہوں سے اسے یکھنے لگے۔

چارلس نے پڑھنا شروع کیا۔

"ڈیر سسٹر اِن کرائسٹ۔

اس مصیبت کے وقت میں ——"

چپراسی کمرے میں داخل ہوا۔

"یس ——؟" بارلو نے پرچہ پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر پوچھا۔ سنہری اور سرخ وردی والے چپراسی کے تھ میں چاندی کی پلیٹ تھی، جس میں ایک نیلا لفافہ رکھا تھا۔

ہندوستان کے اہلکاروں، چپراسیوں اور سائیسوں کی وردیاں، پگڑیاں اور ٹوپیاں برطانوی لومت نے پچھلی صدی میں قدیم ہندوستانی امرا و شرفا کی ملبوسات کے نمونے کی بنوائی تھیں۔ گویا ے ہوں، دیکھو، جو تمہارا لباس ہے، وہ ہم اپنے نوکروں کو پہنائیں گے۔

چپراسی نے پلیٹ چارلس بارلو کو پیش کی۔ چارلس نے کیبل گرام کھولا۔ اسے پڑھا۔ اس کا رنگ سفید

پڑ گیا۔ ہونٹ ذرا سے لرزے۔ وہ چند لمحوں تک بالکل ساکت بیٹھا رہا۔ پھر کندھے سیدھے کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ کیبل گرام جیب میں رکھا۔ ابرو کے اشارے سے چپراسی سے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ پھر وہ لمبا، گہرا سانس لے کر کھوکھلی لیکن مضبوط آواز میں پادری سے مخاطب ہوا۔ "اکسکیوز می پادرے میں ابھی آتا ہوں۔" اور جلدی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

پادری بنرجی حیران پریشان بیٹھے رہے۔ مس ایلس بارلو کے نام خط قالین پر گر پڑا تھا۔ اسے اٹھا کر دوبارہ جیب میں رکھا اور صبر سے چپکے بیٹھ گئے۔

پندرہ منٹ، آدھ گھنٹہ، پینتالیس منٹ، ایک گھنٹہ۔

پورا ایک گھنٹہ گزر گیا۔ تب پادری بنرجی لائبریری سے باہر نکلے۔ کوٹھی پر ایک دم ہُو کا عالم طاری تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر شاگرد پیشے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس کے نزدیک سارے ملازم ایک ہجوم کی صورت میں جمع آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے، عبدالغفور ان کی طرف گئے۔

"کیا بات ہے عبدل۔؟"

"صاحب!" عبدالغفور نے دھیرے سے کہا اور ان کو ساتھ لے کر باغ کی روش پر آ گئے۔ خوب صورت ڈک پونڈ میں بطخیں بڑے سکون سے تیر رہی تھیں۔ دور مرغی خانے میں ایک مرغی کٹ کٹاتے جا رہی تھی۔ باورچی خانے کی چمنی میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

"صاحب۔" عبدالغفور نے کہا۔ "میم صاحب گزر گئیں۔"

"گوڈ ہیو مرسی۔ کیسے عبدل؟"

"صاحب بیڈروم میں بُت بنا بیٹھا ہے۔ ابھی اس نے مجھے آواز دی تھی۔ میں اندر گیا تو آہستہ سے بولا۔ عبدل۔ ہمارا میم صاحب گذر گیا۔ ولایت سے تار آیا ہے۔ جرمن والا بم گرا رہا تھا۔ راکٹ بولتے ہیں۔ کیا بولتے ہیں۔"

"وی ٹو راکٹ۔"

"جی پادری صاحب، وہ بدھ کی رات کو صاحب کے مکان پر گرا۔ مکان جل کے راکھ ہو گیا۔ صاحب اندر سو رہی تھی، وہ بھی ـــــــ"

"مگر اُدھر تو عبدل ایر ریڈ کا بھونپو بجتا ہے۔ سب لوگ تہ خانوں میں چلا جاتا ہے۔"

"معلوم نہیں، صاحب نے اتنا ہی بولا۔ اور بولا کہ بابا لوگ   سے باہر اسکول کے بورڈنگ ہے، اس وجہ سے وہ بچ گیا۔ اور میٹی مس صاحب بھی بچ گئی۔ اس کو میم صاحب نے بڈّھا لوگ ہوم میں ڈال دیا تھا۔"

"شکر ہے۔"

"صاحب نے بولا ہے پادری صاحب سے کہو ہم ابھی آتے ہیں۔"

"اچھا۔ تھینک یو عبدل۔"

عبدالغفور واپس چلے گئے۔ پادری بنرجی واپس آ کر لائبریری کے سامنے والے برآمدے میں ٹہلنے لگے۔

بوٹ کی چاپ سنائی دی۔ چارلس بارلو برآمدے میں نمودار ہوا۔ پادری بنرجی اس کی طرف بڑھے۔

"مسٹر بارلو۔"

"پادرے بدھ کی رات کو مسز بارلو کا ایر ریڈ میں انتقال ہو گیا۔"

"اس کی مرضی پوری ہو۔"

"آئیے بیٹھیے۔" اُس نے پھولدار گدیلوں والی بید کی ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

چند منٹ تک خاموشی چھائی رہی۔ باغ میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ فطرت اسی بے نیازی سے نادہ رہتی ہے۔

"غم نہ کیجیے مسٹر بارلو مسز بارلو ایک بہت بہتر جگہ چلی گئیں۔"

"بہتر جگہ ـــــ؟ آپ کو کیسے معلوم۔ اس وثوق سے کس طرح کہتے ہیں؟" چارلس نے جھنجھلا کر کہا۔ "بہتر جگہ صرف یہ دنیا ہے۔ باقی آپ لوگوں کی خام خیالی اور خوش فہمی ہے۔"

پادری بنرجی خاموش رہے

چارلس بارلو تلخی سے ہنسا۔ " THE LORD HIS INFINITE MERCY }

پادری بنرجی نے آہستہ سے کہا " خدا واقعی بڑا رحیم و کریم ہے۔ میرے بیٹے "

" ہاہا! ۔ اس رحیم و کریم نے میرے جوان اور نیک دل باپ کو آدم خور شیر کا نوالہ بنا دیا۔ میر اور معصوم پھوپھی کو جینیوں سے RAPE کروا کے قتل کرا دیا۔ اس رحیم و کریم نے میرے جوان بھائی کے جز اندھیرے آسمانوں پر پرخچے اڑا دئے۔ وہ رحیم و کریم اس وقت ساری دنیا کے لاکھوں بے گناہ انسانو طرح کی موت مار رہا ہے۔ وہ رحیم و کریم اسی بنگال میں ہر سال ان گنت بے گناہ اور مصیبت زدہ ا کو طوفانوں اور سیلابوں اور وباؤں کی نذر کرتا ہے۔ اور یاد رہے تمہارا وہ رحیم و کریم خدا ننھے بچوں اپاہج اور اندھا کر دیتا ہے۔" وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ " سوری پادرے "

پادری بنرجی ذاتی کرائسس کے مواقع پر اسرار ربانی ت لاعلم فانی انسانوں کے منہ سے ا کے کلماتِ کفر سننے کے عادی تھے۔ انہوں نے جیب سے بائبل نکالی اور تیئیسواں لحن پڑھنا شروع کیا

تیئیسواں لحن جادو کا اثر رکھتا ہے۔

خداوند خدا میرا گڈریہ ہے۔ مجھے کوئی ڈر نہیں وہ مجھے ہری
چراگاہوں میں آرام کرواتا ہے۔ وہ مجھے خاموش پانیوں کے کنارے
کنارے لے جاتا ہے۔

پادری بنرجی نے کتاب گود میں رکھی اور پڑھنا شروع کیا۔

اور گو میں موت کے سائے کی وادی میں چل رہا ہوں ______

لیکن ان کے ساتھ ساتھ لحن کی تلاوت کرنے کے بجائے چارلس تیوری پر بل ڈالے سر ہلا رہا تھا۔ اور اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ پادری بنرجی نے لحن ختم کر کے بائبل کے ورق گردانی شروع کی کوئی اور سکون بخش حصہ پڑھ کر سنائیں۔ مگر عجیب بات تھی کہ ہر صفحے پر ان کی نظریں بڑی پریشان ک سطروں پر ہی جا پڑتی تھیں۔

اے یعقوب! تم اپنی ان مصیبتوں پر جو آنے والی ہیں روؤ اور واویلا کرو۔
تمہارا مال بگڑ گیا۔ تمہاری پوشاکوں کو کیڑا کھا گیا۔ دیکھو! جن مزدوروں نے

تمہارے کھیت کاٹے ان کی وہ مزدوری جو تم نے دغا کرکے ضبط کرلی تھی چلاتی ہے۔ اور فصل کاٹنے والوں کی فریاد رب الافواج کے کانوں تک پہنچ گئی۔

دیکھو منصف دروازے پر کھڑا ہے۔

پادری بنرجی نے گردن آگے بڑھا کر ورق پلٹے۔ یوحنا کا مکاشفہ ——

خدا کا بیٹا جس کی آنکھیں آگ کے شعلے کے مانند اور پاؤں خالص پیتل کے مانند ہیں فرماتا ہے کہ تیرے کاموں اور محنت اور ایمان اور خدمت اور صبر کو تو جانتا ہوں اور یہ بھی ——

اور آگے ——

اور جب اس نے چھٹی مہر کھولی تو میں نے دیکھا کہ سورج کمبل کی مانند کالا اور سارا چاند خون سا ہو گیا اور ستارے انجیر کے درختوں کے کچے پھلوں کی طرح گر پڑے۔ آسمان اس طرح سرک گیا جس طرح مکتوب لپٹنے سے سرک جاتا ہے۔

پھر آسمانوں پر لڑائی ہوئی اور ——

پھر میں نے شیشے کا سا ایک سمندر دیکھا جس میں آگ ملی ہوئی تھی ——

شہر بابل گر پڑا۔ زمین کے بادشاہ جب اس کے جلنے کا دھواں دیکھیں گے تو اس کے لئے روئیں گے اور دنیا کے سوداگر اس کے لئے ماتم کریں گے۔ اور سب ناخدا اور مسافر اور ملاح دور کھڑے اپنے سروں پر خاک ڈالیں گے کہ افسوس افسوس وہ بڑا شہر جس کی دولت سے سمندر کے جہاز والے دولتمند ہوئے۔

پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا۔ اور کیا دیکھتا ہوں ایک سفید گھوڑا ہے اور اس پر ایک سوار ہے، وہ خون آلود پوشاک پہنے ہے اور قوموں کے مارنے کے لئے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے۔ اور۔

پھر میں نے ایک فرشتے کو آفتاب پر کھڑا دیکھا اور اس نے بڑی آواز میں چلا کر آسمان میں اڑنے والے سب پرندوں سے کہا کہ خدا کی بڑی ضیافت میں شریک ہونے کے لئے جمع ہو جاؤ تاکہ تم بادشاہوں کا گوشت اور فوجی سرداروں کا گوشت اور گھوڑوں اور ان کے سواروں کا گوشت کھاؤ ——

پھر میں نے ایک نئے آسمان اور نئی زمین کو دیکھا۔ کیونکہ پہلا آسمان اور پہلی زمین جاتی رہی تھی اور سمندر بھی نہ رہا

اور روح اور دلہن ہیں آ، اور سننے والا بھی کہے آ اور جو پیاسا ہو وہ آئے اور آبِ حیات لے۔"

پادری بنرجی نے گہرا سانس لے کر نیا عہد نامہ بند کر دیا اور سوچ میں ڈوب گئے۔

تب چارلس کی بھاری آواز نے انھیں چونکایا۔

"پادرے! مجھے ایوبؑ کی گریہ وزاری سناؤ۔"

"بہت اچھا۔ اور آپ بھی صبرِ ایوبؑ سے سبق لیجیے۔ مسٹر بارلو۔"

"سبق بعد میں لوں گا۔ تم مجھے پہلے اس عبرانی بڈھے کی گریہ وزاری ——"

"خاموش مسٹر بارلو۔" پادری نے دفعتہً ڈانٹ کر کہا —— "بہت بے ادبی کر لی۔ اب خاموش۔"

"سوری پادرے۔"

پادری نے دوبارہ عینک کا کیس کھولا، عینک تبدیل کی، اور جیب سے مداری کی طرح پرانا عہد نامہ نکالا۔

"جستہ جستہ پڑھ کر سناؤں گا، بہت طویل باب ہے ——

"اور پھر ایوبؑ راکھ میں بیٹھ گیا۔ اور اس کے تین دوست پرسے کو آئے۔ اور انھوں نے خاک سروں پر ڈالی اور اس کے ساتھ زمین پر بیٹھے رہے۔ اور سات دن اور سات رات زمین پر بیٹھے رہے۔ اور ایوب نے کہا، لعنت ہو اس دن پر جب میں پیدا ہوا تھا، میرے جسم پر کیڑے رینگ رہے ہیں، میری کھال اکھڑ گئی، میرے دن جولاہے کی تکلیفوں کی مانند تیز رفتار ہیں۔ میری زندگی ہوا بن گئی۔

"خدا بے گناہوں کے مصائب پر ہنستا ہے اس نے زمین کو ظالموں کے حوالے کر دیا۔ منصفوں کے چہرے چھپا دیے۔ میری زندگی تیز رفتار جہاز کی مانند گزر رہی ہے۔ مجھے اپنے غموں سے ڈر لگتا ہے۔

"میں خدا سے کہوں گا تجھے زیب دیتا ہے خداوندا کہ اپنے بندے سے متنفر ہو اور ظالموں کا ساتھ دے؟ کیا تو بھی انسان ہے؟ ڈاکو عیش کر رہے ہیں اور خدا ان کو بڑھاوا دیتا ہے وہ قوموں کو ترقی دیتا ہے اور تباہ کرتا ہے اور پھر ترقی دیتا ہے۔ میری آنکھوں نے یہ سب کچھ دیکھا۔ کانوں نے سنا۔ اور عقل نے سمجھا۔ اور اب میں خدا سے ذرا منطقی جرح کرنا چاہتا ہوں ——

"ابنِ حوا کی مختصر زندگی کلفتوں سے پُر ہے۔ وہ پھول کی طرح کھلتا ہے اور کٹ کر گر جاتا ہے۔ سائے کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ پانی کی خوشبو کٹے درخت کو از سرِ نو زندگی بخشتی ہے۔ مگر ابنِ آدم ایک مرتبہ

ٹ جائے پھر نہیں اٹھتا۔ لے کر تو، جب تک تیرا طیش زائل نہ ہو، مجھے قبر میں چھپائے گا۔ میں اپنے وقت نتظر ہوں۔

”پانی پتھروں کو بہالے جاتا ہے، تو انسان کی امیدوں پر پانی پھیرتا ہے۔ تو اس کی شکل بدل ل ہے۔ تو نے مجھے ہلکان، پاش پاش کر دیا۔ میرے چہرے پر جھریاں ڈال دیں۔ مجھے جابر دلوں کے حوالے دیا۔ میری باگیں توڑ ڈالیں۔ میرا چہرہ روتے روتے بدہیئت ہو چکا ہے۔ میری پلکوں پر موت کا سایہ لرزاں ے۔ اے زمین میرا خون نہ چھپا۔ میری شنوائی نہ کر، میری قبریں میرے لئے تیار ہیں۔ میری آنکھیں وفورِ غم ، دھندلا گئیں۔ مجھے تم سب میں ایک دانشمند نظر نہیں آتا۔ میرے مقاصد کا خاتمہ ہوا۔ میرے خیالات ے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ قبر میرا مکان ہے۔ میں نے اپنا بستر اندھیرے میں بچھایا ہے۔ میں نے جسم کی گلن سے ا۔ تم میرے باپ ہو، کیڑوں سے کہا تم میری ماں اور بہنیں ——

”جانو کہ خدا نے مجھے اپنے جال میں گرفتار کیا۔ میری راہ میں روڑے اٹکائے، اور اندھیرا پھیلایا۔ ں کے لشکر نے میرے معبد کو گھیر لیا۔ میرے بھائی اور میرے عزیز اور میرے دوست مجھے بھول گئے۔ میں نی بی بی کے لئے اجنبی ہوں۔ دوستو مجھ پر ترس کھاؤ کہ اس قہار و جبار کے ہاتھ نے مجھے چھو لیا ہے۔

”میں انسان کا شاکی نہیں لیکن اشقیا بربط اور ارغنون بجاتے ہیں۔ جبکہ میں آگے بڑھتا ہوں تو مجھے ا نہیں ملتا، پیچھے دیکھتا ہوں تو بھی نظر نہیں آتا۔ میں اس حاضر و ناظر کی موجودگی سے مضطرب ہوں، مجھے اس ے ڈر لگ رہا ہے۔ اس نے میرا دل گداز کر دیا ہے۔

”اہل ثروت حاجت مندوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔ مفلس سردی میں ٹھٹھرتے ہیں۔ کوہستانی رش میں کانپ رہے ہیں۔ چٹانوں میں پناہ گزیں ہیں۔ امراء ان بھوکوں کا اناج چھینتے ہیں، جنہوں نے ان کے ے کولہو چلائے۔ جو ان کے لئے شراب کشید کر کے خود پیاسے رہتے ہیں۔ جو شہر پناہ سے باہر کراہتے ہیں۔

”میں نے خیر کی آرزو کی اور مجھے شر ملا۔ روشنی کا منتظر رہا اور تاریکی پائی۔

”جب وہ رب کریم میرے شامل حال تھا اور میری اولاد میرے ساتھ تھی، جب میں اپنی سیڑھیاں کھن سے دھوتا تھا۔ میں شہر میں نکلتا تھا تو نوجوان مجھے دیکھ کر چھپ جاتے۔ بوڑھے تعظیماً اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ شہزادے بات کرتے کرتے خاموش ہو جاتے تھے۔ کیونکہ میں غرباء کا حامی و نگہبان تھا۔ میری جڑیں ندی کنارے پھیلی تھیں۔ میری شاخ پر شبنم گرتی تھی۔ میری عظمت و شوکت تر و تازہ تھی۔ لیکن اب نوجوان جن

کے باپوں کو میں اپنے گلّے کے کتوں کے ساتھ بھی نہ بٹھاتا، میری تضحیک کرتے ہیں۔ اور آندھی کی مانند مجھ پر حملہ آور ہیں۔ اور تب میں نے اُٹھ کر مجمع سے کہا۔ میں اژدہے کا بھائی اور بوم کا ساتھی ہوں۔ میری کھال جل گئی۔ میرا بربط رو رہا ہے۔ کیا خدا میری حالت نہیں دیکھتا۔ کاش وہ میری فریاد سنے۔ کاش میرے دشمن ایک کتاب لکھیں جسے میں اپنے کندھوں پر رکھوں اور تاج کی طرح پہنوں۔ اگر میری زمینیں میری وجہ سے نالہ کناں ہیں، تو کاش گیہوں کے بجائے گوکھرو اور جَو کے بجائے گھاس پھونس ان پر اُگیں ——— ایوبؑ کے الفاظ ختم ہوئے۔

"تب بگولے میں سے خداوند عالم نے ایوبؑ کو جواب دیا ———"

پادری نے بائبل بند کر دی، چارلس کرسی کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اس نے چونک کر پادری دیکھا ———

"ان تینوں دانش مند دوستوں کے نام کیا تھے جو ایوبؑ کو سمجھانے آئے تھے؟"

"ایلی ہو۔ بل داد اور آلی فاز ——" پادری نے جواب دیا۔

"ایلی ہو، بل داد، اور آلی فاز۔" چارلس نے ذرا اکتائی ہوئی آواز میں دوہرایا۔ اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا

ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ کیونکہ وہ بہت دیر سے سوچ رہا تھا ——— کرنل جوئیل جو مکان میں مقیم تھا وہ بھی اسی رات ان شعلوں میں بھسم ہوا، تم بھی اس کے ساتھ جل کر کوئلہ ہوئیں۔ تمہارا خوب صورت جسم کوئلہ بنا۔ تم مرتے وقت بھی مجھ سے بے وفا تھیں۔ افسوس۔ افسوس۔ افسوس ———

اس نے میز پر سے نیا عہد نامہ اٹھایا اور صفحے الٹنے لگا۔ اُسے بھی "یوحنا کے مکاشفے" نے متوجہ کیا۔ اور سب سے پہلے اس کی نظر پڑی ——— "اور پھر جب میں نے نگاہ کی تو آسمان کے بیچ میں ایک عقاب کو اڑتے دیکھا اور بڑی آواز سے کہتے سنا کہ ان تین فرشتوں کے نرسنگوں کی آوازوں کے سبب سے جن کا پھونکنا ابھی باقی ہے زمین کے رہنے والوں پر افسوس، افسوس، افسوس ———

"اور ان سات فرشتوں میں سے جن کے پاس سات پیالے تھے، ایک نے مجھ سے کہا آ میں تجھے اس بڑی کسبی کی سزا دکھاؤں جو بہت سے پانیوں پر بیٹھی ہے ———"

چارلس بارلو نے زور سے کتاب بند کر لی۔ یہ سطور بابل کے متعلق ہیں۔ لندن کے متعلق نہیں۔ وائلیٹ بارلو ——— مرحومہ ——— کے متعلق بھی نہیں۔ بابل ——— بابل ——— بابل۔ اب میں بیمار پڑ جاؤں گا۔ اب مجھے حاضری کھانا چاہیے۔ اب مجھے ———

کاویری کے کنارے اجاڑ بنگلہ ـــــ پدما کے کنارے اجاڑ بنگلہ ـــــ اجاڑ ـــــ

" اس نے زور سے آواز دی ۔

عبدالغفور اچانک سامنے آن موجود ہوئے ۔ وہ بیحد ملول اور پریشان نظر آرہے تھے ۔ "صاحب ذرا سا حاضری کھا لیجئے ۔ اب تین بج رہا ہے ۔"

چارلس بارلو نے انتہائی مشکور نگاہوں سے اولڈ عبدل کو دیکھا ۔ "اچھا ۔ تھینک یو عبدل ـــ پادرے میرے ساتھ لنچ کھا کر جاؤ ۔"

"تھینک یو ، مسٹر بارلو ۔"

وہ دونوں کھانے کے کمرے میں گئے ۔ میز پر بیٹھ کر پادری نے گریس پڑھی ۔ سوپ کے بعد عبدالغفور ارین خاموشی سے سرو کئے ۔ اسی خاموشی سے کھانا ختم کر کے چارلس اور پادری باہر نکلے ۔

"پادرے ۔ میں ایلیس کو آج ہی تیز ٹرنک کال کر دوں گا کہ وہ روزی کی خیریت معلوم کر لیں ، ن ہے کہ میں رہائی کی کوشش نہیں کر سکتا ۔ ہاں اگر وہ معافی مانگ لے ۔"

"وہ معافی نہیں مانگے گی ۔"

"تو پھر میں بھی کچھ نہیں کر سکتا ، پادرے ۔" چارلس نے پادری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔ عافظ پادرے ۔"

"خدا حافظ ، گوڈ بلیس یو ، مسٹر بارلو ۔"

چارلس بارلو اندر چلا گیا ۔ پادری بنرجی نے ہیٹ ریک میں سے چھتری اٹھائی ۔ اب ان کے ن من بھر کے ہو چکے تھے ۔ اب ان کو معلوم تھا کہ روزی کی قسمت میں بہت طویل قید ہے ۔ ر قید ـــــ

وہ سر جھکائے جوں کی چال چلتے برساتی سے باہر نکلے اور پھاٹک تک اس طرح پہنچے جیسے کسی ے کے ساتھ جا رہے ہوں ـــــ پھاٹک پر کھڑے ہو کر انہوں نے آسمان کو دیکھا ۔ پھر سوچا اب ھاؤں ۔ بارش بہت دیر سے تھمی ہوئی تھی ۔ وہ پھاٹک سے باہر آ کر ایک طرف کو چند قدم چلے ، بذب کے عالم میں ٹھٹھک گئے ، پھر چلنے لگے ۔

۲۵

نواب قمر الزماں چودھری

نواب قمر الزماں چودھری پچھلی سیٹ پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے چھتری کی لکڑی موٹھ پر ہا
اپنی سیاہ بیوک میں ارجمند منزل کی طرف جا رہے تھے۔ جو ڈی ایمز ہاؤس سے چند فرلانگ پر واقع تھی۔ وہ
گھر کے قریب پہنچ چکے تھے، جب ان کو پادری بنرجی کچھوے کی چال چلتے منہ اٹھائے ایک طرف کو جا
نظر آئے۔ ان کے چہرے کی حالت دیکھ کر نواب صاحب کا دل دہل گیا۔ انہوں نے موٹر رکوائی اور اتر
پادری کے پاس پہنچے۔

پادری نے ان کو دیکھا اور یک لخت اطمینان کی سانس لی۔ نواب قمر الزماں اس وقت ڈوب
کو تنکے کا سہارا معلوم ہو رہے تھے یا فرشتۂ رحمت۔ نواب صاحب نے خاموشی سے ان کو اپنے برا
کار میں بٹھایا۔ وہ صبح کا اخبار پڑھ چکے تھے۔

ارجمند منزل پہنچ کر وہ برآمدے میں پڑے صوفے پر بیٹھ گئے۔ پادری کو بٹھایا اور چائے منگوا
سامنے لان پر آیا اختر الزماں کے نوزائیدہ بچے کو گود میں لیے ٹہل رہی تھی۔ اندر ریڈیو بج رہا تھا۔

پادری بنرجی نے جیب سے اخبار نکال کر نواب صاحب کے سامنے پیش کیا۔

"میں پڑھ چکا ہوں۔ بنگلہ اخبارات میں زیادہ مفصل خبریں ہیں۔" انہوں نے آہستہ سے کہا۔ بشیر چا
لے کر آیا۔

"میں ابھی ڈی ایم کے پاس گیا تھا۔ اس نے کوئی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔"

نواب صاحب نے چائے بنائی۔

"ڈی۔ ایم کی بیوی لندن کی بمباری میں ماری گئی اور آبائی مکان بھی جل گیا۔"

نواب صاحب نے آنکھیں پھیلا کر پادری کو دیکھا۔ پادری اس وقت ایک سیاہ پوش پیغامبر نظر آ
تھا۔ جس کے پاس بری خبروں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

"اللہ رحم کرے۔" نواب صاحب نے آہستہ سے کہا۔

اچانک پادری کھڑا ہو گیا۔ "نواب صاحب میں ڈاکٹر سرکار سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسی وقت فوراً۔"

صدمے کی وجہ سے پادری بوکھلا گیا ہے۔ بے چارہ۔ بے چارہ۔

"آپ بیٹھئے پادری صاحب۔ میں نتوے بابو کو ابھی بلواتا ہوں۔ کیا وہ آپ کی کچھ مدد کر سکیں گے؟"

"میں ڈاکٹر سرکار سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" پادری نے دہرایا۔

نواب نے تالی بجائی۔ ٹہلتی ہوئی ماما قریب آئی۔

"ڈرائیور کو بلاؤ۔"

ڈرائیور حاضر ہوا۔

"نتوے بابو کو فوراً ساتھ لے آؤ۔ کہنا بے حد ضروری کام ہے۔"

پادری اور نواب چپ بیٹھے رہے۔

کچھ دیر بعد موٹر دوبارہ برساتی میں داخل ہوئی۔ چادر لپیٹے نتوے بابو وقار سے سیڑھیاں ھے۔ نواب نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور قریب کی کرسی پر بٹھایا۔ نتوے بابو نے پادری کو نمسکار ور نواب سے پوچھا "میں ابھی ابھی فرید پور سے واپس آیا ہوں۔ نہا کر سفر کے کپڑے بھی نہیں بدلے۔ کیا بات ہے۔ خیریت؟"

"خیریت؟" پادری ایک دم برس پڑا۔ "میں آپ کو بتانا چاہتا تھا، یہ سب کچھ آپ کی لڑکی کی وجہ ہوا۔ سب کچھ۔"

نتوے بابو نے حیرت سے پہلے پادری کو دیکھا اور پھر نواب کو۔

"تمہیں نہیں معلوم نتوے؟" نواب نے آہستہ آہستہ کہا۔ "روزی کل بسم اشرڈن کی بغاوت میں چوکی پر حملہ کرتی ہوئی قید کر لی گئی۔ پولیس فائرنگ سے کئی حملہ آور مارے گئے۔ روزی کے بھی سخت زخمی ہونے طلاع خبر میں شامل ہے۔ یہ کل رات کی خبر ہے۔ یہ شاید کل صبح کے اخباروں سے معلوم ہو گا کہ اس کا کیا ہے اور کس جیل میں بھیجا گیا ہے۔ زخمی قیدیوں کو تو شاید جیل کے اسپتال میں رکھا جاتا ہے۔"

اندر کسی کمرے میں — نیر الزماں گراموفون بجا رہے تھے۔ اچانک نذرل کا ریکارڈ بجنا شروع توڑو۔ پھوڑو۔ مارو۔ آگ لگا دو۔ آندھی طوفان بن جاؤ۔ میں سرکش ہوں۔ اصول شکن۔

بربادی کا دیوتا۔ باغی۔ میں ہمیشہ سربلند رہوں گا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ "اسٹاپ اِٹ" نواب نے بے حد آزردگی کے ساتھ زور سے آواز دی۔

گیت ختم ہو گیا۔

پادری نے سر اٹھا کر بنوتے بابو پر نظر ڈالی۔ اتنی دیر میں شاید وہ اپنے غصہ پر قابو پا چکے تھے۔ انہوں نے سپاٹ آواز میں کہا "بنوتے بابو میری فرمانبردار بچی کو دیپالی نے اس راستہ پر لگایا۔ اسے دیپالی کی صحبت نے برباد کیا۔ بس میں آپ سے اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی کہ باپ کی حیثیت سے آپ کا فرض تھا کہ آپ دیپالی کو غنڈوں کی سنگت سے روکتے۔ میں نے اپنے بھرپور کوشش کی، اپنی بچی کو بچانے کی۔ مگر اس کے دماغ میں زہر بہت اچھی طرح بھرا جا چکا تھا۔"

"آپ لوگ سب غالباً مجھے ایک رجعت پسند مسلمان زمیندار سمجھتے ہیں۔ مگر لڑکیوں کی آزادی کے یہی سب نتائج ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے اپنی لڑکیوں کو اجازت نہیں دی کہ گھر سے قدم نکالیں۔" نواب نے کہا۔

"مجھے معلوم نہیں کہ دیپالی کس حد تک سیاسی مشاغل میں حصّہ لیتی ہے۔ اس نے ایک دفعہ مجھ سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ٹررسٹ تحریک میں شامل نہ ہو گی۔ اور میں نے اس کے قول کا اعتبار کیا ہے۔ علاوہ ازیں اگر وہ مجھ سے چھپا کر کسی سیاسی تحریک میں شامل ہے تب بھی میں کچھ نہیں کر سکتا تھا نہ اُسے منع کر سکتا ہوں۔ ہر نئی نسل اپنا راستہ خود بناتی ہے۔ آپ نے بھی اور میں نے بھی اپنے اپنے طریقے سے اپنے لئے نئے راستے تلاش کئے تھے۔ منو موہن بابو۔ آیئے خدا سے امید کریں کہ روزی خیریت سے ہو۔ آپ پر اس وقت جو بیت رہی ہے وہ میں سمجھ سکتا ہوں۔ دینش بھی —" پھر وہ چپ ہو گئے۔

ملازم نے پیچوان لا کر نواب کے پاس رکھا۔ پادری نے سر اٹھا کر دفعتاً نواب کو مخاطب کیا۔ "اور آپ بھی — آپ کا انگریز کے چلے جانے سے کیا فائدہ ہو گا؟ نہرو نے دسیوں بار کہا ہے، رجواڑے ختم کر دیئے جائیں گے۔"

نواب حقہ گڑگڑاتا رہا۔ سیاست حد سے زیادہ گنجلک ہو گئی ہے۔ اللہ اکبر۔ یہ خستہ حال کالا پادری اور یہ خستہ حال ڈاکٹر۔ ان دونوں کو غالباً آزادی سے فائدہ ہو گا۔ مگر واقعی مجھے کیا فائدہ ہو گا۔ ریاست البتہ چلی جائے گی۔ میں نے اقتصادی پہلوؤں پر زیادہ غور نہیں کیا۔ مگر اقتصادی مسائل پر غور کر کے رونو نے پہلے ہی

فت مچا رکھی ہے۔

ردنو کے خیال نے انہیں یک لخت بیحد مضطرب اور ملول کر دیا۔ وہ ہیجان گڑگڑایا کیے۔

پھر انہوں نے پادری سے کہا۔ "سنو موہن بابو۔ میں بھی سمجھ سکتا ہوں، آپ کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ لپنے لاڈلے بھانجے کا خیال آتا ہے تو میرا دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس نے کس طرح ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ تم نئی نسل کی بات کرتے ہو بنوئے۔ یہ بڑی احسان فراموش، ام نئی نسل ہے۔ پچھلے سال تمہاری بچی مجھ سے بحث کرنے لگی۔ قربانی اور تیاگ۔ یہ اور وہ۔ بچی سے کیا کہتا کہ سیاست کی قربان گاہ پر میں اپنی مسرتوں کی قربانی دے چکا ہوں۔ میرے ہونہار کو سیاست ہڑپ کر گئی۔"

"تمہارا کون بھانجا کومر میاں؟" بنوئے بابو نے پوچھا۔

"تم سے بنوئے برسوں میری ملاقات نہیں ہوتی۔ تم میرے حالات سے اجنبی ہو چکے ہو۔ ں اس قصہ کو بھلائے رکھنا ہی میرے لئے بہتر ہے۔ میں اپنی اس ٹریجڈی اور اپنی بیٹی کی بد قسمتی ں پردہ پوشی ہی میں عافیت سمجھتا ہوں۔ رہنے دو یوں ہی بات سے بات نکل آئی۔"

"سوری کومر میاں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔"

مگر اب نواب آہستہ آہستہ ہیجان گڑگڑاتا اور کہتا رہا۔ "میری آنکھوں کا تارا۔ میری مرحومہ شانی۔ میرا لاڈلا۔ جس پر فخر کرتے کرتے میں پھولا نہ سماتا تھا۔ جس کی میں نے زندگی بنا دی۔ اور یکے ساتھ — میری لڑ — میرے ساتھ کیا کیا؟ — یہی — منوموہن بابو — یہی — پھوڑ دو، آگ لگا دو، اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ منوموہن بابو۔ آپ اور میں اور بنوئے ہم سب یں سوار ہیں۔ ردنو۔ روزی۔ دیپالی۔ یہ سب مل کر ہم کو اس چیز کی سزا دے رہے ہیں کہ ہم نے ے ایک محفوظ دنیا تخلیق کی تھی۔ یہ لوگ اسی لئے پیدا ہوئے ہیں کہ اس محفوظ اور مامون دنیا ں کو نیست و نابود کر دیں۔"

"مگر کس لئے —؟" پادری نے پوچھا۔ "ہمیں نیست و نابود کرنے کے بعد یہ کس قسم کی دنیا ؟"

"اس بات کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔" نواب نے افسردگی سے کہا۔

بنوئے بابو صوفے سے اُٹھے، پادری صاحب بھی اُٹھے، "مجھے معاف کر دینا بنوئے بابو۔ میں ہو
داس کھو بیٹھا ہوں۔" بنوئے بابو نے پادری کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

نواب صاحب کرسی ہٹا کر پادری کے نزدیک آئے۔

"منموہن بابو۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ دعا کرتے رہیے۔ روزی یقیناً خیریت سے بہت جلد لوٹے گی۔"

پادری نے بے یقینی سے اقرار میں سر ہلایا۔ نواب نے نیچے اتر کر بیوک کا دروازہ کھولا۔ پادر
ڈاکٹر پیچھے بیٹھ گئے۔ ڈرائیور لپک کر آیا۔ موٹر میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ موٹر آگے بڑھ گئی۔

رات کو ارجمند منزل میں نواب کی پہلوٹھی کے پوتے منور الزماں کے عقیقے کے سلسلے میں بڑا بھا
تھا۔ آٹھ بجے مہمان آنے شروع ہو جائیں گے۔

—— بابر بہ عیش کوش —— ؟

نواب برساتی سے نکل کر پائیں باغ کی سمت چلے گئے۔

ہم تینوں۔ میں۔ سرکار اور بنرجی۔ ہم تین بنگالی، تین مختلف راستوں پر کھڑے ہیں۔ میں اور
دو ایسے کھمبے ہیں جن کو گھن لگ چکا ہے۔ مگر پال میتھیو بنرجی بے چارہ یہ بات سمجھ نہیں سکتا، اور
کر بھی کیا کر لے گا۔

پچھلے لان پر پہنچ کر ان کو بارلو کی میم کا خیال آیا۔ پادری نے بتایا تھا کہ سناؤنی سن کر بارلو نے
بہادری اور ضبط سے کام لیا۔ خالص اسٹف اپر لپ۔ بھئی اگر ایسی ہمتیں نہ ہوتیں تو ساری دنیا پر حکو
کرتے۔ نواب لان پر ٹہلنے لگے۔ کل سارے عمائدین شہر تعزیت کے لئے جائیں گے۔ مجھے بھی جانا ہوگا۔ وا
بارلو بنگال کی یوروپین سوسائٹی میں کافی دل پھینک مشہور تھی۔ خاصی آوارہ۔ مچھلی کی طرح پیتی تھی۔ بچ
مر گئی غریب۔ بارلو اس کی وجہ سے بہت دکھی رہتا تھا۔ اب روزی کے لئے کیا کیا جائے —— کچھ
ہو سکتا —— روزی کی ماں پندرہ سالہ گری بالا اسی تالاب کے کنارے بیٹھ کر برتن مانجھا کرتی
اور میں اس درخت کے پیچھے چھپ چھپ کر اسے طرح طرح سے چھیڑنے کی کوشش کرتا تھا۔ وقت کس ط
ہے، کس طرح بدلتا ہے، اللہ غنی۔

"نواب صاحب ——" ایک کلرک نما نوجوان باغ کی سڑک پر پہنچ کر سائیکل سے اتر

نزدیک آکر سلام کیا۔ "کل شام آفس میں یہ فون آیا تھا۔ یہ پیغام ہے" اس نے جیب سے ایک کاغذ لر پیش کیا۔ "میں نے آپ سے ملاقات کا وقت آج ساڑھے پانچ کا دے دیا ہے۔ کیوں کہ آپ کو اسی ———"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے ۔۔" نواب کارنگ پرچے پر لکھا نام پڑھ کر پیلا پڑ چکا تھا۔

"تم جاؤ۔ اندر جاؤ۔ متعلقہ کاغذات میز پر لگا دو۔" انھوں نے خالی خالی آواز میں کہا۔

"بہت اچھا۔" نوجوان سائیکل سنبھال کر کتب خانہ کی طرف بڑھ گیا۔

نواب چند لمحوں تک گھاس پر ٹھٹکے کھڑے رہے۔ پھر نظریں اٹھا کر اوپر کی منزل کو دیکھا، ارا کے کمرے کی نیلے شیشوں والی کھڑکی ہوا کے جھونکے نے کھٹ سے بند کر دی۔ وہ اس کھڑکی کو چند تک مبہوت تکتے رہے۔ پھر اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی، اور سر جھکائے آہستہ آہستہ کتب خانے ے روانہ ہو گئے۔

۲۶

ریحان الدین احمد

اس صبح جس وقت چارلس بارلو چھوٹا حاضری کے بعد اپنی اسٹڈی میں جا کر "نغماتِ ہند" ے میں مصروف تھا۔ ڈی ایز ہاؤس سے کچھ فاصلے پر ووڈ لینڈز میں کریم خان نے بریک فاسٹ سب معمول تازہ پیتر یکا لا کر رکھا۔ اور چائے دانی لینے کے لئے اندر چلا گیا۔ آدمارا نے ٹوسٹ کاتے لگاتے اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ ورق الٹے۔ اندر کے صفحے پر ایک سرخی نے ان کو متوجہ ں نے گھبرا کر آواز دی۔ "ریحان ——— جلدی آؤ"

بریک فاسٹ کی میز ووڈ لینڈز کے پہلو کے برآمدے میں لگی تھی۔ گیسٹ روم کا دروازہ برآمدے کے ملتا تھا۔ شیو کے صابن کا جھاگ تولیہ سے صاف کرتا ریحان الدین احمد کمرے سے نمودار ہوا۔

"کیا ہوا ——— ؟"

"یہ دیکھو ــــ سنسنی خیز گرفتاری۔" اوما دیبی نے سر اٹھا کر اخبار اس کی طرف سرکا دیا۔
ے قریب جھک کر اس نے اچٹتی نظروں سے پورے کالم کا جائزہ لیا۔

"کماری روزی بنرجی، کماری سندھیا گھوش اور ــــــــ" وہ تیوری پر بل
بیٹھا اور خبر کو دوبارہ غور سے پڑھنا شروع کیا۔ ــــــــــــ

بیرہ چائے دانی لے کر حاضر ہوا۔ اوما نے ریحان کے لئے چائے بنائی۔

"لو چائے تو پی لو۔"

"پی لوں گا ــــ غضب ہو گیا۔ اوما۔ محمود الحق اور جیوتی دونوں شہید ہو گئے۔ روز
کتنی بری طرح زخمی ہوئی ہو گی۔ اس خبر کا کیا، کیا بھروسہ ہے۔"

"پُور گرل۔"

"محمود اور جیوتی دونوں ــــ" ریحان نے اخبار پرے سرکا کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔
منٹ تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اوما نے مضطرب ہو کے دیکھا کہ وہ چپکے چپکے رو رہا تھا۔

"اوہ ریحان ــــ پلیز ــــ" اوما نے اس کے بازو پر نرمی سے ہا

"سوشلسٹ فرنٹ! ابھی جانے اور کتنے مارے جائیں گے ــ اوہ گاڈ ــــ ابھی ا
جیوتی نے کس جوش و خروش سے مجھ سے بحث کی تھی ــــ اُرونا دی، جے پی، لوہیا انڈر گراؤنڈ
پر کھیل کر جن اندولن کو ڈائرکٹ کر رہے ہیں، اور آپ ریحان دا۔ انگریزوں کے پٹھو بن گئے ــــ'
۔ نو ــــ نوٹ جیوتی ــ نوٹ۔"

"اتنا غم نہ کرو ریحان۔ اندولن میں اسی طرح جانیں جاتی ہیں۔ سال بھر پہلے تم بھی کسی
مارے جا سکتے تھے ــــ لو چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے ــ"

"اوما ــــ" ریحان نے غصّہ سے کہا۔

"سوری اولڈ چیپ ــــ تم ہمیشہ یوں ہی مارے مارے پھرتے ہو۔ نہ کھانے کی فکر
لی چائے ملتی ہو گی۔ چند روز کے لئے میرے یہاں ہو تو اپنی صحت کا خیال رکھو۔"

"اوہ۔ سوری اوما۔ لاؤ۔ میں بہت upset ہوں۔"

"میں کیا upset نہیں ہوں۔ تم آملیٹ کھاؤ گے نا ــ؟"

"ہاں۔ دیدو۔"

"اب کچھ دیر کے لئے یہ تکلیف دہ حالات بھول جاؤ۔ آرام سے ناشتہ کرو۔ آج پھر تم کو دن بھر دوڑ دھوپ کرنی ہے۔ آتے ہی فرید پور بھاگ گئے۔" انھوں نے توسٹ دو حصوں میں کاٹ کر ریحان کے سامنے رکھا۔ آملیٹ پر کالی مرچ نمک چھڑکا۔ اور بچوں کی طرح چھری کانٹا اٹھا کر اس کے ہاتھ میں پکڑوا دیا۔

ہ مسکرا دیا۔

"ناؤ بی اے گڈ بوائے، اینڈ ایٹ۔"

وہ سر جھکا کر کھانے میں مشغول ہو گیا۔ آدما اس کو دیکھتی رہیں۔

"تمہارے ابا کیسے تھے، خیریت سے تھے؟"

"کون ـــــ؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"تم اپنے گاؤں گئے تھے نا۔ شونا پور۔ مجھ سے تو یہی کہہ گئے تھے۔"

"اوہ ـــ ہاں۔ نہیں۔ ہاں بالکل اچھے ہیں۔ تھینک یو۔" اس نے ایک لقمہ نگل کر پھر اخبار کی رف ہاتھ بڑھایا۔ آدما نے جھپٹ کر اخبار اٹھا لیا۔

"نہیں ملے گا۔ فنش یور بریکفاسٹ فرسٹ۔"

وہ پھر پلیٹ پر جھک گیا۔

"رات تم بہت دیر سے آئے۔ کیا پارٹی آفس میں اتنی دیر لگ گئی؟"

"رات ـ اوہ ـ ہاں ـ نہیں ـ رات میں دیپالی کے ہاں چلا گیا تھا۔" "دیپالی ـ؟"

"ہاں۔ کیا بھول گئیں اُسے؟ دیپالی سرکار۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ "نورالرحمٰن میاں" کے زمانے کے بعد بھی تمہاری اُس سے جان پہچان ہے۔"

"ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جس کا تم سے ذکر کرتا۔ دراصل وہ بھی کل ہی فرید پور سے لوٹی ہے پر اس سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔"

"اوہ۔ آئی سی ـــ" آدما نے زور سے چھری کانٹا اپنی پلیٹ پر پٹخا اور غصہ سے بیرے کو آواز دی ـــ

"کریم خاں ـــــــ"

بیرہ سُرعت سے نمودار ہوا۔

"کریم خاں۔ روز منع کرتی ہوں کہ انڈا ہاف بائل مت کرو۔" غصے سے ایک دم ان کا چہرہ سُرخ ہو چکا تھا۔

"اوہ اوما۔ دوسرا انڈا بنوا لو۔ ایسی بھی کیا قیامت آگئی۔"

"نہیں۔ تم جانتے نہیں۔ ممی گھر پر نہ ہوں تو یہ لوگ بالکل بیگار ٹالتے ہیں۔ ڈیم۔"

بیرہ غائب ہو چکا تھا۔

"کم آن۔ اُوما۔" ریحان نے ہنس کر کہا۔ "کوئی کانگریس سوشلسٹ سُنے گا تو کہے گا کمیونسٹ لیڈر اس طرح اپنے نوکروں کو ڈانٹتے ہیں۔"

"اوہ شٹ اَپ۔"

"اوما۔ تمہارا غصہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔" وہ آملیٹ ختم کرنے میں مصروف ہو گیا۔

سیزر سیڑھیاں پھلانگتا برآمدے میں آیا اور اپنی مالکن کے قدموں کے پاس ڈھیر ہو گیا۔ اوما۔ ناگواری سے اس پر نظر ڈالی۔

بیرے نے دوسرا انڈا لا کر اوما کے سامنے رکھا۔ ریحان نے نظر بچا کر شرارت سے کریم خاں کو آ ماری۔ بوڑھا بیرہ بھی خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ ہونٹ پچکا کر پیچھے ہٹا اور جا کر میز سے کچھ فاص پر اپنی ڈیوٹی پر کھڑا ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد یہ جان کر کہ اوما دیبی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہوگا، ریحان نے کہا۔ "اوما میں تم کو ایک ضروری بات بتانا چاہتا تھا۔"

"کریم خاں ——— دھوبی سے پوچھو میری ساریاں استری کر دیں۔"

کریم خاں اشارہ سمجھ کر غائب ہو گیا۔

"ہاں بتاؤ کیا بات ہے۔"

"میں دیپالی سے شادی کر رہا ہوں۔"

انڈے کا چمچہ سنبھالے اوما دیبی کا ہاتھ ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔

"اس کے بغیر اگر میں جیتے جی مر گیا تو موومنٹ نقصان ہوگا۔" ریحان نے مصنوعی سنجیدگی وضاحت کی۔

اوما اب عینک آتار کر بھونچکی سی اسے دیکھ رہی تھیں۔

"کیوں اُوما؟"

"تم — تم ریحان۔ جب سے ہم کالج میں داخل ہوئے۔ لندن میں رہے ایک ساتھ سیاسی کام ۔ تم نے آج تک مجھ سے اپنا کوئی ذاتی راز نہیں چھپایا تھا —— پھر اتنی بڑی بات مجھ سے کیوں پوشیدہ ی —؟"

ریحان ذرا سُرخ ہوگیا۔ عورتیں۔ "اُوما۔" اس نے متانت سے کہا۔ "مانتا ہوں تم میری دوست، سفی اور گائیڈ ہو۔ مگر یہ میرا بہت ہی — بہت ہی ذاتی معاملہ تھا اور میرا خیال تھا کہ ایک عورت دوسری ورت کے سلسلے میں کبھی غیر جانبدارانہ رائے نہیں دے سکتی۔"

"یہ تم کس لئے کہہ رہے ہو؟ میں جو تم کو اپنا — اپنا —"

"اوہ — کم آن اُوما ... مجھے افسوس ہے کہ تم کو میری اس رازداری سے دکھ پہنچا۔"

"کیوں —" اُوما نے کرسی پر پہلو بدلا۔ "اگر مجھے پہلے ہی معلوم ہو جاتا کہ تم اسے پسند کرتے ہو تو ں پہلے سے دوگنا اس کا خیال کرتی۔ مجھے خود وہ لڑکی بہت پسند ہے۔"

"تمہیں بھی پسند ہے اُوما؟" ریحان کا چہرہ خوشی سے کھِل گیا۔ "ونڈرفل۔ تو تم میرے نخاب کو مانتی ہو؟"

"مجھے بہت پسند ہے۔ میں ہی اسے مُوومنٹ میں لائی ہوں۔ تم بھولتے ہو کہ ایک لحاظ سے ری ہی وساطت سے اس سے تمہاری ملاقات ہوئی۔"

"یہ تو غلط ہے اُوما۔ اس پر تو میں بہت پہلے زہر کھا چکا تھا۔ لَو ایٹ فرسٹ سائٹ وغیرہ۔ نمیرہ۔"

"تم جذباتی طور پر ابھی تک بیحد امیچور ہو۔"

"ابھی تو تم میرے انتخاب کی تعریف کر رہی تھیں، پھر میں امیچور کیسے ہوا؟ اُوما اپنا ہارڈ بوائلڈ ڑا تو کھاؤ۔ تم کو اس اطلاع سے ایسا — ایسی حیرت ہوئی ہے کہ بے چارے محمود اور جیوتی کی ہادت کا بھی ایسا ری ایکشن نہیں ہوا تھا۔ کمال ہے۔"

اُوما چہرہ سخت کر کے چاندی کے ننھے چمچے سے انڈے پر کھٹ کھٹ کرنے میں مصروف ہوگئیں۔

ریحان کہنیاں میز پر رکھے انہیں دیکھتا رہا۔ یہ شاید میری زیادتی ہے۔ ایسی مخلص دوست کے میں ایسی سخت باتیں کر رہا ہوں۔ "سوری اُوما۔ واقعی مجھے بہت پہلے تم کو اپنا ہمراز بنانا چاہیے تھا مگر حالات بھی تو کیسے ابنارمل تھے۔ مستقل انڈر گراؤنڈ، مسلسل احتیاط، اور پھر وہ احمق بھی نہ کیوں مجھ سے خفا ہو گئی تھی، نہایت محنت سے اب جا کر اسے ذرا راہ راست پر لایا ہوں۔ اُفوہ یہ کرنا بھی خاصی مشقت ہے۔ تم تو کبھی اس چکر میں پڑی نہیں، تمہیں کیا معلوم۔"

اُوما چپ چاپ انڈا کھانے میں مصروف رہیں۔

"لو۔ اب تم خفا ہو گئیں۔ یہ کیا مصیبت ہے یار" پھر اس نے دفعتاً بڑی گمبھیر آواز میں کہا:

"اُوما۔ تم جانتی ہو، میں مدتوں گاؤں جا کر اپنی بہن سے نہیں مل پاتا۔ ڈھاکے میں اپنے نواب رشتہ داروں سے ملنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ صرف تم ہی میرے لئے سب کچھ ہو۔ تمہارے خلوص کی سے یہ گھر تک مجھے اپنا گھر معلوم ہو رہا ہے۔ حالانکہ۔" وہ تمسخراً ہنسا "وڈ لینڈز کو اپنا گھر سمجھنا ہے مگر بہر حال اتفاق سے تم اسی محل میں پیدا ہوئیں۔ کیا کیا جائے۔ تم جہاں رہو گی وہی میرا گھر

اُوما نے پلکیں جھپکائیں۔ ان کی عینک کا شیشہ دھندلا ہو چکا تھا۔ ریحان جھینپ کر دوسری دیکھنے لگا۔ وہ جذباتیت سے بے انتہا گھبراتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی خاصا جذباتی ہو رہا ہے۔ وہ جلدی سے کرسی پیچھے سرکا کر اٹھا۔ اور لپک کر اپنے کمرے سے سگریٹ اور ماچس اٹھا لایا سگریٹ سلگا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بشاش آواز میں اس نے کہا "لاؤ گرما گرم چائے تو بنا کر دو۔"

اُوما نے آہستہ سے ٹی کوزی اٹھا کر چائے اس کی پیالی میں انڈیلی۔

"میں۔ میں تو اب چلا جاؤں گا واپس بمبئی۔ دیپالی تمہارے حوالے۔ تم میری غیر موجودگی میں اس خیال رکھنا۔ وہ ذرا بے وقوف سی لڑکی ہے۔ اگر کبھی کوئی حماقت کی بات کرے تو میری خاطر اسے معاف دینا۔ وعدہ؟"

"وعدہ"

"گڈ اولڈ اُوما" وہ اطمینان سے چائے پینے میں جٹ گیا۔

"تمہارا خیال ہے بنوئے بابو اس شادی کی اجازت دے دیں گے؟"

"کوشش تو میں ہی کروں گا۔"

"اور تم دونوں ہول ٹائمر کی تنخواہ پر گزر کرو گے؟"

"اُوما۔ تم تو کسی بورژوا بڑی بی کی طرح بات کر رہی ہو۔ اتنے ہول ٹائمرز نے آج تک کس شادیاں کی ہیں۔؟ ان سب کی بیویاں کہیں کام کر رہی ہیں۔ دیپالی اتفاق سے گریجویٹ ہے اور سنگیت ر ـــــــ کمال ہے بھئی تم جب بیاہ کرو گی تو کوئی مارواڑی سیٹھ یا ڈپٹی کمشنر تلاش اپنے لئے؟"

"بکواس مت کرو۔"

"اوہ۔ سوری۔ سوری۔"

"چنانچہ ـــــ دیپالی گا بجا کر گھر کا خرچ چلائے گی۔ ریڈیو پروگرام اور ریکارڈوں کی ی رائلٹی اور میوزک کے ٹیوشن۔ اور آپ بیوی کی کمائی پر ـــــ"

"اُوما ـــــ" ریحان کو اب پہلی بار غصہ آیا۔ "تم آج کیسی عجیب و غریب باتیں کر رہی ہو۔ ین نہیں آتا۔"

"میں بورژوا بڑی بی نہیں ہوں۔ محض چند پریکٹیکل باتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہوں۔ یہ تمہاری نوماد تھ خانہ بدوش زندگی ـــــ شادی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہے ـــــ"

"اُوما ـــــ تم سچے دل سے کمیونسٹ کبھی نہیں تھیں ـــــ اس کا یہ مطلب ہے۔"

"میں سچے دل سے تمہاری دوست ہوں۔ اور دوسری بات ـــــ اگر تم اس خوش فہمی میں دے بابو تمہیں بخوشی اپنا داماد بنا لیں گے ـــــ وہ قدامت پسند ہندو ہیں۔"

"جہاں تک میں نے چند ملاقاتوں میں اندازہ لگایا تھا، وہ بالکل کمیونل نہیں ہیں۔ اور بہرحال میں و۔ وہ اگر اجازت نہ بھی دیں تو کیا مضائقہ ہے۔ دیپالی اکیس سال کی ہو چکی ہے۔ ہم لوگ کلکتہ جا ل میرج کر لیں گے۔"

"مجھے تمہاری طرف سے بے حد پریشانی ہے ریحان۔ نہ جانے تم کس آفت میں پھنس جاؤ۔"

"افوہ۔ تم تو اتنی متفکر ہو گئیں گویا آج تک ہندوستان میں کوئی انٹرکمیونل شادی ہی نہیں۔ اچھا۔ تم ایک کام کرو۔"

"کیا ـــــ؟"

"چندر کنج جا کر میری سفارش کر دو۔ جھٹ پٹ۔"

"میں ـــــ؟"

"دیپالی کہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر سرکار پہلی ملاقات ہی میں تم سے بے حد متاثر ہو گئے تھے۔ جب "کلثوم آپا" کی سازش کے سلسلے میں اسے اپنے ساتھ فرضی طور پہ کومیلا لے گئی تھیں۔ یوں اسے اگر ان کے ہاں دیر لگ جائے تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں ـــــ"

"دیپالی کیا کہہ رہی تھی؟"

"کیا ـــــ؟ تمہارے متعلق ـــــ؟" اس نے ہنس کر جواب دیا۔ "کہہ رہی تھی ایسا لگتا اُوما دی نے بابا پر جادو کر دیا ہو۔"

"گُڈ گاڈ۔"

"قسمیہ۔ اوما تم سچ مچ جا کر ذرا ان کے خیالات کا اندازہ تو لگاؤ۔"

"مجھے مڈل کلاس ہندو بنگالیوں کے خیالات کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ بھدرا لوگ۔"

"مجھے بھی اندازہ ہے۔ مگر میں ہندو بنگالی بورژوازی بھدرا لوگ کی نظروں میں کم از کم "اشرا تو ہوں۔ ذرا غور کرو۔" وہ پھر ہنسا۔ "ہمارے بنگال کی ہندو بورژوازی مسلم بورژوازی کو کس طر انداز میں "اشراف" کہہ کر گویا tolerate کرتی ہے۔!!"

"اگر کوئی تمہارے اس لہجے کو سنے تو سمجھے کہ شاید تم بھی کمیونل ہو۔ سچے دل سے کمیون نہیں۔" اوما نے ہنس کر جواب دیا۔

ریحان بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "بہرکیف تم اب اپنے دوسرے مشن پر چندر کنج

"کوئی ہندو یا مسلمان باپ چاہے وہ کتنا ہی روشن خیال کیوں نہ ہو اپنی لڑکی کو دوسرے میں شادی کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔"

"تمہارے ڈیڈی بھی؟"

"میرے ڈیڈی کا یہاں کیا ذکر ہے۔"

"کیوں؟" وہ ہنستا رہا۔ "فرض کرو تم کسی "اشراف" سے بیاہ کرنا چاہو، یا عیسائی انگریز سے یا چینی، جاپانی، روسی سے، تو سر بری توش اجازت نہ دیں گے؟ وہ تو بے حد آزاد خیال ہی

"میرے بیاہ کا کیا ذکر ہے۔"

"اوکے، اوکے آدما۔ بچیوں کی طرح شرماؤ نہیں۔ ہے کوئی مرغا نظر میں؟ چلو میں سرپرستی تو شرعی وکالت کر دوں گا۔ تم ہونے والے بابو سے میرا پروپیگنڈہ کرو۔ لاؤ ملاؤ ہاتھ۔" اس نے دوستانہ سے آدما کا ہاتھ کھینچ کر زور سے مصافحہ کیا۔ آدما نے غصے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ "ریحان۔ تمہارا ریپن کب جائے گا؟"

"اسی لونڈہار پن کو ختم کرنے کے لئے تو اب گھر بسانے کا ارادہ ہے ہمارا۔"

"کل شام کیا پروپوز ــــ؟"

"نہیں۔"

"ابھی تک کوئی بات ہی نہیں کی؟"

"یوں ہی ــ ذرا شاعری داعری بگھارتا رہتا ہوں۔ اس سے کہنا تو ہے کہ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ عدہ سنجیدگی سے۔ ایسا کہتے ہوئے بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ اگر وہ اپنی یار دوست اور کامریڈ نہ ہوتی، ٹکی ہوتی تو دوسری بات تھی۔ اب عجیب مسخرہ پن سا لگتا ہے۔ تم۔ تم میرا مطلب سمجھ نہیں سکتیں۔ سے formal طور پر کیا کہوں؟ بس ایک روز بھگا کر لے جاؤں گا۔ بھگانے کا الٹی میٹم اسے البتہ یلے ہے۔"

"تم بالکل دیوانے ہو ردنو۔"

"ہوں تو سہی۔"

اب ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ پہلو کا باغ بیحد تر و تازہ اور دلفریب معلوم ہو رہا تھا۔

"اچانک آدما نے کہا ــــــ "تم بے چاری جہاں آرا کو اتنی جلدی بھول گئے۔"

وہ ایک دم اس غیر متوقع تذکرے سے ششدر سا رہ گیا۔ پھر اس نے سگریٹ کا کش لگایا اور کر سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ "اتنی جلدی تو نہیں، کافی عرصہ ہو گیا۔"

"اوہ ۔ یُومین (MEN) ۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ مسز آب آدما دیبی کے قدموں سے اٹھ کر گرانباری سے چلتا ہوا کمرے کی طرف جا ۔ وہ اسے دیکھتی رہیں۔ پھر انہوں نے دوسرا سوال کیا ــــــ "دیپالی کو معلوم ہے؟"

"نہیں ۔"

"تم نے اُسے کچھ نہیں بتایا ؟"

"بتانے کی کیا خاص بات تھی ۔ جہاں آرا ، بے چاری کی میری موجودہ زندگی میں اب کیا ہے کہ میں خواہ مخواہ اس کا تذکرہ چھیڑتا ۔ اور بات بھی کیا تھی کہ جہاں آرا کے والد مجھے اپنا گھر داماد چاہتے تھے ۔ ایسا اکثر مسلمان گھرانوں میں ہوتا ہے ______"

"دیپالی جہاں آرا کی گہری دوست ہے ۔"

"میں جانتا ہوں ۔"

"تم ابھی کہہ رہے تھے کہ پچھلے دنوں وہ تم سے خفا ہو گئی تھی ۔ ممکن ہے اُسے معلوم ہو گیا اس وجہ سے وہ تم سے ______"

وہ جھنجھلا گیا ___ "اگر اس وجہ سے ناراض تھی تو مجھے بآسانی بتلا سکتی تھی ۔ وہ بے صاف دل اور منہ پھٹ لڑکی ہے ۔" وہ دفعتاً چپ ہو گیا ۔ اور تیوری پر بل ڈال کر بولا ۔ "پتہ لاحول ولا قوۃ ___ عورتوں کے دماغ بھی عجیب انداز سے کام کرتے ہیں ۔ اُسے مجھے بتانا تو چا تھا ۔ اگر یہی بات ہے ______ مگر تم کو یہ خیال کیسے آیا ؟"

"میں بھی عورت ہوں ۔"

"لائیک ہیل ۔" وہ یک لخت بیحد پریشان ہو کر پیالی میں چمچہ بجانے لگا ___ "اد مائی گا اُوما ، تم ٹھیک کہتی ہو ۔ میں واقعی عجیب آفت میں مبتلا ہو گیا ہوں ۔ مجھے پارٹی کی طرف سے ما سے ہی بات چیت کرنی ہے ۔ ارجمند منزل جا کر ___ اوہ ہل ___"

"ارجمند منزل کب سے نہیں گئے ؟"

"مدتیں گزر گئیں ۔"

"کیوں نہیں جاتے ، کیا احساسِ جرم ستاتا ہے ؟"

"یہی سمجھ لو ۔"

"کبھی جہاں آرا یاد آتی ہے ؟"

"اپنی پہلی محبت کو انسان کبھی نہیں بھول سکتا ہے ؟"

"تم نے مجھے ایک بار لندن میں سرسری سا بتایا تھا۔ وہ تمہاری فرسٹ کزن ہے نا؟"

"بسکنڈ۔ اب چھوڑو اس قصّہ کو۔ گڑے مردے اکھیڑنے بیٹھ گئیں۔"

"بے چاری لڑکی۔"

"یو آر اے ڈیم کروک اُوما۔"

وہ ہنسنے لگیں۔

"اور میں نے کون سا ایسا جرم کیا ہے جس کے کنفیشن کی ضرورت ہے؟"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کے متعلق تمہیں دیپالی کو اندھیرے میں نہ رکھنا چاہئے۔"

"ڈیرٹ —— آئی ایم افریڈ —— از مائی اون بزنس۔"

اُوما نے تازہ چائے کے لئے گھنٹی بجائی۔ وہ اس جذباتی چھوکرے کو ہینڈل کرنا خوب جانتی تھی سرکا کر انہوں نے چند لمحوں بعد موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا —— "بے چارے محمود اور —— ہم اپنی باتوں میں ان دونوں کو بالکل بھول ہی گئے۔"

ریحان نے پلکوں پر انگلیاں پھیریں "خدا کے لئے چپ رہو اُوما۔"

وہ بھی خاموش ہو کر بارش کو دیکھنے لگیں۔ خدمت گار برآمدے میں آیا۔ اُوما نے چائے دانی کی اشارہ کیا۔ —— وہ چائے دانی اٹھا کر اندر چلا گیا۔ اُوما نے آہستہ سے "مجھے اس وقت گرٹرڈ یاد آرہی ہے۔ کس طرح گولیوں سے چھلنی ہو کر مری بے چاری۔ اسپین سے اتنے بعد ہمیں اطلاع ملی تھی۔ یاد ہے؟"

ریحان نے الم سے سر ہلایا۔

"اور مجھے یاد ہے جب تمہاری امّی کے انتقال کی خبر آئی تو تم نے کہا تھا ایک طرح سے اچھا ا۔ اگر میں بھی گرٹرڈ کی طرح کہیں موت کے گھاٹ اتروں تو امّی زندہ نہ رہ سکتیں! اس وقت نہ بیچارے محمود کی ماں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ جیوتی کے ماں باپ تو غنیمتاً اس کے بچپن ہی میں مر ے"

ریحان اب یہ غمناک تذکرہ ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اُوما آنکھیں بند کر لیکن اب اتنے عرصہ بعد اچانک اس کی امّی اس کے تصور میں آن موجود ہوئیں —— میری امّی —— میری

امّی ۔۔۔ اُس نے دفعتاً سر ہاتھوں میں چھپا کر میز پر ٹکا دیا۔

"رونو ۔۔۔۔"

صرف اس کی امّی اتنے پیار سے اسے رونو پکارتی تھیں۔ رونو لو چائے آ گئی۔ اٹھو۔

"رونو۔ لو چائے آ گئی۔ اٹھو۔" اُوما کہہ رہی تھیں۔

اُس نے ہڑبڑا کر سر اُٹھایا۔ اور چوروں کی طرح آوما پر نظر ڈالی۔ مائی لِٹل مدر۔

آوما چائے گھولنے میں مصروف رہیں۔ وہ چپ چاپ اپنی پیالی کا انتظار کرنے لگا۔

"ایک بات سنو۔ مذاق برطرف۔" اوما نے اسے پیالی دے کر کہا۔ "تم نے اپنی غیر موجودگی : دیپالی میرے حوالے کی ہے۔ فرض کرو وہ تمہارے اس قصّے کے بارے میں مجھ سے پوچھے تو میں اُ کیا بتاؤں۔"؟

"کوئی ایسی بات نہیں ہے، تم خواہ مخواہ اتنی دیر سے لمبا چوڑا میلو ڈرامہ بنا رہی ہو۔" ریحا پھر جھنجھلا کر کہا۔

"مگر مجھے پوری تفصیل تو معلوم ہونی چاہیے۔ فرض کرو جہاں آرا اس سے کچھ کہے تو خود اُ کی پوزیشن کتنی نازک اور awkward ہو گی۔ اور وہ تمہارے متعلق کیا سوچے گی کہ تم نے دو کو چُل دیا۔ پہلے جہاں آرا کو دغا دی اور پھر اسے دھوکے میں رکھا۔ جبکہ وہ جہاں آرا کی اتنی گ دوست ہے ۔۔۔۔ مجھے یقین ہے وہ اسی وجہ سے تم سے بدک گئی تھی۔ نواب صاحب تم گھر داماد بنانا چاہتے تھے۔ مگر تم کو جہاں آراء سے خود کوئی دلچسپی نہ تھی؛ تم بالکل بے قصور ہو۔

"کیا میرا ٹرائل ہو رہا ہے؟ تم کو تو واقعی بیرسٹر ہونا چاہیے تھا۔"

"تمہاری امّی نواب قمر الزماں کی سگی چچا زاد بہن تھیں۔؟"

میری امّی ۔۔۔ میری امّی۔

بارش کی لطیف دھند باغ پر منڈلاتی رہی۔ ہوا میں پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

"پھر تمہیں جائداد میں حصہ کیوں نہیں ملا؟"

"اوہ آوما ۔۔۔ آوما ۔۔۔ ڈونٹ بی سچ اے بور۔ تم کو بتلا چکا ہوں۔" ریحان اکتا کر جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "مگر تم ساری الف لیلے نہ جانے کیوں پھر سننا چاہتی ہو۔ آل رائٹ

جائداد میں حصّہ نہیں ملا۔ جس کی مجھے مطلق پرواہ نہیں۔ میرے نانا نوابزادہ فخرالزماں چودھری ب نورالزماں چودھری کے چھوٹے بھائی تھے۔ آیا خیال میں۔ یاد کرلو۔ گرہ میں باندھ لو۔ اور بار اپنے سوالوں سے مجھے بور نہ کرنا۔ میرے نانا فخرالزماں چودھری نواب قمرالزماں کے والد نواب لزماں کے اکلوتے چھوٹے بھائی تھے۔ اب رٹ کر سبق سناؤ۔ چلو۔ تم بھی کیا یاد کروگی۔"

اوما قہقہہ لگا کر ہنسیں۔ "آگے بتاؤ۔ بڑا الف لیلوی قصّہ ہے۔"

"لائیک ہل۔ الف لیلوی قصّہ یہ ہے کہ نانا جان اپنے بڑے بھائی کی طرح بے حد رنگین ج تھے۔ صرف کلکتہ کی گوہر جان پر ایک گاؤں نچھاور کردیا تھا۔ اور ایک وہ۔ بچپن میں سنا تھا۔ لکھنؤ کی ننوا آپجوا اور دلّی کی چھمیا اور بنارس کی بے نظیر۔ فیوڈل ڈیکیڈنس کی بات کرتے آپ لوگ۔" اس نے پیالی ذرا زور سے طشتری میں رکھی۔

"تم کو پتہ ہے ہم بورژوا لوگوں کو تم فیوڈل لوگ بیحد فیسی نیٹ کرتے ہو۔" اوما نے مسکرا ہا۔

"بکواس۔ بہرحال۔" ریحان نے ماچس کے لئے کرتے کی ایک جیب میں پھر دوسری ب میں ہاتھ ڈالا۔

"سگریٹ پینے بند کردو۔ ہاں پھر کیا ہوا۔؟"

"پھر یہ ہوا کہ نانا جان نے ایک تھیٹر کمپنی میں روپیہ لگایا۔ مرحوم خود بھی ناٹک لکھتے تھے۔ بند منزل میں باقاعدہ جلسہ گھر تھا۔ بہرحال۔ تھیٹر کمپنی کا منیجر سارا روپیہ غبن کرکے رنگون بھاگ گیا۔ جب عین عالم جوانی میں نانا جان کا اچانک حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے انتقال ہوگیا ں وقت ان کے حصّے کی زمینداری مہاجن کے ہاں رہن رکھی ہوئی تھی۔

"امّی ان کی اکلوتی لڑکی تھیں۔ جب نانا جان مرے تو شاید چھ یا سات سال کی تھیں۔ والد کے نے کے دوسرے سال کالرا کی وبا پھیلی۔ اور اس میں ان کی والدہ بھی چل بسیں۔ امّی اپنے تایا کے یہاں پلنے نواب زادہ فخرالزماں کی جو جائداد فضول خرچی اور عیّاشی سے باقی بچی تھی نواب نورالزماں نے رہن سے ڑا کر بھتیجی کے قانونی سرپرست کی حیثیت سے اپنے قبضہ میں لے لی۔ قاعدے سے امّی کی شادی نے تایا زاد بھائی یعنے نواب قمرالزماں سے ہونی چاہیے تھی۔ بیگم نورالزماں اب شوہر کی یتیم اور نادار

بھتیجی کو کیوں خاطر میں لائیں۔ وہ کشتیہ کے ایک نواب کی لڑکی کو دیکھ آئی تھیں جو جہیز میں گا مکانات، باغات اور پٹ سن کے کھیت سب ہی کچھ لے کر آئی۔"

وہ سانس لینے کے لئے رکا۔ ماچس سے کھیلنے لگا اور پھر بولا۔ "امی ابھی سولہ سال کی بھی ہوئی تھیں کہ نواب نورالزماں نے ان کی شادی ایک نوجوان غریب مولوی سے کر دی ـــــ جو ان لڑکے کو عربی فارسی پڑھانے آیا کرتے تھے۔"

"اوہ ـــــ"

"امی کا حمایتی یا پرسانِ حال ان کے ننھیال میں بھی کوئی نہ تھا۔ باقی رشتے دار حسبِ معمول آ کی زمینداری کی مقدمہ بازیوں میں جٹے ہوئے تھے۔ ایک یتیم لڑکی کی ذمہ داری کون سنبھالتا۔ ان ماموں اور نانا وغیرہ سب مر چکے تھے۔ نواب نورالزماں کے قریبی رشتے دار ہی امی کے ننھیالی لوگ تھے اور سب نواب کی مطلق العنانی اور دبدبے سے خائف تھے۔ نواب صاحب نے کہا کہ لڑکا سیّد اور بے شریف ہے۔ اور نکاح پڑھوا دیا۔ اور واقعی ابّا بہت ہی فرشتہ صفت اور بھولے انسان نکلے۔ ابّا گاؤں شونا پور نواب صاحب کے علاقے کے پڑوس میں تھا۔ ان کے ہاں کاشتکاری ہوتی تھی۔ میرے ابّا تینوں چچا اور ان کے لڑکے کاشتکار ہیں۔ خود کھیت بوتے اور جوتتے ہیں، خود فصل کاٹتے ہیں۔ حقّہ لے چوپال پر بیٹھتے ہیں۔ ہم اصل نسل کسان ہیں۔ آدما۔"

"تمہاری امی خوش رہی تھیں؟"

"تم جدید لڑکی ہو آدما اور تم پچھلی نسل کی مسلمان اور ہندو لڑکیوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ صبر و قناعت اور شوہر کی خدمت جن کا دین ایمان تھا۔ امی کو تو اپنے تایا سے بھی شکایت نہ تھی۔ نہ اپنے باپ سے جن کی رنگ رلیوں کا اثر اس طرح ان کی اپنی زندگی پر پڑا۔" وہ چپ ہو گیا۔

"کمال ہے۔ تم نے مجھے یہ سب اس مرتبہ لندن میں نہیں بتایا تھا۔ ہمیشہ کتراتے رہے۔"

"میرے ذاتی حالات سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

"مجھے تو ہے ردلو۔ کیا تم واقعی مجھے اپنا پُر خلوص دوست نہیں سمجھتے؟"

جب لندن میں اس کے پاس ماموں جان ـــــ نواب قمرالزماں کا کیبل آیا تھا کہ اس کی امی کا گاؤں میں نمونیہ سے انتقال ہو گیا۔ وہ خود بیمار پڑا ہوا تھا۔ اس زمانے میں آدما نے کس لگن سے اس کی دلجو

تھی۔ دن رات وہ اس کے ارلز کورٹ کے ڈگز میں سرہانے بیٹھ کر اس کا ٹمپریچر لیتی۔ اسے دوا پلاتی۔ س کے لئے کھانا پکاتی۔ اس کے کپڑے تک دھوتی اور استری کرتی۔ صرف اس کی امّی ہی نے اس کی یسی دیکھ بھال اور خدمت کی تھی۔ آدما کا یہ بے لوث سلوک وہ عمر بھر نہ بھول سکتا تھا۔

"پھر کیا ہوا اردنو ——؟"

"ارے تمہیں بتلایا تو تھا یار ——"

"تمہاری امّی غریب کسان گھر میں کس طرح خوش رہیں؟"

وہ اُداسی سے مسکرا دیا۔ "مجھے یاد ہے۔ میں چھوٹا سا تھا اور ایک اندھیری رات برآمدے بں چٹائی بچھائے لالٹین سامنے رکھے اسکول کا سبق یاد کرنے میں مصروف تھا۔ جب اندر سے مّی کے آہستہ آہستہ رونے اور ابّا کے چلّانے کی آواز آئی۔ میں امّی کو بے حد چاہتا تھا۔ ان کے رونے کی آواز سے گھبرا کر میں نے باشا کی دیوار سے کان لگا دیے اور پھر سوراخ میں سے جھانکا۔ امّی دن بھر کام اج کی محنت کے بعد تھک کر رونے لگی تھیں۔ وہ چولہے کے پاس پیڑھی پر سر جھکائے بیٹھی تھیں اور میرے ابّا —— مجھے وہ منظر اب تک یاد ہے۔ میرے ابّا کمرے کے دروازے بں کھڑے اس متانت سے تقریر کر رہے تھے گویا جمعہ کے منبر پر وعظ کہتے ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے، میں نے تم کو ملیحہ بی بی شادی کے دوسرے دن سمجھا دیا تھا کہ بھول جاؤ کہ تم نواب فخرالزماں مرحوم لی بیٹی اور نواب نورالزماں چودھری رئیس اعظم فرید پور کی بھتیجی ہو —— اور ہمیشہ یاد رکھو —— انہوں نے شہادت کی انگلی اٹھا کر کہا —— کہ تم ایک غریب سیّد کی بیوی اور آلِ رسولؐ کی بہو ہو —— اور یاد رکھو حلیمہ بی بی کہ شہنشاہِ کائناتؐ کی بیٹی مولا علیؑ کے گھر میں چکّی پیستی تھیں۔ ور ایران کی بادشاہ زادی شہیدِ کربلاؑ کے گھر میں فاقہ کرتی تھی۔ تم تو ان سب کی خاکِ پا بھی نہیں ہو۔ توبہ استغفار کرو! اور اللہ سے ڈرتی رہو۔ وہ بخشش والا اور مہربان ہے —— ابّا رسول اللہؐ کا نام لینے کے بعد درود پڑھ کر بار بار داڑھی پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ ان کی سنجیدہ شکل اور ہوا میں لرزتی داڑھی پر میری نظر پڑی تو باشا کی دیوار کے اُدھر مجھے اپنی پریشانی کے باوجود بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ور میں اپنی شتیل پاٹی پر واپس آن بیٹھا۔ امّی ساری کے آنچل سے آنسو پونچھ کر پھر چولہے پر جھک گئیں۔ اور ابّا باہر چلے گئے۔

"اس کے بعد مجھے یاد ہے، امّی نے ابّا سے پھر کوئی شکایت نہیں کی، اور خاموشی سے شوہر، ساس، سسر، دیور، جیٹھ اور نندوں کی ٹہل میں لگی رہیں۔ انھیں واقعی یہ فخر تھا کہ سیّد کی بیوی ہیں۔ بے حد مذہبی تھیں۔ پانچ وقت کی نماز، روزے رکھتیں۔ میرے لیے طرح طرح کے وظیفے پڑھتیں، منّتیں مانتیں ــــ" ریحان کی آواز بھرّا گئی اور اس نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"یہ سب لوگ کون تھے؟" آدما نے پوچھا۔

"کون ــــ؟" ریحان نے چونک کر دریافت کیا۔

"یہی سب جن کی محنت کشی کی مثال تمہارے ابا نے اُن کے سامنے پیش کی۔"

"پروفیٹ محمّد کی بیٹی اور ان کے نواسے کی بیوی۔ وغیرہ ــــ ارے چھوڑو آدما۔ تم کو ان باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کیا پرانے قصّے لے کر بیٹھ گئیں۔" وہ کرسی سے اٹھ کر برآمدے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔

"تمہارے ابّا بڑے بلند کردار کے انسان معلوم ہوتے ہیں۔"

"ابّا ــــ" وہ ٹہلتے ٹہلتے ٹھٹھک گیا۔ "ابّا حیرت انگیز، بے مثال شخصیت کے مالک ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے گھر والے ان کو ذرا سا خبطی گردانتے ہیں۔ مگر گاؤں والے ان کو اچھا خاصا ولی اللہ بھی سمجھتے ہیں ــــ جب امّی کی شادی ہوئی تو نواب نورالزماں نے ان کو جہیز دیا۔ نواب زادہ فخرالزماں کا چھوڑا ہوا تھوڑا سا روپیہ موجود تھا اور بہرحال امّی نواب نورالزماں کے سگے بھائی کی اولاد تھیں اور وہ ان کی جائیداد قبضے میں کر کے ان کی کافی حق تلفی کر چکے تھے۔ بہرحال۔ تو امّی کا تھوڑا بہت جہیز بنایا گیا۔ جو غریب کسانوں کے لئے تو کسی شاہی خزانے سے کم نہ تھا مگر جب ابّا کشتیوں پر لدے مولویوں اور کاشتکاروں کا قافلہ بارات میں لے کر پہنچے تو انہوں نے جہیز کا سامان قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ امّی بتایا کرتی تھیں کہ کہنے لگے وہ نواب نورالزماں کے ایسے غریب داماد نہیں کہلانا چاہتے جنہوں نے بیوی کے روپے سے اپنا گھر بھر لیا۔ لہٰذا وہ صرف امّی کے کپڑوں کے صندوق اٹھوا کر امّی کو رخصت کرا لے گئے۔ امّی کے زیور البتہ جب میری بہن رابعہ پیدا ہوئی تو نواب صاحب نے اس کے نام سے بینک میں محفوظ کر دیئے تھے۔ ابّا بہرحال اسی طرح دھان اُگاتے اور جمعہ گھر میں نماز پڑھاتے رہے ــــ"

"سچے کمیونسٹ ——" اوما نے کہا۔

ریحان ہنسنے لگا۔

"اصل قصہ تو تم نے اب تک بتایا نہیں۔"

"لاحول ولاقوۃ۔" وہ عاجز آکر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"جب میں گاؤں کے اسکول میں داخل ہوا اور بقول شخصے میری ذہانت کی دھوم مچنے لی تو نواب قمر الزماں امی ابا سے مصر ہو کر مجھے ڈھاکے لے آئے۔ میں جب چھ سات سال کا تھا ب نواب نورالزماں کا جنھیں میں بڑے نانا کہتا تھا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح یاد ں۔ بالکل پرانے فیشن کے، کار چوبی چوغہ پہنے ہوئے جغادری زمیندار۔ جیسے پرانی کتابوں کی سویروں میں ہوتے ہیں۔ بہرحال۔ اب قمر الزماں ریاست کے مالک تھے۔ وہ مجھے ڈھاکے ے آئے۔ اور اسکول میں داخل کر دیا۔ میں اس وقت بارہ تیرہ سال کا تھا۔ میں ارجمند منزل میں ، رہا تھا۔ اور نیر الزماں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اسکول جایا کرتا تھا۔ ابا کو ماموں جان نے یقین دلایا تھا امی کا روپیہ جو ابا نے شادی کے وقت لینے سے انکار کیا تھا میری تعلیم پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ اس کے وجود بیس روپیہ مہینہ باضابطہ ہر مہینے ابا گاؤں سے میرے نام منی آرڈر کرتے۔ ماموں جان مسکرا کر روپیہ وصول کرتے۔ اور میرے نام ڈاک خانے میں جمع کرتے رہتے۔ اصلیت یہ تھی کہ میں ارجمند زل میں ماموں جان کے لاڈلے نور نظر کی حیثیت سے پروان چڑھایا جا رہا تھا۔ ان کا بیٹا خاصا کوڑھ ز تھا۔ ماموں جان اس کی طرف سے بہت مایوس تھے۔ اور مجھے آئیڈیلائز کر رہے تھے۔ اور اصل بات اری یہ تھی کہ وہ جہاں آرا سے میری شادی کرنا چاہتے تھے۔ ماموں جان علی گڑھ کے معتقد تھے، انہوں الیف۔ اے کے لیے علی گڑھ بھیج دیا۔ وہاں میں مزید لائق اور ہونہار ثابت ہوا۔ ماموں جان کے چار سارے خاندان میں واحد معقول اور ہونہار نوجوان صرف میں تھا۔ ماموں جان میرے لیے طرح طرح خواب دیکھنے لگے۔ بیرسٹری۔ آئی سی ایس کا مقابلہ، ان کے پٹ سن کے کاروبار کی دیکھ بھال۔

"جہاں آرا چھوٹی سی تھی۔ مجھ سے پانچ چھ سال چھوٹی ہوگی۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ بڑی ئی اور پتہ چلا کہ ماموں جان اس سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں، تو میں بے حد خوش ہوا۔ میرا خیال تھا کالج سے نکل کر کسی اخبار میں کام کروں گا۔ ——— میں انگریز سرکار کی ملازمت کے سخت خلاف

ہو گیا تھا۔ کسی یونیورسٹی میں پڑھاؤں گا۔ اور جہاں آرا کو لے کر اپنا گھر الگ بناؤں گا۔

"ماموں جان کو واقعی مجھ سے محبت تھی۔ لیکن میری ذہانت وغیرہ کے علاوہ ماموں جان میر اتنا خیال رکھتے تھے اس کی غالباً ایک وجہ اور بھی تھی۔" ریحان نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ان کے والد نوا نورالزماں پرانے ٹائپ کے جابر اور مطلق العنان زمیندار تھے۔ ماموں جان ۔ قمرالزماں۔ ان کے برعکس ایک جدید انسان ہیں اور نیک دل۔ ان کو یہ احساس تھا کہ ان کے والد نے اپنی بے زبان بھتیجی ساتھ ہر طرح سے بڑی بے انصافی کی۔ وہ مجھے اپنا داماد بنا کر تلافی مافات کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ —— اس کے علاوہ ——" وہ یک لخت چپ ہو گیا۔

اُوما ہمہ تن گوش اسے دیکھتی رہیں۔ "اس کے علاوہ کیا رونو —— ؟"

ریحان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ ماموں جان امّی کو بے حد پسند کرتے تھے انہیں بچپن سے اپنی بنتِ عم ہی سے محبّت تھی۔ اور اگر ان کا بس چلتا تو وہ کشٹیہ کی رئیس زادی کے بجائے اُمّ ہی سے شادی کرتے ——"

"زندگی —— واقعی کتنی عجیب چیز ہے ——" اوما نے آہستہ سے کہا۔ "اور تمہاری امّی بھی نواب قمرالزماں کو پسند کرتی تھیں؟"

"یقیناً۔"

"اور کسی نے ان سے نہ پوچھا کہ ان کے دل پر کیا گزری ہو گی۔"

"نہیں۔ کسی نے ان سے نہیں پوچھا۔ اور نہ انھوں نے کسی کو بتایا۔ وہ مرتے دم تک پتی ورتابی رہیں۔ آخر دم تک شوہر کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں لگی رہیں۔"

"بنگالی عورت ——!"

"ہاں۔ بنگالی عورت! ہندوستانی عورت!!"

"وہ کبھی ارجمند منزل آتی تھیں؟"

"بہت کم۔ کسی خاندانی تقریب کے لئے کبھی کبھار آ جاتی تھیں اور ماموں جان ان کی خاطر مدارات میں دوڑے دوڑے پھرتے تھے۔ جاتے وقت دستور سے زیادہ تحفے تحائف ان کے ساتھ کرتے، مگر وہ سب کچھ یہیں چھوڑ جاتیں۔ کیونکہ ابّا دولت مند سسرال کا ایک پیسہ لینے کے روادار نہ تھے۔ اور امّی نے ساری

اُن کا یہ حکم مانا۔"

"فی مَسٹ ہیو بین اے گریٹ وومن۔"

"شی واز۔"

اب بارش تھم چکی تھی، اور باغ کی ابر آلود فضا بیحد خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ ریحان نے ی پر نظر ڈالی اور جلدی جلدی داستان ختم کرنا چاہی۔

"جب میرے ولایت جانے کا پروگرام بنا تو امّی نے چاہا کہ اپنے زیورات جو بینک میں محفوظ رو خت کر کے میرے ولایت کے خرچ کا انتظام کریں۔ ماموں جان نے ابّا کو تو یہ پٹی پڑھائی کہ مجھے ری وظیفہ مل گیا ہے۔ اور امّی سے چپکے سے کہا بی بی تم زیور اپنی بیٹی کے جہیز کے لئے رکھو۔ میں اپنے بھانجے مجھے نیّر کی طرح عزیز ہے، اپنے روپے سے لندن بھیج رہا ہوں، امّی کو معلوم تھا کہ ماموں جان ہ جہاں آرا کو مجھ سے بیاہ دینے کا ہے۔ وہ بیچاری بے حد مسرور تھیں۔ وہ اپنے شوہر کی ضد کی وجہ اری عمر تنگدستی میں گزار چکی تھیں۔ انھیں اب خوشی تھی کہ اس رشتے سے ان کے غریب بیٹے کی زندگی ے گی۔"

"تمہاری امّی کے پاس بہت گہنے تھے؟" اُوما نے خالص عورتوں کی سی دلچسپی سے پوچھا۔

ریحان نے ایک بار تعجب سے اس پر نظر ڈالی۔ "کہہ تو چکا ہوں، ان کی والدہ کے زیور تھے جو مایا نے بینک میں رکھوا دیئے تھے۔

"وہ ہیرے جواہرات جو امّی کو ملنے چاہئیں تھے، ان پر ان کی والدہ کے انتقال کے بعد سب بیگم ل ان کی تائی پہلے ہی قبضہ کر چکی تھیں۔

"چنانچہ میں ماموں جان کے خرچ پر لندن گیا۔ وہاں سے لوٹ کر آیا تو یہاں شادی کی ہو رہی تھیں۔ مجھے ہار پھول پہنائے گئے، ارجمند منزل میں زوردار دعوت ہوئی۔ شونا پور سارا گاؤں گھاٹ پر استقبال کے لئے موجود تھا۔ صرف امّی نہیں تھیں۔ جن کو میری آمد سے زیادہ انتظار تھا۔ وہ سال بھر پہلے مر چکی تھیں۔ ابّا نے جمعہ گھر میں جا کر شکرانے کی نماز چوپال میں گانے کی محفل ہوئی۔ بیاتیوں نے فوراً میرے لئے گیت بنائے۔ میں گاؤں والوں ایک عجوبہ روزگار ہستی بن چکا تھا۔ جب میں ڈھاکے واپس آیا ——— (تم تو ابھی لندن میں

تھیں۔ یہاں کیا کیا ہنگامے رہے میرے ساتھ؟ تو شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ ماموں جان گلے لگا کر سر پر ہاتھ پھیر کر مجھ سے کہا کہ شادی کے بعد میں ان کا پاٹ کا کاروبار اپنے ذمہ لے لو اپنے کتب خانے کی میز پر زمینداری کے کاغذات اور رجسٹر کھولے بیٹھے تھے۔ میری رہائش کے کوٹھی کی دوسری منزل کے کمرے آراستہ کئے جا چکے تھے۔ ہر چیز پہلے سے طے شدہ تھی۔

"تب میں نے ان کو اطلاع دی کہ میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا ممبر ہو چکا ہوں۔ یہ سن کر ان پر سی گر پڑی۔"

"آئی ڈونٹ بلیم ہِم —" آپا نے کہا۔

"مجھے ان کو صدمہ پہنچاتے ہوئے بڑا دکھ ہوا۔ مگر میں نے نرمی سے ان سے کہا کہ میں نہ ڈ مجسٹریٹ بننے کا ارادہ رکھتا ہوں نہ ان کا خانہ داماد بن کر ان کی ریاست سنبھالوں گا۔ بلکہ میں جہ کو لے جا کر اپنے پھونس کے مکان میں رکھوں گا۔ آخر آپ کی بہن بھی تو اسی محل سے رخصت میرے باپ کے جھونپڑے میں گئی تھیں۔

"ماموں جان بھونچکے ہو کر مجھے تکنے لگے۔ پھر غم و غصے سے تھر تھر کانپنے۔ انھیں یقین نہ کہ یہ میں کہہ رہا ہوں۔ میں نے ان کو پارٹی کارڈ دکھایا اور رسان سے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں نے یہ راستہ اپنے لئے منتخب کیا ہے۔

"عمر بھر میں پہلی بار میں نے ان کو طیش کے عالم میں دیکھا۔ وہ یک لخت اپنے مرحوم جغادری با کی تصویر بن گئے، انھوں نے گرج کر کہا: نمک حرام، احسان فراموش، کسان کی اولاد، ملّانے کا چھ تیرا مستقبل میں نے سنوارا، ورنہ آج ہل چلا رہا ہوتا، دھان کے گٹھے ڈھو رہا ہوتا۔ مکتب میں بچے پڑ رہا ہوتا بدبخت!

"میں نے دبی زبان سے کہا: "دھان کے گٹھے تو میں اب ڈھوؤں گا ماموں جان!

"مگر وہ اسی طرح گرجتے برستے رہے۔ اور مجھے خیال آیا کہ میرے نانا جان مرحوم کے لکھے ہو اسی قسم کے میلو ڈرامیٹک ناٹک، پچاس برس قبل ارجمند منزل کے جلسہ گھر میں اسٹیج کئے جاتے ہوں کون کہتا ہے ہمارا ہندوستانی تھیٹر زندگی کی صحیح عکاسی نہیں کرتا۔

"تین دن تک گھر میں ہنگامہ ہوتا رہا۔ ماموں جان نے ہر طرح مجھے سمجھایا۔ روئے گائے۔ گر

، اپنی عزت کا، اپنی لڑکی کی زندگی کا واسطہ دیا۔

" آپ اس کے روادار ہیں کہ آپ کی لڑکی گھُٹ گھُٹ کے مرجائے، مگر آپ اس کا ہاتھ ایک سٹ کے ہاتھ میں نہ دیں گے۔ میں نے کہا۔

" دہریہ، کنگال، باغی، جیلوں میں سڑے گا۔ مارا مارا پھرے گا۔ روپوشی اور سر پر انعام۔ اور دہ ــــ (سچ پوچھو آدما جب وہ یہ سب کہہ رہے تھے تو مجھے ان پر پیار آگیا) میں اپنی نازوں پلی اتیرے پلّے باندھ کر اس کی قسمت پھوڑ دوں۔

" غرضیکہ نہ وہ مانے، نہ میں مانا۔ ممانی جان کو اختلاج قلب کے دورے پڑنے لگے۔ گاؤدی ر مجھ سے کترانے لگا۔ ماموں جان نے اس کو حکم دیدیا تھا کہ مجھ سے بات نہ کرے۔ شادی کی تیاریاں خ ہوئیں۔ ارجمند منزل پر بڑا بھیانک سناٹا چھا گیا۔

" ماموں جان نے ایسا بندوبست کیا کہ شادی کی تیاریوں کی یا رشتہ ٹوٹنے کی خبر ارجمند ے باہر نہ نکلے۔ ویسے بھی اس وقت تک ماموں جان نے اپنے اس ارادے کا تذکرہ ممانی اور تی کے علاوہ کسی سے نہیں کیا تھا۔ زمینداروں کے ہاں شادی بیاہ کے معاملات میں بہت رازداری برتی ہے۔ ورنہ کٹنیاں اور مشاطائیں اور مخالف زمینداروں کے حالی موالی رشتہ تڑواتے ہیں اور کیا کیا ہوتا ہے۔ اور یہاں جہاں آرا کے اپنے ماموں یعنی کشتیہ کے رئیس اعظم اپنے بعد سہیل صاحبزادے کو ہ تُلے بیٹھے تھے۔ بہر حال۔ ڈھاکہ میں اس میلوڈرامہ کی خبر زیادہ نہیں پھیلی۔ جہاں آرا خود حد سے شرمیلی اور تھوڑی سی گھُنی لڑکی تھی۔ اس نے بھی اسکول یا کالج میں میرا تذکرہ کسی سے نہ کیا تھا۔ اسی وجہ کو اتنے برسوں اس کے ساتھ پڑھنے اور اس کی دوستی کے باوجود یہ بات معلوم نہ ہوئی۔

" بھئی میں سمجھتا ہوں، اب لنچ بھی یہیں منگوا لو، میرا تو داستانِ امیر حمزہ سناتے سوکھ گیا۔"

"کہے جاؤ۔ میں پانی منگواتی ہوں۔"

" بس میں حسب سابق اپنے پرانے کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جہاں آرا کا خیال کر کے میرا دل لٹ جاتا۔ وہ میری لندن سے واپسی کے بعد دستور کے مطابق مجھ سے سخت پردہ کر رہی تھی۔ پنے کمرے میں مایوس بیٹھ چکی تھی۔ جب یہ ٹریجڈی ہوئی۔ اس کی دونوں بہنیں بوکھلائی میرے

پاس آکر کہتیں۔ آپا روتے روتے نیم جان ہوگئی ہیں۔ آپا کی آنکھیں سوج گئی ہیں۔ آپا ان تین دنوں میں آدھی رہیں۔ کہاں وہ دلہن بننے کے لئے مایوں بیٹھی تھیں اور کہاں یہ خوفناک المیہ۔ دونو بھائی۔ خدا کے کو مرنے نہ دیجیئے۔ یہ سب سن سن کر میرے حواس باختہ ہو جاتے۔

" چوتھی رات میرا آخری فیصلہ سننے کے بعد کہ میں اپنی سیاسی زندگی ہرگز ترک نہیں کروں گا جان نے مجھ سے کہا ' تو آج سے ارجمند منزل کے دروازے تمہارے اوپر بند ہیں، اتنا کہہ کر وہ پھوٹ کر رونے لگے۔

" چند منٹ بعد انہوں نے ______ بڑے چالاک ہیں میرے قمر ماموں ______ بلیک میل کے لئے ایک چال چلی۔ اس وقت مجھے ایسا خیال ہوا۔ مگر اب سوچتا ہوں کہ وہ خلوص ا دل سے ایسا کہہ رہے تھے، مگر جوانی کی اکڑ اور اپنے اصول پرستی کے زعم میں ہم یہ نہیں سمجھ پاتے کہ ہما بزرگوں کے بھی جذبات ہیں۔ ان کی بھی اندرونی جذباتی زندگی ہے، انھوں نے بھی شکستہ دلی کا س ہے ______ ماموں جان مجھ سے کہنے لگے: 'ملیحہ مر گئی، تم اس کی نشانی تھے تم نے بھ ساتھ یہ کیا' اتنا کہہ کر وہ ذرا دقت سے اپنی کرسی پر سے اٹھے، اور کمرے کے باہر چلے گئے۔

" امی کے مرنے کا غم تازہ تھا۔ میں بھی بڑی مشکل سے آنسو ضبط کر کے اپنے کمرے میں وا پھر میں نے اپنا سامان باندھنا شروع کیا۔ اور انجم آرا کو بلا کر اس سے کہا اپنی آپا سے کہو رات کو باہر تالا آجائیں۔ مجھے ان سے بے حد ضروری بات کرنی ہے۔ انجم آرا کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ فوراً اوپر دوڑ گئی

" رات کو جہاں آرا مجھے تالاب کے کنارے ملی۔ میں نے تین سال بعد اسے دیکھا۔ تین سال اسے لندن سے خط لکھتا رہا تھا۔ اس کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ مگر زیادہ نہیں۔ مجھے معلوم تھا و ہونے والی ہے۔ اس لئے مجھے اس کے لئے کوئی خاص اضطراب نہیں محسوس ہوتا تھا۔ مجھے اس تھی۔ مگر کوئی جنوں خیز عشق نہیں تھا۔ ہو نہیں سکتا تھا۔ بچپن سے ہم اکٹھے پلے بڑھے تھے۔ لئے ایک پرسکون سی چیز تھی۔ مجھے ہمیشہ یہ معلوم رہتا تھا کہ میں دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں، کہ میں ہوں۔ کیسی کٹھن مسافت طے کر کے لوٹوں، وہ سایہ دار درخت اور میٹھے پانی کے کنویں میری منتظر ہوگی۔ اور اب وہ میرے سامنے موجود تھی۔ میری امی کی طرح پتی ورتا کی ایک اور تصو میں اس کے سامنے گونگا سا ہو گیا۔ وہ تالاب کی سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ انجم آرا، مہر آرا اور مالا ملازمہ پ

آدھر چوکس تھیں۔ اگر ماموں جان کو اس ملاقات کا علم ہو جاتا تو نہ جانے وہ ہم دونوں کا کیا حشر
خیر۔ تو میں نے اس سے کہا۔ وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلی چلے۔"

"تم لڑکیوں کو بھگا کر لے جانے کی تجویز کرنے میں بہت ایکسپرٹ معلوم ہوتے ہو!"۔ اُوما کاٹی۔

"میں نے اس سے کہا، میرے ساتھ جھونپڑوں میں رہے۔ روکھی سوکھی کھائے اور یہ یاد رکھے
ب فخر الزماں چودھری کے نواسے کی نہیں بلکہ مولوی برہان الدین احمد کاشتکار کے لڑکے کی بیوی ہے"؟

"بالکل ایسی ہی بات تمہارے ابا نے تمہاری امی سے کہی تھی"۔ اُوما نے کہا۔

"ہاں۔ عجیب بات ہے نا۔ بہرحال۔ مگر جہاں آرا میں اپنے والد سے اتنی بڑی بغاوت کی تھی۔ وہ بیٹھی ہچکیوں سے روتی رہی، اور میں اسے اسی طرح روتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے ارجمند منزل آ گیا ——

"چند روز بعد ہی مجھے انڈر گراؤنڈ ہونا پڑا۔ اور وہ سارا قصہ خواب و خیال ہو گیا۔"

"اور اس کے فوراً بعد تم نے ایک اور خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ واہ رے مرد کی ذات۔"

"اب اجازت ہے؟ دوپہر ہو گئی۔"

"ابھی نہیں۔ تمہاری بہن پڑھ رہی ہے؟"

"نہیں، میں کتنا چاہتا ہوں، اس کی تعلیم کا انتظام ہو جائے۔ مگر رابعہ امی کے انتقال کے
بھالنے میں جُٹ گئی۔ اگر مجھے کبھی ڈھاکے آنا ملا تو مکان لے کر اسے یہاں بلا لوں گا۔ اگر میں ابا
ں دلا دوں کہ وہاں پردے کا مکمل انتظام ہے تو ابا شاید علی گڑھ گرلز کالج بھی بھیجنے کو تیار ہو جائیں۔"

وہ ہنس پڑا۔ "ابا کو اگر یہ معلوم ہو کہ میں دہریہ —— دہریہ ہو گیا ہوں تو ان پر آسمان گر پڑے۔ ر
ذب بھی گاؤں جاتا ہوں، تو باقاعدہ ابا کے ساتھ جمعہ گھر میں نماز پڑھتا ہوں۔"

"اوہ —— ہاؤ فنی ——" اوما نے زور سے قہقہہ لگایا۔

نہ جانے کیوں ریحان کو اوما کا یہ قہقہہ ناگوار گزرا، وہ نظریں اٹھا کر باغ کو دیکھنے لگا۔

اوما نے اس کی طویل خاموشی سے گھبرا کر پوچھا۔ "تمہارا گھر تو بڑا خوبصورت ہو گا۔ آرٹسٹک۔"

"ہاں بے حد خوبصورت ہے۔ تمہارے ووڈ لینڈز سے کہیں زیادہ خوبصورت۔ اس کی پھوس کی چھت

زرد پھولوں کی بیل سے ڈھکی ہوئی ہے۔ سامنے سبزی باڑی ہے۔ اور گھنی، سرسبز بنسلی۔ پیچھے ہما کنول کے پھولوں سے بھرا رہتا ہے۔ اس کے کنارے سپاری اور ناریل کے سڈول درخت کھڑے میں گائیں رہتی ہیں۔ پچھلے برآمدے میں پالکی رکھی ہے۔ ندی پر ابا کی ناؤ بندھی رہتی ہے۔ اسی کو کھ ابا پار کی مسجد میں نماز جمعہ پڑھانے جاتے ہیں۔ ناؤ ہی میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے ان کی اس کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں جانتے ـــــ امی بتاتی تھیں کہ یہی نوکا کھیتے وہ ا زاد بھائیوں کو پڑھانے اپنے گاؤں سے نواب نورالزماں کی دیہاتی حویلی جایا کرتے تھے۔ کیسا زمانہ تھ لوگ ـــ ابا ساری عمر میں صرف تین چار مرتبہ ہی موٹر میں بیٹھے ہیں۔ جب میرا داخلہ اسکول میں کرانے ڈھ تھے اور ماموں جان کی بیوک ان کی خدمت میں حاضر رہتی تھی ـــــ

"اور پھر ہمارا گاؤں۔ کسانوں کے خوب صورت جھونپڑے۔ گاؤں کا ٹول۔ کالی باڑ مندر۔ جمعہ گھر۔ چوپال۔ بازار۔ منڈی۔ برگد کے تلے گھاٹ۔ درگاہ ـــــ میرا گاؤں ترین گاؤں ہے اور میرا گھر دنیا کا حسین ترین گھر ـــــ کبھی میں تم کو اپنا گھر لے جا کر دکھا اور دیپالی کو ـــــ

"اور قبرستان جہاں امی کی قبر ہے ـــــ" وہ چپ ہو گیا۔ چند منٹ بعد ا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری امی اتنی کم عمر تھیں۔ وہ مجھ سے صرف سترہ برس بڑی تھیں، اور م بہن معلوم ہوتی تھیں۔ اگر آج زندہ ہوتیں تو تم سے بھی زیادہ بڑی نہ لگتیں ـــــ بعض مرتبہ تم م جھلک سی دکھائی پڑتی ہے۔ خصوصاً جب ڈانٹتی ہو ـــــ تو بالکل امی جیسی لگتی ہو۔"

اوما کے چہرے پر کرب اور ناگواری کا بادل گزر گیا۔ جسے ریحان نے نہیں دیکھا۔ وہ ک

"امی تو مر گئیں، اب کہیں تم نہ مر جانا اوما ـــــ"

"ریحان ـــ" اوما نے درشتی اور تلخی سے اس کی بات کاٹی۔ "اب اٹھنا چاہیے۔ تم جا

"ہاں۔" وہ چونک کر بولا۔ "ابھی جاتا ہوں۔"

"کھانا کھاتے جانا۔"

"نہیں۔ کھانا سریندر کے ساتھ کھاؤں گا، اور اس کے بعد ـــ" اس نے اٹھ کر طویل ہوئے کہا۔ "ارجمند منزل میں نواب قمرالزماں چودھری سے سیاسی گفت و شنید ـــ کل شام لیگ آ

ی سے ان کے ساتھ ساڑھے پانچ بجے کا اپوائنٹمنٹ کروایا تھا۔ ابھی سر تیندر کے ہاں بیگم بازار ۔ بھاگتا ہوں۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف لپکا۔

"ارجمند منزل جاتے ہوئے ڈر تو نہیں لگ رہا؟" آدما نے پیچھے سے آواز دی۔ "اگر وہاں ٹھکائی تو مجھے فون کر دینا۔ تمہاری مدد کے لئے آجاؤں گی۔"

"یو آر نوٹ بینگ ویری فنی آدما ــــ" ریحان نے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

آدما کھوکھلی سی ہنسی ہنسیں اور میز پر بیٹھی کانٹے سے لکیریں کھینچتی رہیں۔ پھر سیتزر کو بلانے کے لئے اتر گئیں۔

۲۷

جہاں آرا بیگم

اس وقت ارجمند منزل پر یک لخت ایسی خاموشی چھا گئی، جیسے ساگوان کے جھرمٹ میں چھپے ادوگر نے چپکے سے کوئی منتر پھونک دیا ہو۔ اور چرند پرند، شجر حجر، انسان سب سکتے میں ائیں۔

جہاں آرا، اوپر کی منزل پر پچھلے برآمدے میں چق کے پیچھے آرام کرسی پر بیٹھی نوزائیدہ بھتیجے کے ے بن رہی تھی۔ اور اپنے پاؤں جنگلے کی نچلی جالی میں اٹکا رکھے تھے۔ جنگلے کی سلاخوں میں سے اس نے بلک دیکھی۔ جو سوچ میں ڈوبے پائیں باغ میں ٹہل رہے تھے۔ اور پھر بیگ آفس کا بہاری کلرک زدیک پہنچا اور ابّا اس کے پیچھے باہر چلے گئے۔

باورچی خانے میں جا کر دعوت کی دیگوں کا معائنہ کرنا ہے۔ پلاؤ دم کروانا ہے۔ شاہی ٹکڑے تیار یں ــــ دلہن بھابی اپنے کمرے میں آرام سے سو رہی ہیں۔ امّی حسبِ معمول اپنے کمرے میں صاحبِ ہیں۔ جانے ان کو اختلاج کے دورے اتنے کیوں پڑتے ہیں۔ ابّا تو ان کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ امّی

کو ہر طرح سے خوش رہنا چاہیے۔ ان کے پاس کیا نہیں۔ سہاگ، اولاد، دولت و ثروت، بہو بیاہ ا پوتا کھلا رہی ہیں۔ کیا وہ اب تک نہیں بھول سکیں کہ ابا ان کے بجائے آلیمہ پھوپھی سے شادی کرنا چاہتے مگر وہ تو اتنی پرانی بات ہو گئی۔

بے چارے ابا۔ یہ بات کسی کو معلوم نہیں۔ صرف میں نے محسوس کی ہے۔ اور امی کو تو یقیناً م ہے —— کہ ابا آلیمہ پھوپھی کو کبھی نہ بھلا سکے۔ وہ مر گئیں تب بھی نہیں۔ مر کے شاید وہ ابا کے دل پر محفوظ ہیں۔ جہاں پھوپھا جان کا کوئی دخل نہیں۔

یا اللہ۔ کیسی دنیا بنائی تو نے، انسانی زندگیوں کے ساتھ ایسے بھیانک مذاق۔

انجم اور اختر آرا سگن بگیچے سے اب تک نہیں لوٹیں۔ ہر وقت اپنی دلچسپیاں۔ صرد ہی اس لئے ہوں کہ ہاؤس کیپر بنی رہوں۔ دلہن بھابی بھائی کو نخرے دکھاتی رہتی ہیں۔ شا کو ایک سال ہو گیا مگر کیا مجال جو ہل کر پانی بھی پی لیں۔ اب تو بھئی نئے ولی عہد کی ماں ہیں بس میں سب کی دیکھ بھال کے لئے وقف۔ امی نے کل کیا منہ بھر کے شمسہ خالہ کے سا کہہ دیا کہ اپنا گھر تو نصیبے میں نہیں، اسی گھر کی ذمہ داری اچھی طرح سنبھال لو ——

اچھا اللہ۔ ٹھیک ہے۔

ایک موزہ مکمل ہو گیا۔ اللہ رکھے میرا منور کتنا پیارا ہے۔ ماشاء اللہ۔ خدا بُری نظر۔ بچائے۔ میں نے تو گلابی اون بھی اتنی خرید لی تھی۔ اس کی بھی چیزیں بُن ڈالوں گی۔ لڑکے کیا گا رنگ نہیں پہن سکتے۔

"بی بی — بی بی۔"

جہاں آرا نے چونک کر سر اٹھایا۔ ماما سامنے کھڑی ہانپ رہی تھی۔ بھاگتی ہوئی اوپر آئی تھی۔

"بی بی۔ وہ آئے ہیں۔"

دل پھر دھک سے رہ گیا۔

"کون ——؟"

"رنّو میاں۔"

"دولو — کیا کہہ رہی ہے؟"

"اللہ قسم۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ باہر بیٹھے ہیں۔"

"باہر تو روزی اور دیپالی کے بابا آئے تھے۔"

"وہ تو کبھی کے چلے گئے۔ ابھی بشیر چائے کی ٹرے لے کر باہر گیا تھا۔ اس نے آکر بتایا، تو میں اگی گئی۔ باغ والی کھڑکی میں سے جھانکا۔ سرکار اور دولو میاں دونوں دفتر میں بیٹھے ہیں۔ دروازے دونوں جنوں میں مسکوٹ ہو رہی ہے۔"

ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔

"جھوٹ مت بول مالا کی بچی۔"

"اللہ رسولؐ کی قسم، چل کے دیکھ لیجیے۔"

"دونوں میں بڑی سنجیدگی سے باتیں ہو رہی ہیں؟"

"ہاں ہاں بی بی۔"

کیا دعائیں کامیاب ہو گئیں؟ دعائیں۔ نمازیں، وظیفے، اللہ اللہ۔

وہ اون اور سلائیاں میز پر ڈال کر جلدی سے اٹھی۔

"ٹھہر۔ مالا۔ بھائی جان کہاں ہیں؟"

"نیر میاں موٹر لے کر باہر گئے ہیں۔ چلیے۔"

وہ مالا کے ساتھ زینہ اتر کر کھانے کے کمرے میں پہنچی، جو کتب خانے سے ملحق تھا۔ درمیانی دروازہ بند تھا۔ عموماً بند رہتا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ز پر آنکھ جما دی۔

وہ عین سامنے بیٹھا تھا۔ بڑی میز کے اس طرف، بالکل نہیں بدلا تھا۔ وہی شکل، وہی آنکھیں ، وہی بات کرنے کا انداز۔ مقابل میں ابا بیٹھے تھے۔ چہرہ چٹان کی طرح سخت، درمیان میں اور چائے کی کشتی۔ خالی پیالیاں۔ ہائے اللہ۔ مجھے معلوم ہوتا تو کشتی سجا کر بھیجتی۔ اس سے کان لگا دیئے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "جی ہاں۔ میں کامریڈ جوشی کو مفصل بتا دوں گا۔"

ابا نے عینک ماتھے پر چڑھائی اور کچھ پڑھنے لگے۔ پھر انھوں نے کہنا شروع کیا۔ "جناح صاحب

کے نکات ۔"

اس پر بجلی سی گری۔ وہ اس کے متعلق نہیں اس نامراد سیاست کے متعلق "مسکوٹ" کرر بولتے بولتے ابا نے سر اٹھا کر سامنے بند دروازے پر نظر ڈالی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہو ماما نزدیک ہی گیلری کے صدر دروازہ پر جو کس کھڑی تھی۔ اس نے وہاں سے اشارہ کیا "بیٹھی ر بیٹھی رہئے۔"

وہ پھر کواڑ سے لگ گئی۔

اب ابا کاغذ سمیٹ رہے تھے، وہ کھڑا ہو چکا تھا۔

"اندر جا کر اپنی ممانی کو دیکھ آؤ، بہت علیل ہیں" ابا ذرا رکھائی سے کہہ رہے تھے۔ مجھے ہے، مجھے معلوم ہے۔ ابا کی یہ سرد مہری مصنوعی ہے۔ ابا کی خودداری کی وجہ سے ہے۔ ابا انھی چاہتے ہیں۔

"بہت اچھا۔"

اللہ، اب بھی ان کا دل نرم کر دے۔ ابا کا دل بھی نرم کر دے۔ اللہ۔ ابا اُن سے میر لئے بات کریں۔ مولا معجزہ دکھا دے۔

"نیّر امیاں کہاں ہیں؟" ریحان پوچھ رہا تھا۔

"معلوم نہیں کہیں باہر گئے ہیں۔" نواب نے جواب دیا۔

ابا انھیں رات کی دعوت کے لئے ہی روک لیجئے۔ ایک اجنبی مسافر کی طرح واپس نہ ج دیجئے۔ ابا پلیز۔

"ممانی جان ______ اپنے کمرے میں ہوں گی؟"

"ہاں ہاں۔ وہیں ہوں گی۔"

"اچھا ماموں جان۔ خدا حافظ۔" اس نے مصافحہ کے لئے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ اور بڑ دب سے جھک کر ابا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ "میں دلّی پہنچتے ہی نواب زادہ لیاقت علی خاں کونٹیکٹ کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"آداب عرض ماموں جان۔"

"جیتے رہو۔"

وہ فائل اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ گیلری میں سے مالا نے اشارہ کیا۔ جہاں آرا سرعت سے ڈائیننگ روم کے پچھلے دروازے سے باغ میں اتر گئی۔ اگر کہیں مڈبھیڑ ہو جاتی۔ گیلری میں سے جانا چاہیے تھا۔ ضرور مڈبھیڑ ہوتی، اور پیچھے سے ابا آ جاتے۔ تو کیا ہوتا۔؟ ابا کا حکم ہے کہ اگر کبھی بھی ردنو ار حمید منزل آئے تو جہاں آرا کا اس سے سخت پردہ کرایا جائے۔ وہ تیر کی طرح پچھواڑے پہنچی۔ اور ہانپتی کانپتی سنسان تالاب کے کنارے شکستہ "راج سنگھاسن" پر دھم سے جا کر بیٹھ گئی۔

چند منٹ بعد مالا دبے پاؤں درخت کے پیچھے سے نمودار ہوئی۔ "میں نے اندر جا کر جھانکا تھا۔ ردنو میاں بیگم صاحب کے کمرے میں گئے تھے۔ مگر وہ سو رہی تھیں۔ بے سدھ، وہ باہر نکل ے۔ اب جانے کدھر سے —— " یک لخت وہ چپ ہو گئی۔

وہ پچھلے برآمدے سے اتر کر باہر جانے کے ارادے سے تالاب کی طرف چلا آ رہا تھا۔ جس کا چکر ہٹ کر باغ کی سڑک سامنے کے پھاٹک کی طرف جاتی تھی۔

پھر وہ عین اس کے مقابل میں آن کھڑا ہوا۔ رنگین تخت کے پاس۔ بالکل اسی طرح، جیسے س روز خواب میں آیا تھا۔ خواب میں دیکھا تھا۔

بارش شروع ہو گئی۔ وہ جلدی سے سیمل کے نیچے آ گیا۔

اور تب اس نے جہاں آرا کو دیکھا۔

"اوہ ہلو۔ ہلو جہاں آرا۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"آداب ردنو بھائی۔"

کوئی بھونچال نہیں آیا۔ زمین نہیں ہلی۔ قیامت نہیں آئی۔ وہ اس کے سامنے موجود ہے س رات، چار سال قبل، وہ اسی جگہ سے اسے خدا حافظ کہہ کر، اُسے روتا بلکتا چھوڑ کر گیا تھا۔ اب سامنے وجود ہے۔ اور اس سے بات کر رہا ہے۔

مالا چپکے سے کھسک کر درخت کی اوٹ میں ہو گئی۔

"آپ کب آئے ردنو بھائی۔" مضبوط، پرسکون آواز۔

"ابھی تھوڑے دن ہوئے۔"

"آج کل کہاں رہتے ہیں۔"

"بمبئی ـــــ تم۔ تم اب کس کلاس میں ہو؟"

"میں نے کالج چھوڑ دیا۔ کافی دن ہوئے ـــ پھوپھا جان کیسے ہیں۔ آپ شونا پور گئے تھے؟"

"ہاں۔ ٹھیک ہیں۔"

"اور رابعہ ؟"

"وہ بھی خیریت سے ہے۔ اچھا جہاں آرا اب ہم چلیں۔ بارش تیز ہو گئی تو مشکل ہو جائے گی۔ اچھا۔ خدا حافظ۔" اس نے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا پھاٹک کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ آیا، اتنے برسوں، اتنی رات دن کی دعاؤں کے بعد، اور دو منٹ میں چلا گیا۔ مگر دنیا ویسی ہی موجود تھی۔ درخت، پرندے، آسمان، زمین، بادل۔

مالا پیڑ کے پیچھے سے نکلی۔

وہ ہونقوں کی طرح مالا کی شکل تکنے لگی۔

"بی بی اندر چلیے۔"

اور تب جہاں آرا نے تخت پر زور کا مکا مارا اور دوہری ہو گئی۔ "کیوں آئے تھے مالا۔ کیوں آئے تھے، جب میں اِدھر بیٹھی تھی، تو کیوں آئے تھے۔ سیدھے کیوں نہیں چلے گئے۔ تجھے معلوم ہے مالا کیوں آئے تھے؟ کیا کہہ رہے تھے؟"

"اُٹھو بی بی۔ اُٹھو۔"

"کیوں آئے تھے۔"

"بی بی پاگل مت بنو۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ توبہ۔ توبہ ـــ"

اس نے جلدی سے آنچل سے اپنا چہرہ پونچھا۔ شاید مجھے ہسٹریا ہو جائے گا، اس نے لرز کر سوچا۔ امی کی طرح ـــــ اختلاجِ قلب کی مریضہ کہلاؤں گی ـــــ لوگ مجھ پر ترس کھائیں گے۔ ـــــ ہنسیں گے ـــــ اللہ ـــــ اللہ ـــــ

مالا نے اس کا ہاتھ تھام کر "راج سنگھاسن" کے نیچے سے بہتے ایک ننھے برساتی

لے کو پھلانگنے میں مدد کی۔ پھر بارش کی تیز بوچھار میں وہ دونوں، سر پہ آنچل ڈال کر جھکی جھکی تیزی
سے کوٹھی کی طرف بھاگیں۔

۲۸

رونگیلا ناتیر مانجھی

ستمبر ۴۲ء کی ابر آلود شام کی نیم تاریکی میں دو آوازیں چندر کنج کے پھاٹک کے ترچھے، نیم
کستہ ستون کے قریب۔

"اچھا بھائی۔ یہ لو تینوں کتابیں۔ بہت سنبھال کر رکھنا۔ اس پر ہم نے سروجنی دیبی سے دستخط
ہیں۔ دیکھو انہوں نے تمہارے لئے کیا لکھا ہے۔"

"کہاں۔ کہاں۔؟"

ماچس جلانے کی آواز۔

"یہ دیکھو۔"

"او ماں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے میرا نام لکھا ہے۔ ہاؤ۔ اِن کریڈیبل۔ آپ کو
ں ملیں؟"

"یہ سب تفصیلات نہ پوچھا کرو۔"

"نہیں بتائیے۔"

"دہلی میں۔"

"اور آپ نے ان سے میرے متعلق کیا بتایا؟"

"کچھ نہیں۔ صرف یہی کہا تھا کہ ایک باؤلی سی لڑکی ہے۔ اس کے لئے اپنی طرف سے اس
ے پر کچھ لکھ دیجیئے۔"

"او ماں۔"

"اور یہ لو۔"

"اوہ۔ نوکشی کا تنارما ٹھ! اور یہ ۔۔۔؟"

"رونگیلا نائیرما نجھی۔ !"

"اوہاں۔ !"

"مولوی جشیم الدین سے بھی دستخط کروائے بھائی۔ دونوں کتابوں پر۔ اور یہ لو ۔۔۔ مولوی منصور الدین کی نئی جلد ۔۔۔"

"ہیرا مونی۔؟ دوسری جلد آگئی؟"

"ہاں۔ مع مصنف کے دستخط۔ اب تم بھی کیا یاد کرو گی۔ کس سُوپر انٹلیکچول چاہنے والے سے واسطہ پڑا ہے ۔۔۔"

"یاسمین ایک دن کہہ رہی تھی۔ ایک روز وہ اپنا ٹروپ بنائے گی۔ اور نوکشی کا تنارا ٹھ کا بیلے تخلیق کرے گی۔"

"وہ بھی تمہاری چیلی ہے؟"

"یاسمین؟ نہیں۔ دراصل وہ روزی بیچاری کی چیلی تھی۔ پھر میری چیلی بھی بن گئی۔"

"بس تو پھر اب اللہ اس پر رحم کرے۔ روزی کا حشر دیکھو تمہاری چیلی بن کر کیا ہوا۔ اچھا بھئی اب ہم بھاگتے ہیں۔ تمہارے بابا آ ہی نہیں چکتے۔"

"وہ شاید مترابا بو کی طرف چلے گئے۔ اب پھر کب آئیں گے؟"

"جب بھی تم بلاؤ گی۔ فوراً۔ اچھا ۔ اب چلتے چلتے یہ بتا دو کہ کیوں خفا تھیں۔"

"افوہ۔ ڈن ٹریک مائینڈ۔"

"ہرگز نہیں بتلاؤ گی وجہ؟"

"نہیں۔"

"میں آدما سے کہے جا رہا ہوں کہ معلوم کر رکھیں۔ ان کو بتا دو گی؟"

"ہرگز نہیں ۔۔ دہلی میں ڈھاکہ صاف سنائی دیتا ہے؟"

"ہمیں بالکل صاف سنائی دے گا۔ ۲۹ تاریخ شام کے ساڑھے چھ بجے۔ پھر ساڑھے سا:

پھر سوا دس، تمہارا ہندوستانی پروگرام کس وقت ہے؟"

"ساڑھے سات۔"

"کیا کیا گا رہی ہو؟"

"ہندوستانی پروگرام میں؟ 'مائی ری میں تو' والا بھجن۔"

"سناؤ۔ سناؤ۔"

"یہاں سڑک پر ——؟"

"یہ سڑک ہے؟ سنسان، جنگل بیابان۔ ہُو کا عالم، آہستہ سے گنگنا دو۔"

خاموشی۔

"مائی ری میں تو لیو ر میّو مول۔"

"ہاں۔ ہاں اور آگے۔"

"کوئی کہے چھانے، کوئی کہے چوڑے۔ لیو ہے بجنتا ڈھول۔"

خاموشی۔

"پھر رک گئیں، ارے گاؤ بھائی۔"

"کوئی کہے کارو، کوئی کہے گورو۔ لیو ہے انکھیاں کھول۔"

"شاباش بالکل ٹھیک کہتی ہو۔"

"جائیے ہم نہیں گاتے۔"

"کیری اَون۔ کیری اَون۔ ایڈیٹ۔"

"کوئی کہے ہلکو، کوئی کہے بھارو۔ لیو ہے ترا جو تول۔
تن کا گہنا میں سب کچھ دینا
دلیو ہے باجو بند کھول۔"

"اور تین عدد بالوچر ساڑیاں بھی۔"

"وِل یُو شٹ اَپ۔"

"آ گئے۔"

"آگے کیا، بس ختم۔ مائی ری میں تو لیو رمیّو مول۔"

خاموشی۔ پتّوں کی سرسراہٹ، بہت دور کوئی کھول یکسانیت سے بجے جا رہا ہے۔ کیرتن ا کرتال کی مدھم گونج۔

"کیا آج منگل کی شام ہے؟"

"جی ہاں۔"

"اُفوہ۔ یاد ہے۔ وہ شام بھی اتنی ہی اندھیری تھی۔ جب "نور الرحمٰن میاں" پہلی بار اس پھاٹک پر آ کر کھڑے ہوئے تھے۔ ۲۵ر اکتوبر ۳۸ء۔"

"نہیں۔ ۲۴ر اکتوبر۔"

"ہرگز نہیں ۲۵ر اکتوبر۔ ہمارے تو دل پر نقش ہے بھائی۔ اچھا سنو، ابھی تمہارے میوزک کے کورس میں دو سال اور باقی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"اس کے بعد کیا کہلاؤ گی — لیکچرر ——؟"

"جی جناب۔ لیکچرر۔ فیکلٹی آف میوزک۔ وشو بھارتی انٹرنیشنل یونیورسٹی!"

"اُفوہ۔ رعب پڑ گیا بہت سخت، مگر تم ساتھ ہی ساتھ اپنی ایم، اے کی پڑھائی بھی شروع کر دینا

"بہت اچھا۔"

"گڈ، تو تمہارے فوری مستقبل کی طرف سے تو اطمینان ہے، ویسے یہ یاد رکھو کہ جب تک ں زندہ ہوں تمہارا مستقبل محفوظ ہے —— سنو۔ گری راج کیا کہیں گے؟"

"گری راج۔"؟

"ہاں اُن کی لاڈلی گوری، ایک لمبے تڑنگے سنیاسی کے ساتھ چلی جائے گی تو بہت خفا ہوں گے؟"

"میرا خیال ہے کہ زیادہ خفا نہیں ہوں گے۔ آپ بابا کو نہیں جانتے۔ بس مجھے صرف اپنی لیشی ماں کے غصے سے ڈر لگتا ہے۔ وہ ایک کٹّر مذہبی خاتون ہیں۔ مگر بابا ان بے چاری کو سمجھا بجھا لیں گے۔ وہ بابا کی unconventional باتوں کی عادی ہیں۔ بابا خاصے قدامت پسند ہیں

مگر جہاں میرے رنج و راحت کا سوال پیدا ہو وہ سماجی قوانین کو بالکل نظر انداز کر سکتے ہیں۔ پہلے ی انھیں اپنے سماج سے کیا سروکار رہے۔ برسوں سے گوشہ نشین بیٹھے ہیں۔"

"تو اب میں اطمینان سے پردیس جاؤں؟"

"بالکل اطمینان سے۔"

"بھئی واہ۔ کیا چرخ چوں گاڑی چلی آ رہی ہے۔"

"کہاں ___ ؟ ارے، ارے بھاگئے۔ پشی ماں آ رہی ہیں۔"

"اس وقت کہاں گئی تھیں؟"

"ریس کورس کے قریب جو پرانا مندر ہے نا، وہاں ہر منگل کی شام کو کیرتن ہوتا ہے۔"

"تمہارے عبدالقادر میاں کس قدر چرخ چوں گاڑی ہانکتے ہیں۔"

"بھاگئے۔"

"دہشت۔ میں ڈرتا ہوں تمہاری پشی ماں سے، مگر یہ گاڑی تو اِدھر نہیں آ رہی۔"

"پشی ماں سیدھی جا کر ڈیوڑھی پر اتر جائیں گی۔ تھینک گوڈ۔"

"تو اب میں اطمینان سے گھر جا رہا ہوں۔؟"

"نہیں۔ اب بھاگئے۔ تینوں لڑکے آتے ہوں گے۔ اور بعد میں طرح طرح کے سوال کریں گے۔ نہیں ں مت بھاگیے۔"

"بھائی فیصلہ کر لو۔"

"کیا آپ کو فیصلے کرنے مشکل نہیں لگتے؟"

"قطعی نہیں۔"

"مجھے بھی نہیں۔ میں کسی سے ڈرتی ہوں۔"

"اب کی بار میں تم کو شونا پور لے جاؤں گا۔"

تبسم۔

"کیوں کیا خیال ہے۔"

"سادھو! میں تمہارے گھر ہرگز نہ آؤں گی۔"

"ہا ہا ہا ——— گوری ۔! میں نے تمہارے لئے تالاب کھودا ہے۔ سبزی باڑی بنائی ہے۔ میں تمہارے لئے سیندور کی ڈبیا اور ٹیپشوری ساری لاؤں گا۔ ڈھاکے سے سینگ کی چوڑیاں میں راجہ کا ملازم ہوں۔ تمہارے بالوں سے کھینچتا ہوا لے جاتا۔ مگر کیا کروں عورت کی عزت کرتا ہوں[1] ———"

بشاش ہنسی۔

"اچھا سنو۔ روزی کے متعلق کوئی اطلاع ملے تو مجھے ضرور لکھنا۔"

"بہت اچھا۔"

"اب واقعی چلوں۔ ورنہ ٹرین چھوٹ جائے گی۔ دیکھو میں آدما سے کہے جا رہا ہوں کہ وہ میری غیر موجودگی میں تمہاری دیکھ بھال رکھیں۔ اور تمہارے بابا سے بھی ذرا میری خوب تعریف واریف کر دیں راستہ ہموار کرنے کے لئے۔ اور یہ یاد رکھو۔ آدما فرشتہ خصلت بے مثال لڑکی ہے۔ اس سے بڑھ کر پُرخلوص دوست تمہیں اور کوئی نہ ملے گا۔ یہ بات میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اچھا اب چلے۔ بہت لمبا سفر ہے۔ کلکتہ ۔ دلّی ۔ بمبئی۔"

"اپنا خیال رکھیے گا۔"

خاموشی، کیلے کی ڈالیوں کی سرسراہٹ ——— دور ایک کتا رونے جا رہا ہے۔

دور رسوئی گھر میں روشنی جل گئی۔

"مسکراؤ ——— تو ہم روشنی میں تمہارا چہرہ دیکھیں۔"

ماچس جلانے کی آواز

"لے لو وہ لب پہ آئی ہنسی۔ اے لو وہ مسکرائے ہیں۔"

"کیا مطلب؟ سُوں مُوں؟"

"ہم نے اردو کا ایک حسبِ موقع مصرعہ پڑھا تھا۔ بے وقوف۔"

"آپ نے اتنی فر فر اردو کہاں سے سیکھ لی۔"

---

[1] بنگلہ لوک گیت۔

"علی گڑھ میں بے وقوف۔"

"مجھے بھی سکھلا دیجئے ؟ سُوں سُوں۔"

"ضرور سکھلا دیں گے۔"

دُور گھنٹے کی آواز۔

"ارے آٹھ بج گئے۔ اب چلوں۔ بائی۔ بائی —— "

آواز بازگشت
آواز بازگشت
آواز بازگشت

۲۹

شریمتی رادھیکا سانیال

ڈیر لیسیٹ دیپالی

میں تم سے دلی معافی چاہتی ہوں۔ اگست کی اس طوفانی رات اپنی مہم پر جانے سے
، تمہارے گھر آکر میں نے تمہیں بہت بُرا بھلا کہا تھا۔ مگر ہم سب ایک زبردست قومی کرائسس
گذر رہے ہیں۔ اور اتنی قربانیاں دے کر محمود دا، جو میری آنکھوں کے سامنے گولی کا نشانہ بنے۔ جیوتی دا
لس نے اتنا مارا کہ انہوں نے حوالات میں ہی دم توڑ دیا۔ جب ہمارے ساتھیوں نے پولس چوکی پر حملہ
یں بالکل نہتی تھی۔ اور صرف جلوس کی قیادت کر رہی تھی۔ اسی وجہ سے میرے اوپر کوئی فردِ جرم فوجداری
ائد نہیں کی جا سکی۔ جب ہمارے ساتھیوں نے تھانے پر ہتھ گولے پھینکے پولس نے فوراً گولی چلا
۔ ہجوم پر اشک آور گیس چھوڑا اور بُری کوڈی چارج کیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میری بائیں
ب میں سخت تکلیف تھی۔ اور میں ہتھکڑی پہنے زنانہ حوالات کے فرش پر پڑی تھی۔ اور باہر شام ہو
تھی۔ بالکل سناٹا۔ کچھ دیر بعد کچھ سپاہی اندر آئے۔ مجھے پولس کی لاری میں بٹھا کر جیل لے گئے

اور زنانہ وارڈ میں ڈال دیا۔ جہاں مچھر ہی مچھر تھے۔ ایک لالٹین میرے پاس رکھ دی گئی۔ باہر کھٹ سے جب میں زور زور سے کراہنے لگی تو ایک بڑھیا وارڈر اندر آئی اور بڑبڑاتی ہوئی پھر باہر نکل گئی۔ بعد جیلر آیا۔ اس نے گندا سا اسٹریچر منگوایا۔ مجھے پھر پولیس کی لاری میں لادا گیا۔ دو مسلح سپاہی ساتھ بیٹھے۔ لاری ہچکولے کھاتی اندھیرے شہر میں سے گزرتی سول ہسپتال پہنچی۔ مجھے اتار کر زنانہ وارڈ کے ایک میلے سے لوہے کے پلنگ پہ ڈال دیا گیا۔ اس طرح ہتھکڑیوں سمیت وارڈ دیکھ کر ہنگامہ سا ہو گیا۔ ایک بوڑھی عورت زور زور سے بین کرنے لگی۔ اس کا لڑکا بھی چند روز قبل ا شہید ہو گیا تھا۔ خیر ڈاکٹر آیا۔ میری مرہم پٹی ہوئی۔ کھانا کھلایا گیا۔ سپاہی دروازے پر پہرے پر بیٹھے۔

تین دن تک جنرل وارڈ میں رہی۔ مریض عورتیں ہمدردی سے ہر وقت میرے پاس گھری رہتی حکام نے میرا پلنگ ایک خالی کمرے میں منتقل کر دیا۔

خوش قسمتی سے میری ٹانگ کی ہڈی پر ضرب نہیں آئی تھی۔ سر میں البتہ زیادہ چوٹ لگی تھی۔ ہم ڈاکٹر بڑی توجہ سے میرا علاج کرتے رہے۔ رات کو جنرل وارڈ کی عورتیں سپاہیوں کی نظر بچا کر مجھے پھل دے جاتیں اور ہر طرح میری خدمت کو تیار رہتیں۔ اور میں سوچتی۔ میں اس لائق نہیں ہوں کہ میری قوم کے افراد میرا اتنا خیال کر رہے ہیں۔

اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ تب ایک روز صبح صبح کمرے میں ایک میم صاحب داخل ہوئیں۔ آ کر میرے اوپر جھکیں اور آہستہ سے کہا۔ ”روزی!“ ادھیڑ عمر کی خاتون۔ چھوٹا سا جوڑا باندھے۔ بھورے بال ک رنگ کا فراک۔ پاؤں میں بھدے بوٹ۔ مس ایلس بارلو تھیں۔ اور ان کو دیکھتے ہی باہر بیٹھے سپا نے انھیں فوراً اندر آنے دیا۔ مس بارلو چارلس بارلو کی بڑی بہن ہیں۔ مشنری۔ انھوں نے نرمی سے کہ میرے پاپا پریشان حال مسٹر بارلو کے پاس پہنچے تھے۔ اور مسٹر بارلو نے فوراً پٹنہ کے انگریز بڑے پادر ٹرنک کال کیا تھا۔ جن کے ہاں مس بارلو گردو ملز سے آئی ہوئی تھیں۔ میں چپ چاپ پڑی رہی۔ عجیب و غر کی تفصیل سنائی۔ مس بارلو نے اسٹول پر بیٹھ کر مجھے سمجھانا بجھانا شروع کیا۔ جیزس کے رحم و کرم کی تبلیغ کیا کہ وہ اپنی گمشدہ بھیڑوں کی واپسی کا منتظر ہے اور یہ کہ اگر میں معافی نامے پر دستخط کر دوں تو مجھے فوراً رہا کر گا۔ اور پٹنہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سرکاری حفاظت میں ڈھاکے پہنچوا دیں گے (پٹنہ کے ڈی۔ ایم مسٹر بر گئے ہیں) میں نے صاف انکار کر دیا۔ مس بارلو اٹھ کر چلی گئیں۔ دوسرے روز صبح پھر آئیں۔ کیک، پھل،

افلاسک اٹھائے چپڑاسی ساتھ (میری یہ نئی شان و شوکت دیکھ کر ہسپتال کے عملے اور پہرے کے سپاہی بہت ب ہوئے اور ان کا رویّہ بدل گیا) مس بارلو نے پھر مجھے اس نرمی سے لیکچر پلانا شروع کیا گویا میں کوئی کم عقل لڑکا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں۔ وہ مایوس ہو کر چلی گئیں۔

اس رات زنانہ جنرل وارڈ کی ایک مریض لڑکی خدیجہ چپکے سے میرے پاس آئی (اس کا باپ کچہری کا معمولی رتھا) اور کہنے لگی دیدی ہم سب عورتیں برابر آپ کی صحت کے لئے دعائیں مانگ رہے ہیں لیکن آپ نے انی نامہ پر دستخط کر دیئے تو ہم آپ کو کبھی معاف نہ کریں گے۔

میں نے اس سے کہا۔ خدیجہ۔ تم سب اطمینان رکھو۔ میں ہرگز معافی نہ مانگوں گی۔ اسی وقت باہر پہرے سپاہی نے ڈنڈا بجایا اور وہ چپکے سے کھسک گئی۔

ایلس بارلو تیسرے روز شام کو آئیں۔ اب کے مے ایک بنگالی افسران کے ساتھ تھے۔ انہوں نے رف کرایا۔ مسٹر سین گپتا کے اسسٹنٹ، مسٹر ربی کمار سانیال۔ یہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب نہ دیا۔ مسٹر سانیال نے بھی مس بارلو کے الفاظ دہرائے۔ معافی نامے پر دستخط کر دیجیے۔ میں نے سری طرف کروٹ بدل لی۔ مسٹر سانیال نے کہا۔ میں کل معافی نامہ لے کر آؤں گا۔ کل تک اچھی طرح سوچ ۔ ایلس بارلو کو شاید امید ہو چلی تھی کہ میں نرم پڑ جاؤں گی۔ چند منٹ بعد وہ اور مسٹر سانیال واپس چلے گئے۔

چوتھے روز صبح مسٹر سانیال پھر آن موجود ہوئے۔ لیکن ان کے ہمراہ مس بارلو کے بجائے ان ہی کے ہم شکل اور صاحب تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ان کے کزن بسنت کمار سانیال ہیں۔ کلکتہ کے ایڈوکیٹ اور جرنلسٹ انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ اشردی کے معرکے کے بعد کے حالات "کور" کرنے کے لئے کلکتے سے آئے ہوئے ہیں۔ یرا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ذرا حیرت سے سوچا کہ ایک سرکاری افسر اس قسم کے انٹرویو کی اجازت کس دے رہا ہے۔ مگر یہ اندولن کا ابنارمل زمانہ تھا۔ ہر چیز ممکن تھی۔ کچھ پتہ نہیں کون ہمارا ساتھی ہے کون دشمن۔

ربی کمار سانیال مسکرا رہے تھے۔ مسٹر بسنت کمار سانیال اب تک بت کی طرح بیٹھے مجھے تکے جا رہے تھے۔ ایکدم گھبرا گئی۔ میرا حلیہ بھی کیا رہا ہوگا۔ اس وقت ماتھے پر پٹی بندھی۔ سر جھاڑ منہ پہاڑ۔ جیسے برسوں کی روگی ت آٹھ دن سے آئینہ تک نہ دیکھا تھا۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ یہ انٹرویو کی کیا تک ہے اور میں کون سی اتنی بڑی ہیروئن ہوں۔ میری جیسی ان گنت لڑکیوں نے کہیں زیادہ بہادری سے یہ اندولن چلایا ہے۔ میں تو پولیس کی لاٹھی سے ہی چکرا کر گر پڑی۔

خیر۔ تو بسنت کمار سانیال نے مجھ سے چند عام سے سوالات کئے۔ کہاں پڑھا ہے۔ تحریک می سے ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور نمسکار کرکے دونوں باہر

میں نے چونکہ معافی مانگنے سے قطعی انکار کر دیا تھا اور میری ٹانگ اور سر کے زخم ٹھیک ہو اس لئے دس روز بعد مجھے ہتھکڑیاں پہنا کر پولیس گاڑی میں سوار کروایا گیا اور دوبارہ جیل پہنچا دیا گیا۔

اس روز رات بھر زنانہ وارڈ میں رت جگا رہا۔ مریض لڑکیاں چپکے چپکے قاضی نذرالاسلام کے گیت رہیں۔ صبح کو جب میں اپنے کمرے سے نکل کر جا رہی تھی بہت ساری مریض عورتیں برآمدے میں کھڑی رو تھیں۔ ان سب کو معلوم تھا کہ اگر ہتھ گولے پھینکنے کا جرم مجھ پر ثابت ہو گیا تو عمر قید ہو سکتی ہے پلنگ سے نہ اٹھ سکتی تھیں وہ بھی نرسوں کے چلانے کی پرواہ کئے بغیر کھسکتی کھسکتی وارڈ کے دروا میں آ گئی تھیں۔

چنانچہ میں [illegible] ڈسٹرکٹ جیل کے زنانہ وارڈ میں پہنچا دی گئی۔ کوٹھری میں پہنچ کر مجھے پہلی بار احسا [illegible] میں واقعی [illegible] ہوں۔

[illegible] ملاقات کے وقت بسنت کمار سانیال آن پہنچے۔ انہوں نے کہا کہ میں قطعی فکر نہ کرو کے بڑے بھائی کلکتہ کے نامور بیرسٹر ہیں۔ اگر مجھ پر مقدمہ چلا تو وہ پیروی کریں گے۔

میں نے کہا کہ آپ میرے لئے اتنی پریشانی کیوں اٹھا رہے ہیں۔ وہ ایک دم ہنسنے لگے۔

قصہ مختصر کرتی ہوں دیپالی بسنت کمار سانیال روزانہ شام کو جیل آ کر مجھے قانونی صورت حال سے کرتے رہے۔ اشتروی کے معرکے کے بعد ہم پینتالیس لوگوں کو بغیر مقدمہ چلائے جیل میں رکھا گیا تھا۔ سند اور دوسری لڑکیاں کشتیہ جیل بھیجی جا چکی تھیں۔

اب دیپالی غور سے سنو۔ مجھے یہ انکشاف ہوا کہ بسنت کمار مجھے بید پسند کرنے لگے ہیں۔ اسی د سے وہ جو صرف دو روز کے لئے پٹنہ آئے تھے آج ایک مہینے سے یہاں ڈٹے ہوئے تھے۔ یہ صحیح تھا کہ وہ قومی میری مدد کرنا چاہتے تھے مگر اور بھی تو اتنی لڑکیاں جیلوں میں بھر دی گئی تھیں۔ صرف میری مدد ہی کیوں؟ اس جواب میں انہوں نے کہا کہ ان سب لڑکیوں کے گھر والے ان کے لئے دوڑ دھوپ کریں گے میری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ (میں ان کو پاپا کے متعلق بتا چکی تھی) مگر مجھے لگتا ہے یہ بھی گپ تھی۔ دراصل ان کو مجھ سے عشق ہو تھا۔ لو ایٹ فرسٹ سائیٹ گپ نہیں ہے۔

ایک روز وہ خوش خوش آئے اور کہنے لگے مجھے دس ہزار کی ضمانت پر رہا کیا جا سکتا ہے۔ میری
ری ضمانت کون دے گا۔ میں نے کہا۔ اس کے متعلق سوچنا ہی بے کار ہے۔ دراصل دیپالی میں نے اپنے
تیار کر لیا تھا کہ ایک نامعلوم مدت تک جیل میں پڑی رہوں گی اور پاپا میرے غم میں روتے روتے اندھے
ں گے یا مر جائیں گے۔ (ایلس بار لو ہسپتال کے بعد ایک مرتبہ جیل بھی آئی تھیں۔ مگر میرے ارادہ کی مضبوطی
رہ لگا کر دوبارہ نہ آئیں۔ گارڈ ہلز واپس چلی گئیں)

دوسری صبح دروازہ کھلا۔ جیلر نے اندر آ کر کہا آپ کو رہا کیا جاتا ہے۔ ضمانت مسٹر لسبنت کمار سانیال
ھی۔ میں بالکل ہی بھونچکی رہ گئی۔

جیل کے پھاٹک پر لسبنت کمار اپنے بھائی بھاوج ربی اور رنجنا سانیال کے ساتھ موٹر لئے منتظر تھے
پنے ساتھ گھر لے لئے۔ ربی کمار سانیال کی کوٹھی سول لائنز میں تھی۔ وہاں پہنچ کر افوہ دیپالی۔ مجھے ایسا
لگا۔ زنانہ جیل اور ہسپتال کے زنانہ جنرل وارڈ کے بھیانک، افسردہ ماحول کے بعد یہ دوسری دنیا معلوم
میں نے سوچا۔ میں خوش قسمت ہوں۔ میں جو اکثر اپنی للی کالج کی محدود سی زندگی سے شاکی رہا
تھی۔ میں نے دیکھا کہ اسی دنیا میں بیشتر انسان کتنی تکلیفوں میں زندہ رہتے ہیں۔ کیسی کیسی ذلتیں
ذیتیں اٹھاتے ہیں۔ مجھے وہ سب زنانہ جنرل وارڈ کی غریب، میلی کچیلی لیکن باہمت عورتیں یاد آئیں۔
مجھے پتہ چلا کہ ہماری جنتا، ہماری عورتیں واقعی کتنی بہادر ہیں۔ کیسی بہادری سے زندہ رہتی ہیں۔
یسی بہادری سے مرتی ہیں۔

اتنے دنوں بعد اچھے سے غسلخانے میں اچھی طرح نہائی۔ صاف ساری پہنی۔ میز پر بیٹھ کر کھانا
یا۔ اور برابر یہ احساس رہا کہ کروڑوں انسانوں کو زندگی کی یہ بنیادی آسائشیں ہی میسر نہیں۔ یہ احساس
یچ مچ پہلی بار ہوا۔

شام کو ہم تینوں برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ لسبنت نے مجھ سے کہا۔ کل روانگی ہے سامان
ھ لو۔ (میرے پاس سامان ہی کہاں تھا، جو ساری پہن کر میں مہم پر گئی تھی وہ خون میں تر بتر ہو چکی تھی۔
ل میں انہوں نے ایک بھدا سا روب پہننے کو دیدیا تھا۔ مجھے وہ روب بہت چبھتا تھا۔ بے چاری خدیجہ
مجھے اپنی ساری اور بلاؤز اور پیٹی کوٹ پہننے کو دیدیا تھا۔ روزانہ وہ اپنی ایک ساری دھو کر سکھا کر مجھے
کو دیتی۔ وہ خود بہت غریب لڑکی تھی۔ ایک مسلمان چپراسی کی بیٹی۔ دوسری عورتوں نے بھی مجھے اپنی ساریاں

پہننے کو دیں۔ یہ سب مفلس عورتیں تھیں۔ دیپالی۔

"سامان میرے پاس کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے۔ "بالکل عادتاً منہ سے نکل گیا۔"

"میں روزی کو کل بازار لے جاؤں گی۔" رنجنا بولیں۔

"یہاں کے بازار میں کیا رکھا ہے۔ جب وہ کلکتہ پہنچے گی تو ——" بسنت بابو نے کہنا شروع کیا

"کلکتہ کیوں ——؟" میں نے ان کی بات کاٹی۔

"کلکتے اس لئے کہ میں تم سے شادی کر رہا ہوں۔" بسنت بابو نے جواب دیا۔

اسے ویمنز میگزین رومانس، طوفانی محبت، سنڈیلا اسٹوری وغیرہ وغیرہ کیا کہتے ہیں۔ اپنا تجربہ تو بہر حال یہ بتاتا ہے کہ اس طرح کے واقعات زندگی میں یقیناً ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

میں نے پاپا کا غیظ و غضب، یہ انوکھی، پر مخطر صورت، ہر چیز نظر انداز کر دی۔

سول میرج کے لئے عدالت جانا پڑتا۔ اور نئے قضیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ چنانچہ دوسرے روز رات کو چپکے سے پنڈت کو بلایا گیا۔ ٹپکل موٹا تازہ برہمن۔ ڈرائینگ روم میں پھیرے پڑے۔ باقاعدہ۔ میرا نام رادھیکا رکھا گیا۔ بسنت نے مجھے بتایا کہ بنگالی دیشنو مت میں ہر مرد کرشن اور ہر عورت رادھا کا تصوّر ہے۔ لوَلی آئیڈیا۔ مذہب وذہب سب میرے لئے بے معنی بات ہے۔ چرچ کا پادری چند الفاظ دہرا دیتا۔ پنڈت نے بھی اسی طرح کچھ ممبو جمبو کہہ دیا۔ اصلی چیز محبت ہے۔

تین روز بعد ہم لوگ کلکتے آگئے۔ بسنت کی کوٹھی بالی گنج میں ہے۔ بیحد اعلیٰ خاندان۔ ان کے پاپا کلکتہ کے مشہور سرجن ہیں۔ بڑے بھائی بیرسٹر۔ بسنت کی بھابی بھی ڈاکٹر ہیں۔ میری نند۔ برد بورن کالج میں کیمسٹری کی لیکچرر ہے۔ بڑا روشن خیال اور کلچرڈ خاندان ہے۔ میرے سسر اور جیٹھ نے جو بڑے جوشیلے قوم پرست ہیں فخر سے میرا سواگت کیا۔ لیکن ساس اور کنبے کی دوسری بڑی بڑھیاں اس شادی سے خوش نہیں ہیں کیونکہ بہر حال میں عیسائی ہوں۔ اور ایک گمنام غریب پادری کی لڑکی۔ مگر یہ لوگ اتنی شائستہ ہیں کہ اپنے کسی رویے سے اپنی ناخوشی کا اظہار نہیں کرتیں۔ اور انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ بسنت کمار مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک بیحد Sophisticated خاندان ہے۔ ادا رائے کے خاندان جیسا۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد میری ساس اور دوسری بوڑھی خواتین میرے برتاؤ سے خوش ہو جائیں گی۔

ہماری کوٹھی سر پری توش رائے کے بیٹے کی کوٹھی کے پڑوس ہی میں ہے۔ میرے جیجو اور بسنت کی مسٹر بہت دوستی ہے۔ چنانچہ دیپالی اب میں جہاں آرا اور اوما رائے والے اس اونچے طبقہ میں شامل ہو چکی پر مجھے اپنے احساس کمتری کی وجہ سے اتنا رشک آیا کرتا تھا۔ یہ سب باتیں میں اس سچائی سے تم کو لکھ رہی اور کو نہیں لکھ سکتی۔

سانیال بہت دولت مند خاندان ہے اور دیپالی میری ساری عمر عسرت میں کٹی۔ اب میں خوش ہوں کہ آسائش کی زندگی گزاروں گی۔ روپئے کی قدر اسی کو ہوتی ہے جس نے ہمیشہ تنگی و ترشی سے بسر کی ہو۔ ہماری لِلی زندگی تمہیں یاد ہے؟

پاپا اکثر اسرارِ ربّانی کی بات کیا کرتے تھے۔ اور ذرا سوچو تو مجھے بسنت کس ذریعے سے ملے اپنے پرانے چارلس بارلو کے ذریعے! اگر چارلس بارلو اپنی بہن کو ٹرنک کال نہ کرتا، وہ مجھ سے ملنے نہ آتیں۔ وہ اپنے ربی بابو کو لے کر آئیں اور ربی بابو کے ساتھ بسنت کمار آئے!!

پاپا ظاہر ہے کہ ہندو سے شادی کرنے کی وجہ سے مجھے قطعی معاف نہ کریں گے۔ میں نے بھی ایک ایک ان کو کتنے عظیم صدمے پہنچ گئے ہیں۔ کلکتے پہنچتے ہی میں نے اور بسنت نے اکٹھے پاپا کو خط لکھا۔ سے ان کی BLESSINGS کی درخواست کی۔ آج صبح ان کا چند سطروں میں جواب آیا ہے لکھا وہ خداوند خدا کے شکر گزار ہیں کہ میں زندہ بچ گئی اور خیریت سے ہوں۔ مگر میں نے یسوع کا دامن چھوڑ بُت پرست کافر سے شادی کر لی۔ اس وجہ سے وہ عمر بھر میری شکل نہ دیکھیں گے۔ اور لِلی کاٹیج کے دروازے اوپر ہمیشہ کے لئے بند ہیں۔ اور یہ کہ وہ میری روحانی نجات اور بخشش کے لئے برابر دعا کرتے رہیں گے۔

اب ختم کرتی ہوں۔ دیپالی۔ بہت لمبا خط ہو گیا۔ ڈائننگ روم میں لنچ کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ اب سسرال کا معاملہ ہے بھائی! پی۔ ایس۔ بسنت نے تم کو بہت بہت سلام کہا ہے۔ اور تم سے ملنے مشتاق ہیں۔ اب تم جلدی سے ہمارے پاس کلکتہ آؤ۔

تمہاری

رادھیکا روزی سانیال
بالی گنج۔ کلکتہ۔ ۸؍ اکتوبر ۴۲ء

۳۰

ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار

بھوتارنی دیبی نے کھانے کے کمرے کی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا کالے رنگ کی لمبی پھاٹک پر کھڑی تھی۔ یہ مس صاحب کل بھی آئی تھیں۔ بنوئے گھر پہ نہیں تھا۔ باہر سے باہر چلی گئی اب آج پھر آئی بیٹھی ہیں۔ بھوتارنی دیبی نے بیٹھک خانے کے دروازے میں جاکر پردے کے پیچ سے نظر ڈالی۔ مہمان خاتون کو تیوری پر بل ڈال کر غور سے دیکھا اور کھڑاویں پہنے کھٹ کھ کرتی رسوئی کی طرف چلی گئیں۔

ٹوٹو نے جاکر ڈاکٹر سرکار کو ان کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ "اچھا۔ بٹھاؤ۔ میں آتا ہوا مریض اُٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر سرکار نے چلمچی میں ہاتھ دھوئے اور تولیہ سے کلائیاں پونچھتے بیٹھ خانے میں آئے۔ اس وقت مہمان بی بی مسز سرکار مرحومہ کی تصویر کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"نومشکار۔ اوما دیبی۔"

"نومشکار۔ بنوئے بابو۔" انہوں نے چونک کر کہا۔

"دیپالی تو بولپور جا چکی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ مسکرائیں۔

شیریں مسکراہٹ۔ ڈاکٹر سرکار صوفے پر چپکے بیٹھے رہے۔ بڑی عجیب بات ہے۔ شبانی ک مرنے کے بعد سے آج تک، اس گھر میں، اس کمرے میں۔ دیپالی اور بھوتارنی کے علاوہ اور کسی عورت کے ہی نہیں آئے تھے۔

اوما نے باتیں شروع کیں۔ سوشل "اسمال ٹاک"۔ ٹوٹو اندر سے سلہٹی بید کی کشتی میں چاء لے کر آیا۔ بھوتارنی دیبی نے باقاعدہ چاندی کا سیٹ مقفل الماری سے نکال کر نئی پیالیوں کے ساتھ جا بھیجی تھی۔ عمدہ ٹرے کلاتھ۔ جلدی میں ٹی کوزی کا غلاف تبدیل کرنا البتہ بھول گئیں۔

"دیپالی تو اسی اتوار کو بولپور گئی ہے۔ اگر آپ تب آگئی ہوتیں تو اس سے ملاقات ہو جاتی۔"

"کیوں بنوے بابو۔ کیا میں آپ سے ملاقات کرنے نہیں آسکتی؟"

بنوے بابو جھینپ گئے۔ "کیوں نہیں۔ کیوں نہیں"۔ وہ ذرا اسیلف کونشس سے ہوکر میز انگلیاں بجانے لگے۔ شبانی کے مرنے کے بعد سے انہیں خواتین سے غیر ضروری "اسمال ٹاک" رنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی۔

اُومانے اُن پر ایک محظوظ نظر ڈال کر دنیش چندر آنجہانی کے پورٹریٹ کو دیکھا۔ واقعی لوں بھائیوں میں بڑی گہری مشابہت تھی۔ بنوے بابو بھی خاصے دلکش تھے۔ یہ آج غور سے یکھنے پر پتہ چلا۔ دیپالی نے اس روز پہلے روز ووڈلینڈز کے مورننگ روم میں ان کے متعلق غلط ہیں کہا تھا۔ بنوے بابو واقعی بہت جاذب نظر تھے۔ اور بیحد تنہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بنوے بابو ان کو پہنچانے کے لئے پھاٹک تک گئے۔ واپس ر پھر مطب میں جا بیٹھے۔

چند روز بعد اُوما پھر چندر کنج آئیں۔ یہ اتوار کا روز تھا۔ کوئی پندرہ منٹ تک مطب میں بیٹھیں ر کہا کل شام آؤں گی۔

دوسری شام وہ دیر تک دنیش چندر آنجہانی کی باتیں کرتی رہیں جن کی وہ عقیدتمند اور پرستار ہیں۔ پھر شبانی کا تذکرہ چھڑا۔ ڈاکٹر سرکار مرحومہ شبانی کے متعلق کسی سے باتیں نہ کرتے تھے وہ ن کے نہاں خانۂ دل کا ایک ایسا انمول خزانہ تھا کسی دوسرے سے اس کا ذکر کرنا ہی اس کی توہین ں تھی۔ مگر اُوما نے ایسے خلوص اور محبت سے شبانی کے متعلق پوچھا کہ وہ بے اختیار اس کا تذکرہ کرنے لگے۔ اس عورت کو وہ اپنا ہمراز بنا سکتے تھے۔ یہ عورت شاید جانتی تھی کہ مرد دراصل کتنا HELPLESS ہوتا ہے اور ہر عورت میں شاید اپنی ماں کو ڈھونڈتا ہے۔

اب وہ شام کے وقت اُوما کا انتظار سا کرنے لگے تھے۔ تینوں لڑکے اس وقت کھیلنے کے ئے باہر چلے جاتے تھے ورنہ اپنے بابا کو برآمدے میں ذرا الکین کے ساتھ ٹہلتا دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھتے ر بھوتارنی دیبی ان کو بخشنے والی نہ تھیں۔ وہ تو ایسے کسی موقعے کے لئے برسوں سے ادھار کھائے یٹھی تھیں۔ ایک روز انہوں نے بنوے بابو سے کہا۔ "سریری توش رائے کی ولایت پلٹ لڑکی پیر باند سے بھیا پر لٹو ہو گئی ہے۔ اب اسے زیادہ دبدھے میں نہ رکھو۔ بڑھیا ہوئی جا رہی ہے

لاکھوں کا جہیز لائے گی ـــ کیوں کھوکا ـــ ؟"

"دیدی ـــ" بنوئے بابو نے یک لخت بے حد جھنجھلا کر کہا۔ "آئندہ ایسی لچر حماقت کی بات نہ کہنا!"

وہ ہونٹ بچکا کر مسکراتی اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

مگر کہاں ماننے والی تھیں۔ دوسری شام جب اُوما دیبی آئیں بھوتارنی دیبی نے جھپاک سے اندر پہنچ کر یہاں پیش کیا۔ اوما دیبی کھڑکی کے پاس بیٹھی ڈاکٹر سرکار کا وہ ذاتی البم دیکھ رہی تھیں جس میں ان کی لڑکپن، کالج کے زمانے، سیاسی دور، شادی اور ہنی مون کی تصویریں تھیں۔ اُن کی فرمائش اور اصرار پر بنوئے بابو نے فوراً یہ البم لاکر ان کو دیدیا تھا اور خود کسی کام سے اپنے مطب کی طرف چلے گئے تھے۔

اُوما کی بھوتارنی دیبی سے اب تک ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ ان سے بھی بہت گھُل مِل کر باتیں کرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد بڑی بی نے پھٹ سے کہا۔ "اے تم بیاہ کب کرو گی بٹیا؟"

اسی لمحے ڈاکٹر سرکار کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے انتہائی کوفت اور ندامت سے بڑی بہن کو دیکھا۔ "دیدی ـــ!"

اُوما بھی صاف جھینپ گئی تھیں۔ لیکن بھوتارنی دیبی نے اطمینان سے جواب دیا "اے کیوں؟ تمہیں تو اپنی بیٹی تک کی شادی کی فکر نہیں۔ تم کو ان معاملات سے کیا غرض۔ جاؤ۔ تم باہر جا کر اپنے فقطے مریضوں کا ٹمپریچر لیتے رہو۔"

اُوما دیبی سر جھکا کر مسکرانے لگیں۔ اس ہینڈسم، شرمیلے، تارک الدنیا ڈاکٹر سے ہلکا ہلکا فلرٹ کرنے میں لطف آرہا تھا۔ بڑی بی نے لے کے بیچارے کو بالکل ہی شرم سے لال بھبوکا کر دیا۔

بھوتارنی دیبی اٹھیں اور فاتحانہ انداز سے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

"آپ۔ دیدی کی حماقت کا برا نہ مانیئے گا اُوما دیبی۔"

"قطعاً نہیں۔ میں پرانی نسل کی خواتین کو کیا جانتی نہیں ہوں!" انہوں نے شگفتگی سے جواب دیا۔

لیکن اسی رات جب سب لوگ سو گئے۔ تو بھوتارنی دیبی نے سرہانے کی کارنس سے قلم دوات اتارا۔ بچوں کے کمرے میں دبے پاؤں گئیں اور کھوکھو کی کاپی بک میں سے چند سادے کاغذ پھاڑے۔ اپنے کمرے میں آکر پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھیں اور بھتیجی کو خط لکھنا شروع کیا۔ بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ حروف بنا کر انہوں نے لکھا "بیٹی۔ بھگوتی ماتا نے میری برسوں کی پرارتھنا سن لیں۔ شاید تمہارے باپ کا گھر بس

وما دیبی کے آنے کی تفصیل۔ اُوما دیبی کی محبت اور خلوص۔ (اتنے بڑے باپ کی بیٹی، مگر غرور نام کو نہیں)۔ ھوکا کو پسند کرنے لگی ہے۔ کھوکا کا بھی عورت کے معاملے میں میں سمجھتی ہوں اب جا کر شاید دل نرم پڑا۔ رشتہ مجھے لگتا ہے بہت مبارک ثابت ہوگا۔ کھوکا کے اور تم سب کے دن بدل جائیں گے۔ اب تم ہی سوچو۔ ہری شادی ہو جائے گی۔ (ماں سے پرارتھنا ہے تم کو کوئی ڈپٹی مجسٹریٹ ملے۔ رانی بن کر رہو۔ تم نے میری بی بہت مصیبتیں بھوگ لیں) لڑکے کالج چلے جائیں گے۔ رہ گئی میں۔ کسی روز بھی میری آنکھ بند ہوگئی تو میرے ھوکا کا پرسان حال کون ہوگا۔ تو بیٹی خوش ہو جاؤ کہ اُوما جیسی امیر اور سمجھ دار ساس ملے گی۔ باقی اس خط کھوکا سے ذکر نہ کرنا۔ میں تمہیں بڑے راز سے لکھ رہی ہوں۔

تمہاری پھوپھی
بھوما رانی دیبی

ڈاکٹر سرکار کے ایک مریض مترا بابو سر بری توش رائے کے موکل تھے۔ اور اکثر مطب آتے رہتے تھے ادہ تر اڈے کی خاطر۔ انہوں نے کئی بار سر بری توش رائے کی کار باہر دیکھی اور اُوما دیبی کو آتے جاتے یھا۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ دیپالی گھر پر موجود نہیں ہے۔ پھر انہوں نے ذرا کرید سے بنوئے بابو سے چھا کہ کیا آج کل اُوما دیبی اُن سے اپنے درد سر کا علاج کروا رہی ہیں۔ بنوئے بابو صاف گو اور بھولے آدمی ے۔ کہنے لگے۔ نہیں ایسے ہی ملنے کے لئے چلی آتی ہیں۔

مترا بابو نے فوراً گھر پہ جا کر اپنی بی بی کو یہ قصہ سنایا۔ مسز مترا دوسرے ہی روز وُوڈلینڈز پہنچیں۔ یی رائے پچھلے برآمدے میں بیٹھی صبح کی کافی پی رہی تھیں اور اسٹیٹسمین پڑھتی جا رہی تھیں۔ جب مسز ترا سج سج چلتی آکر نزدیک کی کرسی پر بیٹھ گئیں اور نمسکار کیا۔

"اوہ ہلو اورن دھتی۔" لیڈی رائے نے مسکرا کر اخبار رکھ دیا۔ اور ان کے لئے کافی بنانے لگیں۔ ڑی سی رسمی گفتگو کے بعد مسز مترا اس خوبصورتی اور فنکاری سے جو اس قسم کے معاملات میں حرف ائین کا حصہ ہے، اصل مقصد کی طرف آئیں۔ "اُوما کی طبیعت اب کیسی ہے؟" انہوں نے کافی کا گھونٹ تے ہوئے دریافت کیا۔

"اب تو بالکل ٹھیک ہے۔ آپ تو جانتی ہیں وہ ہمیشہ سے کتنی زرد رنگ اور چڑچڑی سی رہی

ہے۔" لیڈی رائے نے جواب دیا۔

"جبھی تو میں نے پوچھا۔"

"نہیں۔ اب تو شکر ہے کچھ دنوں سے کافی شگفتہ نظر آ رہی ہے۔"

"یہ بھی ہمیشہ مجھ سے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر سرکار کا علاج بالکل جادو کا اثر رکھتا ہے۔"

"ڈاکٹر سرکار ـــــ؟"

"یہ بھی ڈاکٹر صاحب سے اپنے دمے کا علاج کروا رہے ہیں۔ بہت تعریف کرتے ہیں۔ انہوں نے ہی کئی مرتبہ اُوما کو ڈاکٹر صاحب کے مطب میں دیکھا تو مجھ سے آ کر بولے کہ یہ بڑا اچھا ہوا ـــــ"

"اچھا۔ اُوما نے مجھ سے ذکر نہیں کیا۔"

مسز مترا اب باقاعدہ GLOAT کر رہی تھیں۔ انہوں نے بات جاری رکھی۔ "آپ نے اُن کا نام تو سنا ہوگا۔ بنوئے چندر سرکار۔ وہی جن کی لڑکی دیپالی سرکار ریڈیو پر گاتی ہے۔"

"اوہ ـــــ"

"بے چارے بڑے شریف آدمی ہیں۔ بی بی تو عرصہ ہوا پرلوک سدھاریں۔ چار بچے ہیں۔ لڑکی بس دیپالی ہی ہے۔ بڑا اچھا خاندان ہے۔ ان کے بابا میمن سنگھ کے زمیندار تھے۔"

لیڈی رائے قطعاً بیوقوف نہیں تھیں۔ وہ مسز مترا کا لہجہ اور عندیہ دونوں بھانپ گئیں اور فوراً ذرا رکھائی اور ناگواری سے دوسری طرف دیکھنے لگیں لیکن مسز مترا کہے گئیں۔ "یہ تو بنوئے بابو کو بالکل دیوتا سمجھتے ہیں۔ ایسے خاندانی اور وضعدار لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں اور رہا روپیہ پیسہ تو وہ تو ہاتھ کا میل ہے۔" اس نکتے تک پہنچ کر مسز مترا نے کوئی بالکل غیر متعلق موضوع چھیڑ دیا۔ اس کے دس منٹ بعد گھما پھرا کر بات کو پھر وہیں لے آئیں۔ "لڑکیوں کی شادی آج کل ایسا کٹھن مرحلہ بنتی جا رہی ہے آخر کیا کیا جائے۔ میری ماشی ماں کے دیور کی لڑکی انجلی داس گپتا تو آپ کو یاد ہوگی اُوما کی سہیلی تھی اس کی عمر نکل گئی بال سفید ہو گئے وہ تنگ آ کر بھاؤدان جانے لنکا یا برما یا کہاں چلی گئی۔ اسکول پڑھانے۔ اب خیال آتا ہے۔ بنوئے بابو جیسا کوئی مل جاتا تو بیچاری کی قسمت بن جاتی۔ بنوئے بابو بے چارے اب جا کر کوئی چوالیس پینتالیس سال کے ہوئے ہوں گے۔ زمیندار کے لاڈلے بیٹے تھے۔ باپ ماں نے نوعمری ہی میں بیاہ کر دیا تھا۔"

یہاں تک پہنچ کر مسز مترا نے سوچا کہ اتنا آج بھر کے لئے کافی ہے۔ اور پھر دوسری باتوں میں لگ گئیں۔

لیڈی رائے مسز مترا کی گفتگو سے کافی پریشان ہو چکی تھیں۔ رات کو ڈنر کے بعد انہوں نے سر ی توش سے اس کا تذکرہ کیا۔ ڈھاکہ بہت چھوٹا اور پرونشل قسم کا شہر تھا۔ اُوما کی جتندر گنج جانے ی خبر اڑتی اڑتی سر پری توش تک بھی پہنچ چکی تھی۔ وہ ڈاکٹر سرکار سے واقف تھے۔ اس وقت انہوں نے لیڈی ائے سے کہا۔ "شکر کرو کہ اُوما نے کسی میں دلچسپی لینی شروع تو کی۔"

"اس کا مجھے احساس کھائے جا رہا ہے کہ وہ اکتیس ۳۱ سے اوپر ہو چکی ہے۔ مگر ایسا بھی کیا ـــ" لیڈی ائے نے آزردگی سے کہا۔ وہ اب تک آس لگائے بیٹھی تھیں کہ شاید کوئی ہم رتبہ داماد مل جائے۔ حالانکہ لڑکی روز وز زیادہ چڑچڑی اور موٹی اور بھدی ہوتی جا رہی تھی۔ ہماری قسمت میں نہ جانے یہ دکھ کیوں لکھا تھا۔ معمولی معمولی وگوں کی لڑکیاں ایک سے ایک حسین، نازک، دلچسپ۔ ہماری بیٹی شکل و صورت اور حلیے سے استانی لگتی ہے۔ باتیں شروع کرتی ہے تو سوائے اس کے ان بے تکے کامریڈز کے، سمجھ دار نوجوان ڈر کر دور بھاگ جاتے ہیں۔ کارل مارکس اور لینن اور اسٹالن اور یہ اور وہ۔ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا ہمارے مصلحین کی شاید ہمالیہ سے بھی بڑی غلطی تھی۔

بالی گنج کلکتہ میں سر پری توش اور لیڈی رائے کے اکلوتے فرزند زمیلندو کمار رائے کے پڑوس میں ایک بے حد دولتمند سانیال خاندان رہتا تھا۔ اس خاندان کے چھوٹے بیٹے بسنت کمار سے زمیلندو کی بڑی دوستی تھی۔ پچھلے دنوں جب اُوما کلکتہ اپنے بھائی کے پاس جا کر رہی۔ تو وہ نوجوان اس سے بھی ملنے آیا کرتا تھا اور لیڈی رائے کو امید بندھی تھی کہ شاید بسنت اُوما میں کچھ دلچسپی لے۔ مگر اس نے بھی آدبا کر اُوما کو دیدی کہنا شروع کر دیا اور پھر وہی کارل مارکس اور لینن اور اسٹالن اور اُوما نے بھی ذرا سی بھی جو ان میں دلچسپی لی ہو۔ بس وہی کمبخت ہیگل اور مارکس۔ اور بسنت نے اس غریب کالے پادری کی حسین لڑکی روزی سے بیاہ کر لیا۔ غضب خدا کا۔

اور اب ساری دنیا دیکھنے کے بعد یہ بے چارہ بنوئے ستیندر سرکار اُوما کو بھایا ہے۔ چلو۔ واقعی شکر ہے۔ کوئی تو پسند آیا۔ سرکاری افسر سے شادی کرے گی نہیں۔ کمیونسٹ ہو گئی ہے۔ تو ظاہر ہے کسی ایسے ہی نادار آدمی کو چھانٹے گی۔

"مگر بنوئے بابو بہرحال خاندانی آدمی ہیں۔ ان کے باپ زمیندار رومیش چندر کو لوگ آج بھی ڈھاکے میں بھولے نہیں ہیں۔" سر پری توش کہہ رہے تھے۔ لیڈی رائے نے گہرا سانس بھرا۔

"ان کی ایک جوان لڑکی بھی ہے۔" لیڈی رائے نے سوچ کر کہا۔

"دیپالی ــــ؟ اس کے گانے تو تم بڑے شوق سے سنتی ہو۔ اور ہمارا ارنل اس کے ریکارڈ بڑی لگن سے بجایا کرتا ہے۔" سرپری توش نے ہنس کر کہا۔

لیڈی رائے خاموش ہو گئیں۔ اور سوچنے لگیں۔ دیپالی کچھ عرصے بعد اپنے گھر چلی جائے گی۔ لڑکے اپنی فدرا لیونگ۔ ٹھیک ہے۔ بحالت مجبوری اُوما کے لئے بنوئے بابو ہی بالکل ٹھیک ہیں۔ اگر وہ آج ہی اپنا عندیہ ظاہر کر دیں تو بات آگے بڑھائی جائے۔

صبح کو لیڈی رائے نے اُوما سے ڈاکٹر سرکار کے متعلق گول گول الفاظ میں استفسار کیا تو وہ مسکرا کر چپ ئیں۔ لیڈی رائے نے فوراً چپکے چپکے بنوئے بابو کے متعلق مزید معلومات شروع کروادیں!

ایک روز اُوما چندر نگر گئیں تو ڈاکٹر سرکار سے کہنے لگیں۔ "دیپالی کے لئے اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"دیپالی ــــ؟ ابھی تو وہ اپنے میوزک ڈپلومے کے لئے پڑھ رہی ہے۔"

"اس کے بعد؟"

"پتہ نہیں۔"

"آپ کے خیال میں ہے کوئی لڑکا؟"

"نہیں۔ آپ اتنے لوگوں کو جانتی ہیں آپ ہی کوئی تجویز کیجئے۔ مگر آپ کو معلوم ہے میں لمبا چوڑا جہیز نہیں دے سکتا۔"

"مجھے وہ اپنی چھوٹی بہن کی طرح عزیز ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد اس کا اچھی جگہ بیاہ ہو جائے۔"

"جلد از جلد ــــ؟ ابھی دو سال تو اس کے میوزک ڈپلوما میں باقی ہیں۔ پھر اس کی ضد ہے کہ ایم۔ اے کرے ۔ ابھی اس کی عمر زیادہ نہیں ہے۔"

"نہیں۔ جلدی وہ اپنے گھر چلی جائے تو بہتر ہے آج کل زمانہ ــــ"

"ــــ بڑا خراب ہے؟" بنوئے بابو ہنس پڑے۔ "آپ جیسی ترقی پسند یہ کہہ رہی ہیں!"

"میں آپ کو قدامت پرست سمجھتی تھی مگر آپ شاید مجھ سے بھی زیادہ ترقی پسند ہیں!"

"نہیں۔ میں پرانی وضع کا آدمی ہوں۔ مگر میں دیپالی کی خلاف مرضی اس کا بیاہ ہرگز نہ کروں گا۔"

"اگر وہ آپ کی خلاف مرضی کرے تو؟"

"وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔ بڑی معصوم، سیدھی بچی ہے۔"

اُوما ذرا مسکرائیں۔ بنوئے بابو نے ان کو تعجب سے دیکھا۔

"ہر باپ اپنی بیٹی کو معصوم سیدھی ننھی بچی ہی سمجھتا ہے!"

"آپ کے والد بھی آپ کو یہی سمجھتے ہوں گے —!" بنوئے بابو نے ہنس کر جواب دیا۔ اُوما رائے لاجواب ہو ئیں۔ چند سیکنڈ بعد انھوں نے کہا۔ "فرض کیجیے۔ دیپالی غیر فرقے میں شادی کرنا چاہے؟"

"غیر فرقے میں؟ آپ کو یہ خیال کس طرح آیا؟"

"بنوئے بابو۔ وہ ایک مسلمان لڑکا نہیں ہے۔ کامریڈ ریحان۔ وہ شاید آپ کے ہاں بھی کئی بار آچکا ہے ں نے کچھ یونہی افواہ سنی تھی کہ —"

"افواہ —؟" بنوئے بابو نے گھبرا کر پوچھا۔

"بنوئے بابو۔ ڈھاکہ اتنا چھوٹی سی جگہ ہے۔ افواہیں اڑتے کیا دیر لگتی ہے۔"

"لیکن آپ نے کیا سنا؟"

"کچھ نہیں۔" اُوما نے اطمینان سے صوفے پر پہلو بدل کر عینک اتاری۔ لگائی۔ اور ذرا بے پرواہ آواز ں کہنے لگیں۔ "دیپالی پچھلے سال جون میں جب بولپور سے گھر آنے کے بجائے سندربن چلی گئی تھی نا۔"

"وہ سنتھال پرگنے —" بنوئے بابو نے تصحیح کرنا چاہی مگر اُوما دیبی کہے گئیں "وہ سندربن گئی تھی نا۔ پچھلے سال جون میں۔ ریحان سے ملنے۔ آپ کو تو خیر معلوم ہی ہوگا۔ تب ڈیڈی کے کسی موکل نے ضلع کھلنا کے ایک لوے اسٹیشن پر، شاید باگھیر ہاٹ پر ریحان کو اسے ٹرین پر سوار کراتے دیکھا تھا۔" اچانک وہ سراسیمگی کے ساتھ ادھوری چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ کیونکہ ان کو لگا جیسے بنوئے بابو پر دل کا دورہ پڑنے والا ہے۔ وہ بھونچکے سے نیں تکے جا رہے تھے۔

"اوہ — آئی ایم سو سوری۔ بنوئے بابو۔ میرا خیال تھا کہ آپ جانتے ہوں گے۔ آئی ایم سوری — یز — اوہ —"

بنوئے بابو نے ہاتھ اٹھا کر ان کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ذرا کرب سے اُن پر نظر ڈالی اور صوفے کی نت سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور تیوری پر بل ڈال کر کھڑکی کے باہر

دیکھنے لگے۔

"مجھے افسوس ہے بنوتے بابو" اُوما نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میرا خیال تھا آپ خود جانتے ہوں! دیپالی بڑی راستباز بچی ہے۔ وہ آپ سے جھوٹ نہیں بولتی ہوگی۔"

"اُسے جھوٹ بولنا آپ نے سکھایا ہے اُوما دیبی۔" بنوتے بابو نے مدھم آواز میں کہا۔

"میں نے ـــــ؟ میں نے بنوتے بابو ـــ؟" اُوما نے عینک اتار کر حیرت سے پوچھا۔

"جس طرح آپ اسے ایک ہفتے کے لئے اپنے ساتھ گویا کومیلا لے گئی تھیں۔ مجھے آج تک معلوم نہیں دراصل وہ کہاں گئی تھی۔ یہ سب آپ کی ٹریننگ کا نتیجہ ہے اُوما دیبی۔"

"مجھے افسوس ہے بنوتے بابو ـــ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں۔" اُوما اب ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئیں "میں آپ کو پانی لا دوں؟" بنوتے بابو خاموش رہے۔ اُوما جلدی سے کھانے کے کمرے میں گئیں۔ ڈولی رکھی صراحی میں سے گلاس میں پانی انڈیلنے سے قبل ایک نظر سے کمرے کا جائزہ لیا۔

شام کا وقت تھا اور رسوئی گھر سے کڑاہی کی چھن چھن کی آواز آ رہی تھی۔ کھانے کے کمرے کی کھڑکی باہر عبدالقادر کے مریل گھوڑے گھاس چر رہے تھے۔ اُوما گلاس لے کر بیٹھک خانے میں واپس پہنچیں۔ تو بنوتے بابو اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ اور دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ اُوما تذبذب کے عالم میں دروازے کے پاس کھڑی رہیں۔ اتنے میں بھوتارنی دیبی کھڑاویں پہنے کھٹ کھٹ کرتی اندر آئیں۔

"کیا ہوا ـــــ؟" انہوں نے بھویں جوڑ کر دریافت کیا۔

"کچھ نہیں۔ شاید بنوتے بابو کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔ یہ لیجئے۔" گلاس بڑی بی کو تھما کر جلدی سے باہر کار میں جا بیٹھیں۔ اور گھر روانہ ہو گئیں۔

دوسری صبح اُوما پھر چندر کنج پہنچیں۔ مطلب کے دروازے میں تالا پڑا تھا۔ بچے اسکول جا چکے تھے۔ بھوتارنی دیبی عبدالقادر کی گاڑی میں بیٹھ کر مہینے کی جنس لانے بازار گئی ہوئی تھیں۔ اُوما نے اندر جا کر بابو کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بنوتے بابو نے اخبار ہاتھ میں لئے لئے کواڑ کھولا۔

"اوہ ـــ تھینک گاڈ ـــ" اُوما نے کہا۔

"کیوں ـــ؟"

"رات بھر مجھے فکر کے مارے نیند نہیں آئی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو یہ صدمہ پہنچایا۔"

"میں زندگی میں بڑے سے بڑے دھچکے کو سہار لینے کا عادی ہو چکا ہوں۔ مگر میں آپ کا مشکور ہوں کہ
نے مجھے اصل صورت حال سے آگاہ کر دیا۔" وہ باہر بیٹھک خانے میں آنے لگے مگر اوما ان کے کمرے میں داخل
کتھیں۔ انہوں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔

"آپ تو واقعی بالکل سادھو بن چکے ہیں۔"

بنوئے بابو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اوما نے عینک اتار کر آنکھیں ہتھیلیوں سے ملتے رہنے کے بعد کہا: "بنوئے بابو آپ سے اب صرف
درخواست ہے۔"

"کہیئے ــــ"

"آپ دیپاؔلی پر ہرگز ہرگز یہ نہ ظاہر کیجیئے کہ میں نے آپ کو اس کے سندر بن جانے کا واقعہ بتایا ہے۔"

"آپ کو یہ درخواست کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس سے اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔"

"کچھ بھی نہیں کہیں گے؟" اوما نے حیرت سے دہرایا۔

"نہیں ــــ" بنوئے بابو آہستہ آہستہ دروازے کی سمت بڑھے۔ "آئیے باہر چل کر بیٹھیں۔
الی سمجھ دار اور بالغ لڑکی ہے۔ آپ کا خیال ہے میں اس طرح کی کوئی بات کہہ کر اسے شرمندہ
ں گا؟"

اوما ان کے پیچھے پیچھے بیٹھک خانے میں آ کر ایک کرسی پر ٹک گئیں۔

بنوئے بابو آہستہ آہستہ کہتے رہے۔ "اوما دیبی۔ شاید۔ شاید ایک غیرت مند باپ کی حیثیت سے
دیپاؔلی کو کال کوٹھری میں بند کر دینا چاہیئے۔ اور شاید فوراً کوئی ہندو لڑکا تلاش کر کے اس کی
ی کر دینی چاہیئے۔ لیکن اوما دیبی ــــ" انہوں نے ایک لمبا سانس لیا۔ "میں یہ سب کچھ نہیں کروں
اس اثنا میں وہ تھکے تھکے سے کمرے کا ایک چکر لگا کر شکستہ صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔ "میں یہ بھی جانتا
ا کہ وہ اپنی نوعمری کی رومانیت، آئیڈیلزم، اس مسلمان لڑکے سے محبت، جو کچھ بھی ہو، اس کی وجہ
مجھ سے بہانہ بنا کر ریحان سے ملنے اکیلی وہاں چلی گئی اور غالباً اس کے ساتھ ایک ہی جگہ رہی۔ مگر اس نے
بھی ایسی حرکت نہ کی ہو گی جو اسے نہ کرنا چاہیئے ــــ مجھے اس کا یقین ہے۔"

"کس طرح ــــ؟"

"آپ اُدما دیبی ـــــ آپ ولائیت میں تین چار سال اکیلی رہیں۔ آپ کے والد کو کس طرح ہے کہ آپ نے وہاں کوئی ایسی حرکت نہ کی ہوگی جو آپ کو نہ کرنا چاہیے۔"

اُدما پھر لاجواب ہوگئیں۔ انھوں نے دھیمی آواز میں سوال کیا "اب آپ کیا کریں گے؟ دیپ اور ـــــ اور ریحان کو بیاہ کی اجازت دیدیں گے؟ میں ریحان کو عرصہ سے جانتی ہوں۔ وہ کافی اُبالی اور غیر ذمہ دار لڑکا ہے۔ ایک مرتبہ وہ اپنی کزن کو let down کر چکا ہے۔ اور دیوا بھی، وہ بالکل hand to month زندگی گزارتا ہے۔ دیپالی ایک ہول ٹائمر کے الاؤنس پر کس طرح گزر کرے گی۔؟ علاوہ ازیں وہ مسلم سماج میں کس طرح ایڈجسٹ کرے گی؟ خود اس شادی سے آپ کی اپنی پریکٹس پر بُرا اثر نہیں پڑے گا؟ آپ کے زیادہ تر مریض کٹر ہندو بھدرا لوگ ہیں ـــــ معاف کیجیے گا بنوئے بابو آپ تو ایک لامذہب رشی ثابت ہوئے مگر میں آپ کی ایک پُرخلوص کی حیثیت سے دیپالی کی بھلائی کے خیال سے یہ سب کہہ رہی ہوں۔ حالانکہ It is none of my business!

بنوئے بابو سر پیچھے ڈالے چھت کو تک رہے تھے۔ وہ ذرا سا مسکرائے۔ "اُوما دیبی۔ آپ یقین میری اور دیپالی کی بھلائی کے لئے یہ سب کہہ رہی ہیں۔ اور میں آپ کا ممنون ہوں۔ مگر بات یہ ہے ـ" انہوں نے پھر ایک لمبا سانس لیا۔ "میرے نزدیک انسانی زندگی ایک انتہائی انمول شے ہے۔ اپنی نو جوان بیوی، اور اپنے نوجوان بھائی کو کھو دینے کے بعد مجھے احساس ہوا ہے کہ زندگی کتنی انمول شے ہے۔ ا انسان کا دل ـــــ انسان کا دل ـــ" ایک دم ان کی آواز میں جوش سا آگیا ـ "اُدما دیبی آپ کو کیا ا بھی علم نہیں۔ آپ اتنا پڑھ لکھ گئیں۔ دنیا گھوم آئیں۔ اتنا نہیں جانتیں کہ انسان کا دل کتنی قیمتی چیز جوان دل اور جوان زندگی بیحد ـــــ بیحد بیش قیمت چیزیں ہیں۔ اُدما۔ اور اس ایک مختصر سی انسانی زند کو دُکھی بنانا دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ زندگی بار بار نہیں ملتی۔ انسان صرف ایک بار جنم لیتا میں پُنر جنم میں یقین نہیں رکھتا۔ وہ ایک لغو تصور ہے۔ انسان کا دنیا سے، دوسرے انسانوں سے صرف ! بار رشتہ بندھتا ہے اور موت آتی ہے تو یہ رشتہ بھی ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جاتا ہے۔ ـــــ اگر ـــ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ دیپالی اس لڑکے کو اتنا چاہتی ہے"۔ وہ لڑکا دیپالی کو اتنا چاہتا ہے۔ کہ ان کے راستے میں ح ہونے کی وجہ سے ان کی زندگیاں ہمیشہ کے لئے خزاں آلود ہو جائیں گی۔ تو میں یقیناً اسے شادی کی اجازت

ں گا — ہندو سماج اور مسلم سماج اور میری پریکٹس، میری بچی کی مسرت سے زیادہ اہم نہیں۔"

"شادی کی اجازت دے دیں گے —؟" اوما نے بھونچکی ہو کر دہرایا۔

"یقیناً —!" وہ بہت محظوظ ہو کر اوما کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔ "تعجب ہے! کٹر پروگریسو پ تھیں۔ آپ کو میرے ان پروگریسو خیالات پر بہت خوش ہونا چاہیے۔"

اوما۔ کرسی سے اٹھیں۔

"جا رہی ہیں —؟ بیٹھیے۔ چائے وائے پی کر جائیے گا۔ دیدی ابھی بازار سے آتی ہوں گی۔"

"نہیں اب میں چلوں" اوما نے جواب دیا۔

بنوئے بابو صوفے پر سے اٹھے اور انھیں کار میں سوار کرانے کے لئے باہر آ گئے۔ جب اوما کار میں بیٹھ ں تو انھوں نے ہاتھ اونچا کر کے مسکراتے ہوئے نمسکار کیا۔ اور فوراً دو مریضوں سے بات چیت میں منہمک ے جو اسی وقت پھاٹک پر پہنچے تھے۔

ووڈلینڈز واپس پہنچ کر اوما رائے نے سر پری توش کے سکریٹری کو حکم دیا کہ جلد از جلد بولپور جانے کے ٹیمر اور ٹرین میں ان کا ریزرویشن کروا دے۔ وہ دیپالی سے ملنے شانتی نکیتن جا رہی تھیں۔

۳۱

دلہن کی پالکی

دیپالی دیدی آداب

پرسوں یعنی جمعے کے روز جہاں آرا آپا کی شادی ہو گئی۔ آپ کو معلوم کر کے ضرور تعجب ہو گا پکے چپکے بات چیت چلائی جا رہی تھی تاکہ بقول شمسہ خالہ کوئی باہر والا اڑنگا نہ لگا دے۔ خود ں آرا آپا کو تاریخ طے کرنے سے چند روز قبل ہی اطلاع دی گئی۔ یہ شادی بھی شمسہ خالہ ہی نے ئی ہے۔ نواب اجمل حسین مرشد زادہ نیر بھائی کی دلہن کے سگے خالو ہیں۔ دلہن بھابھی کی خالہ ہوا انتقال ہو گیا۔ اولاد کوئی نہیں ہے۔ بقول شمسہ خالہ جہاں آرا آپا کی عمر بڑھ رہی تھی اور کم عمر لڑکا مل نہیں رہا تھا خصوصاً جبکہ جہاں آرا آپا کی صورت شکل بھی معمولی ہے۔ نواب اجمل حسین

مرشد زادہ آپا سے عمر میں دو گنے بڑے ہیں۔ وہ بھی دیناج پور کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔ میٹرک پاس ہ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ بقول شمسہ خالہ وہ اپنے سسر نواب قمرالزماں چودھری کے توڑ کے رئیس تین موٹریں اور تین چار ہاتھی رکھتے ہیں۔ آپا کے لئے سیروں زیور چڑھاوے میں آیا۔ شمسہ خالہ امی کہہ رہی تھیں لڑکا میٹرک پاس ہے تو کیا ہوا کون سا جہاں آرا کو اس کے ساتھ بیٹھ کر شیکسپیر ڈ کرنا ہے۔ لیکن امی نے مجھ سے کہا کہ بے چاری جہاں آرا کی قسمت پھوٹ گئی۔ سنا ہے اجمل حسین صاحب عیاش ہیں۔ شراب بھی پیتے ہیں۔ امی نے شمسہ خالہ سے ان کی عیاشی کی خبر پر پوچھ گچھ کی تو وہ بولیں بہن بس اب چپکی رہو۔ جب لڑکی والوں نے سب طرح سے اطمینان کر والیا ہے تو ہم غیر لوگ کیوں فکر میں گھلیں۔ دوسرے یہ کہ لڑکا ایک زمانہ میں ذرا رنگین مزاج ضرور تھا۔ کلکتے جا کر ریس کھیلتا تھا اور ذرا پ پلانے اور گانا وانا سننے کا شوقین تھا۔ مگر غریب کیا کرتا۔ بیوی مر چکی تھی۔ اکیلا دم۔ اللہ کا دیا پیسہ بہت اُڑاتا تھا۔ مگر اب پھر سے گھر گرہستی میں لگ کر ٹھیک ہو جائے گا۔ جہاں آرا بڑی نیک بخت ہے اس کی اصلاح کر لے گی۔

سچ کہتی ہوں دیدی۔ مجھے شمسہ خالہ اور نیّر بھائی کی دلہن دونوں پر بڑا غصہ آیا کہ انھوں نے مل کر آپا کو کہاں جھونک دیا۔ نواب صاحب اس رشتے سے قطعی خوش نہیں ہیں مگر سب گھر والوں نے مل کر اُن کا بیچھا لے لیا۔ اُدئی کیا لڑکی کا کوار کوٹ چُننا ہے۔ جب تک وہ بیٹھی رہے گی انجم آرا، اختر آرا کے لئے بھی پیغام نہیں آسکتے۔ نواب صاحب نے پھر بھی حامی نہ بھری تو جہاں آرا کی امی پر فوراً اختلاج قلب کا دورہ پڑ گیا۔ (اختلاج قلب نہیں دیدی۔ اب میں بڑی ہوتی جا رہی ہوں تو دنیا کی بہت سی باتیں سمجھ میں آتی جا رہی ہیں۔ بیگم قمرالزماں کو دراصل ہسٹریا کا مرض ہے اور نواب صاحب چاہے امن پسند آدمی ہیں بیوی کے ان دوروں سے ان کی روح فنا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے بیچارے نے ساری عمر اپنے اس ڈیپریسنگ کتب خانے میں بیٹھے بیٹھے گذار دی) بہرحال تو بیگم قمرالزماں نے الٹی میٹم دے دیا کہ لڑکی کا رشتہ اس جگہ نہ ہوا تو وہ زمین آسمان ایک کر دیں گی۔ نواب صاحب تب بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔

اور تب ان کی بیوی نے ایک ترپ چال چلی۔ یہ مجھے بالکل اتفاقیہ معلوم ہوا اور بڑی سخت حیرت ہوئی۔ ایک روز میں ارجمند منزل گئی ہوئی تھی۔ جہاں آرا آپا باورچی خانے کی طرف ج

ھتیں۔ میں نیّر بھائی کے بچے منوّر کو گود میں لے کر پیچھے والے برآمدے میں ٹہلنے لگی کہ اندر بیگم قمرالزما کمرے سے آواز آئی۔ نواب صاحب بے چارے اپنی بیوی سے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے " میں ں آرا کو جان بوجھ کر کنویں میں نہیں ڈھکیلوں گا۔" تو وہ چمک کر بولیں۔ "اور کیا کرو گے؟ ہتے ہو کہ وہ تمہاری بھتیجی ملیحہ کے لفنگے بیٹے کے ساتھ بھاگ جائے؟" نواب صاحب نے متانت سے کہا۔ ری بیگم۔ خاموش رہو۔" وہ بھلا کہاں خاموش رہتیں۔ بولیں۔ "معلوم بھی ہے فنگا جیل سے چھوٹ گیا۔ پھر ڈھاکے کے چکر لگا رہا ہے۔ ابھی پرلے روز یہاں آیا تھا۔ میں سو رہی ۔ وہ میرے کمرے سے باہر نکلا تو آہٹ سے میری آنکھ کھلی۔ جاتے ہوئے اس کی جھلک دیکھی تو گھبرا کر کی میں گئی۔ باہر جھانکا تو کیا دیکھتی ہوں۔ باہر تالاب کے کنارے دونوں کھسر پسر کر رہے ہیں۔ تمہیں سنت کی خبر بھی ہے نواب صاحب۔ تم اپنی اسٹڈی میں بیٹھے پاکستان زندہ باد کرتے رہو۔ تمہیں یہ ں کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اب تم یہی چاہتے ہو کہ صاحبزادی تمہارے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا کر اس ں اٹھائی گیرے کے ساتھ گھر سے نکل جائیں؟ اور فرض کرو وہ نہ بھی بھاگ سکے تو یہ خبر کہ رونو میاں ں گئے ہیں کم بدنامی کی بات ہے؟ بے چاری شمسہ بہن اور اللہ رکھے نیّر کی دلہن نے جوڑ توڑ کر کے ایک لگایا ہے وہ بھی ٹوٹ جائے گا۔ رونو میاں کا قصہ اب تک چھپا ہوا تھا۔ مگر اب بات پھیل گئی تو آرا تو خیر ہیں ہی بدنصیب۔ چھوٹی دونوں کے بھی رشتے نہیں آئیں گے۔"

نواب صاحب چپ چاپ بیگم کی یہ تقریر سنتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے۔ "انوری بیگم۔ رونو اگر ی کے لئے آپ کہیے تو میں اسے اجازت دے دوں گا۔ چار برس قبل میں نے حماقت کی تھی۔ اب اجازت دوں گا۔" یہ سنتا تھا کہ انوری بیگم پر دورہ سا پڑ گیا۔ کہنے لگیں۔ "میں مرتی مر جاؤں گی یہ شادی نہ ہونے گی۔ اور یاد رکھو وہ اب تمہاری لڑکی سے بیاہ کرے گا بھی نہیں۔ میں اس روز کے بعد شمسہ بہن کے اس کے رتی رتی حالات معلوم کروا چکی ہوں۔ وہ اس ہندو بیرسٹر کی لڑکی کے چکر میں مبتلا ہے۔ بیر ٹر کی لڑکی۔ یوں کہو کہ بیرسٹر کی لڑکی نے اسے رکھا ہوا ہے۔ توبہ توبہ۔ اس خاندان میں ایسا بے آدمی پیدا ہوا۔ مگر کیا کرے۔ ہے بھی تو پاٹ کوٹنے والے دو ٹکے کے کسان کی اولاد۔ اجی وہ نواب کا بن کر بھی آئے تو میں اس دہلیز کو نہ پھلانگنے دوں۔ آوارہ۔ دو کوڑی کی اوقات۔ میری شہزادی کو گا؟ اور اجی تم بھی سٹھیا گئے ہو کیا۔ یا مرحومہ ملیحہ بیگم کی محبت نے جوش مارا ہے؟ بلواؤ تو اس کو۔

ذرا دیکھوں کیسے شادی کرتے ہو جہاں آرا سے اس کی ۔" اتنا کہہ کر وہ تو ٹسوے بہانے لگیں اور نو صاحب کمرے سے باہر چلے گئے ۔

جب اندر یہ باتیں ہو رہی تھیں تو انجم آرا بھی برآمدے میں آگئی تھی ! اور کان لگا کر والدین مکالمہ سن رہی تھی ۔ جب باپ باہر چلے گئے تو وہ لمبا سانس بھر کر مجھ سے بولی ۔" اب دیکھو کیا کیا ہے ۔ اللہ کرے ایسا ہو جائے ۔ اللہ کرے ایسا ہو جائے ۔" میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ قصہ کیا ۔ نجمہ کہنے لگی ابھی آپا سے کچھ ذکر نہ کرنا ۔ ممکن ہے کچھ بھی نہ ہو اور آپا پھر غلط آس لگا کر بیٹھ جائیں ۔

مگر دیدی بے چاری انجم کو تو ٹوہ لگ گئی کہ اب ابا کیا کرتے ہیں ۔ اور وہ اور سالا دونوں جاسوسی پر مستعد ہو گئیں ۔ انہوں نے اپنی جاسوسی کے ذریعے معلوم کیا کہ نواب صاحب نے شمسہ خالہ کو بلا کر سے پوچھا ۔" رونو میاں اور اُومارائے کا قصہ کیا ہے ؟" شمسہ خالہ ہاتھ کانوں پر رکھ کر بولیں ۔" مجھے کچھ معلوم نہیں ۔ میں نے تو ایسے ہی اُڑتی اڑتی سنی تھی ۔ وہی میں نے انوری بہن کو بتلا دیا ۔" اب نو صاحب نے جلد از جلد اپنے رونو میاں کو کونٹیکٹ کرنے کی کوشش کی ۔ ان کو دہلی خط لکھا کہ فوراً آکر اُومارائے کو فون کر کے پوچھا کہ رونو اس وقت کہاں ہیں ۔ انہوں نے کچھ گول سا جواب دیدیا ۔

ادھر دیناج پور سے عقد کی تاریخ جلد طے کرنے کے تقاضے آرہے تھے ۔ ادھر بیگم قم کے اختلاج قلب میں زیادتی ہوتی جا رہی تھی ۔ جس روز نواب صاحب نے ان سے کہا کہ وہ جب تک میاں سے بات نہ کرلیں نکاح کی تاریخ طے نہ کریں گے ۔ تو اُن کی بیگم نے قیامت برپا کردی ۔ نوابہ نے دلی ، بمبئی ، کلکتہ جانے کہاں کہاں ہر ممکن پتے پر رونو میاں کو تار دیئے ٹرنک کال کئے ۔ مگر وہ حضرت جا کہاں غائب ہو چکے تھے ۔ کوئی جواب نہ آیا ۔ ادھر انوری بیگم پر اتنا زبردست دل کا دورہ پڑا کہ لینے کے د پڑ گئے ۔ نواب قمر الزماں نے ہار مان لی ۔ نواب اجمل حسین سے شادی کی تاریخ طے کر دی گئی ۔

مجھے اس زمانہ میں دیدی نواب صاحب پر اتنا ترس آیا کہ کیا بتاؤں ۔ ایسے ٹوٹے ہوئے اور دُکھ اور غمزدہ لگتے تھے کہ دیکھا نہ جاتا تھا ۔ آپا کو مایوں بٹھایا گیا ۔ ان کو بس چُپ سی لگ گئی تھی ۔ بڑی دھوم کی شادی ہوئی ۔ روزی آپا کی اور آپ کی عدم موجودگی کا ہم سب کو افسوس تھا ۔ روزی آپا کا اب کچھ پتہ نہیں چلا ۔ ایک خبر ہے کہ معافی مانگ کر جیل سے نکل آئیں ۔ دوسری خبر ہے کہ کالے پانی بھیج دیا گیا ۔ اور ایک خبر ہے کہ کسی انگریز سے بیاہ کر لیا ۔ اور ایک خبر ہے کہ ہتھکڑیوں سمیت جیل سے فرار ہو گئیں

ں کی کوئی حد نہیں!) اس بدامنی کے زمانے میں بھی بڑی شان و شوکت کی تقریب رہی۔ نواب قمرالزما ی کی بیٹی کی شادی تھی کوئی مذاق تھوڑا ہی تھا دیدی۔ دیناج پور سے برات آئی۔ جو دراصل سب ائی کے سسرال والے ہی تھے۔ ایک سے ایک دقیانوسی زمیندار نرائن گنج میں اسٹیمر سے اترا۔ سال ہم لوگ اسی برسات کے زمانے میں نیرّ بھائی کی بارات لے کر دیناج پور گئے تھے) خیر صاحب بارات ارجمند منزل کے دروازے پر آئی اور دولہا ہاتھی سے اترا تو ہم سب دھک سے رہ گئے۔ ھجنگ۔ تمباکو کا پنڈا۔ منہ پان سے رچا ہوا۔ بس ٹپکل قصباتی زمیندار۔ نواب اجمل حسین نواب ماں کے ہم عمر ہیں بلکہ ایک آدھ برس نواب صاحب سے بڑے ہی لگتے ہیں۔ اور ان کے گھر کی عورتیں قصباتی ان پڑھ بنگالنیں۔ جن کے نزدیک ڈھاکہ بھی لندن سے زیادہ آزاد ہے۔ یا اللہ۔ یہ آپا کی سرال ہے۔ اور یہ آپا کے شوہر ہیں۔ اللہ کی شان ہے۔

اب اللہ کی ایک اور شان کا قصہ بھی سنئے اور غور کیجیے کہ بڑی بوڑھیاں جو "قسمت کا کھیل" ست کا کھیل" رٹتی ہیں تو کچھ غلط نہیں کہتیں۔

شادی میں رخصتی کے وقت، رولو میاں بحیثیت مہمان آن موجود ہوئے! نکاح ہو چکا تھا۔ نیچے اروں کی کشش مچی تھی۔ قہقہے لگ رہے تھے۔ میں نے فرید پور سے آئے ہوئے کسی نوجوان رشتے دار ازسنی: "رولو بھائی۔ آپ بھی کھا لیجیے۔ جلدی سے دو کیلے ہو جائیں گے۔" میں نے پلٹ کر اگر ہال میں اتنی بھیڑ تھی کہ کچھ پتہ نہ چلا۔ اتنے میں انجم میرے پاس بھاگی بھاگی آئی۔ اور کہنے۔ "غضب ہو گیا یاسمین۔ رولو بھائی آ پہنچے۔ ان کو اب آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اُن کو تار نہیں ملے؟ اور اگر مل گئے تو ان کا جواب کیوں نہ دیا۔ پہلے کیوں نہ آئے؟ اب کیوں ہیں۔ زخموں پر نمک چھڑکنے؟" اتنے میں شور مچا۔ دولہا آرہا ہے۔ دولہا آرہا ہے۔

آپا جو بالکل بے جان سی ہو گئی تھیں۔ ان کو زینے سے اتار کر زنانہ دیوانخانے میں لایا گیا اور پر بٹھال دیا گیا۔ دولہا میاں مسکراتے ہوئے آئے۔ آرسی مصحف ہوا۔ ساری رسمیں ادا کی ہم لوگوں کا (انجم، اختر آرا اور میرا) جی جوتا چرانے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر مجبوراً چرایا۔

اس وقت مجھے پہلی بار رولو میاں نظر آئے جو دیوانخانے کے دروازے میں کھڑے نے اطمینان رّ بھائی سے باتیں کر رہے تھے۔

اب دیدی اللہ کی تیسری شان سنیے —— یہ رونو میاں آپ کے مشہور و معروف ریب احمد ہیں۔ جن کو آپ بھی شاید جانتی ہوں۔ کمال ہو گیا۔ یہ آپا کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ ان کی منگنی آ سے کیسے ٹوٹی ایک اور لمبا قصہ ہے جو مجھے انجم آرا نے بعد میں بتایا۔ اور اگر میں اس خط میں لکھوں تو خط ہی طویل ہو جائے گا۔ زبانی بتاؤں گی۔ بہر حال تو دلوانخانے میں عورتوں کی وہ بھیڑ جمع تھی کہ دم گھٹا ج تھا۔ اُسی وقت میں نے آپا کے خاندان کی چند بڑھیوں کی کھسر پسر سنی۔ فرید پور سے آئی ہوئی ایک بڑھ بولیں۔ "اے ہے یہ تو اللہ بخشے فخرل بھائی کا نواسہ ہے۔" دوسری نے کہا۔ "وہ تو روپوش تھا میں نے سنا تیسری بولیں۔ "نکل آیا جیل سے نگوڑا۔ یونہی خدائی خوار پھرتا ہے۔" چوتھی نے فرمایا۔ "اے جنت مکانی کا پوت۔" "ہاں۔ ہاں وہی۔ اچھا ہوا جہاں آرا سے بیاہ نہ ہوا۔ بے چاری کی قسمت پھوٹ جاتی۔ (خود کھاتا۔ کیا نواب کی بیٹی کو کھلاتا نگوڑا دہریہ کمیونسٹ۔"

اب رخصتی کا وقت آیا۔ نیر بھائی نے پکارا "کمرہ خالی کرو۔ بھیڑ کم کرو۔ دلہن کے بزرگ آ رہے ہیں! بزرگ آ رہے ہیں۔" خیر بہت سارے بزرگ آئے۔ آپا کو دعائیں دینے (ہاں دیدی آپ کے بابا، پشپی ماں تینوں بھائی بھی آئے تھے شادی میں) آپ کے بابا آپا کے لئے ایک بنارسی ساری لائے تھے۔ دوسرے بزرگوں کے ساتھ جب وہ آئے سر پر ہاتھ رکھنے تو وہ آپا کے سر پر ہاتھ رکھ کر ایک منٹ کے لئے چپ سے کھڑے رہے۔ نو صاحب نے کہا "بیٹی تمہارے ڈاکٹر چچا آئے ہیں۔" نواب صاحب دراصل رخصتی کے وقت دیوانخانے کے ایک گوشے میں گم سم کھڑے تھے۔ (میں نے کسی مرد کو روتے زندگی میں پہلی بار جبھی دیکھا۔ مگر سنا ہے کہ بیٹیو کی شادی پر سب ماں باپ لوگ روتے ہیں) جب دیدی آپ کے بابا آپا کے قریب آئے تو نواب صاحب سے کہنے لگے۔ "بنوئے! ایک دن دیپالی بھی اسی طرح رخصت ہو جائے گی۔ تم بہت سمجھ بوجھ کر اسے وداع کرنا۔" میں مسند کے پیچھے والے دریچے میں چڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور یہ سارا نظارہ دیکھ رہی تھ پھر پادری بنرجی روزی کے پاپا آگے بڑھے۔ انہوں نے بھی آپا کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ اور آی وائف" قسم کے عنوان کی ایک مذہبی و اخلاقی پند و نصائح کی مجلد کتاب ربن سے بندھی ان کے رکھ دی۔ پھر نواب صاحب سے کہا خدا باپ کا شکر ہے۔ آپ نے اپنی لڑکی اپنے ہاتھوں سے عزت ساتھ اپنے گھر سے رخصت کی۔ خدا کا شکر ہے۔ اور سر جھکائے کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے باہر چلے گئے۔

وہ کوتا کو ہار مچی تھی کہ کیا بتاؤں۔ اور انجم بار بار جب موقع ملتا مجھ سے آ کر کان میں کہہ جاتی۔ "ر

ی کو نہ آنا چاہیے تھا۔ ایسی بے رحمی کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کہاں کی جدلیاتی مارکسیت ہے۔ کیا آدمی
مسٹ بن کر جذبات سے عاری ہو جاتا ہے؟"

رونو میاں اُوما دیبی کے ساتھ آئے تھے۔ مہمانوں میں سر پرتی توش اور لیڈی رائے بھی شامل تھیں۔
رونو میاں اُوما دیبی کے ساتھ بعد میں پہنچے۔ رخصتی کے وقت وہ دروازے میں کھڑے نیر بھائی سے باتیں
ر رہے تھے۔ نیر بھائی نے کہا: "آہا۔ رونو بھائی یہ عید کا چاند کہاں سے نکلا۔ آپ سے تو آج چار ساڑھے
ر برس بعد ملاقات ہوئی ہے۔" کہنے لگے۔ "ہاں بھئی۔ ذرا ادھر خاصا مصروف رہا۔ (یہ بھی کس قدر زبردست
راسٹیٹمنٹ تھا!) میں ابھی پچھلے مہینے ڈھاکہ آیا تھا۔ تب تم لوگوں سے ملاقات نہ ہو سکی۔

انجم تو اس موقعے کی تاک میں تھی کہ ان سے مچیٹا کر سکے۔ وہ بچپن سے ان کی کافی منہ چڑھی کزن ہے
لپک کر آگے بڑھی اور بولی۔ "رونو بھائی آپ ڈھاکے سے کہاں گئے تھے۔ دلی؟" کہنے لگے۔ "نہیں بی بی میں
لی کے بجائے پارٹی کے ایک ضروری کام سے سیدھا لاہور چلا گیا تھا اور وہاں سے پشاور۔ یہ پچھلا مہینہ
جاب اور سرحد کے دورے میں گزرا۔ پشاور میں مجھے پارٹی ہیڈکوارٹرز کی طرف سے حکم پہنچا کہ فلاں کام
لئے پھر فوراً ڈھاکے واپس جاؤ۔ تو دوبارہ سیدھا یہاں آ رہا ہوں۔ آج صبح ہی پہنچا تو اُوما نے
لایا کہ شام کو جہاں آرا کی شادی ہے ____ کیوں بھئی۔ اب تم کب شادی کر رہی ہو۔ کم از کم تم
ر آگے پڑھ ڈالو۔ بے چاری جہاں آرا کو ماموں جان نے کالج سے نہ جانے کیوں اٹھا لیا تھا۔"

نجمہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ جب وہ اس قدر سادگی سے یہ سب کہہ رہے تھے تو میرا جی چاہا کہ
ھاڑیں مار مار کر روؤں اور پھر ان کو قتل کر ڈالوں۔ آپا ان کے دکھ میں رو رو کر زندہ درگور ہو گئیں اور یہ
ن کی شادی میں کس قدر مطمئن اور بے نیاز نظر آ رہے تھے۔

ساتھ ہی اُوما کھڑی تھیں۔ دیوار سے لگی۔ اور عینک کے پیچھے سے آنکھیں جھپکا جھپکا کر رخصتی کا نظارہ
لاحظہ کر رہی تھیں۔

اب وداع کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ آپا کو گود میں اٹھا کر صدر دروازے تک لایا گیا۔ پھر رونا
یٹنا مچا۔ نیر بھائی آپا کو پالکی میں بٹھانے لگے۔ اس وقت رونو میاں بھی قریب کھڑے تھے۔ شمسہ خالہ بھی
ک ہی خرانٹ ہیں۔ جھک کر بولیں۔ "لے ہے رونو میاں۔ تم بھی تو بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے رخصت کرو۔"
اس وقت دیدی مجھے ایسا لگا جیسے سرخ گٹھری بنی آپا سر سے پیر تک لرز کر رہ گئیں۔ چنانچہ رونو میاں نے

آئے بڑھ کر ان کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے کہا ALL THE BEST بی بی ۔ اور جلدی سے ہٹ گئے ۔ نواب صاحب قریب کھڑے تھے ۔ وہ چہرہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگے ۔ دراصل اس و زار و قطار رو رہے تھے ۔ اور اسی بھیڑ بھڑکے میں ایک بڑی بی دوسری بڑی بی سے بولیں "اے بے! طرح دُکھیا ملیحہ کو بھائی کی حیثیت سے قمر میاں نے رخصت کیا تھا ۔"

باہر بینڈ بج رہا تھا ۔ ہاں ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی ۔ میں انجم اور اختر اس شادی سے اس ت ڈیپریسڈ تھے جن دنوں شادی کی تیاریاں کی جا رہی تھیں تو میں نے سوچا کہ دل خوش کرنے کے لئے کچھ تو جائے ۔ چنانچہ سروجنی دیبی کی وہ نظم "پالکی بردار" ہے نا ۔ کالج کی چند لڑکیوں کے ساتھ مل کر میں نے اس کا بیلے بنایا اور اسے رخصتی سے کچھ دیر پہلے ارجمند منزل کے جلسہ گھر میں پیش کیا ۔ آپا کی پالکی سامنے ہی رکھی تھی ۔ اور دیناج پور پہنچ کر بھی آپا اسٹیمر گھاٹ سے بیس میل دور اپنی سسرال پالکی میں جائیں گی ۔

ہمارا بیلے دیکھنے کے لئے سارے مہمان مرد عورتیں جلسہ گھر پر ٹوٹ پڑے ۔ بہت سے اوپر جا کر روشندان میں سے جھانکنے لگے ۔ بے حد پسند کیا گیا ۔ دیدی یہ گویا میری پہلی پبلک پیش کش تھی ۔ ابا بہت خفا ہوتے مگر وہ خوش قسمتی سے جل پائے گوڑی گئے ہوئے تھے ۔ آپ کو معلوم ہے نا ابا بڑے قدامت پسند پکے مولوی ہیں ۔ بھیڑ چھٹ گئی تھیں ۔ دنو میاں بھی جلسہ گھر کی ایک دیوار سے لگے "پالکی بردار" دیکھ رہے تھے ۔ اُمّارا آ ان کے ساتھ کھڑی تھیں ۔ وہ بڑے سوچ میں ڈوبے ہمارا رقص دیکھا کئے ۔ جب بیلے ختم ہوا تو وہ بھیڑ چیرتے میرے پاس آئے اور کہنے لگے ۔ بھئی تم تو کوریوگرافی کا خوب صلاحیت رکھتی ہو ۔ شاباش ۔ کہاں سیکھ رہی ہو ۔ میں نے جواب دیا ۔ کہیں بھی نہیں ۔ کہنے لگے مگر یہ تو بڑی زیادتی ہے ۔ تم کو باقاعدہ یہ فن سیکھنا چاہیے میں نے کہا ابا کی اجازت نہیں ۔ حالانکہ میں شانتی نکیتن جانا چاہتی تھی وہاں ہماری دیپالی دیدی بھی ہیں

دیپالی کے نام پہ دیدی وہ مسکرانے لگے ۔ بولے اچھا ۔ تمہاری دیپالی دیدی وہاں ہیں ۔ بہت خوب ۔ کوشش کر کے تم وہاں ضرور جاؤ ۔ اور ان کے چہرے پر ایک دم آپ کا نام سنتے ہی روشنی سی آگئی ۔

کیوں دیدی ؟ کیا قصّہ ہے ؟ چھُپی رستم ؟

جس وقت ، دنو بھائی مجھ سے باتیں کر رہے تھے اُمّارا اے عینک کے گول گول شیشوں کے پیچھے سے گھورتی ۔ مجھے گھُورے جا رہی تھیں ۔ میں تو بھیّا فوراً وہاں سے کھسک گئی ۔ ارے بھئی آپ ہی سوچیے دنو میاں سے مجھے مطلب ؟

دیدی سروجنی دیبی کے "پالکی والوں کا گیت" کتنا دلدوز ہے۔ پالکی چلے ہو ہو — پالکی ہو ہو — گیتوں کی تھاپ پر پھولوں سی جھومتی۔ ندیا کے جھاگ پر چڑیا سی ڈولتی۔ پالکی چلے ہو — ہنس ہنس ہم گاتے چلیں، تیز تیز، جلدی جلدی، گیتوں کی شبنم میں تارا سی پالکی، ٹا کی موجوں پر کرنوں کی لہریں — یا دلہن کے آنسو — سہج سہج پالکی چلے — پالکی چلے"۔ ع دیدی اس گیت پر بہت ہی موثر بیلے بنا۔ خوب تالیں بجیں۔ اس کے بعد آپا کو پالکی میں بٹھلا گیا۔ ہ بے چاری روتی بلکتی سسرال سدھاریں۔ جب ان کی پالکی ارجمند منزل کے پھاٹک سے باہر نکلی رونو اں اس وقت لان پر ایک طرف کھڑے دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایسول بتولیس پیسے پہ رکھ کے مارے۔

اچھا دیدی بائی بائی   فقط

یاسمین مجید
سگن بگیچہ۔ ڈھاکہ
۲۱ اکتوبر ۱۹۴۲ء

۳۲

کمل اور اکمل

اکتوبر ۴۳ء۔ تیسرا پہر۔ ارجمند منزل کا پچھلا برآمدہ۔ جہاں آرا، روزی، یاسمین، انجم آرا اور ہزآرا بڑے تخت پر بیٹھی ہیں۔ جہاں آرا، روزی کے تین ماہ کے بچے کو گود میں لیے کھلا رہی ہے۔ روزی، اں آرا کے ڈھائی ماہ کے بچے کی گاڑی پر جھکی "بے بی ٹاک" میں مشغول ہے۔ پھر وہ دونوں لڑکیوں مخاطب کر کے کہتی ہے۔ "کلکتے میں میں نے بسنت سے کہا۔ جہاں آرا کے بیٹے کا نام اس کے باپ اجمل حسین ،نام کے وزن پر اکمل رکھا گیا ہے۔ میں اپنے بیٹے کا نام اکمل کے وزن پر کمل رکھوں گی۔ بسنت ہنسنے ہ۔ بولے۔ سنسکرت میں کسی شبد کا مخالف شبد بنانا ہو تو اس کے شروع میں اَ [illegible] لگا دیتے ہیں۔ یھو کہیں تمہارا اکمل کملی کا مخالف نہ ہو جائے!"

جہاں آرا روزی کے بچے کو اس کے گدیلے پر لٹا کر کہتی ہے۔ "کیوں ماسٹر کمل! تم بڑے ہو کر اکمل سے لڑو گے؟"

نیرّ الزماں کا سوا سالہ لڑکا منوّر الزماں اپنے گڈولنے کو برآمدے میں دھکیلتا پھر رہا ہے۔ تینوں لی آپائیں گٹ بنائے سامنے تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھی پان چبا رہی ہیں، روزی سانیال اپنے شوہر، بچے اور کے ہمراہ چند روز قبل کلکتے سے ڈھاکے آئی ہے۔

"روزی آپا اپنی مہم کا قصّہ تو سنائیے۔ جب آپ کل لِلی کاٹج پہنچیں تو کیا ہوا؟" اختر آرا پوچھتی۔

"کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں کمل کو لے کر لِلی کاٹج گئی تھی۔ ماما کو کلکتے سے خط لکھ دیا تھا کہ پاپا کے ڈر کے' سیدھی گھر نہیں آؤں گی۔ ووڈ لینڈز والے بسنت کے خاندانی دوست ہیں۔ نرملیندو رائے نے اصرار کیا تھا' ڈھاکے جاؤ تو ہمارے ہاں ہی اترنا۔ ڈھاکے پہنچ کر اسی شام ووڈ لینڈز سے میں لِلی کاٹج گئی۔ ماما بے چا صبح سے راہ دیکھ رہی تھیں۔ سارا مشن کمپاؤنڈ پھاٹک پر جمع تھا۔ میں کمل کو لے کر لیڈی رائے کی کار سے آ

"بسنت بابو ساتھ گئے تھے؟" یاسمین مجید نے پوچھا۔

"نہیں۔ ماما تو روتی ہوئی آ کر لپٹ گئیں۔ بیچاری نے پھولوں سے سارا گھر سجایا تھا دع کا انتظام کیا تھا۔ میں اندر گئی تو بولیں تمہارے پاپا اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ چلی جاؤ کچھ نہیں کہیں گے۔ میں سہمی سہمی اندر گئی۔ پاپا کھڑکی میں کھڑے کچھ پڑھ رہے تھے۔ ماما نے کہا 'ہاں ـــ !'"

"وہ کچھ نہ بولے۔ معلوم تھا میں دہلیز پر کھڑی ہوں۔ ماما نے پھر کہا۔ ہاں! خدا باپ کے ناشکرے نہ بنو۔ ایک سال ہوا تمہاری لڑکی اس طوفانی رات موت کے منہ میں جانے کے لئے گھر سے نکلی تھی۔ خد باپ نے اسے زندہ سلامت رکھا۔ اسے برکت دو۔ دیکھو اس کے ساتھ ایک ننّھا فرشتہ تمہارے گھر مہما آیا ہے۔ (گڈ اولڈ ماما ـــ ! میں نے دل میں کہا) غرضیکہ پاپا شاید کیو CUE کے انتظار میں کھڑے تھ ذرا چہرہ سخت کر کے میری طرف مڑے۔ عینک ماتھے پر سرکائی۔ ذرا جھجک کر آگے بڑھے اور میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ کمل اپنی غوں غاں کرنے لگا۔ پاپا بولے۔ خدا باپ لمبی عمر کرے۔ اور پُر تکلّف لہجے میں مجھ پوچھا ـــ کیا نام رکھا ہے؟ کمل میں نے جواب دیا۔"

"بسنت بابو کے لئے کچھ نہ پوچھا؟" جہاں آرا نے دریافت کیا۔

"نہیں۔"

"چلو۔ خیر کچھ تو برف پگھلی۔" اختر آرا بولی

"بالکل پگھل گئی۔ کچھ دیر بعد پاپا نے کمل کو گود میں لیا۔ اس سے لاڈ پیار کرنے لگے۔ اس نے ن کا سُوٹ بھی خراب کر دیا۔ مگر پھر وہ اسے اپنے سے الگ ہی نہ کریں۔ جب میں چلنے لگی پوچھا کہاں ں ہو؟ میں نے کہا میں وُوڈ لینڈز میں ٹھہری ہوں۔ کہنے لگے۔ کیوں؟ کیا یہ گھر تمہارا نہیں ہے؟ ے کہا۔ کل آجاؤں گی۔ چنانچہ دوسرے روز جو میں گئی تو وہ جیسے کمل کے انتظار میں باہر ہی ٹہل رہے تھے۔ یکھ کر کھل اٹھے۔ ماما نے چپکے سے پوچھا۔ بسنت بابو کو نہ لیتی آئیں؟ میں نے جواب دیا۔ کل لاؤں گی۔ آپ ستہ ہموار کر رکھیے۔"

"پھر لے کر گئیں بسنت بابو کو؟" یاسمین نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ کل تو نہیں جا سکی۔ پرسوں نرسوں کسی روز لے جاؤں گی۔"

"اتنی دیر کیوں لگا رہی ہو روزی آپا؟ میں تمہاری جگہ ہوں تو فوراً لے جاؤں۔" یاسمین نے اپنی سابق نی سے کہا۔

روزی چپ ہو گئی۔ اتنے میں ماسٹر اکمل حسین مرشدزادہ نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ پانچوں ں اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ جہاں آرا نے روزی سے کہا: "بسنت بابو کو آج ہی لِلی کاٹیج لے جاؤ۔ ا ـــ"

"کل شام تو ہم لوگ سر پری توش سے باتوں میں لگ گئے تھے۔ میرے سُسر بسنت کو دلّی بھیجنے ر میں ہیں کہ وہ وہاں رہ کر قانون کی پریکٹس شروع کریں۔ نئی دلّی میں ان کی کوٹھی بھی ہے۔ اس کے کرائے جانے کا انتظار ہے۔ اسی سلسلے میں ضروری باتیں ہونے لگیں۔ اور آج شام کو سر پری توش اور لیڈی نے ہم دونوں کے اعزاز میں ڈنر کیا ہے۔ اس لیے آج بھی نہ جا سکیں گے۔"

"سر پری توش اور ان کے ڈنر کی وجہ سے روزی تم اپنے ماں باپ کے گھر نہیں گئیں۔" جہاں آرا نے کہا۔

"جہاں آرا ـــ" روزی نے آہستہ سے ذرا کوفت کے ساتھ جواب دیا۔ "اب میں بسنت کو وہ بھیڑ ے دکھلانا نہیں چاہتی۔"

جہاں آرا نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا ـــ "روزی۔ تم کو اب اپنے گھر سے شرم آتی ہے اپنے لو اپنے POSH شوہر سے ملاتے بھی شرم آتی ہے۔ تم جھینپتی ہو کہ پادری بنرجی کی لڑکی ہو۔"

اسی وقت بیگم قمرالزماں اپنے کمرے سے نکلیں۔ ڈھاکے کی سُرخ پاڑ والی سفید ساری بنگالی طرز سے باندھے، بیحد نازک اندام آ کر تخت کے کنارے پر ٹِک گئیں۔ کمل کو گود میں لے کر قریب آئی مالا کو ابروئے اشارہ کیا۔ وہ اندر سے صندوقچہ نکال کر لائی۔ بیگم صاحبہ نے صندوقچہ کھول کر دو سَو ایک روپے کے نوٹ نکالے اور کمل کے گدیلے کے نیچے چُپکے سے سرکا دیئے۔

"اور سناؤ روزی۔ ماں باپ سے صلح صفائی ہوگئی؟" انھوں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔"

"اچھّا ہوا۔ اللہ مبارک کرے۔" لڑکیوں سے چند منٹ باتیں کرنے کے بعد بیگم قمرالزماں اندر واپس چلی گئیں۔

روزی نے قیمتی جارجٹ کی ساری پہن رکھی تھی اور نو نگے کا پورا سیٹ۔ مالا نزدیک آ کر بڑے اشتیاق سے اس کے گہنے چھو چھو کر دیکھنے لگی۔ ارجمند منزل کی خواصوں کے لیے بے چارے غریب پادری صاحب کی بٹیا کی بڑے گھرانے میں شادی نہایت اہم واقعہ تھی۔ خواصوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ پادری صاحب سے شادی سے پہلے روزی کی ماں گری بالا ارجمند منزل میں ماماگیری کر چکی تھیں۔ ان سب کو وہ قصہ معلوم تھا۔ کس طرح ایک غریب برہمن بال ودھوا سسرال والوں کے مظالم سے بچنے کے لئے فرید پور کے ایک گاؤں سے بھاگ کر اپنے زمیندار آقا نواب قمرالزماں چودھری کی پناہ میں ارجمند منزل پہنچی تھی۔ یہاں برتن مانجھنے کے کام پر لگا دی گئی تھی۔ کس طرح نواب صاحب نے اسے اپنے نوعمر بیٹوں کی عنایات سے بچانے کے لئے انگریز لاٹ پادری کی میم کے حوالے کر دیا تھا جس نے اسے عیسائی کر کے اس کی شادی نوجوان کالے پادری بنرجی سے کر دی تھی۔ ـــ روزی کو بھی ماضی کی ان تلخ حقائق کا شدّت سے احساس تھا۔

ملازمہ مالا مصاحب خاص کی حیثیت رکھتی تھی اور صاحبزادیوں کی گپ شپ میں حصہ لیتی تھی۔ اس نے روزی سے پوچھا۔ "یہ سب سسرال سے ملا ہے بی بی؟"

"ہاں۔ مالا۔"

"کیا کیا ملا؟"

"ایک سیٹ ہیرے کا۔ سات جڑاؤ اور سادے۔ یہ والا سیٹ ہماری شادی کی پہلی سالگرہ پر کمل کے ڈیڈی نے دیا ہے۔"

"اللہ مبارک کرے۔"

(مسز انیتھر گری بالا بنرجی نے اپنے گلے کی باریک طلائی زنجیر جس میں منّی سی صلیب آویزاں ور کانوں کے مختصر سے پھول اور چار باریک چوڑیاں اتار کر اس کے لئے رکھ لی تھیں۔ جب نہ مشن کے مسٹر لوتھر بسواس سے اُس کا رشتہ طے ہوا تھا۔ اور پچھلے سال جب روزی نے کلکتے سے وا اپنی شادی کی اطلاع بھیجی تو مسز بنرجی نے گھر کے خرچ میں سے تھوڑے پیسے بچا کر اپنے ے ہوئے اچار مربّے میز پوش اور سوئیٹر بیچ بیچ کر روپیہ جمع کیا۔ اور ساری عمر کی گرہستی میں جو چند روپے انہوں نے پس انداز کئے تھے ان کو اس رقم میں ملا کر ڈھاکہ کا مخصوص کھوکھلے سونے کا ایک ے خرید پائیں۔ اور تین ریشمی ساریاں۔ ان کی اپنی شادی میں ان کے انگریز مربّی رائٹ ریورنڈ الفرڈ ن اور مسز براؤن نے چاندی کا ٹی سیٹ دیا تھا۔ انہوں نے اسے بھی روزی کے لئے محفوظ رکھا ہوا تھا۔ ب چیزیں جب روزی پہلے روز لِلّی کاٹیج گئی تو انھوں نے ایک سوٹ کیس میں رکھ کر اسے دیں۔ روزی بال نے آج ارجمند منزل میں اپنی بلند مرتبت سہیلیوں سے اور رالا سے اس کم مایہ جہیز کا ذکر نہ کیا)

ارجمند منزل کی ایک باندی چائے کی کشتی لے کر حاضر ہوئی۔ جہاں آرا نے اکمل کو اختر آرا کی گود یا اور چائے بنانے میں مصروف ہو گئی۔

نواب قمر الزماں چودھری باہر تشریف لائے۔ پانچوں لڑکیاں تعظیماً کھڑی ہو گئیں۔ انھوں نے ں سے بات کی۔ اس کے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کیا نام رکھا ہے؟"

"کمل کمار سانیال۔"

"اکمل کے وزن پر۔" اختر آرا نے خوشی سے کہا۔ اور بسنت کمار سانیال کی کہی ہوئی بات دہرائی لفظ میں اَ [illegible] کی اضافت اس لفظ کا الٹ ظاہر کرتی ہے۔

"کیوں بے؟ میرے اکمل سے لڑے گا؟ کان کھینچوں گا۔" نواب صاحب نے خوش دلی سے کہا۔

"جی نہیں نواب صاحب ـــ!" روزی نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "اکمل کمل کا مخالف، وہ اس سے ـــ میرے کمل سے لڑے گا۔"

"دونوں کے کان کھینچوں گا۔ بدمعاش کہیں کے ـــ!" پھر نواب صاحب ٹہلتے ہوئے برآمدے سے

نیچے اتر گئے۔ اور پائیں باغ کی روشوں پر چہل قدمی کرنے لگے۔ کچھ دیر قبل نیر الزماں کی دلہن ایک سو ایک نوٹ مخمل کے گدیلے کے نیچے سرکا گئی تھیں۔ جہاں آرا نے چاندی کے ننھے منے برتنوں، نقرئی جھنجھنے، زر بیش قیمت انگریزی کھلونوں اور کپڑوں سے بھرا سوٹ کیس مع ایک سو ایک روپے کے دیا تھا۔ سوٹ کی تخت کے نزدیک رکھا تھا۔

"لوٹڑوں کا رئیس!" روزی نے چائے پیتے ہوئے شگفتگی سے کہا۔ "دیکھو ہر طرف سو سو کے نو بکھرے پڑے ہیں۔"

روزی کے اس جملے سے تینوں نوابزادیاں اور یاسمین جھینپ گئیں۔ روزی بطور مسز سانیال اپنی نئی دولتمند حیثیت سے بے حد مسرور تھی۔ یاسمین کو بہت مایوسی ہوئی۔ شاید روزی آپا تھوڑی سی بددما بھی ہو گئی ہیں۔ وہی روزی جو آج سے صرف سال بھر قبل سر پر کفن باندھ کر میدان کارزار میں کودی تھ پولیس کی لاٹھیاں کھائی تھیں۔ جیل میں معافی مانگنے سے انکار کیا تھا۔ دولت، مرتبہ اور آسائش انسان اتنی جلدی کایا پلٹ دیتے ہیں؟ اب یہ کس مربیانہ انداز میں مجھ سے باتیں کر رہی ہیں کیونکہ میں محض ایک غریب بیو کی لڑکی ہوں۔ یہ بھی بھول گئیں کہ سال بھر قبل تک پندرہ روپے ماہوار پر مجھے ٹیوشن دیتی رہی ہیں۔ یاسمی نے سوچا۔

عین اسی لمحے روزی نے اسے مخاطب کیا۔ "ارے یاسمین اب تم بھی جھٹ پٹ شادی کر ڈالو دیپالی کو بھی چاہیے بیاہ کر لے۔ اور نکلے اپنے اس ڈیپریسنگ جیندر گنج سے۔"

"وہ دیپالی دیدی کا گھر ہے روزی آپا۔ اور وہ ان کے لئے شاید بالکل ڈپریسنگ نہیں ہے۔" یاسمین نے نرمی سے جواب دیا۔

"نون سنس۔ شادی سے پہلے ماں باپ کا گھر لڑکی کے لئے قید خانہ ہوتا ہے۔ آزادی تو شاد کے بعد ملتی ہے۔ خود مختاری کی زندگی۔ کیوں جہاں آرا؟"

جہاں آرا مسکرا کر خاموش رہی۔

روزی نمائش پسند، چھچھوری اور بددماغ ہونے کے علاوہ ذرا سی بے وقوف بھی ہو گئی ہے۔ جہاں آرا نے افسوس کے ساتھ سوچا ــــ اور اسے ایک نہایت کمینہ خیال آیا ــــ آخر ہے تو ہماری پالی نوکرانی کی اولاد ــــ دوسرے لمحے اسے اپنے اس خیال پر ندامت ہوئی۔ اس نے جلدی سے کہا ــــ

رے دیپالی کا بیاہ ہوگا تو دیکھنا میں کیسی دھوم دھام کروں گی۔ اس کے بابا تو کچھ کرنے سے رہے۔ سادھو ی ٹھہرے۔ میں دو مہینے پہلے سے دیناج پور سے آجاؤں گی۔ سارا انتظام خود کروں گی۔ مگر وہ روزی کی طرح کر کسی سے بیاہ نہ کرلے ـــ سِول میرج ـــ"

"آپا تم اپنے ہاتھی بھی لیتی آنا۔ دیناج پور سے" انجم آرا نے لقمہ دیا۔

"ضرور۔ ہاتھی گھوڑے پالکی سب لاؤں گی۔ مگر دیپالی کوئی مرغا ڈھونڈے تو سہی جیسے روزی نے ھونڈ لیا۔"

"دیپالی ہے کہاں؟ تم سسرال سے آئی ہوئی ہو۔ کیا تم سے ملنے اسے نہیں آنا چاہیئے تھا؟" روزی نے ذرا بلندی سے ترش لہجے میں کہا۔

"آپا کے ڈھاکہ آنے سے پہلے ہی دیپالی دی ریڈیو پروگرام کے لئے دلّی بلا لی گئیں۔ آج کل یہ خبر گرم ہے کہ اُدما رائے ڈاکٹر سرکار سے بیاہ کرنے والی ہیں۔ شاید دیپالی دی کو یہ بات پسند نہ ہو۔ اور اسی وجہ سے وہ زیادہ سے زیادہ گھر سے دور رہتی ہوں۔" اختر آرا نے کہا۔

"ڈاکٹر سرکار سے ـــ؟ اُدما رائے ـــ؟ میں نے تو ووڈلینڈز میں کوئی تذکرہ نہیں سنا۔" روزی نے حیرت سے کہا۔

"کیوں ـــ؟ ادما رائے جیسی ہیں ویسی ہیں۔ ڈاکٹر سرکار نے انہیں قبول کرلیا تو ادما دیبی کی خوش قسمتی ہوگی۔ مگر دنیا یہی سمجھے گی کہ ڈاکٹر سرکار نے اُدما رائے کی دولت سے شادی کی ہے۔" جہاں آرا نے جواب دیا۔

انجم آرا اٹھ کر اندر گئی اور ایک قیمتی ولایتی کھلونا لا کر کمل کے قریب رکھ دیا۔

"ہائے تم لوگوں نے کتنی پیاری پیاری چیزیں کمل کو دی ہیں۔" روزی نے تینوں نوابزادیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"ڈونٹ بی سلی۔" جہاں آرا بولی۔

تخت کے کنارے بیٹھی ہوئی یاسمین نے سوچا۔ میرا تحفہ ان سب تحائف کے مقابلے میں حقیر اور کم قیمت ہے۔ مگر میں نے کتنے پیار سے بچے کے یہ دو فراک سی کر انہیں دیئے ہیں۔ انھوں نے میرے پریذنٹ کا ذکر تک نہیں کیا۔ اب وہ دوستی کو تحائف کی قیمت سے ماپا کریں گی؟

"لیڈی ارجنا رائے نے تو بس ایک چیک دیدیا ہے۔" روزی بے پروائی کے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

اکمل کے نام جمع کروا لوں۔ ویسے تو اس کے ٹھاکر دادا نے اس کے پیدا ہوتے ہی بنک میں اس کا اکاؤ
کھول دیا ہے۔"

بے چاری روزی نئی نئی دولت پا کر بوکھلا گئی ہے۔ چاروں لڑکیوں نے سوچا۔

برآمدے سے موٹر آن لگی۔ اور نواب اجمل حسین مرشد زادہ چوڑی دار پاجامہ، سیاہ شیروا ترکی ٹوپی نیچے اترے۔ برآمدے میں آ کر وہ تخت کے قریب ذرا سا ٹھٹھکے۔ جہاں آرا نے روزی سے ان کا کرایا۔ انہوں نے ذرا گھبرا کر "آداب آداب عرض۔ مزاج شریف ۔۔ ؟" کہا اور زینے کی سمت چلے گ

یہ پان چباتے، بھدے، حبشی نما، بدہیئت، میٹرک فیل جاگیردار جہاں آرا کے خدائے مجازی! روزی سوچ رہی تھی۔ اسرارِ خداوندی! میں جہاں آرا کو کتنا خوش قسمت سمجھا کرتی تھی اور خود کو کتنا بدنصیب۔ مجھے لیفٹننٹ کمار سانیال جیسا دلکش اور اسمارٹ شوہر ملا۔ جہاں آرا بے چاری کی تقدیر میں نواب اجمل حسین لکھے تھے۔ اسرارِ ربّانی!

نواب قمر الزماں پائیں باغ میں ہوا خوری کر کے برآمدے کی طرف آ رہے تھے۔

"ارے بھئی بیگم ۔۔ ذرا یہاں آئیے گا۔ میری سفید شیروانی کہاں ہے۔" اوپر زینے پر آ کر نواب اجمل حسین نے آواز دی۔

"جی ابھی آئی۔"

"اور تازہ پان ۔۔"

"جی۔ آتی ہوں ۔۔" جہاں آرا نے فوراً اکمل کو تخت پہ لٹایا۔ اور چپّل پیروں میں ڈال کر بسرعت زینے کی طرف بھاگی۔

نواب قمر الزماں اس وقت برآمدے میں پہنچ کر گیلری کی جانب جا رہے تھے۔ انہوں نے کرب کے ساتھ جہاں آرا پر نظر ڈالی۔ بے زبان ملیحہ چودھری کی بے زبان بھتیجی! اسی کی طرح پتی ورتا! ملیحہ کی کی شادی ایک غریب کسان، مولوی کے ساتھ کردی گئی تھی۔ وہ اس سے نباہ لے گئی۔ لیکن یہ کالج کی تعلیم یافتہ لڑکی بھی اس زبردستی کے بے تکے رشتے کو کس سلیقے سے نباہ رہی ہے۔ میں تجھ سے شرمندہ ہوں بچی! اور اپنی مجبوریوں سے شرمندہ ہوں۔ میں تو ساری عمر ملیحہ سے بھی نادم رہا تھا۔ مگر میری ندامت سے ملیحہ کے لئے کیا فرق پڑا؟ میری شرمندگی یا پشیمانی سے تیرے لئے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تو مرتے دم تک اپنے اس نامعقول

مجازی کی اسی طرح خدمت کرتی رہے گی۔ میری بچی ۔۔۔ میری بے چاری بچی ۔۔۔ کاش ۔ کاش میں
بان سے تیرا بیاہ کر دیا ہوتا ۔۔۔ شاید میں ملیحہ کی روح کے سامنے بھی سرخرو ہو سکتا ۔۔۔ کاش ۔۔۔ کاش۔
تہ آہستہ گیلری میں سے گزرتے اپنی جائے پناہ ۔ اپنے کتب خانے کی طرف چلے گئے۔

روڈ لینڈز سے مسٹر بسنت کمار سانیال کا فون آیا تھوڑی دیر میں مسز سانیال کے لئے کار بھیج
اے گی" نیر الزماں نے برآمدے میں آکر روزی سے کہا۔

روزی کی آیا تالاب کی منڈیر سے اٹھ کر آئی اور کمل کا سامان اور تحائف پیک کرنے میں مصروف
کمل اور اکمل دونوں برابر گدیلوں پر پڑے بے خبر سو رہے تھے۔ ڈھائی تین ماہ کی دو مختصر، کمزور، نازک
سی جانیں۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ تالاب کا پانی گلنار ہو گیا۔ گلاب خاص کے نیچے رکھے "وکرم آدتیہ
ھاسن" کی رنگین مورتیاں کرنوں میں جھلملا اٹھیں۔

جھٹ پٹے کا وقت کمروں کے اندر بہت ڈپریسنگ ہو سکتا ہے۔ نواب قمر الزماں گھبرا کر اپنے
انے سے پہلو کے باغ میں اتر گئے اور ٹہلتے ہوئے تالاب کے کنارے آکر راج سنگھاسن" پر ٹک گئے۔

برآمدے میں تخت پر لیٹے دونوں بچے سوتے میں کنمنائے۔

سنا ہے جب ننھے بچے کوئی پیارا سا خواب دیکھتے ہیں تو کنمناتے ہیں۔ یاسمین نے مسکرا کر بچوں پر
الی۔ اسی لمحے اس نے دل ہی دل میں روزی کے نئے کینے پن اور نودولتے پن کو معاف کر دیا اور اپنی فطری
لی سے اسے مخاطب کیا۔ "روزی آپا۔! آپ نے یہ نام خوب سوچا۔ کمل بروزن اکمل ۔! اور دونوں
بچے ۔۔۔ ایک سن کی پیدائش ۔۔۔! دو نئے ہندوستانی!"

"انسان ۔۔۔ جدید ترین موڈل ۔۔۔" روزی نے کہا۔

دونوں لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"روزی آپا ۔۔۔ سروجنی دیبی کی ایک نظم ہے۔" فنکار یاسمین کمل اور اکمل کو دیکھتے ہوئے
ہستہ بولی ۔۔۔

"سو جاؤ میرے بچو ۔۔۔
صبح تک کے لئے محفوظ و مامون
سوتے رہو۔

کہ ہمارا رت جگا بہت طویل ہے۔
جتنی دیر تم سوؤ۔ ہم۔ ہم کھیتی بوئیں گے
ہم آرزؤں، اور رنجوں اور آنسوؤں سے بھرپور سپنے بوتے ہیں۔
تاکہ جب تم جاگو تو ان کی فصل کاٹ سکو
بچو ــــ
صبح ہوتی ہے۔ رات گذر گئی ـ
ہماری مشقت ختم ہوئی ـــ ہماری کھیتیاں لہلہا رہی ہیں
ہمارے ہاتھ کمزور تھے
لیکن اندھیارے میں ہم نے تمہاری آنے والی شان و شوکت کے خواب دیکھے۔
تمہارے بچوں کو اپنے آنسوؤں سے سینچا ـــ ہمارا رت جگا ختم ہوا۔
جاگو، بچو
ہم نے سپنوں کی جو فصل تمہارے لئے بوئی ہے
اس کے صلے میں
ہماری محنتوں کے ثمر کو
تم توصیف سے یاد کرو گے
یا دکھ سے؟
ہمیں ملزم ٹھہراؤ گے ـ یا ہمیں معاف کر دو گے۔؟"

یاسمین مجید نے سر اٹھایا۔ نواب قمر الزماں برآمدے میں آچکے تھے اور تخت کے قریب کھڑے
ہے تھے۔ انہوں نے یاسمین کے سر پہ ہاتھ رکھا اور چپ چاپ واپس اندر چلے گئے ـ
ین باغ کے درخت شام کی سنہری ہوا میں لوریاں گنگنا رہے تھے ـ
ل اور اکمل بے خبر سو گئے۔

۳۳

برڈز آف پیراڈائز

"اگر تمہارا وہ خط مجھے صرف ایک دن پہلے مل گیا ہوتا تو شاید ہم لوگ آج یہاں نہ ہوتے۔" نے کہا۔

ہسپانوی لباس پہنے مسز سرسوتی نے کیلے کے جھنڈ میں سے نکل کر قہوے کی کشتی میز ۔ ایک برڈ آف پیراڈائز رین ٹری کی شاخوں سے اتر کر نیچے آئی اور گھاس پر چلنے لگی۔ یاسمین ر سے دیکھ رہی تھی۔ پہاڑی کے نیچے اسپینش کولونیل وضع کے بنگلے میں سے کلیپسو میوزک زانے لگی۔ "شونو کی گرل فرینڈ سان فرنینڈو سے آئی ہوئی ہے۔" دیپالی نے کہا۔ پانی کی نڈ ٹپ سے میز پر آن گری۔ یاسمین نے اوپر دیکھا۔ بادل کریبین پر سے سرکتے ٹیلے کی سمت آ رہے ڑے پتوں اور موٹے تنے والے رین ٹری کے جھرمٹ میں شفاف نالہ بہہ رہا تھا۔ سر پر سرخ بند دانا باندھے اسکرٹ میں ملبوس ایک ایسٹ انڈین عورت نالے کے کنارے کپڑے دھو رہی تھی۔ ایک درخت پر بنے ٹری ٹاپ ہاؤس پر بورڈ لگا تھا ۔۔۔ ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار، پلانٹیشن میڈیکل ڈسپنسری۔ اس درخت کے نیچے بھی پرندِ فردوس اڑتے پھر رہے تھے۔ چند مریض جمع تھے۔ چینی ایسٹ نیگرو۔ اپنی اپنی جنتوں سے نکالے ہوئے انسان۔ آدمی کی عادت ہے کہ اسے اس کی جنت سے نکالو تو وہ اپنے ی بھی ایک اور جنت بنالیتا ہے۔

"دیدی۔ کیا ہوا تھا ۔ ؟" یاسمین نے کمزور آواز میں پوچھا۔

"ماسٹر کا فون ۔" مسز سرسوتی نے بنگلے کے برآمدے سے آواز دی۔ دیپالی نے کہا: "ابھی آئی۔" ٹھ کر بنگلے کی سمت چلی گئی۔ مسز سرسوتی باہر آ کر کرسی پر بیٹھیں۔ اور بولیں: "ہمارا میم صاحب کہت م ڈانسر ہے۔ پاکستان سے آیا ہے۔" "ہاں مسز سرسوتی۔ ہم تمہارا میم صاحب کو بہت زمانے سے لہے۔" یاسمین نے بنگلہ اردو میں جواب دیا۔ "ہم اور دیپالی میم صاحب ایک ہی کنٹری کا رہنے والا ۔ مطلب ۔۔۔ پہلے ایک ہی کنٹری تھا۔"

"تم سینما میں بھی ناچتا ہے؟" ۔ جیسے مس نکوتہ ۔ مسٹریس سرسوتی نے کھڑے ہو کر دو تین چک
لیں ۔ یاسمین کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔

سرخ بندآنا والی عورت اسکرٹ گھماتی کپڑوں کی ٹوکری کمر پر رکھے نالے کی طرف سے آئی ۔ گا
مبریلا کے قریب پہنچ کر اس نے ٹوکری گھاس پر رکھی اور مسٹریس سرسوتی کے ساتھ ناچنے لگی ۔ اب وہ دو
ہسپانوی رقص کر رہی تھیں ۔ سمرسٹ ماہم کے کسی قبل از جنگ استوائی سیٹنگ کے ناول کا سین ۔ یا
نے آنکھیں ملیں ۔

سرخ بندانا والی عورت نے گلے میں پنجتن پاک کا بڑا سا تعویذ پہن رکھا تھا ۔ وہ مسٹریس سرسوتی
زیادہ خوبصورتی سے ناچ رہی تھی ۔ دیپالی بنگلے سے واپس آئی ۔ کرسی پر بیٹھ کر چاء بنانے لگی ۔

کتنی بے فکری کی زندگی ہے یہاں یاسمین نے سوچا ۔ "یہ لڑکی بہت اچھی ڈانسر ہو سکتی ہے ۔ کون
یاسمین نے پوچھا ۔

"مسٹریس خیرالنسار ؟ بابا کے کمپاؤنڈر شرافت علی کی بیوی ۔" دیپالی نے جواب دیا ۔

مسٹریس خیرالنسار نے عقیدت سے پوچھا ۔ "آپ پاکستان سے آیا ہے؟"

"ہاں ۔" یاسمین نے جواب دیا ۔

"آپ نے نورجہاں کو دیکھا ہے ؟"

کون نورجہاں ؟"

"میرے لئے جہاں میں چین ہے نہ قرار ہے ۔" مسٹریس خیرالنسار نے گا کر جواب دیا ۔ "خاندا
مُووی ولا ۔ ہم نے سب موویز دیکھی ہیں ۔ کنگن ۔ بندھن ۔ گاجی صلاح الدین ۔ سکندر ۔ جندگی ہے پیا
سے پیار میں بتائے جا ۔ عسک کے حجور میں اپنا سر جھکائے جا ۔"

"مگر یہ تو بہت پرانی فلمیں ہیں ۔" یاسمین نے کہا ۔

"بس وہی یہاں چلتا ہے ۔ اور دو نئی فلم دیکھا ۔ انداج اور برسات ۔" مسٹریس سرسوتی ۔
جواب دیا ۔

"ہم لوگ مس صاحب یہ مُوویز دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے ۔ ہمیں پتہ چلا ہے ہمارا ادلہ
کنٹری ایسا ہی ہوگا ۔" مسٹریس خیرالنسار نے اداس آواز میں کہا ۔

دیپالی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"فرگٹ اِٹ۔ دیدی" یاسمین نے کہا۔

"تم بہت خوش ہو۔ تم دنیا کے TOP پر ہو۔ ورلڈ ٹور پر نکلی ہو۔ اپنے ملک کی مشہور ڈانسر ڈھاکہ اب بھی تمہارا وطن ہے۔" دیپالی نے ذرا ترشی سے جواب دیا۔

"سوری دیپالی دی۔" یاسمین نے کہا۔ واقعی میں بہت مسرور ہوں۔ ساری دنیا اب میرے بوں میں ہے۔ کامیاب کریر۔ اَن گنت مدّاح۔ گلیمر۔ سیلیبٹی۔ شہرت۔ ان بے چاری دیپالی دیدی کو املا۔؟ اور جہاں آرا آپا کو۔؟ محض مایوسی۔ لیکن مجھے روزی سانیال کی طرح اپنی کامیابی پر رور نہیں ہونا چاہیے۔" گو میں نے اپنی کامیابی کی بھاری قیمت ادا کی۔ اپنے ابّا کو ڈیفائی کیا۔ مگر ٹسٹ کی لگن۔" اس نے باآوازِ بلند اضافہ کیا۔

"بوَش۔" دیپالی بولی پھر اچانک چپ ہوگئی۔

شاید یہ مجھ سے جلنے لگی ہیں۔ انہیں اب کون جانتا ہے۔ مجھے ساری دنیا جاننے لگی ہے۔ جیرالڈ ہتا ہے اگر کوشش کی جائے تو میں اپنے "موڈرن اور نیشل بیلے" کا نیویارک میں باقاعدہ اسٹوڈیو قائم رسکتی ہوں۔ مگر ابھی یہ بات ان کو نہیں بتاؤں گی اور جل جائیں گی۔ کیا پتہ لاشعوری طور پر متعصب بھی ہوں۔ بہرحال ہالیسٹ پاکستان سے ان کو نکلنا ہی پڑا۔ نہیں۔ پرانی مارکسسٹ ہیں۔ متعصب تو شاید نہیں ہیں۔ اتنی پرانی دوست ہیں۔ اگر ان کو یہ بتا دوں کہ ہینڈسم، مشہور انگریز فیشن ڈیزائنر جیرالڈ بلونٹ سے شادی کرنے والی ہوں تو شاید اور حسد کریں۔ نہیں بتاؤں گی۔ نظر لگ جائے گی۔ پری ناد جیرلڈ ایک طرف۔ بے مثال یونانی مجسمہ۔ اور ایک طرف اِن بے چاری کے موٹے کالے للت موہن سین۔ وہ تو جہاں آرا آپا کے میاں سے بھی گئے گذرے ہیں۔

سرسوتی اور خیر النسا گھاس پر بیٹھی ایک اجنبی زبان میں گفتگو کر رہی تھیں۔ شونو نے بنگلے کے برآمد یں آکر آواز دی۔ "دیدی۔ آپ کا فون۔" دیپالی پھر اٹھی اور عمارت کی طرف چلی گئی۔

سرسوتی نے آہستہ سے پوچھا: "مس صاحب ہمارا میم صاحب رو کیوں رہا تھا؟ ہم نے دیکھا ہے۔ وہ کبھی کبھی ایسے ہی بیٹھے بٹھلائے رونے لگتا ہے۔"

"معلوم نہیں۔ مسز لیس سرسوتی۔ شاید۔ شاید ان کو اپنا کنٹری یاد آتا ہے۔ اور۔ اور؛"

"اور کون ــــ ؟"

یاسمین نے جلدی سے بات بنائی۔ "وہ ــ مسٹریس سرسوتی ادھر ڈھاکہ میں ڈیڈی کا ایک فرینڈ تھا۔ جہاں آرا بیگم ــ"

"جہاں آرا بیگم ــ!" مسٹریس خیرالنسار نے خوشی سے دہرایا۔ "بادشاہ کا بیٹی ؟"

"نہیں۔ ایک معمولی سے نواب کا بیٹی ــ"

"پھر کیا ہوا ــ کیا ہوا ــــ ؟" دونوں عورتوں نے بے صبری سے پوچھا۔

"جہاں آرا بیگم کا لو اسٹوری بہت ٹریجک تھا۔ اُسی کو یاد کر کے تمہارا امیم صاحب دُکھی ہو جاتا ہو گا ــ"

"کیا ہوا ؟ ــ کیا ہوا ؟ ــ عاسکی معسوکی ــــ ؟" سرسوتی نے پوچھا

خیرالنسار نے سوال کیا۔ "عسک مجاجی تھا یا عسک حکیکی ــ ؟ ہیرو کون تھا ــ ؟"

یہ عورتیں بے حد سینما دیکھتی تھیں۔

"خیرالنسار شاید عسک مجاجی اور حکیکی دونوں تھا۔ جہاں آرا آپا اپنے کزن کو لو کرتا تھا ــ وہ اُس کو ــ"

"سمجھ گیا ــ" مسٹریس سرسوتی نے طمانیت سے کہا۔

"پھر اُن کا کزن اُن کو چھوڑ کر بھاگ گیا ــ"

"کیوں ــ ؟ پچ پچ۔ ہائے ہائے۔ ہائے رے ــ"

"آئیڈیالوجی کی خاطر ــ"

"آئیڈیالوجی ــ کیا ــ ؟" خیرالنسار نے دریافت کیا۔

"مطلب ــ مطلب ــــ ایسا کہ ــ غریب امیر سب برابر ہونا چاہیے۔ ہیرو امیر لوگ کو HATE کرتا تھا ــــ ہیروئن بہت امیر تھا ــ اُس زمانے میں خیرالنسار۔ لڑکا لڑکی آئیڈیالوجی کی خاطر ایک دوسرے کو چھوڑ دیتا تھا ــ"

"تب تو وہ پاگل لوگ تھا ــ" سرسوتی نے کہا۔

"ہاں۔ ایک دم پاگل۔ اور اگر سوچو تو ــ تو ہم بھی پاگل ہے۔ ہم نے آئیڈیالوجی کی خاطر

ں سیکھا۔ کہ ہمارا دیش میں کلچر خوب پھلے پھولے۔ ہم نے اس کے لئے بہت محنت کیا۔ بہت کوشش ہمارا ایک انکل کا دوست سنٹرل منسٹر ــ تھا۔ اس نے ہمیں فارن ٹور پر بھجوایا ــ پاکستانی گورنمنٹ ــ"

"کون گورنمنٹ ــ؟" سرسوتی نے پوچھا۔

"ہمارا اپنا پاکستان گورنمنٹ۔ تم لوگ تو ابھی برٹش کولونی ہے۔"

"کولونی ہے تو ٹھیک ہے۔ آرام سے ہے۔"

"آہا۔ تمہاری مینٹلیٹی اب تک کولونیل ہے۔" یاسمین نے حقارت سے کہا۔ بے چاریاں غلاموں ولاد۔ خود غلام۔

"اور تمہاری مینٹیلٹی کیا ہے؟" سرسوتی نے چمک کر پوچھا۔ نیو ورلڈ میں پیدا ہو کر ہندی نژاد ر بھی نڈر ہو جاتے ہیں۔ اور بے ادب۔ اب ان جاہلوں سے کون بحث کرے۔ وہ چپ ہو گئی۔

دیپالی واپس آئی "میرے شوہر کا فون آیا تھا کہ تم سے کہہ دوں۔ انہوں نے کل رات کو تمہارے ڈانس روگرام گورنمنٹ ہاؤس میں رکھوا دیا ہے ــ گورنر جنرل کے لئے ــ"

"گورنر جنرل کے لئے ــ؟" یاسمین نے خوشی سے اچھل کر دہرایا۔ مسز الیس سرسوتی زیر لب مسکرائی۔ ے کی ٹرے اٹھا کر بنگلے کی طرف چلی۔ یاسمین نے اس کی طنزیہ مسکراہٹ دیکھی اور جھینپ گئی۔

"اچھا اب ہم بھی چلتا ہے ــ" خیر النسا نے کہا۔ سر خم کر کے مسکرائی اور کپڑوں کی ٹوکری اٹھا کر رد پیشے کی سمت روانہ ہو گئی۔

"عجیب مسخری عورتیں ہیں" یاسمین نے اظہار خیال کیا "تم کن لوگوں میں آ پھنسیں۔"

"بہت بھلے لوگ ہیں" دیپالی نے جواب دیا۔ "انہیں یقیناً ہم اور تم مسخرے لگتے ہوں گے۔ ا سرزمین کو چھوڑے انہیں سو سال سے اوپر ہو گئے۔ اب تک اسے یاد کرتے ہیں۔ یہ خیر النسا اور سرسوتی ہ دونوں کے پرکھے یو۔پی کے ضلع اعظم گڑھ سے آئے تھے۔ سو سال پہلے۔ جب انگریزوں نے یہاں اپنے نگرو غلاموں کو آزاد کیا تھا۔ تب ان کی جگہ اپنے نئے ہندوستانی غلام یہاں منگوائے تھے۔ امیہ آدھے بینش آدھے ایسٹرن یو۔پی کے ہندو یا مسلمان آدھے برٹش ہیں۔ سترہویں صدی کے انگریزی الفاظ ان رائج ہیں۔ پنچ میل زبانیں۔ یہ بے چارے اب تک بُش قلی کہلاتے ہیں۔ مگر یہ بڑے ذہین لوگ ہیں انھیں

معمولی مت سمجھنا ۔۔"

"دیدی۔ کہاں سے کہاں بات نکل گئی۔ کچھ دیر ہوئی میں نے آپ سے پوچھا تھا ۔۔ کیا ہوا تھا ن کا جواب تو دیجیئے۔ مجھے اب تک معلوم نہیں۔ کیا ہوا تھا ۔۔ ذرا سوچنے کی بات ہے۔ سنہ ۴۲ء کے پہلے سے اب ملاقات ہوئی ہے ۔۔ اور اس اجنبی دور افتادہ جگہ ۔۔۔۔ آخر ہوا کیا تھا ۔۔؟"

دیپالی نے ایک برڈ آف پیراڈائز کو دیکھ کر کہا ۔۔ "دیکھو یہ کتنے خوب صورت پرندے ہیں ۔۔"

"دیدی ۔ پلیز ۔ بات مت ٹالیئے" "یاسمین بھائی تم تو ہمیشہ کی نوزی پارکر ہو!"

"پوری بات بتایئے نا۔ آپ سن بیالیس میں جب جہاں آرا آپا کی شادی ہوئی اس کے بعد کبھی اُن سے ملی کیوں نہیں؟ وہ جب بھی دیناج پور سے ڈھاکہ آئیں آپ کے لئے معلوم کرائیں۔ اطلاع ملتی کر شانتی نکیتن میں ہیں یا ریڈیو پروگرام کے لئے کلکتہ گئی ہوئی ہیں۔"

"نہیں ۔ میں چند ایک بار جہاں آرا سے ملی تو تھی۔ دراصل اس سے نظریں چار کرتے ہوئے مجھے احساسِ جرم ستاتا تھا ۔۔"

"آخر کیوں ۔۔؟ کیا ہوا تھا؟"

دیپالی ہنس پڑی۔ "کیا ہوا تھا؟ اُس نے دُہرایا۔ "کچھ بھی نہیں۔ جہاں آرا کی شادی کی اطلاع کا جب تمہارا خط آیا اس سے صرف دو روز قبل اُوما رائے شانتی نکیتن پہنچیں۔ مجھ سے بہت میلوڈرامیٹک انداز میں کہا ۔۔ ریحان اپنی کزن کا بچپن کا منگیتر ہے۔ تم بیچ میں آگئیں بڑے شرم کی بات ہے۔ تم اپنی سہیلی کی زندگی برباد کر رہی ہو۔ اپنے نیک دل باپ کو صدمہ پہنچا رہی ہو۔ جہاں آرا اور ڈاکٹر سرکار دونوں کہیں تمہاری وجہ سے اپنی جانوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں ۔۔

"جب سے میں نے بالکل غیر متوقع جہاں آرا کی الماری میں ریحان کی تصویر رکھی دیکھی تھی میں بھونچکی تھی۔ اور احساسِ جرم مارے ڈال رہا تھا اس کے بعد میں نے ریحان سے بات نہیں کی۔ ان کے بہت اصرار پر جب ان کو وجہ بتائی انہوں نے پورا قصّہ سنایا۔ کس طرح ان کی نسبت ٹوٹی۔ اور وہ ان سے میری ملاقات سے پہلے کی بات تھی۔ پھر بھی مجھے تشفی نہیں ہوئی۔ بہت سمجھا بجھا کر ریحان نے مجھے ان سے بیاہ کر لینے پر راضی کر لیا۔ لیکن اب شانتی نکیتن پہنچ کر اُوما دیبی کہنے لگیں۔ جہاں آرا اب تک یہ آس لگائے بیٹھی ہے کہ ریحان شاید ارجمند منزل واپس آجائے اور نواب اس سے شادی کر دیئے

کے لئے تیار بھی ہو جائیں۔ اگر تم نے ریحان سے بیاہ رچایا تو جہاں آرا غریب شاید زہر کھا لے۔ پلدہ نشین محمڈن لڑکیوں کے ایسے ٹریجک قصے سنے ہیں۔ علاوہ ازیں ریحان ایسا ناقابل اعتبار شخص ہے جب اس نے اپنی کزن سے بے وفائی کی جس کے باپ کے روپئے سے وہ ولایت پڑھنے گیا تھا تو وہ بھلا تمہارا کب تک ساتھ دے گا۔ تم کو بھی چھوڑ دے گا۔ پھر تم کیا کرو گی۔ چندر کنج کے دروازے بھی تمہارے لئے بند ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ میں کم سن تھی اور ناتجربہ کار۔ یہ سب سن کر دہل گئی۔ اُوما رائے کے واپس جانے کے بعد اسی رات میں نے ریحان کو بڑا کڑا خط لکھا کہ آئندہ مجھ سے کبھی نہ ملیں۔ اسی رات یں نے وہ خط پوسٹ کر دیا۔ اس کے دوسرے روز تمہارا خط ملا۔ جس میں تم نے اطلاع دی تھی کہ بیچاری جہاں آرا کی شادی دیناج پور کے کسی زمیندار سے ہو گئی۔ اگر تمہارا وہ خط مجھے دو روز پہلے مل گیا ہوتا ذ میں اُوما رائے کے بھرّے میں نہ آئی ہوتی اور پروگرام کے مطابق ریحان سے سول میرج کرنے کلکتہ چلی جاتی۔ لر ہونی کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔

”ریحان کلکتہ جا چکے تھے۔ میرا عتاب نامہ موصول ہونے کے بعد انہوں نے مجھ سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں نے ان کو بہت ہی سخت خط لکھا تھا۔ آئیڈیالوجی کی خاطر۔ یعنی یہ کہ انسان انسان کا ل نہ دکھائے۔ اور وہ جہاں آرا کا دل دکھا رہے تھے۔ اور میں اپنے والد کا۔“

”دیپالی دیدی۔ ایک بات بتاؤں۔ ہم سب پاگل لوگ تھا۔ بقول مسٹرلیس سرسوتی۔ صرف وہ ادیبی صحیح الدماغ تھیں۔ اور ریحان بھائی کے بارے میں آگے میں بتاؤں، سنئے۔ سن پینتالیس میں ل انڈیا کسان سبھا کی طرف سے ایک لوک گیت کانفرنس ہوئی تھی۔ یاد ہے؟ لوک گیت منڈلیاں مارے ملک سے آئی تھیں۔ اس کانفرنس میں ریحان بھائی میرے پیچھے لگ گئے۔“

”راسکل —!“ دیپالی نے قہقہہ لگایا۔

”آپ اُس میں نہیں آئی تھیں۔“

”مجھے معلوم ہوا تھا کہ ریحان اور اُوما وہاں جانے والے ہیں اس لئے نہیں گئی تھی۔“

”مسلمان فوک سنگرز بہت بڑی تعداد میں آئے تھے۔ کیونکہ بنگال کی فوک میوزک زیادہ تر سلمانوں کی تھی — یہ دراصل مجھے اب مشرقی پاکستان بننے کے بعد اندازہ ہوا۔ ریحان بھائی ن فوک سنگرز کے کیمپ کے انچارج تھے۔ ایک دستہ منی پور سے آیا تھا۔ گارو ہلز سے مس ایلیس بارلو

کو انہوں نے بھگا دیا تھا۔ کیا زمانہ تھا کہ منی پور کے راجہ کا بھائی کمیونسٹ لیڈر تھا! آج یہ سب قصے اتنے عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ پیپلز تھیٹر کے لوگ تھے۔ کیا جوش و خروش تھا۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ سونار بنگال عنقریب تقسیم ہونے والا ہے۔ بس صرف یہی خیال تھا کہ انگریز کو نکالتے ہی ملک میں دودھ کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ ——

"اور کتنی جنگجو اصطلاحات تھیں! ہماری ٹولیاں اسکواڈ کہلاتی تھیں — چاٹگام اسکواڈ۔ سرما ویلی اسکواڈ۔ منی پور اسکواڈ۔ پیپلز تھیٹر اسکواڈ — دیدی وہاں اڑیسہ اسکواڈ نے ایک گیت سنایا تھا۔ اس پیٹ کی خاطر میں بنگال گیا۔ پاپڑ بیلے۔ دھان کوٹے۔ دھان کاٹی۔ چاکری کی۔ پیٹھ پر کوڑے کھائے۔ ناچا۔ چرخہ کاتا۔ گالیاں دیں۔ یم راج سے ملا۔ اس پیٹ کی خاطر ——"

"اور ہم ڈھاکہ سے ٹری ننڈاڈ آ گئے۔ اس پیٹ کی خاطر۔" دیپالی بولی۔

یاسمین کہتی رہی۔ "ایک گونڈ گیت تھا۔ میں نے گائے بیچ کر جنگل کا ٹیکس دیا۔ بیل بیچ کر — اب بھی کافی نہیں۔ انگریز کے راج میں ہم بھوکے رہتے ہیں۔" ہمیں اس وقت ایسا پکا معصوم یقین تھا کہ اپنے قومی راج میں کوئی بھوکا نہیں رہے گا —— اور وہ حیدرآباد اسکواڈ — ہم سرخ سپاہی شانِ وطن —"

"ریحان کے متعلق بتاؤ یاسمین۔"

"ہاں دیدی تو وہ اس کانفرنس میں میری بہت سرپرستی کرتے رہے۔ میں نے ان کو بتایا میں دیپالی سرکار کی دوست ہوں۔ ان پر مطلق اثر نہ ہوا۔ اچانک میں بہت بور ہو گئی۔ طبیعت بیزار ہو گئی۔ پارٹیشن سے ذرا پہلے میں اپنے کٹر مذہبی قدامت پرست مولوی والد اور سارے گھر والوں سے بغاوت کر کے ایک اسکالرشپ پر بھرت ناٹیم سیکھنے مدراس چلی گئی۔ اور وہاں سے ایک سال بعد اپنے ایک روشن خیال رشتے دار کے پاس سیدھی کراچی۔ وہ بہت بارسوخ آدمی تھے۔ انہوں نے ایک بنگالی سنٹرل منسٹر کے ذریعہ کوشش کر کے مجھے باہر بھجوانے کا بندوبست کیا۔ انہی دنوں ڈھاکہ سے جہاں آرا آپا نے لکھا کہ آپ لوگ چندر کنج فروخت کر کے کلکتہ اور وہاں سے ٹری نیڈاڈ جا چکے ہیں —— جہاں آرا آپا کو بڑا افسوس تھا کہ جاتے وقت آپ ان سے ملی نہیں۔ خط تک نہ لکھا۔ ان کو صدمہ زیادہ یہ تھا کہ شاید ہندوستان پاکستان کی سیاست کی تلخی آپ دونوں کے درمیان آ گئی ——"

"کاش میں اسے سمجھا سکتی کہ اس کا سامنا کرنے کی مجھے ہمت کیوں نہ پڑتی تھی۔ شاید اسے بھی تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ قصور میرا بالکل نہ تھا۔ اس کی نسبت ٹوٹنے کے بعد ریحان مجھ سے ملے تھے ـــــ بہرحال حالات پر انسان کا بس نہیں۔ میں تقدیر کی قائل ہو چکی ہوں۔ شاید جہاں آرا بھی تقدیر کی قائل ہو گی۔ اور جس وقت پارٹیشن ہوا جہاں آرا دیناج پور میں تھی میں س سے کس طرح مل سکتی تھی۔ گو ہم لوگ سن اڑتالیس تک ڈھاکہ میں رہے ـــ بابا کے ایک مریض مترا بابو تھے ان کی بیوی بابا سے اُوما رائے کی شادی کی بات چیت چلا رہی تھیں۔ مترا بابو کلکتے کے کسی مسلمان سے اپنا مکان ایکسچینج کر کے پارک سرکس کلکتہ چلے گئے تھے۔ سر پریتوش رائے کا خاندان بھی جا چکا تھا۔ ـــ وڈلینڈز میں ایسٹ پاکستان گورنمنٹ کا کوئی دفتر بن گیا تھا۔ پارٹیشن سے ان بڑے لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ لیڈی رائے اطمینان سے ڈھاکہ آ کے ووڈلینڈز کا کرایہ وصول کرتیں۔ پرانے دوستوں کے ساتھ ڈھاکہ لب میں اپنی شامیں گزارتیں۔ اور واپس چلی جاتیں۔ کلکتے میں وہ لوگ نرملیندو کے پاس بالی گنج میں مقیم تھے۔ رملیندو کلائیو روڈ کا بڑا کاروباری تھا۔ بے حد شراب پیتا تھا۔ اور کنفرمڈ بیچلر تھا۔

"اب مترا بابو نے کلکتے سے بابا کو لکھا کہ وہ فوراً وہاں آ جائیں۔ کھوکھو پہلے ہی ویسٹ بنگال جا چکا تھا۔ اور شیاما پرشاد مکرجی کا ورکر بن گیا تھا۔ اس نے کہا تھا وہ سکنڈ کلاس شہری بن کر ایسٹ پاکستان ں نہیں رہے گا۔ بالکل یہی بات انڈیا سے آنے والے مسلمان وہاں کے لیے کہہ رہے تھے۔ آخر ایک روز بابا رکشا پر بیٹھ کر ارجمند منزل نواب قمر الزماں سے مشورہ کرنے گئے۔ انہوں نے کہا ہرگز مت جاؤ۔ یہاں اکٹروں کی کمی ہے۔ ہندو ڈاکٹر سب جا رہے ہیں۔ تمہاری پریکٹس چمک جائے گی۔ بابا نے کہا لیکن میرے وں کا مستقبل کیا ہو گا؟ چندر کنج ایک بہاری مسلمان کے ہاتھ اونے پونے بیچ کر ہم لوگ کلکتے روانہ ہو گئے خصت کرتے وقت نواب قمر الزماں اور عبدالقادر کوچوان بہت روئے۔ بے چاری جہاں آرا دیناج پور میں تھی۔

"گوالنڈو گھاٹ پر اسٹیمر کے فرسٹ کلاس ڈیک پر چارلس بارلو اکیلا ایک کونے میں بیٹھا بیئر پیتا ظر آیا۔ بڑا علامتی منظر تھا۔ معلوم ہوا انگلستان واپس جانے کے بجائے آسٹریلیا جا رہا ہے۔ وہاں ارمنگ کرے گا۔

"سیالدہ اسٹیشن پر پہنچ کر ہم لوگ سیدھے مترا بابو کے ہاں گئے۔ بابا نے دوستی کی وجہ سے برسوں ن کا مفت علاج کیا تھا۔ مترا بابو مزے میں تھے۔ بزنس شروع کر رکھی تھی۔ کسی تارک الوطن مسلمان سے

تبادلے میں لیا ہوا بڑا سا مکان تھا۔

"مترا بابو نے نہ جانے کس طرح یہ طے کر لیا تھا کہ بابا اُوما رائے پر عاشق ہو گئے ہیں۔ لیڈی رائے بھی چاہتی تھیں کہ اُوما کسی سے بھی جلد از جلد شادی کر لیں! اور ریحان کے FIXATION سے آزاد ہوں۔ ریحان بھی شہر میں موجود تھے۔ میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ نیا نیا پارٹیشن ہوا تھا۔ کمیونلزم بہت شدید تھی۔ ریحان سے دوستی کی افواہ کی وجہ سے اپنی ساری دولت کے باوجود اُوما دیبی کے لئے رشتے مفقود تھے۔ نرملیندو بھی بہت پریشان تھا۔ وہ ایک پکا سرمایہ دار۔ وہ بہن کے سیاسی رجحانات سے ہمیشہ نالاں تھا! اب اس نے بھی اُوما پر شادی کے لئے زور ڈالا۔ آخر ایک روز اُوما دیبی خود ہی آ کر ہڑبڑاہٹ میں بابا سے کہہ گئیں کہ وہ اُن سے بیاہ کر لیں گی۔ شاید ان کی اسکیم یہ بھی رہی ہو کہ بیاہ کے بعد شوہر کی موجودگی میں ریحان سے ملنا جلنا اتنا قابلِ اعتراض نہ سمجھا جائیگا

"میرے بابا بہت سادہ لوح ہیں۔ وہ کسی انسان کو بُرا سمجھ ہی نہیں سکتے۔ مگر اُوما کے وہ بھی مدّاح نہ تھے۔ اس کے باوجود، چونکہ اپنی جگہ سے اُکھڑ چکے تھے، وہ کسی جذباتی سہارے کے متلاشی تھے اور اُوما دیبی ان کو بھی خوب FLATTER کر رہی تھیں۔ مترا بابو جو شادی کی گفت و شنید ڈھاکے کے زمانے سے چلا رہے تھے بڑے کائیاں بزنس مین تھے۔ بابا رائے خاندان کے داماد بن جائیں تو ان کے ذریعے وہ نرملیندو رائے سے اپنے دسیوں کام نکلوا سکیں گے۔ کیونکہ نرملیندو اتنا "براؤن صاحب اور بد دماغ مغرور آدمی تھا کہ کوئی نتھو خیرا اس کے پاس پھٹک ہی نہ سکتا تھا۔

"میں محوِ حیرت یہ سارا ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ اصول پرست بابا نے مجھ سے ریحان کے بارے میں کبھی ایک لفظ نہ پوچھا تھا۔ اوما دیبی سے میں بات ہی نہیں کرتی تھی۔ بڑے شدید تناؤ میں وقت گذر رہا تھا۔

"اب دیکھو۔ کلاس کی پیدائشی خر دماغی کبھی جاتی نہیں۔ اُوما پرانی "فیلو ٹریولر" تھیں۔ بابا سے شادی کرنے والی تھیں مگر ہمارے کنبے سے اس طرح کا برتاؤ کرنے لگی تھیں جیسے ہم غریب ریفیوجی لوگ ان کے محتاجِ کرم تھے۔

"میں نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ بابا مطب جمانے کی فکر میں تھے۔ چندر گنج کی قیمت کا روپیہ آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ شونو اور ٹوٹو آوارہ گردی کرنے لگے تھے۔ مترا بابو کے گھر پر رہتے

وں کو تقریباً ایک سال ہو گیا۔ اب مسز مترا نے اپنی ماں سے لڑنا شروع کر دیا۔ بھوتارنی دیبی۔ گوڈ ہر۔۔ خود ایک لڑاکا خاتون۔ گھر میں روز کھٹ پٹ ہونے لگی۔ میں گھبرا کر باہر نکل جاتی۔ ریڈیو راموں سے ذرا سی آمدنی ہو جاتی تھی۔ باقی وقت میں میوزیم یا کسی لائبریری میں گزارتی۔ مترا بابو کے اس جاتے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ اور اس چیز سے اور زیادہ کوفت ہوتی کہ ریحان اسی شہر میں موجود اور ان کو معلوم ہے کہ میں کس حال میں ہوں۔ ایک بے روزگار ریفیوجی۔

”ایک صبح میں وکٹوریہ میموریل میں گھوم رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں ٹیپو سلطان کے بدالخالق کے پورٹریٹ کے نیچے کھڑی جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ سراج الدولہ۔ کلائیو۔ کارنوالس یٹو میر۔۔ اچانک اُوما دیبی کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا وہ کسی انگریز کے ساتھ وہاں موجود مجھے اس سے ملوایا۔ وہ ان کا لندن کا کوئی پرانا ہم جماعت تھا۔ کلکتہ آیا ہوا تھا۔ اسے سیر کرا رہی پھر انہوں نے نہایت بلندی سے میرا تعارف کرایا۔ مس دیپالی سرکار۔۔۔ میرے بھائی رائے کی پرسنل اسسٹنٹ۔

”میں ہکا بکا ان کی شکل دیکھنے لگی۔ غصے کے مارے میرا بھیجا آؤٹ ہو گیا۔ میں نے فوراً کہا کیجیے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کسی مسٹر نرملیندو رائے کی پی۔ اے نہیں ہوں۔

اُوما دیبی نے جو اس وقت وکٹوریہ میموریل کے اندر انگریز دوست کے ساتھ بڑی شان سے کھڑی ے گھور کر دیکھا۔ اور کسی برطانوی ڈچز کے سے انداز میں کہا۔ ”اس کے متعلق ہم پھر بات کریں یلونگ برڈ۔

انگریز بہت مہذب ہوتا ہے۔ وہ اس غیر متوقع چھینٹے سے خاصا نادم نظر آیا۔ میں لال پیلی سے ہٹ گئی۔

اسی روز شام اُوما رائے مترا بابو کے ہاں پہنچیں۔ میں باہر چبوترے پر کھڑی تھی انہوں نے ترتے ہی مجھے پھٹکارنا شروع کیا۔ تم۔ تم کو میرے انگریز دوست کے سامنے مجھے جواب دینے کی ہوئی۔

پ حد سے آگے بڑھ رہی ہیں اُوما دیبی۔ میں نے جواب دیا۔

حد سے تم آگے بڑھ چکی ہو۔ احسان فراموش۔ تم پہلی تاریخ سے نرملیندو کے آفس میں کام کرو گی۔

تمہاری جیسی ریفیوجی لڑکیوں سے کلکتہ پٹا پڑا ہے۔ ہر چوتھی بنگالی لڑکی تمہاری طرح گاتی ہے۔ تم عجوبہ ر
نہیں ہو۔ یہاں تم کو ویسٹ بنگال کا گورنر کوئی نہیں بنا دے گا۔ شکر کرو کہ میں نے نرملیندو کے دفتر م
ملازمت کا بندوبست کر دیا۔

"اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میں آپ کے شرابی، بدمعاش، بد دماغ بھائی کی سکریٹری بننا قبول کر لوں گ
بہت سخت غلطی پر ہیں۔ اوما دیدی۔

"میں نے اب ذرا سکون سے جواب دیا۔

"میں تمہارے باپ سے بات کرتی ہوں۔ انہوں نے پیر پٹخ کر کہا۔

"کر لیجئے۔ میں نے جواب دیا۔

"بابا اور مسٹر مترا گھر پر موجود نہ تھے۔ لیشی ماں کالی گھاٹ گئی ہوئی تھیں۔ مسز مترا کان لگا
اندر سے یہ سارا مکالمہ سن رہی تھیں۔ اوما دیبی الٹے پاؤں واپس گئیں۔ جب بابا گھر آئے مسز م
یہ سارا قصہ نمک مرچ لگا کر ان کو سنایا۔ بابا نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ نزدی
میدان میں ٹہلنے جاتے تھے۔ کھانے کے بعد مجھے آواز دی۔ میں باہر چبوترے پر آئی۔ اس رات میں اُد
جانے کے بعد کمرہ بند کر کے بہت روئی تھی۔ بابا نے کہا دیپالی ہمت سے کام لو

"میں نے کہا۔ بابا کیا آپ واقعی اس خوفناک عورت سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟

"وہ چپ رہے۔ میں نے کہا کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں نرملیندو رائے کی پرسنل سکریٹری
علاوہ ازیں مسٹر پری توش اوما دیبی کے لئے علیحدہ کوٹھی بنوا رہے ہیں۔ آپ وہاں رہیں گے۔ ریحان
آیا کریں گے۔ میں ریحان کی ساری عمر شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ یہ کیسی ہولناک صورت حال ہے۔ م
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس روز میں نے پہلی بار بابا کے سامنے ریحان کا نام لیا تھا۔

"بابا چند منٹ تک خاموش رہے۔ پھر بولے۔ چلو۔ ہم اس ملک کو ہی خیرباد کہتے ہیں

"واپس ڈھاکہ ـــــ؟ میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ٹری نیڈاڈ۔ مُکل کا خط آیا تھا۔ اگر میں وہاں آنا چاہوں تو وہ میرے لئے وہاں ا
کر سکتا ہے۔ کسی بھی پلانٹیشن پر میڈیکل آفیسر کی جگہ مل سکتی ہے۔

"بابا کے ایک چچازاد بھائی مدتیں گذریں ڈھاکہ سے پورٹ آف اسپین چلے گئے تھے۔ ڈا

بہت پیسہ کمایا۔ ایک مرتبہ وطن آئے تو چندر کنج آئے تھے۔ بڑھیا سوٹ۔ ہوانا سگار۔ میری ماں زندہ
انہوں نے جھینپ جھینپ کر گھر کا افلاس چھپاتے ہوئے ان کی میزبانی کی تھی۔ اب میں نے بابا سے
مگر آپ اب اُوما دیبی کو کس طرح SHAKE OFF کریں گے؟

”بابا ہنس پڑے کہنے لگے۔ میں ان سے کہوں گا شادی کے بعد وہ میرے ساتھ ٹرینیڈاڈ چلیں۔
نکار کریں گی۔ قصہ ختم ہو جائے گا۔

”ایسا ہی ہوا۔

”چندر کنج کی قیمت کا جو روپیہ باقی بچا تھا اس سے جہاز کے پانچ ٹکٹ خریدے گئے۔ بابا۔
ماں۔ ممّا۔ شونو۔ ٹونو۔ بہت لمبا بحری سفر کر کے ہم لوگ یہاں پہنچے۔ کھوکھو آنے پر راضی نہ ہوا۔
ہا سبھائی لیڈر بنتا جا رہا تھا۔ اور آر۔ ایس۔ ایس میں شامل ہو چکا تھا۔

”ازدواجی زندگی کا آرام جو پندرہ برس بعد ان کو دوبارہ حاصل ہو سکتا تھا شاید بابا نے میری وجہ
اس کی قربانی دی۔ پتہ نہیں۔ لیشی ماں مجھ سے بہت خفا تھیں کہ گھر آئی لکشمی کو واپس کر دیا۔“

”ارے وہ لکشمی تھی کہ وبال جان۔“ یاسمین بولی۔ ”آپ سب کی زندگی اجیرن کر دیتیں۔“

”یہاں پہنچ کر میں نے لیشی ماں کو سمجھایا کہ اشنان کریبین میں بھی ہو سکتا ہے۔ مہا کالی ہر جگہ ہے۔
روں کی یہاں کمی نہیں۔

”یہاں سوشل رسوم انیسویں صدی کے ہندوستان کی ہیں۔ ہنومان جی کے مندروں میں پوجا
بعد لوگ باگ چوراہوں پر آ کر فیسٹا کرتے ہیں اور کلیپسو ڈانس۔ شونو کو سان فرینڈو میں نوکر
ئی ہے۔ ٹونو وینیزولا چلا گیا ہے۔

”للت سین سے میری شادی یہاں پہنچنے کے دوسرے برس ممکل چاچا نے طے کروا دی۔ اور میں بڑے
ن سے مسز سین بن گئی۔ للت یہاں کے کامیاب ترین بیرسٹر ہیں۔ پہلی بیوی اسپینش نژاد اور لاولد تھی
عرصہ ہوا طلاق دیدی۔ شریف آدمی ہیں۔ میں کافی خوش ہوں۔ بابا اور لیشی ماں ہمارے ساتھ بطور P.G.
تے ہیں۔ بابا کے مطب کے لئے دیکھو للت نے کیسا خوب صورت ٹری ٹاپ ہاؤس بنوا دیا ہے۔“

یاسمین نے ذرا تعجب سے دیپالی کو دیکھا۔ کچھ لمحے خاموش رہی اور بولی۔ ”اس کا مطلب ہے
ں آرا آپا بھی اپنے دیناج پور کے رئیس کے ساتھ خوش ہوں گی؟“

"شاید۔"

"یہ مجبوریوں سے سمجھوتہ ہے یا سچی خوشی؟"

"معلوم نہیں۔"

ایک طویل امریکن کار پھاٹک میں داخل ہوئی۔ اسے وردی پوش نیگرو شوفر ڈرائیو کر رہا بھاری بھرکم اور کم رو للت سین بریف کیس سنبھالے کار سے برآمد ہوئے۔ رین ٹری کی سمت آئے ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار ٹری ٹاپ ہاؤس کی سیڑھیاں اترے۔ وہ چاروں باتیں کرتے اسپی کولونیل بنگلے کی طرف چلے گئے۔ اندر ڈائننگ روم میں نیگرو بٹلر لنچ کے انتظام میں مصروف یاسمین طویل برآمدے میں سے گزرتی ڈرائینگ روم میں چلی گئی۔ اس نے دریچے سے باہر جھانکا۔ بھوتر دیبی ایک درخت کے نیچے آنکھیں بند کئے بیٹھی ہل ہل کر مالا جپ رہی تھیں۔ سامنے پالتو خرگو اور اعلیٰ نسل کتے دوڑتے پھر رہے تھے۔ نہایت پُرسکون منظر تھا۔ یاسمین دریچے میں سے ہٹ کر وسیع ڈرائینگ روم میں ادھر سے ادھر بیش قیمت سامان آرائش دیکھتی پھری۔ ایک بڑے اد گراموفون کے نزدیک دیپالی سرکار کے پرانے ریکارڈز رکھے تھے۔ یاسمین نے کُوک بھر کے سفید اور بھونپو والا ایک ریکارڈ گراموفون پر لگایا۔ سوئی کہیں بیچ میں پڑ گئی۔ اچانک دیپالی کی آواز بل ہوئی۔ کوئی کہے کالو ـــ کوئی کہے گورو ـــ لیو ہے ـــ لیو ہے بجنتا ڈھول۔

یاسمین پر پھر بیزاری کا دورہ پڑا۔ اس نے سوئی اٹھائی۔ ریکارڈ پلٹا۔ کماری دیپالی سرکا دوسرا بھجن۔ سوئی پھر وسط پر پڑی۔ جو پہرا دے سوہی پہنوں۔ جو کھلا دے سو ہی کھا جہاں بٹھاوے تاہیں بیٹھوں ـــ میرا کے پربھو ـــ

واہ ری عورت کی اوقات۔ یاسمین نے دل میں کہا۔

نیگرو بٹلر کمرے میں آکر بولا "مس! لنچ از سروڈ۔"

گراموفون بند کر کے وہ ایوان طعام کی طرف بڑھی۔ سامنے آتش دان پر روزی کی دستخط شدہ تصویر پر نظر پڑی۔ "رادھیکا سانیال۔ نئی دہلی۔ ۱۶ مارچ ۴۹ء"

۳۴

الیتھر گری بالا بنرجی

ڈھاکہ۔ مشرقی پاکستان۔ دسمبر ۴۹ء

مشن کمپاؤنڈ کے ایک کوارٹر کے سٹنگ روم میں کروشیا کے میزپوش سے ڈھکی بڑی میز پر تین تصویریں رکھی ہیں۔ کمل۔ نیرا۔ ایلا۔ نئی دہلی۔ روزی کے بچے۔ پادری بنرجی آرام کرسی پر آنکھیں ند کئے لیٹے ہیں۔ ڈاکیہ سامنے سے گزر جاتا ہے۔ وہ اس کے قدموں کی آہٹ پہچانتے ہیں۔

"روزی کا خط آیا؟"

"نہیں۔" الیتھر گری بالا اسٹوو پر بھات اُبالتے ہوئے جواب دیتی ہیں۔

"اتنے برسوں سے وہ آئی بھی نہیں۔ کب آئے گی؟ ہر سال انتظار کرتا ہوں کہ شاید اس کرسمس پر آجائے۔"

"ہاں۔ اس کے لئے یہاں آنا اتنا آسان نہیں ہے۔ ویزا بڑی مشکل سے ملتا ہے۔"

"جب پارٹیشن نہیں ہوا تھا تب کونسا آتی تھی۔ اسے اب بھی ہم سے شرم آتی ہے۔ وہ ہم سے ہمیشہ سے چڑتی تھی۔ وہ بڑے آدمی کی بیوی ہے۔ ہم دیسی کرسچین غریب لوگ ہیں۔ مگر ہمارے مرنے کے عد اسے شاید ہماری قدر آئے۔ ہم اس کے ماں باپ تھے۔"

چرچ سے ریٹائر ہونے کے بعد ان کو دو کمروں کا کوارٹر مل گیا ہے۔ عسرت سے گذر ہوتی ہے۔ گری بالا اچار چٹنی بنا کر بیچتی ہیں۔ دونوں کا باری باری موتیا بند کا آپریشن ہو چکا ہے۔ پادری صاحب ا آپریشن ٹھیک سے نہیں ہوا۔ ان کی بصارت زائل ہو چکی ہے۔ یسوع۔ یسوع۔ یسوع۔ وہ جو آسمانوں سے گذر گیا۔ یسوع۔ شام کو گری بالا پادری صاحب کا ہاتھ تھام کر ان کو ٹہلانے لے جاتی ہیں۔ سفید داڑھی۔ نابینا۔ پُرنور چہرے والے پادری بنرجی سنسان سڑک پر آہستہ آہستہ چلتے یسوع کے ایک حواری معلوم ہوتے ہیں۔ آلے لُویاہ۔ آلے لُویاہ

کل رات پادری بنرجی اپنے منجی سے جا ملے۔ آخر وقت میں وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو نہ دیکھ سکے۔ گری بالا نے روزی کو موت کی اطلاع کا تار بھیجا۔ اس کا خط آیا۔ ماما تم فوراً میرے پاس چلی آؤ۔ لیکن برہمن نژاد ماما اپنے داماد کے ٹکڑوں پر پلنے نئی دہلی نہیں جائیں گی۔ اور نہ اپنے امیر زادے نواسوں کی آیا گیری کریں گی۔ مشن والے ان کی مدد کر رہے ہیں۔ مشن اسکول میں ہوسٹل وارڈن کا کام دلوا دیا ہے۔ مگر پرنسپل سے اُن کی نہیں بنتی۔

ایک روز وہ رکشا پر بیٹھ کر ارجمند منزل پہنچتی ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں ایک بال ودھوا برہمن ہندو پندرہ سالہ بچی سسرال والوں کے مظالم سے بچنے کے لئے کشتی پر بیٹھ کر فریدپور کے گاؤں سے بھاگ کر اپنے زمیندار آقا کے ہاں پناہ لینے ارجمند منزل ڈھاکہ آئی تھی۔ ایک بوڑھی عیسائی غریب بیوہ نے ارجمند منزل پہنچ کر نواب قمر الزماں کے دفتر کے دروازے پر دستک دی۔

پینتالیس سال قبل، نوعمر قمر الزماں اپنی بنت عم ملیحہ بی بی پر دم دے رہے تھے۔ مگر اپنی رعیت کی اس دلکش ہندو بال ودھوا کے تیر نظر کے بھی گھائل ہو گئے تھے۔ بوڑھے نواب قمر الزماں نے خود اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ ایک پوپلے منہ والی پریشان حال ضعیفہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔

اسکول پرنسپل کے خلاف اس کی شکایات سن کر نواب نے کہا۔ "ایستھر! ارجمند منزل تمہارا گھر ہے۔ یہیں رہو۔ تم کو اس عمر میں ہم محنت مزدوری نہیں کرنے دیں گے۔"

"نواب صاحب۔ پال بڑے خوددار آدمی تھے۔ میں کسی بھی جگہ مفت خوری کر کے ان کی روح کو تکلیف نہیں پہنچاؤں گی۔ میری صحت بہت اچھی ہے۔ مجھے کہیں کام دلوا دیجیے۔"

گری بالا دیبی کے اصرار پر نواب صاحب ان کو یونیورسٹی کے گرلز ہوسٹل میں کچن سپروائزر کی ملازمت دلوا دیتے ہیں۔ دو سال بعد وہ بعارضہ نمونیہ مر جاتی ہیں۔ چرچ یارڈ میں پال کے پہلو میں دفن کی گئیں۔ کسی کو علم نہیں کہ نئی دہلی کی مشہور دولتمند سوشل ورکر رادھیکا سانیال ان کی بیٹی ہے۔

نئی دہلی میں جس وقت روزی کو مسز بنرجی کی وفات کا تار ملا جو نواب قمر الزماں نے بھجوایا تھا وہ اپنی عالیشان نئی کوٹھی میں ڈنر کے انتظام میں مصروف تھی۔

مہمان آ چکے تھے۔ تار بسنت کمار سانیال نے لیا۔ وہ روزی کے پاس گیا جو چند غیر

لی مہمانوں کا سواگت کر رہی تھی۔ ایک امریکن اسکالر ۴۲ء کی تحریک کے بارے میں ایک امریکن فاؤنڈیشن کی ف سے کتاب لکھ رہا تھا۔ اس سلسلے میں روزی سے ملنے آیا تھا۔ اس نے بسنت کمار سانیال سے کہا۔ "مجھے م ہوا ہے کہ آپ کی بیوی ۴۲ء کے موومنٹ کی ایک ہیروئن تھی!" بسنت سانیال دھیرے سے مسکرایا۔ اس نے روزی کے ہاتھ میں وہ تار دیا جو ڈھاکہ سے آیا تھا۔ اور آہستہ سے کہا۔ "روزی۔ تم ہیروئن نہیں یں۔ تمہاری ماں ہیروئن تھیں۔"

جہاں آرا دیناج پور سے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ سب ارجمند منزل کے پچھلے دالان جمع تھے۔ اس کا بچہ اکمل۔ والدہ۔ بھاوج۔ دونوں چھوٹی بہنیں۔ نیر الزماں نے اندر سے آکر کہا۔ ذرا اپنی بھتیجی یاسمین مجید کی حرکتیں دیکھو۔ یہ دیکھو لندن کے ایک اخبار میں اس کی تصویر۔ کسی ریز سے شادی کر لی۔"

جہاں آرا نے عینک لگا کر اخبار دیکھا۔ "بلیک بیوٹی ویڈز۔ ڈارک ڈانسر یاسمین مجید ہر ڈ وائٹ پرنس چارمنگ۔" "ننگے پاؤں والی کالی رقاصہ کی شادی۔"

"معقول۔ اور یاسمین کیا رئیس کا گھوڑا ہے۔ بلیک بیوٹی۔ ڈارک ڈانسر۔ حد ہو گئی۔" نیر الزماں سر ہلا کر کہا۔ "جل پائے گوری کے مولویوں کا خاندان۔ اور یہ انجام۔ ننگے پاؤں والی رقاصہ۔"

"اور وہ نگوڑا انگریز کیا کرتا ہے؟" بیگم قمر الزماں نے پوچھا۔

"ہو گا کوئی بھڑ بھونجا۔" نیر الزماں نے کہا۔

"فیشن ڈیزائنر ہے۔" جہاں آرا نے اخبار پڑھ کر کہا۔ "مگر جب دیپالی کا ٹری نیڈاڈ سے خط آیا اس نے لکھا تھا کہ یاسمین ڈانس کرنے پورٹ آف اسپین گئی تھی۔ اس خط میں تو کسی انگریز ونگریز کا ذکر تھا۔ جیرلڈ ایڈرین بلمونٹ۔ بہت خوب!"

۳۵

یاسمین بلمونٹ، ”ڈارک ڈانسر“

دیپالی دیدی۔ آپ کا خط ملا۔ اب آپ کو ساری بات بتاتی ہوں۔ بہت عرصہ بعد آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ جیرلڈ سے میں نے کہا تھا کہ شادی اسلامی طریقے سے ہو۔ وہ مان گیا۔ نکاح کے لیے ہم نے ایک دوست کو بلایا جو پہلے باقاعدہ مولوی رہ چکے تھے۔ اب بے دین تھے۔ ہم سب پب سے نکل کر رات کے بارہ بجے ان کے گھر پہنچے۔ وہاں مزید مے نوشی ہوئی۔ پھر مولوی صاحب نے نکاح پڑھا۔ دولہا دلہن مولوی گواہ سب نشے میں آؤٹ تھے۔

شادی کے بعد ہم دونوں نے چیلسی میں ایک میوز کرائے پر لے لی۔ جیرلڈ کی آمدنی بہت اچھی تھی میں نے رقص ترک کر دیا۔ گھر ہاؤس وائف بنی۔ بچی پیدا ہوئی۔ اس کا نام شہرزاد رکھا۔ جب وہ ذرا بڑی ہوئی میں نے پھر اپنا ڈانس ٹروپ تیار کیا۔

ایک روز اچانک اور بالکل غیر متوقع جیرلڈ میرے ٹروپ کے ایک بنگالی رقاص کے ساتھ بھاگ گیا۔ معلوم ہوا دونوں پیرس میں ہیں۔ میں پتہ چلا کر پیرس پہنچی۔ ان کو ڈھونڈ نکالا۔ صبح کو میں ان کے فلیٹ پر پہنچی بنگالی چھوکرا ایپرن باندھے گھریلو عورتوں کے سے انداز میں اسٹوو کے سامنے کھڑا ناشتہ تیار کر رہا تھا۔ جیرلڈ ڈریسنگ گاؤن پہنے بیٹھا اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ گرہستی کا یہ نظارہ دیکھ کر مجھے ابکائی سی آئی اور میں بغیر کچھ کہے سنے الٹے پاؤں لندن واپس آ گئی۔ پھر میں نے جیرلڈ کو لکھا کہ طلاق دیدے۔ اور مہر ادا کرے اس کا جواب آیا کہ شادی ہی کب ہوئی تھی۔ مولوی اور گواہ سب نشے میں دھت تھے۔ وہ نکاح نہیں تھا مذاق تھا۔ علاوہ ازیں ہم نے بلحاظ برطانوی قانون سول میرج نہیں کی۔ لہٰذا بچی کی پرورش کی ذمے داری بھی مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ مجھے صنف نازک میں کبھی دلچسپی نہیں تھی۔ تم لندن میں اپنا ڈانس اسکول اور یوگا کلاسیں چلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں اور ڈاؤن اینڈ آؤٹ تھیں۔ اور وطن واپس جانے کے لیے کرایہ تک پاس نہ تھا۔ میں تمہارے ساتھ رہ کر تمہاری کفالت کرنے لگا تھا۔ محض ازراہِ ہمدردی۔ لیکن میں امید کرتا ہوں ہم اچھے دوست رہیں گے۔

جیرلڈ کی والدہ جو ایک متموّل اور نہایت کنجوس ریٹائرڈ اسٹیج ایکٹرس ہیں وہ شہزاد کو اپنے ھا اپنے گاؤں لے گئی ہیں اور اس شرط پر اس کی ذمے داری لینے کو تیار ہیں کہ وہ اسے رومن کیتھولک اٹھائیں یں نے کہا رومن کیتھولک کیا ہوٹن ٹوٹ، شنتو، بدھسٹ کچھ بھی بنا دیجیے۔ اسے میری طرح دھکے کھانے پڑیں۔ میں اب ایک دفتر میں کلرکی کر رہی ہوں۔ ڈانس ٹروپ چلانا بہت مشکل تھا۔ انڈیا آنے والے نامور ڈانسرز کا کمپی ٹیشن بہت سخت ہے۔ پچھلے مہینے امید کی کرن نظر آئی۔ معلوم ہوا یحان الدین احمد آئے ہوئے ہیں۔ پچھلی مرتبہ پورٹ آف اسپین میں آپ کو میں نے بتایا تھا کس طرح یہ ت ایک زمانے میں میرا تعاقب کرتے رہتے تھے۔ اب وہ منسٹر تھے اور یہاں ایک وفد کے ساتھ آئے ۔ اور ڈورچیسٹر میں ٹھہرے تھے۔ میں نے فون کیا ملنے کی کوشش کی۔ انہوں نے صاف ٹال دیا کہ مصروف ہیں۔ پھر میں نے سنا۔ انھوں نے کہا "پرانے شناسا اب سب قریبی دوست ہونے کا دعوے تے ہیں۔ مجھے تنگ کرتے ہیں۔ یہ کام کروا دو۔ وہ کام کروا دو۔ میں کس کس سے ملتا پھروں" جس طن سے انہوں نے یہ کہا۔ اتفاق سے وہ مجھے بھی جانتا تھا۔ اس نے آکر مجھے بتایا۔

جہاں آرا آپا سے آپ کی خط و کتابت ہے؟ میں نے ان کو کئی خط لکھے۔ جواب نہیں آیا۔ غالباً بند منزل والے بھی میرے طرز زندگی سے سخت متنفر اور بیزار ہیں۔ مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔ زمین اد ن میرے سامنے سے بھاگ گئے۔ مجھے کہیں پناہ نہ ملی۔

آپ کی یاسمین بلمونٹ

۳۶

پائلٹ آفیسرِ اکمل مرشد زادہ

لاؤڈ اسپیکر پر دُہرایا جا رہا تھا۔ مسز دیپالی سین۔ مسز دیپالی سین۔ وی۔ آئی۔ پی لاؤنج یں آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ مسز دیپالی سین ٹی۔ ڈبلیو۔ اے کی مسافر — پورٹ آف اسپین کی مس پالی سین —

ششدر اور مضطرب وہ مسافروں کی بھیڑ سے نکلی۔ پاکستان ایر فورس کے یونیفارم میں

ملبوس ایک سانولا نوجوان اس کی طرف آیا۔ "دیپالی آنٹی ـــــ؟" اس نے ذرا جھجک کر پوچھا۔ "میں اکمل ہوں۔ امی لاؤنج میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ آپ کی فلائیٹ بہت لیٹ تھی۔"

وہ پائلیٹ آفیسر اکمل حسین مرشد زادہ کے ساتھ وی۔ آئی۔ پی لاؤنج کی طرف بڑھی۔ کم کے اندر ڈھکی ململ کی سفید ساری میں ملبوس ایک غمگین آنکھوں والی دبلی پتلی عورت، کھچڑی خیر مقدم کے لیے صوفے سے اٹھی۔ دیپالی نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"یہ امی ہیں۔" نوجوان اکمل نے ذرا گھبرا کر کہا۔

"میں تمہاری شادی میں شریک نہ ہو سکی تھی دیکھو اتنی دور سے تمہارے بیٹے کی شادی میر شرکت کے لئے آگئی!" دیپالی نے مصنوعی بشاشت سے کہا۔ جہاں آرا کو اس حالت میں دیکھنے کی ذمہ دا میں خود ہوں۔ میں ریحان کو آسانی سے بھلا سکی۔ لیکن ریحان کی وجہ سے ان کی زندگی ہمیشہ کے لئے غا ہوگئی۔ زندگی کی بربادیوں کا یہ کیسا لامتناہی سلسلہ ہے۔ اس نے اُداس آنکھوں والی جہاں آرا پر پھر نظر ڈالی دو سال قبل وہ بیوہ ہوگئی تھی۔ اکمل اس کا اکلوتا لڑکا تھا۔

دیپالی نے اتنی شان و شوکت پہلے ارجمند منزل میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ اُدما رائے کے دو ڈلنہ میں بھی نہیں۔ پاکستان کا نیا اوپری طبقہ واقعی بیحد متموّل ہو چکا تھا۔ دلہن بھی ایک ملک التجار کی لڑکی جب اکمل کے سہرا باندھا جانے لگا جہاں آرا وہاں سے ہٹ گئی۔ وہ کونے میں جا کر اپنے مرحو شوہر کو یاد کر کے رو رہی تھی۔ دیپالی نے ایک بار پھر اسے حیرت سے دیکھا۔ ہندوستانی ـــ خیر ـــ پاکستانی ـــــ عورت! خلاف مرضی اسے ایک ایسے عیاش بدقوارہ بدہیئت شخص سے بیاہا گیا جس نے ساری عمر اسے جلایا۔ مگر اس نے دوسروں کے سامنے ہمیشہ اپنے شوہر کی حمایت کی اور اس کی خدمت گذار رہی۔ اور اب اسے یاد کر کے رو رہی تھی۔

چند سال قبل، جہاں آرا کی چھوٹی کنواری بہنیں انجم آرا اور اختر آرا اپنے بھتیجے منوّر الزماں سے ملنے لندن جا رہی تھیں جو وہاں اسکول میں پڑھتا تھا۔ طیارہ آلپس پر گر کر پاش پاش ہو گیا۔ سارے مسافر ہلاک ہوئے۔ برف میں لاشیں بھی نہ ملیں۔ اس دہشتناک جوانمرگی کے صدمے نے ان کی ماں بیگم قمر الزماں کی جان لی۔ نواب قمر الزماں اس کے بعد سے بہت کم بولتے تھے۔ اس وقت یتیم نواسے کی شادی کے عصرانے میں

میانے کے نیچے ترکی ٹوپی اوڑھے (اگلے وقتوں کے لوگ ننگے سر رہنا خلاف تہذیب گردانتے تھے) گورنر ر اور اعلیٰ افسروں سے ایک آدھ بات کر لینے کے بعد پھر خاموش ہو گئے۔ صوفے پر گم صم بیٹھے رہے۔ کی نظر دیپالی پر پڑی جو ایک طرف کھڑی جہاں آرا کی پرانی خادمہ مالا سے باتیں کر رہی تھی۔ انہوں نے اشارہ کے لیے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ ان کے قریب جا بیٹھی۔ وہ دونوں چپ چاپ سامنے کی چہل پہل کا نظارہ کیا کئے۔ دیپالی کی آنکھ بھر آئی۔ اس نے چپکے سے آنسو پونچھے۔ نواب صاحب نے دیکھ لیا۔ آہستہ سے لے "رونا نہیں چاہیے بیٹی۔ بری بات ہے۔ صبر بڑی چیز ہے۔"

کچھ دیر بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کے بھانجے ریحان الدین احمد ـــ میں ابھی ان سے ہ میں مل کر آ رہی ہوں۔"

نواب صاحب نے چاندی کی موٹھ والی چھڑی کو آہستہ سے قالین پر کھٹکھٹایا اور ذرا توقف کے بولے۔ "ریحان اب وہاں بڑا آدمی ہے۔ اپنی پرانی سیاست چھوڑ کر کانگریس میں شامل ہو گیا۔ منسٹر ن چکا ہے۔ اب کیا کر رہا ہے؟"

"اوما رائے کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ اُن کے بھائی کی کوئی بہت بڑی بزنس ہے۔ ردنو اُس ایک فرم کے جنرل منیجر ہو گئے ہیں۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کھوکھو کے ہاں ٹھہری تھی۔ اس نے ان کو فون کر یرے آنے کی خبر دی۔ خود ملنے نہیں آئے۔ اپنی کار بھیج دی۔ میں، کھوکھو اور اس کی بیوی اوما رائے کے علی . روڈ گئے۔ کوٹھی کی دوسری منزل میں اوما رائے خود رہتی ہیں۔ نیچے ایک ونگ میں ریحان اور اُن بیوی اور لڑکا۔ چند روز ہوئے لڑکا گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اوما دیدی کے بھائی نرملیندو رائے نے اب شادی نہیں کی۔ چوبیس گھنٹے شراب میں غرق بنگال کلب میں بیٹھا رہتا ہے۔ سارا کاروبار ریحان ہاتھ میں ہے۔ سنا ہے چند ماہ کے لئے منسٹر بنے تھے نرملیندو اور اوما رائے کے اس کاروبار کو .. فائدہ پہنچایا تھا۔ اس وجہ سے وہ لوگ ان کے اور زیادہ احسان مند ہیں۔ ریحان صاحب اپنے تے لڑکے کے متعلق بہت پریشان تھے۔ مجھ سے کہنے لگے باغی ہو کر گھر سے نکل گیا۔ تیرہ سال مر میں۔ ابھی سے شاعری کرتا ہے۔ بھوکی پیڑھی کا ہمدرد شاعر۔"

نواب قمر الزماں نے جو سر آگے بڑھائے بغور سن رہے تھے۔ یک لخت ایک تلخ قہقہہ بلند لوگوں نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔ انجم آرا اور اختر آرا کی موت کے بعد آج وہ پہلی بار ہنسے تھے

بنگال کے ایک قدیم کوی ابھی نند نے کہا تھا "تالاب کنول سے بھر گئے بہار میں مکھیاں آم بور پر جمع ہیں۔ مسافت چھوٹی ہو تب بھی، ہوا جب گاڑی کے راستے میں رقص کرتی ہے، غریب الوطن دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔" اور ڈھاکہ سے پورٹ آف اسپین کا راستہ بہت طویل تھا۔ واپس جانے سے قبل اس آخری شام وہ سنگ مرخ کے تالاب کے کنارے پرانے "راج سنگھاسن" پر بیٹھی جہاں آرا سے باتیں کرتی رہی۔ اس نقلی شاہی تخت پر لڑکپن میں یہ لوگ اسی طرح بیٹھا کرتی تھیں۔

معاً جہاں آرا نے پوچھا: "ریحان بھائی کی دلہن کیسی ہیں؟ کون لوگ ہیں؟"

"عام سی گھریلو بی بی ہیں۔" دیپالی نے جواب دیا۔ "غریب شریف گھرانے کی لڑکی۔ بتا رہی تھ اوما رائے کے بھائی نرملیندو رائے نشے میں دُھت کار چلا رہے تھے۔ گارڈن ریچ میں ان زہرہ بی بی کے با ان کی کار کے نیچے دب کر مر گئے۔ وہ ایک غریب کاریگر تھے۔ زردوز۔ جن کے دادا لکھنؤ سے کلکتے آ گ تھے۔ اوما دیدی نے تگڑم کر کے بھائی کو پولیس کچہری سے بچا لیا۔ متوفی کی ایک ہی لڑکی تھی۔ ماں مر چکی بھائی آوارہ نکل گئے تھے۔ اوما رائے بطور تلافی اس یتیم بے سہارا لڑکی کو لینے ہاں اپنی نئی کوٹھی میں ل آئیں۔ اپنے وارڈ روب کی دیکھ بھال اس کے سپرد کر دی۔ رہنے کے لئے ایک کوٹھری دیدی۔ زردوز لڑکی سینے پرونے میں طاق۔ سلیقہ مند۔ احساس کمتری کی شکار۔ ریحان صاحب جو حسب معمول اوم کے ہاں آتے رہتے تھے انہیں یہ لڑکی بھا گئی۔ یہ پارٹیشن کے ڈھائی تین سال بعد کی بات ہے۔ ریحان صا کے دل میں جانے کیا نیکی آئی ایک دن اس بے چاری مظلوم لڑکی سے نکاح پڑھوا لیا۔ اوما اس کے سات بڑی ساس نند کا سا برتاؤ کرتی ہیں۔ وہ خاموش رہتی ہے۔ ریحان بھی اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیتے

"اوما رائے کا ایک دلچسپ مشغلہ زہرہ نے بتایا۔ دائم المریض ہیں۔ سیاست سے کب کی کنارہ کش ہو چکی ہیں۔ صبح سویرے اٹھ کر نزدیک بیلویڈیر چلی جاتی ہیں۔ ایک ملازم چھیچھڑوں اور ہڈیوں کا برتن ل کر پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ سڑک اور باغ کے سارے آوارہ بلیوں اور کتوں کو ناشتہ کراتی پھرتی ہیں۔ پھر کوّوں کو دانہ ڈالتی ہیں۔ گھر واپس آ کر ریحان کی بیوی سے جھائیں جھائیں کرتی ہیں۔ ریحان عموماً گھر سے باہر رہتے ہی

واٹ اے لائف۔"

جہاں آرا نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور اٹھ کر مغرب کی نماز کے لئے اندر چلی گئی۔ باورچی خانے کی طرف سے رابعہ آتی نظر آئی۔ ریحان کی چھوٹی بہن رابعہ جو اکمل کی شادی کے لئے اپنے گھر عظیم پورے سے

ز کے لئے ارجمند منزل آئی ہوئی تھی۔ وہ راج سنگھاسن کے پاس آکر کھڑی ہوئی۔ شفق رنگ پر نظر ڈالی اور کہا۔ "میں بھی نماز پڑھ آؤں۔ ناصرہ کو تمہارے پاس بھیجتی ہوں۔"

"ناصرہ نماز نہیں پڑھتی ـــ؟" دیپالی نے پوچھا۔

"نماز ـــ؟ وہ خدا ہی کو نہیں مانتی۔ وہ اپنے ماموں پر پڑی ہے۔ اللہ کی شان ہے۔ مولانا الدین احمد کا بیٹا اور نواسی دونوں ملحد"۔ رابعہ نے جواب دیا اور تیز تیز چلتی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئی۔ چند منٹ بعد اس کی لڑکی ناصرہ نجم السحر ارجمند منزل سے باہر آکر "راج سنگھاسن" پر ٹک گئی۔ حساس، ذہین چہرے والی بیس سالہ لڑکی تھی۔ اور ایک جوشیلی اسٹوڈنٹ لیڈر۔ لگ بھگ اسی یں نے انقلابی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ دیپالی نے سوچا۔ پچھلے ایک ہفتے میں دیپالی کی ناصرہ ت دوستی ہو گئی تھی۔ ناصرہ اسے ایسٹ پاکستان کی پیچیدہ سیاست کے قصے سناتی رہی تھی۔ مولانا نی کی عوامی لیگ۔ باریسال اور کھلنا کے قحط۔ جیسور کی زرعی تبھاگا تحریک۔ پولیس فائرنگ۔ کا ایجی ٹیشن۔ پولیس فائرنگ۔ مظاہرے۔ آدم جی جوٹ مل کا فساد۔ عوامی محاذ۔ جیل یاترائیں۔ بنگال ست کا پرانا نقشہ۔ ادھر مغربی بنگال میں بھی تقریباً یہی سب ہو رہا تھا۔

"میں تمہارے ماموں کے متعلق تمہاری جہاں آرا خالہ کو بتا رہی تھی۔" دیپالی نے کہا۔

"مجھے ان کے متعلق سب معلوم ہے۔" ناصرہ نے ناگواری سے جواب دیا۔ "امی اپنے بھائی کو ہمیشہ یڈیلائیز کرتی رہی ہیں۔ اور جہاں آرا خالہ بھی۔ اور شاید ـــ اور شاید ـــ آپ بھی۔ مگر ہم لوگ آپ سے زیادہ تیز فہم ہیں۔ ہم کھرا کھوٹا پہچان لیتے ہیں۔ ماموں جان۔ کیا خوب چیز ہیں۔ مکمل آدرش وادی۔ مجسم نل گڈ دل۔ آج پراگ میں ہیں۔ کل قاہرہ۔ پرسوں نیویارک۔ آج اس پولیٹیکل پارٹی میں ہیں کل اس جہاں منسٹر بننے کے مواقع زیادہ نظر آئیں۔ ادھر کو لڑھک گئے۔ ماسکو اور واشنگٹن دونوں کے خیر خواہ۔ یر جانبداری اسے کہتے ہیں۔"

"ناصرہ ـــ" دیپالی نے رسانیت سے کہا۔ "کل کے باغی آج کے اسٹیبلشمنٹ میں شامل ہو چکے تم آج کی باغی ہو۔ ممکن ہے تم کل کے اسٹیبلشمنٹ میں شامل ہو جاؤ۔"

ناصرہ نجم السحر استہزا کے ساتھ ہنسی۔

"دیپالی آنٹی ـــ معاف کیجئے گا آپ عمر کی اس اسٹیج پر پہنچ چکی ہیں جہاں انسان CYNICISM

کو ایک دفاعی ہتھیار۔ ایک زرہ بکتر کی طرح استعمال کرتا ہے۔ اس کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔"
دیپالی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے کہا: "ناصرہ ڈیر۔ تم نے ایلس ان ونڈر لینڈ پڑھی ہے؟ ا
کی وہ نظم یاد ہے —

YOU ARE OLD FATHER
WILLIAM, THE
YOUNG MAN SAID
AND YOUR HAIR HAS
BECOME VERY
WHITE
AND YET YOU INCESSANTLY
STAND ON YOUR
HEAD —
DO YOU THINK, AT
YOUR AGE
IT IS RIGHT?

ناصرہ بھی ہنسنے لگی۔ اور بولی — "یہ بات تو آپ کے پنڈت نہرو سے کہنی چاہیے"
مالا اندر سے قہوے کی ٹرے لے کر آئی اور اسے تخت پر رکھ دیا۔ اس کے واپس جانے کے بعد
دیپالی نے کہا۔ "ناصرہ۔ تم جہاں آرا سے ملتی رہا کرو۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ وہ بیحد تنہا ہے۔ نیّرالزما
کی بیوی سے اس کی نہیں بنتی۔ دینا ج پور اپنی سسرال میں اب وہ رہنا نہیں چاہتی۔ ماں مر گئیں۔ دو جوا
بہنوں کی خوفناک موت کا غم سہہ چکی ہے۔ باپ چراغ سحری ہیں۔ اور وہ اُن سے ہمیشہ سے خائف ر
ہے۔ شوہر مر گیا — جیسا کچھ بھی تھا۔ اب لڑکے نے اپنا گھر بسا لیا۔ وہ کتنی اکیلی ہے —"
"ہوں گی۔ مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اکمل مجھ سے شادی کرنا چاہ
تھا؟ مجھے بھی وہ بیحد پسند تھا۔ مگر میرے باپ معمولی آدمی ہیں۔ کلاس ٹو افسر۔ ہم لوگ عظیم لوے

بہت معمولی سرکاری فلیٹ میں رہتے ہیں۔ ہماری کوئی سماجی حیثیت نہیں۔ جہاں آرا، خالہ اپنے اکلوتے ں خواہش رد کر کے ایک کروڑ پتی انڈسٹریلسٹ کی لڑکی بیاہ لائیں۔ یہ طبقہ ناقابل معافی ہے — جب میں پیدا ئی تھی جہاں آرا خالہ نے میرے بڑے چاؤ چونچلے کیے تھے۔ میرا نام نجم السحر انہوں نے ہی رکھا تھا۔ امّی کو بنا کر دیتی تھیں۔ گویا ہماری سرپرستی کرتی تھیں۔ ہم لوگ ان کے POOR RELATIVES تھے۔" ب بپھر کر اس نے ایک کنکر اٹھایا اسے زور سے تالاب میں پھینکا اور بات جاری رکھی۔— "اور یہ نواب ان۔ ہمارے نانا — یہ اب تک اس تگڑم میں رہے ہیں کہ ان کو مرکزی کابینہ میں لے لیا جائے۔ ناکام رہے۔ زندگی ان کی سیاسی داؤ پیچ میں گزری۔ اولڈ گارڈ مسلم لیگی۔ جب یہاں زبان کا ایجی ٹیشن ہوا انہوں کی موافقت میں آواز اٹھائی۔ جلوس نعرے لگاتا یہاں ارجمند منزل کے پھاٹک پر آیا — اردو بھاشا ا— اردو بھاشا چولیے نا — یہ اپنی چھڑی ہاتھ میں لیے ترکی ٹوپی اوڑھے برآمدے میں جا کر چلّائے۔ ے لیے — ضرور چولیے۔ جلوس اتنا مشتعل ہوا کہ پتھراؤ کر دیا۔ بچ گئے۔ اب یہ ایک پولیٹیکل بیک ڈور فرسٹریٹیڈ۔ لیکن یاد رکھیے —" اس نے سنگھاسن پر سے اٹھ کر خطیبانہ انداز میں کہا۔ "یہ نہ سمجھیے ہم لوگ اردو امپیریلزم کے خلاف ہیں یا مغربی پاکستان جو ہمارا استحصال کر رہا ہے اس سے متنفر ہیں تو ر سے ہم انڈیا سے جا ملیں گے۔ ہرگز نہیں۔ جہاں انڈیا سے مقابلے کا سوال پیدا ہوا ہم پاکستان کی حفاظت یت کے لیے کٹ مریں گے۔ ہم بچے پاکستانی ہیں — اچھا دیپالی آنٹی۔ اب میں چلوں۔ کل آپ کو ایرپورٹ ے آجاؤں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اس وقت کہاں جا رہی ہو —؟"

"گھر — عظیم پورہ۔"

"تم شادی کے لیے یہاں ارجمند منزل میں نہیں ٹھہری ہو —؟"

"ہرگز نہیں۔ امّی آگئی ہیں۔ وہی ان لوگوں کی محبت میں گھلی جا رہی ہیں۔ میں روزانہ آپ سے ملنے جاتی تھی۔ اچھا خدا حافظ۔"

دیپالی اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ وہ روش پر سے گزر کر بسرعت پھاٹک کی طرف چلی گئی۔

نے رات کی تاریکی میں ڈوبی کائی آلود ارجمند منزل پر نظر ڈالی۔ اندر کمروں میں تیز روشنی ہو رہی تھی گہما گہمی۔ مہمانوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ دو دن بعد اکمل اپنی دلہن کے ساتھ مغربی پاکستان واپس

جانے والا تھا۔ وہ پشاور ایئر فورس اسٹیشن میں تعینات تھا۔ اپنی کزن ناصرہ کی طرح وہ بھی بڑا شدید قوم پاکستانی تھا۔ پاکستان کی دفاعی سرحدوں کا ایک فرض شناس جوشیلا، محب وطن ہوا باز۔

۳۷

شنکری کا ناچ

نئی دہلی۔
۳ اکتوبر ۱۹۶۵ء

مائی ڈیئر دیپالی

تمہارا خط آیا تھا۔ جلد جواب نہ دے سکی۔ اپنی شدید پریشانیوں اور فکروں میں مبتلا تھی۔ میرا کمل اب فوج میں لفٹنٹ ہے۔ وہ محاذ پر لڑ رہا تھا۔ خدا باپ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خیریت سے گھر آگیا۔ مگر ایک بری خبر سناتی ہوں۔ جہاں آرا کا بیٹا اکمل جموں پر بمباری کرتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر مجھے بالکل اتفاقیہ معلوم ہوئی۔ میں سوچ سکتی ہوں کہ جہاں آرا بے چاری کا کیا حال ہوگا۔ اس بے چاری کی شادی میں شرکت کے لئے پچھلے سال ہی وطن آئی تھیں۔

جب کمل اور اکمل پیدا ہوئے ہیں تو یاد نہیں کس نے یا تم نے یا میرے شوہر نے کہا تھا کہ کے پہلے اَ (अ) لگانے سے اس لفظ کی ضد بن جاتی ہے۔ سچ یہ نام ہی منحوس نکلا۔

موجودہ صورتِ حال میں جہاں آرا کو تعزیت کا خط لکھنا بھی ممکن نہیں۔ کیا قیامت ہے اور جہاں آرا ٹیگور کا "شنکری ناچے۔ اتی گمبھیر نیل اومبرے ڈمرو باجے" بہت گایا کرتی تھیں۔ بے چارہ اکمل مرشد زادہ نیل اومبر میں ڈمرو بجانے گیا اور اس کے اپنے پرخچے اڑ گئے۔ ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر تمہاری شنکری زوروں میں ناچ گئی۔ تم وہاں آرام سے بیٹھی ہو۔ خوش قسمت ہو۔ بچے ڈوڈو۔

بیرسٹر صاحب کو سلام۔

تمہاری
رو زی

۳۸

گُڈ لک ڈائری

م جنوری ۱۹۶۷ء ـــ ۱۶ر پوش ۱۳۷۳ء ـــ ۱۹ر رمضان ۱۳۸۶ھ ـــ ۱۸ر پوہ ۲۰۲۳ء

نام: یاسمین بلمونٹ

دفتر کا پتہ:۔

گھر کا پتہ:۔

ٹیلیفون نمبر:۔

کار نمبر:۔

ڈرائیونگ لائسنس نمبر:۔

ٹی۔ وی۔ لائسنس نمبر:۔

بینک اکاؤنٹ نمبر:۔

پاسپورٹ نمبر:۔

لائف انشورنس پالیسی:۔

بلڈ گروپ:۔

عینک نمبر:۔

آج سالِ نو ہے۔ اللہ کا نام لے کر اس نئی نویلی ڈائری کو شروع کرتی ہوں۔ جو ڈھاکہ سے کوئی آنے مجھے دے گیا ہے۔ نام ہے "گُڈ لک ڈائری" اس میں مَیں لکھ رہی ہوں۔ لہٰذا اس کا نام بَیڈ لک ڈائری چاہیے۔ توبہ۔ توبہ۔ یا اللہ میں تیری ناشکری نہیں کرتی۔ ہزاروں سے اچھی ہوں۔ توبہ۔ توبہ۔ اللہ ن کرنا۔ اللہ تجھ پر میرا سارا حال روشن ہے۔ میرے گناہوں کو معاف کرنا۔ تو غفور و رحیم ہے۔ میں نے افرمانیاں کیں۔ اپنے حافظ قرآن مولوی باپ کو صدمہ پہنچایا۔ اسٹیج پر ناچی گائی۔ مشرک سے بیاہ کیا۔ احائز نکاح ہی نہ تھا۔ بیٹی کو عیسائی بنوا دیا۔ اللہ میں تیرے غضب کے خوف سے تھر تھر کانپتی ہوں۔

مجھے عذاب قبر سے بچائیو۔ اللہ تجھے اپنے حبیبؐ کا واسطہ۔

آج سال نو ہے۔ میں نے سینئر مسز بلمونٹ کو ٹرنک کال کی تھی کہ نئے سال کی مبارکباد اپنی بیٹی دوں۔ معلوم ہوا دادی پوتی دونوں ماس کے لئے چرچ گئی ہوئی ہیں۔ اللہ مجھے معاف کرنا۔ اللہ میں اپنے حالا اپنی مجبوریوں کا شکار تھی۔ اللہ تو تو میرے سب مصائب یا مجبوریوں سے واقف ہے۔ پھر کبھی مجھے زرے گا ؟

ڈیر ڈائری۔ اس ملک کی عورتوں کے بھی خون سفید ہیں۔ شہرزاد بیمار پڑی ہے۔ بڑھیا مسز نے اسے ہسپتال میں ڈال دیا۔ اسے دیکھنے بھی نہیں جاتی۔ وہ گاؤں یہاں سے اتنی دور ہے۔ صبح کو ٹرین سے ج رات کو تھکن سے چور ٹرین سے لوٹو۔ صبح سویرے پھر فیکٹری وقت پر پہنچو۔ یہ بے کیفی مسلسل محنت، جا کی زندگی کب تک چلے گی۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے تمہارا دل کمزور ہے۔ ڈانس کرنا بالکل چھوڑ دو۔ میری بیٹی شہرزاد حسن کا اب پورا نام شہرزاد کرسٹینا جوزفین بلمونٹ ہے۔ مجھ سے کہتی ہے۔ اس کے دین میں احساس جر ور احساس گناہ کی شدت ہی بخشش کا باعث بنتی ہے۔ بہت سے راہب اپنی پیٹھ پر خود کوڑے لگا یں۔ تو کوڑے تو مجھے زندگی ہی لگا رہی ہے۔ اللہ میرے عیوب سے چشم پوشی کرے۔

ڈیر گڈ لک ڈائری۔ پرسوں شام میں شیری کو دیکھ کر ہسپتال سے باہر آئی۔ گاؤں کی خامو سڑک شدید بارش میں نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں بس اسٹاپ پر کھڑی ہو گئی۔ شیری مجھ سے بہ رکھائی سے پیش آئی تھی۔ شاید اس کی دادی نہیں چاہتی کہ میں اس سے زیادہ ملوں جلوں۔ شہرزاد ابھی ٹانگ برابر چھوکری ہے مگر اپنے باپ کی طرح بے رحم اور کائیاں اور دادی کی طرح سرد مزاج۔ وہ شاید یہ بھی نہیں چاہتی کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس کی ماں ایک کالی عورت ہے۔ اس کا اپنا رنگ سفید ہے۔ سبز آنکھیں۔ چوکلیٹ بال۔ اپنے حسین و جمیل باپ پر گئی ہے۔ وہ اپنے آپ کو دوغلا ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔ آج وہ مجھ صاف صاف کہہ رہی تھی "ممی تم بار بار ہر ہفتے مجھے دیکھنے اتنی دور سے کیوں آتی ہو۔ مت آیا کرو۔ میں اچھ ہوں۔" میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں باہر آ کر سنسان بس اسٹاپ پر کوچ کا انتظار کر رہی تھی۔ مینہ زیادہ تیزی سے ت لگا۔ بارش کے قطروں اور میرے آنسوؤں نے میرا چہرہ بھگو دیا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ اللہ اللہ کہتے ہوئے میں چہرے پر اوٹ کر کے ذرا پیچھے ۔اس اجنبی نے مجھے اللہ اللہ کہتے سن لیا۔ اُردو میں بڑے ہمدردی کے ساتھ دریافت کیا۔ "کیا آپ کا کوئی ز اس ہسپتال میں ہے؟"

میں نے جھجک کر اس کی صورت پر نظر ڈالی گورا چٹا، لمبا تڑنگا۔ پنجابی یا پٹھان۔ خاصا خوش شکل برساتی ھے۔ وہ بھی اسی کوچ کا منتظر تھا۔ اس کے دردمند لہجے کے یہ دو بول سن کر میں جو اس وقت اس لمحے اس اتنی دنیا میں خود کو بالکل تنہا اور بے سہارا اور بے یار و مددگار محسوس کر رہی تھی مجھے ایسا لگا جیسے تاریک طوفانی رِ کی لہروں پر ایک روشن محفوظ نو کا اچانک نمودار ہو گئی۔ میں نے ممنونیت کے ساتھ اُسے جواب دیا۔ میری ہسپتال میں ہے۔ اچھی ہے۔ اگلے ہفتے اُسے ڈسچارج کر دیں گے۔

تو پھر میں اس بری طرح بلک بلک کر رد کیوں رہی تھی۔ اس نے وجہ نہ پوچھی۔ روشن کوچ سلیٹی دوں میں سے نمودار ہوئی۔ وہ میرے ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ راستے میں اس نے بتایا بیڈفرڈ سے آرہا یہاں پہنچ کر اس کی کار خراب ہو گئی۔ اُسے ایک گیراج میں چھوڑ اب بس پکڑ کر شہر جا رہا ہے۔ آبائی وطن ر۔ یہاں لاہور سے آیا ہے۔ بزنس کرتا ہے۔ باتوں سے اعلیٰ تعلیمیافتہ معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا آپ ہیں مگر اردو اتنی صاف کیسے بولتی ہیں اور وہ بھی پنجابی لہجے میں۔ میں نے بتایا میں برسوں سے لندن کی ایک گارمنٹ فیکٹری میں مزدوری کر رہی ہوں جہاں میری ساتھ والیاں سب پنجابی عورتیں ہیں۔ جی ہاں۔ میں ہوں لیکن ہول سیل قمیص سیتی ہوں۔ ناکام ڈانسر۔

ڈیر گڈ لک ڈائری۔ آج شام میں اور مقبول دیر تک ہیمپٹن کورٹ کے باغات میں ٹہلتے رہے۔ ا تھا عنقریب بارنز میں ایک بہت بڑا مکان خریدنے والا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا۔ مگر کو اشارہ کافی ہے۔

مقبول کہتا ہے میں فیکٹری میں مزدوری کرنا چھوڑ دوں اور اس کی فرم میں کام کروں۔ چار گنی زیادہ تنخواہ لے کیوں دل گوارا نہیں کرتا۔ میں اس کی احسان مند نہیں ہونا چاہتی۔ ابھی وہ میری بہت عزت کرتا ہے بہت ڈ سے ملتا ہے۔ پھر میں اس کی ملازم ہو جاؤں گی اور وہ میرا آقا۔ نہیں۔ یہ بات غلط ہو گی۔ ہے نا اللہ؟

تو مجھے صراطِ مستقیم پر چلائے جائیو۔ آمین۔

جب شہرزاد چھوٹی سی تھی۔ میں اور جیرلڈ چیلسی کی ایک میوز میں رہتے تھے۔ ٹیلی ویژن پر ایک AUTUMN CROCUS دیکھا تھا۔ ایک غریب اسکول ٹیچر جس کی زندگی میں کوئی رنگ اسپنسٹر۔ کم مایہ۔ وہ پیسہ جوڑ کر چھٹی گزارنے سوئٹزرلینڈ جاتی ہے۔ وہاں اسے ایک بڑا دلآویز سا شخ ملتا ہے۔ نہایت اداس۔ ہلکا پھلکا غمناک سا رومانس۔ چھٹیاں ختم ہوتی ہیں۔ وہ آدمی اپنے ملک چلا ہے۔ اسکول ٹیچر اپنی اجاڑ زندگی میں واپس انگلستان آجاتی ہے۔

بڑھیا مسز بلمونٹ نے آج تک مجھے اپنے گھر نہیں بلایا۔ حرامزادی۔

شہرزاد کہتی ہے بہت خوبصورت دو منزلہ مکان ہے۔ بہت بڑا باغ۔ بڑھیا اپنی جوانی میں ونڈمل میں بھی ناچ چکی ہے۔ بہت دولت مند ہے۔ شیری اسی لئے اس کی خوشامد میں لگی رہتی ہے۔ اور کوئی رشتہ دا نہیں۔ بڑھیا اپنے اکلوتے لڑکے جیرلڈ کو عاق کر چکی ہے۔ شہرزاد نے آج تک مجھے کوئی معمولی سا تحفہ خرید کر نہیں دیا۔ ہاں پچھلی کرسمس پر ایک ہینڈ بیگ لے آئی تھی۔ سال میں ایک دو بار مجھ سے مل خیر۔ خدا اسے خوش رکھے۔ ابا مجھے عاق کر چکے ہیں۔ دوسرے رشتہ داروں نے مجھے بھلا دیا۔ شاید و میرا ذکر بھی کرتے ہوں گے تو اس طرح کہ چل پائے گوری کے مولویوں کے خاندان کی لڑکی اور آوارہ نکل خاندان کی ناک کٹا دی۔ خیر میرا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ میرے ہم وطن جب کبھی یہاں ملتے ہیں خصو ڈھاکے والے بڑے جوش سے کہتے ہیں۔ کراچی آجائیے۔ آپ کے لئے حکومت ڈانس اکیڈمی بنا دے گی۔ م نے اس کے لئے خط و کتابت شروع کی۔ وہاں سے کوئی جواب ہی نہ آیا۔ میں بہت کمزور، بہت غیر اہم معمولی ہستی ہوں۔ کون میری سنے گا۔ وہ تو بالکل شروع شروع کی بات تھی۔ ایک بنگالی منسٹر کو خو کرنا تھا جس کی سفارش پر حکومت نے میرے فارن ٹور کا بندوبست کر دیا تھا۔ اس کے بعد ٹائیں ٹا۔

ڈیر ڈائری۔ دنیا بہت ہی ذلیل کمینی جگہ ہے۔ منسٹر ریحان الدین احمد کا رویہ دیکھا؟

فیکٹری میں میرے ساتھ کی دو پنجابی لڑکیاں بہت اچھی سنگرز ہیں۔ ان میں سے ایک نے مجھے خو

یز سکھائی ——

مرنے تے مینوں ہٹک نہ مُلّاں
مینوں مرن دا شوق مٹاون دے
کجری بیناں میری عزت نہ گھٹدی
مینوں نچ کے یار مناواں دے ——

لراچی میں بندر روڈ کے جگمگاتے اونچے فلیٹوں کے نیچے رات کے وقت ایک اندھا فقیر۔ سر پہ گول ٹوپی۔
ں انگلی تھامے آنکلتا۔ اور منہ اٹھا کر چلاتا —— اے غم کے مارو۔ خدا تمہارا غم دور کرے۔ اللہ فتح
ی دلدوز آواز میں گانے لگتا —— نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر۔ رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
ئیوں پہ جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا ——

ار ۳۰ر جولائی ۱۹۶۷ء ۲۱ر ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ ۱۵ر ساون ۲۰۲۴
۱۳۷۴

لک ڈائری۔ اس برس کے بھی سات مہینے نکل گئے۔ اور ایک اکیلا تنہا انسان اور اتنے سارے
ں گھرا ہوا ہے۔ کیوں؟ مسیحی۔ اسلامی۔ بنگالی۔ بکرمی۔ اور شاید ایرانیوں کا ایک اور کیلنڈر
اس ڈائری کے چھاپنے والوں نے ایرانی کیلنڈر بھی کیوں نہ شامل کر دیا۔ ذرا وقت کا کنفیوژن

ی رے۔ اور رنگین کشتی والے ملاح۔ کشتی موڑ لے۔ اس گھاٹ سے لگا دے۔ یہ ندی کب تک
گی۔ اس ناؤ کو کب تک کھینا ہے۔ کس دھن میں شام سویرے کس دھن میں چلا جاتا ہے۔ تیرے
بچھے ہیں۔ بھائی مانجھی۔ کیا اس دریا کا کوئی انت نہیں۔ اس کا کوئی سرا نہیں او مانجھی رے۔

مانجھی رے بھائی۔ اب ہاتھ تھک گئے۔ کشتی کھینے کی اب سکت نہیں۔ میں نے دریا کے مخالف

ہمت بھی چپّو چلائے۔ پر اب ہمت نہیں۔ او مانجھی رے۔

یہ سارے بھٹیالی گیت بار بار یاد آتے ہیں۔ میرے دکھی مظلوم خوبصورت دیس کے ملاحو
لدروز گیت۔ کیا میں کبھی واپس جا سکوں گی؟

آج میں نے دیپالی کو خط لکھا۔

روزی۔ اپنے میاں اور چاروں بچوں کے ساتھ مغرب کی سیاحت پر نکلی ہے۔ کیا
میں نے اسے نہیں بتایا کہاں رہتی ہوں۔ کیا کرتی ہوں۔ شام کو ان کے ساتھ جا کر پکیڈلی میں کھانا
لامحالہ پرانے دنوں کا ذکر نکلا جب روزی اور دیپالی انڈر گراؤنڈ انقلابی ورکرز تھیں۔ روزی
ساتھ اُن کے ہندوستانی میزبان کے لڑکے لڑکیاں بھی تھے۔ میں نے ذکر کیا اسکول میں ہم لو
تھی کہ پرتی لتا، کلپنا دت اور کنک لتا بروا کی طرح کی ہیروئن بنیں تو روزی کے میزبان کی لڑکی نے
یہ لوگ آپ کے زمانے کی فلم اسٹار تھیں؟

"کافکا کہتا ہے کہ بعض الفاظ کا مطلب محض اپنے زخموں کے ذریعے ہی سمجھ میں آتا۔
نے بھی ایسا ہی بولا۔"

"اوہ گوڈ۔ کیپ کوائٹ یاسمین یو آر کریزی۔ ڈونٹ ڈسٹرب می۔ میں اپنی کمپنی کے کاغذ

"چھُن چھَن چھُن۔۔ اچھا۔ سنو۔ ایک پولش رائیٹر نے کہا ——"

"ہیں۔ تم نے پھر ناچ شروع کر دیا۔ ڈاکٹر نے تم کو منع کیا ہے۔"

"مینوں رج کے یار منا دلں دے —— ہاہاہا۔"

"فور گوڈز سیک۔ گھنگرو اتارو۔ ڈاکٹر کا حکم مانو۔"

سنو پولش رائیٹر نے کہا ہے۔ انسان کی روح جو سات تالوں میں بند ہے اس میں ا
کیشر۔۔ بتاؤں۔ سن رہے ہو——"

"بکو ___"

"ایک پوشیدہ گوشہ ہے۔ جس کو صرف مصائب کی کنجی ہی کھول سکتی ہے۔ اور اس گوشہ میں
ت اور افضل ترین فہم اور ادراک چھپا ہوتا ہے ___ اور مقبول ایک جگہ میں نے لکھا دیکھا ہے کہ جب
ھتی میں نے خدا کو دیکھا۔"

"اور بکو۔"

"اور جب ہم اپنی مسرت کے بارے میں سوچتے ہیں اس وقت ہمارا تخیل بچے کے تجسس کی طرح
ور معصوم ہوتا ہے ___ اور یہ بھی کہ ہم جس دریچے میں کھڑے ہوتے اس کے سامنے کا منظر ہماری
ہوتا ___"

"اور ٹیگور ایسا بول گیا ہے کہ یاد مندر کی وہ پجارن ہے جو حال کو مار کر اس کا دل مردہ ماضی کے سامنے
رتی ہے۔"

"اور کیا کیا بول گیا ہے، تمہارے ٹیگور نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"چھن چھن چھن ___

جو پہرا دے سو ہی پہنوں
جو دے سو ہی کھاؤں ___
جہاں بٹھا دے تاں ہی بیٹھوں ___
سے یو لومی۔" میں نے التجا کی۔

"آئی لو یو" اس نے جواب دیا۔

مقبول اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گھڑی دیکھی اور کہا اسے ضروری کام سے جانا ہے۔ خدا حافظ
باہر گیا کار میں بیٹھا اور چلا گیا۔ مقبول ایک سیلف میڈ بے حد دولتمند کاروباری ہے اور عموماً سیلف
امیاب لوگ خود غرض ایگو سنٹرک اور خود پسند اور مغرور ہوتے ہیں۔ وہ بھی ایگو سنٹرک، خود پسند اور مغرور
مگر بہت سی چیزوں میں اصول پرست اور راستباز۔

وہ اپنی ایک کتاب میرے کمرے میں بھول گیا تھا۔ میں نے کتاب اٹھائی کہ سنبھال کر رکھ دوں جب دوبارہ
ے دوں گی۔ کتاب میں سے ایک کھلا خط سرک کر نیچے گر گیا۔ زنانہ کچی اردو تحریر۔

ڈیئر بیڈ لک ڈائری۔ میں نے وہ خط پڑھا:

میرے پیارے خاوند عالی جناب خان مقبول احمد خان صاحب۔ کنیز دست بستہ آداب بجال ہے اور عرض کرتی ہے کہ واضح ہو کہ منیارڈر موصول ہوا۔ میں خیریت سے ہوں۔ بچے بھی خیریت سے اور آپ کو یاد کرتے ہیں گے۔ دیگر یہ کہ آپ کو ولایت گئے بہت برس ہو گئے۔ اب آکر اپنی پیار دکھا جائیے یا ہم لوگوں کو وہاں جلد از جلد کر کے بلا لیجیے۔ اپنی ہیلتھ کا خیال رکھیں۔ مکرمہ ساس صاح مکرم سسر صاحب آپ کو دعا لکھواتے ہیں۔ پیاری نند شاہدہ خاتون سلام عرض کرتی ہے۔ باقی ہر دم آپ کو یاد کرنے والی

آپ کی

ناچیز زوجہ میمونہ سلطان

آج بتاریخ ۹ ستمبر بمقام لاہور ت پوسٹ کیا۔

اصول پرست راست باز خان مقبول احمد خاں صاحب۔ عالی جناب خان صاحب۔ تم بھی

---

۳ اکتوبر۔ گہری رات۔ الو کی آنکھ۔ بلی کی آنکھ۔ چیتے کی آنکھ۔ برہن کی آنکھ۔ خاموشی سو رہی زرد خزاں ایک ایسی کمزور بے بس عورت ہے جس کا آدمی اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہو۔ میمونہ سلطان خزاں ہری مٹی کا یا جانے کس کا دلآری کا ایک بہت پرانا گھسا پٹا ریکارڈ ارجمند منزل میں موجود تھا۔ ا جہاں آرا آپا اسے اکثر بجایا کرتی تھیں۔ جل جانے دو۔ جل جانے دو اس دنیا کو۔ یاں کوئی کس کا یار نہیں۔

تم بھی غم مت کرو میمونہ سلطان۔ اے گم کے مارو گم مت کرو۔

ڈیئر ڈائری۔ میں نے ابھی ابھی طے کیا ہے۔ کل گارمنٹ فیکٹری کے سالانہ جلسے میں خوب ناچوا گی۔

WHAT THE BLOODY HELL

ڈیئر ڈائری۔ تم تو وہی سن سرسٹھ کی پرانی ڈائری ہو۔ آج میں نے اتنے برسوں بعد الماری کے نچلے خان

ں تم کو پڑھا پایا ۳۱ر اکتوبر کے بعد سارے ورق سادے۔ کیا ہوا تھا؟ ہارٹ اٹیک۔ طویل بیماری پھر DOLE جینا۔ شہزادہ موڈلنگ کر رہی ہے۔ کبھی دیکھنے بھی نہیں آتی۔ روزی، دیپالی کسی کو میں خط نہیں لکھتی یا لکھوں اپنی ساس کا سر؟ مقبول نے اچانک ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ ایک دائم المریض عورت کے ساتھ کون بنا وقت خراب کرے۔ سنا ہے ایک حسین انگریز لڑکی اس کے ساتھ رہتی ہے۔

اور جب تم گئے تو میں نے دیکھا کہ خدا کے پاؤں کے نشان فرش پر بنے تھے۔ ٹیگور نے کہا تھا۔ ہا ہا ہا
ریفنی۔

BUT WHEN THE NIGHT IS
ON THE HILLS, AND THE
GREAT VOICES
ROLL IN FROM THE SEA,
BY STARLIGHT AND BY
CANDLELIGHT HE COMES
BACK TO ME

دھت۔

نادر دام تانا دی رے نا۔ نادر دام تا نا دی رے نا۔

شیری کا باپ جیرلڈ بلمونٹ ایک GAY LIB رسالے کا اسسٹنٹ اڈیٹر ہو گیا ہے۔ سنا ہے اب ایک جرمن لڑکا اس کے ساتھ رہتا ہے۔ زندگی بڑی ڈرائونی چیز ہے۔ بھیانک۔

ڈیر گڈ لک ڈائری۔ آج صبح برسوں بعد مقبول نے فون کیا۔ بڑی دردمندی سے کہا اگر مجھے ملازمت کی ضرورت ہو۔ ہیمبرگ میں اپنی برانچ میں ہلکا پھلکا ریسپشنسٹ کا کام دیدے گا۔ جس میں مجھے محنت نہ کرنی پڑے۔ میں نے یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کیا۔

ڈیر بیڈ لک ڈائری۔ آج میں خود مقبول کے دفتر گئی تھی۔ وقت مغرور انسانوں کو بھکاری بنا دیتا ہے۔ میں نے

اس سے کہا مجھے وہ جرمنی والی نوکری دیدے۔ بڑے اخلاق سے ملا۔ میرے متعلق خاصا متفکر نظر آتا تھا۔ ا مہینے سے انشاء اللہ میں ہیمبرگ میں کام شروع کردوں گی۔ شہزاد لاپتہ ہے۔ شاید امریکہ چلی گئی۔ باہر برف مو کی طرح گر رہی ہے۔ پرسوں کرسمس ہے۔ میرے ساتھ کرسمس منانے والا کون ہے۔ چچا سارتر نے سچ کہا ہے۔ جہنم دوسرے لوگ ہیں HELL IS OTHER PEOPLE

کرشن چتر دشی میں ___ اندھیری رات میں ایک بار میں دیپالی کے ساتھ پدما پر گئی تھی۔ وہاں دیپالی نے ہم سب کے نام کے چراغ جلا کر پتوں کی کشتیاں بنا کر ان میں رکھے تھے اور ان کو پانی میں چھوڑ دیا تھا۔ وہ چراغ پانی پر بہتے کچھ دور جا کر گھپ اندھیرے میں کھو گئے تھے۔

ریحان الدین احمد سنا ہے۔ کلکتہ سے ڈھاکے واپس چلے گئے۔ انڈیا میں دال زیادہ نہیں گلی۔ اب واپس ڈھاکہ میں بھی منسٹر نہ ہو جائیں تو میرا نام بدل دینا۔ یوگ پرسنلٹی چینج کی بات کرتے ہیں۔

" اور میں تو ایسی رحمدل تھی کہ کتوں بلیوں بے عقل چڑیوں تک کی دل آزاری نہ کرتی تھی۔ لوگوں نے مجھے اتنے دکھ کیوں دیئے؟ "

"MUSIC IN WHERE YOU HEAR IT"

گارمنٹ فیکٹری میں میری سکھ رفیق کار منجیت کور بڑے جذبے سے گایا کرتی تھی ___ اک بار جو ترے در آوے۔ وہ بھوساگر توں تر جاوے۔ ہن آجا عرشاں والیا ___

جانے وہ ہے بھی کہ نہیں۔ اب ذرا ذرا شبہ ہو چلا ہے

"LOVE IS THE STATE
OF TOTAL SECURITY
NON-LOVE IS THE
STATE OF TOTAL ABSENCE"

ڈیر گڈ لک ڈائری۔ کل مقبول آیا تھا۔ بہت دیر بیٹھا رہا۔ کہنے لگا میمونہ سلطان پیدائشی IMBEC ہے۔ چچا کی لڑکی تھی اس لئے نوعمری میں اس سے شادی کر دی گئی تھی۔ اسی وجہ سے اس کے ساتھ کبھی زیادہ نہیں رہا۔ اب تک وہ اپنی بزنس پھیلانے میں مصروف تھا۔ اسلام میں چار زہیں۔ کیا میں —— ؟

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

"میں جلد سب معاملات طے کرتا ہوں"

"وہ بارنز والا مکان —— ؟"

"اس سے زیادہ بڑا اور زیادہ شاندار گروزنر اسکوائر میں۔"

اس کے بعد سے وہ پھر غائب ہے —— او مانجھی رے۔ افسوس کہ یہ ناؤ بھی۔

میمبرگ برانچ کا منیجر پنجابی ہے۔ جب سے بنگلہ دیش وار چھڑی ہے مجھے طعنے دیتا رہتا ہے۔ میں چپ تی ہوں۔ جواب دے کر کہاں جاؤں گی۔ زمانہ انسان کو بزدل اور مصلحت پسند بھی بنا دیتا ہے۔ کل معلوم ہوا بول کی بہن بہنوئی اور دو بھائی سب کے سب دوسرے "بہاریوں" کے ساتھ چٹا گانگ میں مارے گئے نا ہے مقبول کا صدمے کی وجہ سے نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ مجھے اپنے گھر والوں کی خیریت معلوم ہیں، اس کالی آندھی میں کس سے معلوم کرواؤں۔ آج صبح یہاں کے سابق مشرقی پاکستانی حال بنگلہ شیوں کا ایک گروہ میرے پاس آیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں فوراً اس دفتر میں کام کرنا وڑ دوں۔ کیونکہ مقبول پاکستانی ہے۔ میں نے کہا پہلے ہم ہندوؤں کے خلاف تھے۔ اس لیے پاکستان ایا۔ کیا مقبول مسلمان نہیں ہے؟ مگر وہ پاکستانی ہے۔ اور اگر میں یہاں کام کروں تو غدار۔ پھر ں جاؤں۔ دوسری ملازمت مجھے آسانی سے نہیں ملے گی۔ میرے پاس کوئی اکیڈمک کوالیفیکیشن نہ ہے۔ میں نے محض رقص میں مہارت حاصل کی تھی۔ میرے ہم وطن لڑ جھگڑ کر چلے گئے۔

آج صبح پنجابی منیجر نے مجھے خود ہی نوٹس دیدیا۔ میں نے مقبول کو ٹرنک کال کیا۔ وہ کراچی گیا ہوا
اب میں پھر ڈول پر جاتی ہوں۔

ہندو بنگالیوں کے ہاں کالی اور مہادیو کا تصور لرزہ خیز ہے۔ تخریب۔ سنسنی۔ قہر۔ بلا۔ بھینکر اندھیکار۔ خون۔ قیامت۔ دیپالی کی پھوپھی بھوتارنی دیبی چندر گنج میں بڑی عقیدت سے جھوم کر ایک ہندی کیرتن گاتی تھیں۔

اگڑ دم بگڑ دم باجے ڈمرو۔ ناچے سدا شو جگت گرو
برہما ناچے وشنو ناچے ناچے مہادیو
کھپڑلے کے کالی ناچے ناچے چاروں دیو
کھپڑلے کے کالی ناچے۔ کھپڑلے کے کالی ناچے۔

نذر الاسلام کو کالی کے اس تصور نے کتنا فینسی نیٹ کیا تھا۔ کھپڑلے کے ــــ آتش نوا نذرل کا بنگال اس وقت آگ اور خون میں ڈوب گیا۔ یہ جملہ بھی ڈیر ڈائری ایک کلیہ بن چکا ہے۔ اور کلیشے میں تبدیل ہو کر الفاظ اپنی معنویت اور اہمیت کھو دیتے ہیں۔

چار سال گذر گئے۔ چار سال سے میں منتظر ہوں۔ شاید ایک دفعہ مقبول کے دل میں پھر ہنکی آجا
در وہ یاد کر لے۔ لیکن اب ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ وہ خود گروونر اسکوائر میں منتقل ہو چکا ہے۔ میں یہاں ا
نک میں شہر بہ شہر ادنیٰ ترین نوکریاں کرتی پھر رہی ہوں۔ مزدور طبقہ کے ترکوں اور ایشیائیوں کی بھیڑ میں شا
ہم وطن اعلیٰ مرتبت بنگلہ دیشی یہاں ملتے ہیں کنی کترا کے نکل جاتے ہیں کہ شاید میں اُن سے امداد کے لئے کہو
زیادہ تر نئی جنریشن والے تو مجھے پہچانتے ہی نہیں۔ انہوں نے میرا نام تک نہیں سنا۔ پرانی نسل والوں کے
میں اب ایک EMBARRASSMANT ہوں۔ چند ایک نے مجھے سٹرن مشہور کر دیا ہے۔ کیا وا
میرا کریک اَپ ہوتا جا رہا ہے؟ برتن دھو چکنے کے بعد رات گئے تک، جب تک ریسٹوران خالی نہیں ہو
ایک کونے میں تنہا بیٹھی سڑک کو تکتی، لگاتار سگریٹ پیتی مغربی پوشاک میں ملبوس سانولی عورت۔ خالص
انتظار۔ کچھ نہ ہونے کا انتظار۔ کیا مقبول اب بھی سامنے سڑک کے دھندلکے میں سے نمودار ہو سکتا ہے؟
ناممکن۔ اب یہ کیسے ممکن ہے۔

اسی طرح میں ایک روز ایک گوشہ میں بیٹھی سیاہ قہوہ پی رہی تھی۔ ایک خوفناک بوڑھے گلف
عرب نے دور سے مجھے نوٹوں کی گڈی دکھائی۔ اس رات سے میں نے طعام خانے میں بیٹھ کر سڑک کو تکنا

چھوڑ دیا۔

رات آئینے میں مجھے اپنا عکس نظر نہیں آیا۔

کل میں فرینک فرٹ جا رہی ہوں۔

فرینک فرٹ۔ ۴ جنوری۔ آج میں نے بنگلہ میں ایک ایسا سیاہ پوش FUGUE لکھا ہے کہ مار رکھا
ہم دیکھ لے تو جلو نہر پانی۔ INDIAN MODE PURAVI - SAD EVENING MELODY.
OVERTUR — وہ دیکھو دریا سے کہرہ اٹھا۔ غبار تاروں کا اُڑ رہا ہے۔
BAS — اکھنڈروں کے دھندلکوں میں الم کے مغنی پکارتے ہیں کہ وقت نے صرف غم دیا ہے کہ وقت
نے صرف۔ وقت نے۔
POIN — ہمیں یقین تھا کہ روز فردا کرن کرن دل میں آ بسے گا۔ کیا کرے گا جہاں کو روشن۔
COUNTERPOI — الم کے ساتھی سیاہ کپڑوں میں، بیدلی کے علم اٹھائے یوں نوحہ زن ہیں۔ یہ وقت
ب وبلا ہے آؤ۔ جھکاؤ سر، آنسوؤں کے دریئے بہاؤ یہ وادیٔ محن ہے۔
BAS — جنازے واپس گھروں کو آئے۔ جنازے واپس۔ جنازے واپس

بکواس۔ مورہا بکواس۔ اد۔ کے۔ میں MODE بسنت میں موسم بہار کا بیلے کریوگراف کرتی ہے
سخت کرو، دل سخت کرو، اسی طرح زندہ رہنا ممکن۔
یہ جتنے لوگ سامنے ہم ہوا ت استراسر پر اس وقت چل رہے ہیں، یہ دراصل کسی قبرستان، کسی
یوریم کی سمت قدم بڑھا رہے ہیں۔ جتنے لوگ زندہ ہیں سب POTENTIAL لاشیں ہیں۔ میرے

اس میٹے ہاؤس میں جتنے لوگ مقیم ہیں سب فانی ۔

۲۴ جنوری ۔ فرینک فرٹ میں کام نہیں بنا ۔ واپس ہمبرگ ۔

اب دریا اور سمندر برف سے ملتے ہیں ۔

اللہ ۔ میں ترے اسرار سمجھنے سے انکار کرتی ہوں ۔ میں تیرے قہر اور ترے جلال اور تیرے غضب کے آگے ایک ذلیل کتیا کی طرح لرزاں ہوں ۔ سزائے موت کے قیدی کے مانند جو جلاد کی دستک کا منتظر ہو خداوندا میں تیرے سامنے حاضر ہوں ۔

میرا دل ۔ جو کالی کا مندر ہے جس میں خلقت اٹاٹوٹ گھسی ہوئی ہے ۔ جس کے تنگ صحن بکری کے بچوں کا سر کلہاڑی سے جدا کیا جاتا ہے ۔ کالی کی تین سرخ آنکھیں سامنے دیکھ رہی ہیں جدھر جھن ہے ۔ کالی کی مورتی کلکتہ کی کالی ماٹی میں سولہ سو سال سے زمین میں آدھی دھنسی ہوئی ہے ۔ آدھی دفن ہے ۔ عورت کی طرح جو ہمیشہ آدھی دفن رہتی ہے ۔ اور کالی کے مندر کے فرش پر کتوں کے پلّے لوٹتے پھر رہے ہیں عورتیں بکروں کا سرخ سرخ گوشت کاٹ رہی ہیں ۔ میرا دل سوناگاچی کی تاریک گلی ہے جس میں میری آرزوئیں میری پشیمانیاں میری حسرتیں پاؤڈر سے لپی پتی سستی ساڑیوں میں، کونوں کھدروں میں، غلیظ دیوا سے لگی کھڑی ہیں اور آنے والوں کو تک رہی ہیں ۔ ہر آرزو یہ سوچتی ہے ۔ اب کا آنے والا مکتی لائے گا ۔ او اس گلی سے نکال لے جائے گا ۔

اب سارے دروازے مقفل ہیں ۔

گلی تو چاروں طرف سے بند ہوئی ۔ میں ہری ملن کیسے جاؤں ۔

جب فون کی گھنٹی بجتی ہے دل لرزتا ہے ۔ شاید مقبول نے فون کیا ہو ۔ شاید شہزاد نے فو کیا ہو ۔ اس لمحے سے میری عقوبتوں میں اضافہ ہوگا ۔ میرا ان دیکھا عقوبت رسان مجھے مرتے دم تک کوڑ مارتا رہے گا ۔ خداوندا تو جو رحیم و کریم ہے تو نے مجھے اس لئے پیدا کیا کہ میں اس طرح زندہ رہوں — اور جانے کس طرح مروں گی — ؟ میری زندگی میں او خدائے ذوالجلال تو خوب جانتا ہے کہ بیشتر وقت ایسے آئے ہیں جب میں نے کہا ہے یہ میری زندگی کا بدترین ۔ خوفناک ترین لمحہ ہے ۔ اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ ابھی بھی اس سے کہیں زیادہ برے وقت آنے باقی ہیں ۔ میرا خدا میرے دشمنوں کے سامنے میرا سر جھکا

ڈیر بیڈ لک ڈائری ۔ میرا کریک اپ ہوتا جا رہا ہے ۔ کیا مجھے پرسیکیوشن کومپلیکس ہو گیا ہے

مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں ——
او مانجھی رے۔ اپنی پتوار الگ رکھ دو۔ تمہاری ناؤ ٹوٹ چکی۔ جانے کا وقت آ گیا۔

"آخری نقطہ نظر کے آگے اور کوئی منظر نہیں ہے۔"

دوسرا ہارٹ اٹیک۔ میں نے ریحان الدین احمد کی بہن رابعہ آپا کو ان کے ڈھاکے کے پرانے پتے پر خط لکھا ہے۔ کہ اگر میں یہاں مر جاؤں تو میری غائبانہ نماز جنازہ ڈھاکے کی کسی مسجد میں ادا کروا دیں۔

کیا یہاں سب بدباطن ہیں بھرتری ہری نے لکھا تھا معصوم انسانوں کے لئے ہر جگہ بدباطن انسان موجود ہیں۔ سانپ کی طرح ایک آدمی کا کان چاٹنے کے لئے دوسرے کو ختم کر دیتا ہے۔ برے انسان پستی سے بلندی کی طرف ترقی کرتے ہیں۔ جس طرح شفاف پانی سانپ کے منہ میں پہنچ کر زہر بن جاتا ہے۔ اسی طرح معصوم آدمی کے الفاظ بدمعاش کے منہ میں پہنچ کر زہر بن جاتے ہیں۔ میں بدمعاشوں کے نشتروں کو ضبط کر کے ہنسا ہوں۔ کب تک؟ کب تک بھرتری ہری؟

کہیں میں نے یہ بھی پڑھا کہ دنیا THERMODYNAMICS کے دوسرے اصول پر عمل کر رہی ہے۔ کنفیوژن بڑھ رہا ہے۔ نظامِ عالم ختم ہو رہا ہے۔ دنیا اسی طرح بہت جلد نیست و نابود ہو جائے گی۔ سورج سرد پڑ جائے گا۔ مذہب کہتا ہے قیامت آئے گی۔ شاعر کہتا ہے۔ نہیں سب کچھ باقی رہے گا۔ انسانیت زندہ رہے گی۔ اللہ جانے۔

میں بہت وقار سے مرنا چاہتی ہوں۔

دکھ سکھ۔ جنون اور صحیح الدماغی۔ محبت اور نفرت۔ جنگ اور امن۔ غربت اور امارت۔ شکست اور فتح۔ شرافت اور رذالت۔ گناہ اور معصومیت۔ زندگی اور موت سب میں فقط بال برابر کا فرق ہے۔ پل کی پل میں انسان ادھر سے اُدھر ہو سکتا ہے۔

ڈیر گڈ لک ڈائری۔ کل رات میری بیٹی شہرزاد کی شکاگو سے ٹرنک کال آئی۔ میں گھر پہ نہ تھی۔ آج

وہ پھر فون کرے گی۔ بہت دنوں بعد اس کی آواز سنوں گی۔ میں بے انتہا مسرور

(ناتمام)

۳۹

شہزاد کرسٹینا بلمونٹ

ہیمبرگ۔ ۱۶؍جون

ڈیر مسز سین۔ آپ مجھے نہیں جانتیں لیکن میں نے اپنی ممی سے آپ کا ذکر بہت سنا ہے۔ آپ کو شاید اخباروں سے معلوم ہوا ہو۔ میری والدہ مادام یاسمین بلمونٹ ایک حادثے کا شکار ہو گئیں۔ ایلب کے کنارے کنارے جا رہی تھیں پاؤں پھسل گیا۔ میرا ذاتی خیال ہے وہ خود دریا کے اندر چلی گئیں۔ میں آپ سے واقف نہیں۔ ممی سے خاصی واقف تھی۔ میرا ذاتی خیال ہے آپ ٹیگور، گاندھی، سروجنی نائیڈو، نہرو وغیرہ کے پرستار لوگ خاصے کنفیوزڈ اور بھولے تھے۔ آپ لوگ اب COPE نہیں کر سکتے۔ COPE تو میں بھی نہیں کر رہی ہوں لیکن مجھے کوئی دعوے نہیں ہیں۔ آپ لوگوں کو (ممی سمیت) بہت دعوے تھے۔ میں جانتی ہوں میں ایک تیرتا ہوا تنکا، ہوا میں اڑتا ٹوٹا پر، یا چیونٹی یا کیچوے کی طرح بے بضاعت جاندار ہوں۔ زمان و مکان میں میری کوئی حیثیت نہیں۔ حیاتِ انسانی بالکل مہمل اور لایعنی ہے۔ یقیناً آپ کہیں گی میرے منفی بیمار خیالات مغربی یوروپین ڈیکیڈنس کا نتیجہ ہیں۔ یوں ہی سہی۔ آپ لوگوں کے مثبت، صحتمند، اعلیٰ روحانی خیالات کا کیا نتیجہ نکلا۔ بات یہ ہے مسز سین کہ میں ۲۴ چوبیس سال کی عمر میں آپ سے اور اپنی بے چاری رومینٹک غمزدہ آئیڈیلسٹ دکھی ممی سے کہیں زیادہ ہوشمند، تجربہ کار بلکہ خرانٹ ہوں۔ دنیا کا کوئی تجربہ پوچھیے ـــــ ذہنی۔ روحانی۔ جسمانی۔ وہ میں کر چکی ہوں۔ کسی سوامی، گرو، مرکرے یا ذکر کیجیے میں وہاں جا چکی ہوں۔ کسی خطرناک سے خطرناک منشیات کا نام لیجیے۔ خاکسار اس سے بہرہ ور ہو چکی ہے۔ اخلاقیات کا آپ لوگوں کا نسخہ بیکار ثابت ہوا۔ ممی کے ساتھ ٹریجڈی یہ ہوئی کہ وہ دو راہے کی تہذیب سے بنی تھیں۔ بنگالی، مسلمان، پاکستانی ہوتے ہوئے انہوں نے مغربی رویّے اپنانا چاہے۔ اندرونی روحانی تصادم شدید تھا۔ ممی اس کی تاب نہ لا سکیں اور ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ اب میں آپ کو اصل وجہ بتاتی ہوں وہ کیوں مریں۔

ھلے بیس بائیس سال سے مغرب میں کافی تنگی ترشی سے گذر کر رہی تھیں۔ مختلف کارخانوں میں مزدوری
رقص کا انٹرنیشنل کیرئیر بنانے میں ناکام رہیں۔ کیونکہ ڈانسر کی عمر دس سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔
صائب اور مایوسیوں نے ممّی کو قبل از وقت کمزور اور بوڑھا کر دیا۔ دل کا عارضہ لگ گیا۔ لیکن
وہ اس وجہ سے مریں کہ پچھلے دنوں میں نے ان کو شکاگو سے فون پر مطلع کیا کہ میری تصویر
وائے کے سنٹر اسپریڈ پر چھپنے والی ہے۔ میرے لئے یہ بڑے فخر کی بات تھی۔ بہت کم لڑکیاں
خوش نصیب ہیں جن کو یہ اعزاز میسّر ہو۔ میں نے ان کو بڑی مسرّت کے ساتھ شکاگو سے یہی
نے کے لیۓ ٹرنک کال کیا۔ جواباً وہ خوب چیخیں چلائیں اور ریسیور پٹخ دیا۔ چند روز بعد مجھے اُن
ادثے کی خبر ملی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کپڑے پہننے اور اتارنے اور جسم کی اناٹومی کو آپ
ں نے اتنی شدید اہمیت کیوں دے رکھی ہے۔ جنس کے بارے میں یہ سارے بے معنی اور لغو
یئے میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ بہرحال میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں اب اچھی خاصی کامیاب
ل ہوں۔ اور اب تک ہر نسل اور قوم کے اتنے آدمیوں کے ساتھ سو چکی ہوں کہ ان کی گنتی
مجھے یاد نہیں۔ اور ممّی بے چاری محض ایک عدد جیرلڈ ایڈرین بلمونٹ سے شادی کر کے بقیہ عمر
احساسِ جرم میں مبتلا رہیں کہ جس شخص سے ان کا "نکاح" غلط سلط پڑھا دیا گیا تھا۔ وہ تین سال
اس کے ساتھ رہیں۔ میرے والد سے علیحدگی کے بعد مجھے یقین ہے مرحومہ نے نہایت پاک دامنی
ندگی گزاری ہوگی۔ بے مصرف، بے کار، بے معنی زندگی۔ کتنا انمول وقت ضائع کیا بے چاری نے۔
وانی واپس نہیں آتی۔ انسان دنیا میں صرف ایک بار ہی آتا ہے۔

دوسرا "احساسِ جرم" ممی کو یہ تھا کہ انہوں نے اپنی اجازت سے مجھے رومن کیتھولک بنوا
۔ یہ سب میں آپ کو اس لئے لکھ رہی ہوں کہ میں پرسوں شکاگو سے یہاں آئی۔ ان کے کمرے میں ان کے
نے سے ایک ڈائری برآمد ہوئی کئی سال پرانی ڈائری ہے۔ جس میں وہ وقتاً فوقتاً لکھتی رہی تھیں۔
۔ بنگلہ۔ کہیں کہیں انگریزی۔ اس میں آپ کا نام اور پتہ بھی درج ہے۔ نہ مجھے بنگلا آتی ہے نہ اردو۔
کی پرانی دوست تھیں لہٰذا یہ بے چاری المناک ڈائری میں آپ کو بھیج رہی ہوں۔ میں امید کرتی ہوں
اسے ممّی کی یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھنا پسند کریں گی۔ میں ہوں آپ کی مخلص:

شہرزاد کرسٹینا بلمونٹ

P.T.O

P.S. نہ معلوم میرے والد کہاں ہیں۔ سنا ہے لندن میں LIB GAY تحریک کے آرگنائزز شامل ہو گئے ہیں۔ ان سے آج تک ملاقات نہیں ہوئی۔ میری دادی کا انتقال ہو چکا ہے۔

یہ مقبول احمد خاں کون صاحب ہیں۔ ان کو گولی ماردینی چاہئے۔

P.P.S. آپ کی نسل کا دوغلا پن اور اخلاق کے دوہرے معیار حیرت انگیز ہیں۔ آپ لوگ ندن آکر جوق در جوق "HAIR" اور "OH! CALCUTTA!" دیکھتے ہیں۔ اور پھر ہمیں لیاں دیتے ہیں۔ ہم نے خود کو پرانی زنجیروں سے آزاد کر لیا ہے۔ شاید اس وجہ سے آپ ہم سے لتے ہیں۔ معاف کیجئے۔ میں یہ سب آپ کو اس لئے لکھ رہی ہوں کہ میرے بچپن میں ممی اکثر آپ کی بشن شال دے کر مجھے لیکچر پلایا کرتی تھیں۔ آپ کیسی بڑی انقلابی تھیں۔ جان پر کھیل کر حصول ادی کی جد و جہد کی۔ کتنا اعلیٰ کردار تھا آپ کا۔ ہا ہا ہا۔ آپ کی حاصل کی ہوئی آزادی ایسی ئی کہ خود آپ ہی کو تارک الوطن ہونا پڑا۔ اور آپ کے انقلابی بلند کردار ہیرو ریحان الدین احمد و بھی دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ لندن میں پلے بوائے کلب میں نظر آئے تھے مخالف ملک کے دو منسٹر ساتھ تھے۔ سب بیٹھے ایک ساتھ شراب پی رہے تھے۔ صبح کو کانفرنس ہال میں ایک دوسرے کے خلاف لڑے بیان دیئے۔ جن کے اثر سے دونوں ملکوں میں مزید خون خرابہ ہوا۔ معصوم غریبوں کی جانیں گئیں۔ اس سے پہلے آئے تھے ممی نے ملنا چاہا صاف ٹال گئے کہ وقت نہیں ہے۔ اگر ممی کوئی اہم ہستی ہوتیں دوڑ کر ملتے۔ سِک۔ سِک۔ سِک۔ یہ آپ لوگوں کے دوہرے معیار تھے۔ مجھے پ کی نسل نے بہت ڈِزالوژن کیا ہے مسز سین۔ اور اگر ہم لوگ آپ لوگوں سے بغاوت کر کے DRUGS اور سوامیوں کے ریکٹ میں پناہ ڈھونڈتے ہیں تو آپ کیوں متعجب ہیں؟ آپ نے امن کے لئے کام کیا تھا؟ اصل عالمی امن تو ہم چاہتے ہیں مسز سین۔ اگر نوجوان لوگ فلاور چلڈرن بن گئے آپ کی بنائی ہوئی دنیا بہت بھیانک معلوم ہوئی۔ وہ اس سے علیحدہ ہو گئے۔

امید ہے آپ میری اس صاف گوئی کو معاف کریں گی۔ اوم شانتی شانتی شانتی۔

شہرزاد

۴۰

سوامی آتم آنند شنکر پریمی

روم ایرپورٹ پر ایک نوجوان سفید فام سوامی جی ترشول اور جھولا سنبھالے ساتھ چلتے ادے پر سوار ہوئے۔ اور سیٹ پر مسز سین کے برابر بیٹھ گئے۔ شِوا شِوا۔ انھوں نے لمبا سانس لے کر ا۔ اور پھر مالا جپنے لگے۔ مسز سین نے تعجب سے ان کی سنجیدہ صورت کو دیکھا۔ ایسا نوعمر لڑکا اور کرانا نہیں جانتا۔

مسز سین نے دوبارہ اس کی شکل پر نظر ڈالی۔ ذرا مانوس معلوم ہوئی۔ مسز سین کو اپنی طرف ر دیکھتا پا کر سوامی جی نے جھولے سے اپنا تبلیغی لٹریچر نکال کر ذرا درشتی سے اُن کی گود میں سرکا دیا۔

"معاف کرنا بیٹے تمہارا کیا نام ہے؟"

"سوامی آتم آنند شنکر پریمی ــ" لڑکے نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

"نہیں بیٹے۔ اس سے پہلے کا نام؟"

"مجھے پہلے کا نام یاد نہیں۔ میں اپنی پہلی زندگی بھول چکا ہوں۔"

"او۔ آئی سی۔" انھوں نے گورے چھوکرے کو نظر بھر کے دیکھا۔ یہ شکل کس کی تھی۔ کس کی تھی لس بارلو۔ آئی سی ایس۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ڈھاکہ ــ شاید وہ نہ ہو۔ مسز سین خاموش رہیں۔ توقف کے بعد انھوں نے گھڑی دیکھی اور بولیں۔ "ہم لوگ کتنی جلدی ایتھنز پہنچ جائیں گے۔ سائنس ترقی کمال ہے۔"

"سائنس ــــ؟ پراچین کال میں ویمان اڑتے تھے۔ اور مہابھارت کے زمانے میں ٹیلی ویژن د ہو گیا تھا۔ انگریز ہندوؤں کی قدیم کتابیں چرا کر لے گئے اور ان کی بنا پر اتنی ترقی کر لی۔ اب امریکن روسی ہیں چاند پر پہنچ گئے۔ یہ جھوٹ ہے۔ چاند پر کوئی نہیں پہنچ سکتا۔" سوامی جی نے کہا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"ایتھنز۔ وہاں آشرم قائم کروں گا۔ پھر انڈیا۔ ہردوار۔ لارڈ شِوا کا شہر۔"

"انڈیا جا رہے ہو تو قحط زدگان میں کام کرو۔ آج کل وہاں خشک سالی ہے۔"

"قحط زدہ لوگوں کو چاہیے کہ رین گوڈ کی پوجا کریں۔ تاکہ وہ پانی برسائے۔ ہر ہر مہادیوا۔"

"تم کو چاہیے بیٹے کہ تم رام کرشنا مشن والوں کی طرح خدمت خلق کرو۔ ہندوستان میں بڑی غربت ہے۔"

"غریب لوگ ہمارے شنکر پریم فاؤنڈیشن کے قائم کئے ہوئے مندروں میں آکر پرسادم کھا سکتے ہیں۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"دیکھو بیٹے۔ میں بھی شکتی — مہاکالی کی پجارن ہوں شاید شنکر بھگوان کی مرضی تھی کہ تم مجھے اس طرح ملو۔ اس لئے میری بات دھیان سے سنو۔ شاید میں تمہارے والد سے واقف ہوں۔ کیا تم انڈین سول سروس کے مسٹر چارلس بارلو کے لڑکے ہو؟"

گورا سنیاسی چونک پڑا۔ پھر اس نے زیادہ مضبوطی سے آنکھیں میچ لیں۔ چہرہ سخت کر کے جواب دیا۔ "او۔ کے۔ چارلس بارلو۔ لیکن میرے لئے وہ ایک اجنبی نام ہے۔ میں اُن سے دس سال سے نہیں ملا۔ وہ میرے والد نہیں دادا ہیں۔ میں اُن کے بڑے بیٹے ٹامس بارلو کا لڑکا ہوں۔"

وقت اتنی تیزی سے گزر گیا۔ ڈھاکے کے جواں سال حاکم اعلیٰ چارلس بارلو اور اس کی بیحدری طور پر حسین بیوی وائلیٹ بارلو کا پوتا اتنا بڑا ہے کہ سوامی بن چکا ہے۔

"بیٹے اگر تم —"

"شِوا — شِوا — میم آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔ آپ کو کیا دلچسپی ہے؟" سوامی شنکر پریمی نے درشتی سے کہا۔ "میرے گرینڈ پا چارلس بارلو آسٹریلیا میں ہیں۔ ان کی بیوی میری دادی لندن میں جرمن بمباری کا نشانہ بن گئی تھیں۔ اب تک دوبارہ جنم لے کر بھی دوبارہ مر چکی ہوں گی۔ کیا معلوم میرے والد ٹام بارلو بھی مر چکے ہیں۔ میری پھوپھی کیرل بارلو شاید زندہ ہیں۔ مجھے پتہ نہیں۔ میں اور میری بہن بچے تھے جب ڈیڈ اور ممی کی طلاق ہو گئی تھی۔ ممی ایک غیر اخلاقی زندگی گذارتی ہیں۔ انہوں نے ہماری کبھی پرواہ نہیں کی۔ گرینڈ پا چارلس بارلو نے آسٹریلیا میں دوسری شادی کر لی تھی۔ ان کا ایک لڑکا ہے۔ میرا سوتیلا چچا رچرڈ۔ اس کا نام گرینڈ پا نے اپنے مرحوم بھائی ونگ کمانڈر رچرڈ بارلو کے نام پر رکھا تھا۔ جو سیکنڈ ورلڈ وار میں جرمنی پر بمباری کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔ یہ رچرڈ سڈنی میں انٹیریر ڈیکوریٹر ہے۔ اور آدھا GAY۔ میری

سوہو لندن میں ایک لزبین کلب چلاتی ہے۔ میری والدہ ایک رئیس زادی ہیں۔ ایک فرینچ جگ لو کے ساتھ
تھ آف فرانس میں رہتی ہیں۔"

شکر ہے وہ تو نارمل ہیں۔ مسز سین نے دل میں کہا۔

" مجھے اس دولت عیش و عشرت، کامیابی، گناہ آلود دنیا سے، چوہوں کی دوڑ سے نفرت ہو گئی
ایا ہے۔ میں سنیاس لے چکا ہوں۔ ممی آپ کو کہاں ملیں؟"

"تمہاری ممی مجھے نہیں ملیں۔ میں پورٹ آف اسپین میں رہتی ہوں۔ میرے شوہر بیرسٹر ہیں۔ پچھلے
ہ ایک سرکاری مقدمے کے سلسلے میں پرتھ گئے تھے۔ میں بھی ساتھ گئی تھی۔ بحیثیت انڈین سنگر
ژن پر میرا انٹرویو لیا گیا تھا۔ تمہارے دادا نے وہ پروگرام دیکھا اور پتہ لگا کر ہمارے ہوٹل ہم
ے آئے۔ ہمیں اپنے شیپ فارم پر لے گئے۔ وہ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ مجھ سے مل کر بے حد
ہوئے جیسے میں ان کی مدتوں کی بچھڑی ہوئی رشتہ دار ہوں۔ حالانکہ ہندوستان کی جنگ آزادی
نے میں وہ مجھے اپنا سب سے خطرناک دشمن سمجھتے تھے۔ اب وہ اتنے اکیلے تھے۔ تن تنہا اور ضعیف۔
ہوں نے مجھے بتایا تھا کہ بنگال سے آسٹریلیا آ کر انہوں نے ایک امریکن لڑکی سے شادی کر
۔ اس سے طلاق ہو گئی۔ اس امریکن بیوی سے ان کا لڑکا سڈنی میں رہتا ہے مگر ان سے نہیں
ٹر بارلو تم سب کو بہت یاد کرتے ہیں۔ صحت گر چکی ہے۔ تم لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ
یں کہ تم سب ان سے ایک بار ہی مل آؤ ۔۔۔؟ ان کا پتہ لکھ لو ۔۔۔"

لڑکا رودراکش کی مالا جپتا رہا۔ "ان کو اپنا کرما بھگتنا ہے۔" اس نے سرد مہری سے کہا۔ "ایک سنیاسی
خون کے رشتے بے معنی ہیں۔"

مسز سین نے جھنجھلا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور ایتھنز تک اس سے بات نہیں کی جب
ایرپورٹ پر اترنے کے لئے نیچا ہونا شروع کیا سوامی آتم آنند شنکر پریمی نے اچانک
کو مخاطب کیا۔ "میرا سوتیلا چچا رچرڈ بارلو جو سڈنی میں انٹیریر ڈیکوریٹر ہے مجھے ابھی چند
پیرس میں ملا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ایک نیا ہوٹل سجانے کے لئے اسے بنگلہ دیش ڈھاکہ بلایا
اگر اتفاق سے آپ کی وہاں اس سے ملاقات ہو تو اس سے کہئے گا کہ میں اگلے مہینے کی پندرہ
بعد ہردوار میں ہوں گا۔ یہ رشی کیش میں میرے آشرم کا پتہ ہے۔" اس نے اپنا کارڈ سرکایا۔

"اُس سے کہئے گا مجھ سے وہاں آن کر مل لے۔ مَیں اُسے راہ راست پر لانے کی کوشش کروں گا۔ وہ مایا جال میں بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ اور آپ بھی کبھی رشی کیش آئیے۔ شِوا۔ شِوا۔"

طیارے نے لینڈ کیا۔ سوامی جی مسافروں کی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ایرپورٹ پر اتر کر ہجوم میں ان کا جھنڈا اور ترشول کچھ دیر تک نظر آتا رہا۔

۴۱

جلسہ گھر

ڈھاکہ ایرپورٹ پر یاسمین مجید یادگار کمیٹی کے اراکین ہار پھول لئے منتظر تھے۔ شریمتی دیپالی بنگلہ دیش کی ایک قابلِ فخر بیٹی، مشہور مغنیہ، بنگلہ دیش کی دوسری قابلِ فخر بیٹی، نامور رقاصہ اور شہ مرحومہ یاسمین بلمونٹ کی یاد میں منائے جانے والے تہذیبی جشن کے لئے اتنی دور جنوبی امریکہ سے م کی گئی تھیں۔ مرنے کے بعد یاسمین بلمونٹ "عظیم شاعرہ" بھی قرار دی گئی تھی۔ واہ۔ جب وہ ز تھی پچیس برس پردیس کی فیکٹریوں میں مزدوری کر کے، فاقے کر کے، ریسٹورانوں میں برتن دھو رشتے داروں اور ہم وطنوں کی گالیاں کھا کے، ایڑیاں رگڑ رگڑ کے، سرد بے رحم دنیا میں ڈوب کر اب اس کے نام پر بین الاقوامی تہذیبی جشن منایا جا رہا ہے جس پر لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ گا۔ یادگار کمیٹی نے مسز سین کو آمد و رفت کا ایر ٹکٹ پیش کیا تھا۔ جسے لینے سے انہوں نے انکار کیا۔ یہ بڑا GHOULISH آسیبی سفر تھا۔ وہ اپنے سورگیہ پتا ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار اور سورگیہ پھوپھی بھوتارنی دیبی کی راکھ ساتھ لائی تھیں کہ ان کی وصیت کے مطابق اسے ہردوار لے جا کر گنگا میں دیں۔ یہ شاید خود دیپالی سین کی وطن کی آخری وزٹ ہو۔ جلد شاید خود ان کا بلاوا سفرِ آخرت کا آجا سنسار میں کافی تو رہ لیں۔

"آپ کے لئے انٹرکونٹی نینٹل میں انتظام کیا گیا ہے۔" استقبالیہ کمیٹی کے سکریٹری نے کہا۔ "ا آئے ہوئے فنکار بھی وہیں ٹھہرے ہیں۔ یا آپ کسی دوست کے ہاں قیام پسند کریں گی؟"

اب ایک وردی پوش شوفر آگے بڑھا۔ "میم صاحب" وہ دانت نکوس کر بولا۔ "نواب

رجمند منزل سے گاڑی بھجوائی ہے۔ خود تشریف نہیں لاسکے۔ آج صبح اخبار میں آپ کا نام دیکھا حکم دیا ن تیج گاؤں جاکر آپ کو لے آؤں۔ چلیے۔" دیپالی نے استقبالیہ کمیٹی سے معذرت چاہی۔ شوفر کے ہ تیز تیز چلتی باہر آئی۔ شوفر نے ایک سفید مرسیڈیز کا دروازہ کھولا۔

نواب صاحب بیچارے اب کتنے ضعیف ہو گئے ہوں گے۔ مدتوں سے اس خاندان کی خیر خبر معلوم ں۔ ڈھاکہ اور پورٹ آف اسپین میں بہت بڑا فاصلہ ہے۔ جو محض ایر لیٹرز کے ذریعے نہیں پاٹا جاسکتا۔ سنہ ۱۹۶ء میں وہ پچھلی مرتبہ یہاں آئی تھی۔ اگلے سال اکمل کے مرنے کی خبر معلوم کر کے بھی جہاں آرا کو خط نے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ اب اتنے برسوں بعد ان سب سے ملنے کی خوشی اور اضطراب سے اس کا دل ڑکنے لگا۔

مرسیڈیز ڈھاکہ کی سمت رواں تھی۔

"سب لوگ کیسے ہیں؟" اس نے شوفر سے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں۔" اُس نے جواب دیا اور انہماک سے کار چلاتا رہا۔ وہ لڑکا سا تھا۔ شاید ارجمند ل میں نیا نیا ملازم ہوا تھا۔ اس وجہ سے اسے اپنی اہمیت کا بہت احساس معلوم ہوتا تھا۔ اس کی گردن پچھلے حصے پر زخم کا اُبھرا نشان تھا۔

دیپالی نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچتی رہی۔ جہاں آرا، کا سامنا کس طرح کروں۔ اکمل کی تعزیت الفاظ میں کروں۔ اکمل کو مرے بھی اتنے برس گزر گئے۔ جہاں آرا، اب اپنے پوتے کے سہارے ں رہی ہوگی۔ ممکن ہے بہو نے دوسری شادی کر لی ہو۔ اس نے دل ہی دل میں تعزیت کے جملوں کی سل شروع کی۔ پھر دل کڑا کر کے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف شہر تھا اور یادیں بندوق کی دوں کی طرح بوچھار کر رہی تھیں۔ یادیں LAND MINES کی طرح دفن تھیں۔

"میم صاحب گانا سنیئے گا۔؟ بنگلہ دیش ریڈیو۔" ڈرائیور نے کہا۔ اور ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا۔ کی بھاٹا کا گیت۔ بھٹیالی ختم ہو رہی تھی۔ اب نذرل گیتی شروع ہوئی۔ "بدروہی۔ کہہ دے لے میں سربلند ہوں۔ اتنا بلند کہ ہمالیہ کی چوٹی بھی میرے آگے سرنگوں۔ کہہ دے اے بہادر کہ اس وسیع ن کو چیر کر چاند سورج ستاروں کو توڑ کر جنت دوزخ دہلا کر آسمان سے ٹکرا کر میں سارے عالم کے بتسمہ حیرت بن گیا ہوں۔" نوجوان ڈرائیور نے مڑ کر اطلاع دی: "میم صاحب۔ ہم بھی بہت لڑا۔"

گانا جاری رہا : میں سرکش ۔ سنگدل آتش نوا ۔ قیامت کا دوست طوفان تباہی دہشت ہوں دنیا کے لئے سراپا ہلاکت ۔ میں ہر چیز کو چکنا چور کر دیتا ہوں ۔ اصول شکن ۔ بربادی کا دیوتا ۔۔۔

وہ بے اختیار خود بھی اس کے ساتھ ساتھ گانے لگی ۔ اور پل کی پل میں اپنے کالج کے زمانے میں وا پہنچ گئی ۔ جب وہ اور ریحان اور روزی بنرجی اور محمود الحق اور جیوتی سب مل کر جوش و خروش سے یہ گیت گاتے تھے ۔

اُسے پتہ بھی نہ چلا مرسیڈیز ارجمند منزل کی برساتی میں کب پہنچی ۔

ایک پاگل سی عورت جھبڑے سفید بال بکھرائے برآمدے کے ایک در میں بُت بنی کھڑی تھی ۔ دیپا کو کار سے اترتا دیکھ کر فوراً اندر بھاگ گئی ۔

ایک ملازم نے آکر اسباب کار سے اُتارا ۔ دیپالی اندر گئی ۔ ارجمند منزل سنسان پڑی تھی ۔ جہاں آرا ۔۔۔ جہاں آرا ۔۔۔ پکارتی وہ زنانخانے میں پہنچی ۔ وسطی تالاب بھی خالی پڑا تھا ۔ دیپالی اوپر جانے کے لئے منقش چوبی زینے کی طرف مڑی ہی تھی کہ وہ دیوانی عورت بھاگتی ہوئی اندر آئی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر آ ۔۔۔ آ ۔۔۔ آ ۔۔۔ کرنے لگی ۔

" مالا ۔ میم صاحب کو تنگ مت کر ۔ " ملازم نے جو اسباب اٹھائے پیچھے پیچھے آرہا تھا جھڑک کر کہا ۔ پھر مہمان کو مخاطب کیا ۔ " میم صاحب ۔ جب سے سب لوگ مارا گیا مالا پاگل ہو گیا اور گونگا بھی ہو گیا ہے ۔ "

" کون ۔۔۔۔ مارا گیا ۔۔۔ ؟ "

" سب جنے ۔ میم صاحب ۔ بڑے نواب صاحب ۔ نیّر میاں ۔ اُن کا بی بی بچے ۔ جہاں آرا بی بی ۔ ان کا بہو اور پوتا ۔ سب مارا گیا ۔ آدھی رات کے ٹائم ۔ سب بندوق کا نشانہ بنا ۔ یہی کوٹھی کے اند مالا نے سب کو مرتے دیکھا ۔ جب سے یہ گونگا ہو گیا ۔ "

دیپالی کی آنکھوں کے سامنے ایک کوندا سا لپکا ۔ وہ اپنی جگہ جم کر رہ گئی ۔ پھر کھڑے کھڑے زور سے لرزی ۔ پھر اس کی ٹانگوں نے جواب دیا ۔ دماغ سنسنایا ۔ سارے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی ۔ آنکھوں کے سامنے سرخ اندھیرا تیرا ۔ وہ دھم سے فرش پر بیٹھ گئی ۔۔۔ کہہ دے اے نوجوان ۔۔۔ جوانمرد ہیں جنت و دوزخ دہلا کر ۔ عرش سے ٹکرا کر سارے عالم کے لئے مجسمہ حیرت ۔ اُس نے وحشیوں کی طرح چاروں طرف دیکھا

ند لمحے چپ رہی۔ پھر دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کیا۔ اس کے بال بکھر گئے۔ روتے روتے اس نے محسوس
یا کہ وہ انسان نہیں رہی ہے۔ وہ درندوں سے بھرے جنگل کا ایک جانور ہے۔ جس کے بھٹ کے باقی جانوروں
دوسرے زیادہ خونخوار حیوان آکر چیر پھاڑ گئے ہیں۔ اور ان کی لاشیں گدھ کھا چکے ہیں۔ اور سنسان صحرا
ریت نے ان کے ڈھانچے بھی غائب کر دیئے ہیں اور وہ گیدڑ کی طرح پنجوں سے زمین کھرچتی ان کو یاد کر
رو رہی ہے۔ پھر اس نے جنگلی بلی کی طرح رونا شروع کیا۔ اس کی آواز سن کر اجنبی شکلوں والے نوکر
اکر دروازوں میں نمودار ہوئے۔ مالا اور زور سے آ — آ — آ — کرنے لگی۔ جس طرح ایک ناسمجھ بچہ
سرے بچے کو روتا دیکھ کر ہمدردی میں خود بھی رونے لگتا ہے۔ مالا نے دیپالی کو آنسو بہاتے دیکھ کر آنسوؤں
جھڑی لگا دی۔

دفعتاً دیپالی چپ ہو گئی۔ آنکھیں خشک کیں۔ اور سپاٹ آواز میں کہا۔ "مجھے بڑے نواب صاحب
پاس لے چلو۔ ان کو اطلاع کر دو۔ میں آگئی ہوں۔"

"وہ بھی مارا گیا میم صاحب" ملازم نے جواب دیا۔ دیپالی نے فرش پر مکّہ مارا۔ "اس بدمعاش
دتّے کمینے ڈرائیور نے کہا نواب صاحب نے ایرپورٹ کار بھجوائی ہے۔ نواب صاحب نے۔"

"چھوٹے نواب صاحب نے — میں ان کو بلا کر لاتا ہوں۔ وہ ابھی آتے ہوں گے۔ باہر گئے تھے۔
آتے ہوں گے۔ میں ان کو خبر کرتا ہوں۔ دھیرج رکھئے میم صاحب۔ نیاز میاں میم صاحب کے لئے ایک
ٹھنڈا پانی — جلدی —" دوسرے خدمت گار نے گھبرا کر کہا اور لپکا ہوا باہر گیا۔

دیپالی اب ایک نیم جان کوکر اسپینیل کی طرح فرش پر سرنگوں بیٹھی تھی۔ اس کے آنسو بوڑھی گنگا کے مانند
رواں ہو گئے۔ مالا اس کے نزدیک آ کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ دیپالی نے آنسوؤں کی چلمن میں سے اسے دیکھا۔ اور سپہ
آرا کی پرانی وفادار خادمہ مالا۔ وہ اب اپنی دیوانگی میں لکڑ بگّے کی طرح ہنس رہی تھی۔ ان دونوں عورتوں
ندگی کا، دنیا کا انجام دیکھ لیا تھا۔

چند منٹ بعد دیپالی نے سر اٹھایا۔ صدر دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ہاتھ میں "فائیو فائیو"
سنبھالے بڑھیا سوٹ پہنے ریحان الدین احمد دہلیز پر کھڑے تھے۔

نواب قمر الزماں چودھری کے بھانجے۔ ارجمند منزل کے نئے مالک۔ شہید نواب کے واحد قانونی وارث
م میں زندہ بچے تھے۔ ارجمند منزل کے موجودہ نواب۔

دیپالی نے سر زور سے جھٹکا۔ اور آنکھیں ملیں۔ کالی جگت کے چوراہے پر بیٹھی پتنگیں بناتی ہے۔ پتنگیں کا ہے۔ پتنگیں اڑاتی ہے۔[1]

لنچ کے بعد ریحان کار لے کر پاٹ کی فیکٹری چلے گئے جو نواب قمر الزماں اور ان کے فرزند نیر الزماں مرحو کی فیکٹری تھی جس کے اب وہ مالک تھے۔ زہرہ دیپالی کو آرام کرانے اوپر بیڈ روم میں لے آئیں۔ یہ جہاں آر مرحومہ کا بیڈ روم تھا۔ دیوار پر ائیر فورس یونیفارم میں ملبوس متبسم اکمل مرشد زادہ اور اس کی دلہن کی تصو لگی تھی۔ یہ پائلٹ آفیسر اکمل مرشد زادہ ستمبر ۶۵ء میں پاکستان کی خاطر لڑتے ہوئے مرا تھا۔ دیپالی کا سر گھومنے لگا۔ وہ دریچے کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ جس کے نیچے تالاب اور" وکرم آدتیہ کا راج سنگھاس نظر آ رہا تھا اور گلاب خاص کا درخت۔

دوسری مسہری پر بیٹھی زہرہ اوما رائے کی شکایتیں کر رہی تھی۔

"اوما دیدی نے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا۔" پان بناتے ہوئے اس نے کہا۔ "وہ بالکل سٹھیا گئی تھ جس طرح وہ بلویڈیر جا کر لاوارث بلیوں کتوں کو کھلاتی تھیں ان کا خیال تھا ریحان صاحب اور میں بھی ان کے پالتو جانور تھے۔"

"ریحان کے متعلق ساری عمر ان کا یہ رویہ رہا۔" دیپالی نے غیر شخصی انداز سے کہا۔ اب اس لمحے وہ محض ایک دور کی تماشائی تھی۔

"جی ہاں۔ ہمارے لڑکے فرقان کو بھی انہوں نے ہی میرے خلاف بھڑکایا۔ وہ DRUGS کھانے لگا۔ گھر سے نکل گیا۔ ہپی بن گیا۔ پھر ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ڈھاکہ آ گیا ہے۔ ریحان صاحب بیٹے کو بہ چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا چلو ہم بھی کلکتہ کو خیرباد کہتے ہیں۔ ڈھاکہ واپس جا کر نئی زندگی شروع کر ساری عمر گزارنے کے بعد شاید اوما رائے ان کی سمجھ میں بھی آ گئی تھیں۔ ۶۸ء میں ہم لوگ ایسٹ پاکستا آ گئے۔ ریحان نے کھلنا میں بزنس شروع کر دی۔ وہ بنیادی طور پر سیاسی آدمی ہیں۔ پھر پولیٹکس میں کو پڑے۔ عوامی لیگ۔ شیخ مجیب الرحمٰن۔ وہ سب چکر۔ لڑکا یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ سدھر گیا۔ پھ

---

[1] اٹھارویں صدی کے بنگالی شاعر رام پرشاد سین کا ایک گیت۔

صاحب نے اسے آگے پڑھنے کے لئے لندن بھیج دیا۔ ہم لوگ اپنا سارا روپیہ کلکتہ سے کسی ترکیب سے یہاں ئے تھے۔

"اس کے بعد جو ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔ فرقان لندن میں تھا۔ زندہ بچ گیا۔ اب باپ کے ساتھ بزنس یکھ بھال کرتا ہے۔

"جب ارجمند منزل پر حملہ ہوا ہم لوگ کھلنا کے ایک گاؤں میں چھپے ہوئے تھے۔ ارجمند منزل کا یہ گھرانا شیخ مجیب کا حامی بن چکا تھا اور جو کچھ ہوا کیوں اور کس طرح یہ لوگ مارے گئے وہ ریحان پتے قت آپ کو بتا چکے ہیں۔"

"ہاں۔ میں اس کی تفصیل نہیں سننا چاہتی۔" دیپالی نے مضبوطی سے جواب دیا۔ ریحان نے کس پاٹ طریقے سے اس قتل عام کا تذکرہ کیا تھا۔ پھر اس نے خود کہا تھا "جب لاکھوں اکٹھے مارے جائیں غ ماؤف ہو جاتا ہے۔ افراد کی موت کا اتنا شدید صدمہ ذہن پر نہیں رہتا۔ مرگ انبوہ واقعی ایک جشن ، یہ کسی بھی قتل عام کے پسماندگان کی نفسیات ہو سکتی ہے۔" لیکن اتنا کہنے کے بعد ریحان خود پھوٹ ٹ کر رونے لگے تھے۔

ریحان کی بہن رابعہ اور اس کا شوہر اور چھوٹے بچے رفیوجی بن کر کلکتہ چلے گئے تھے اور وہاں لے تھے۔ رابعہ کی بڑی لڑکی ناصرہ نجم السحر کلکتہ جانے کے بجائے ایک گوریلا دستے میں شامل ہو گئی تھی بہت دنوں تک غائب رہی تھی۔ آزادی کے بعد بھی ہتھیار ڈالنے پر راضی نہیں تھی۔

"میں نے اس لڑکی کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ انتہا پسندوں سے جا ملی تھی۔ بڑی آفت میں پھنستی۔ ا پسندوں کے گروہ سے الگ کروایا۔ اسکالرشپ دلوا کر اعلیٰ تعلیم کے لئے ماسکو بھجوایا۔ فرینڈشپ درسٹی میں پڑھ کر آئی۔ مگر ماؤسٹ بن گئی۔ یہاں کالج میں لیکچرر ہو گئی۔ اب وہ مجھ سے نہیں ملتی۔ ے خلاف بکتی پھرتی ہے۔ نہ جانے یہ نوجوان کیا چاہتے ہیں۔ یہ بڑی احسان فراموش نئی نسل ہے۔" یان نے نواب قمر الزماں کی آواز میں دیپالی سے کہا تھا۔ اسے ناصرہ نجم السحر کی تلخ گفتگو یاد تھی جب وہ ر نو سال قبل اس سے یہیں ملی تھی۔ اب ریحان ـــ اپنی مرسیڈیز میں بیٹھ کر نرائن گنج جا چکے تھے۔ ان کا ٹائلش موڈ شاعر بیٹا فرقان اپنا پروگرام تیار کرنے ٹیلی ویژن سنٹر چلا گیا تھا۔ نوکر چاکر شاگرد پیشے میں تھے۔ پہر قیلولے کا سیسٹا کا وقت۔

دیپالی دریچے سے ہٹ آئی۔ اور جہاں آرا کے چھپر کھٹ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ریحان کی زہرہ بہت باتونی تھی۔ متواتر بولتی تھی اور مسلسل پان کھاتی تھی۔ دیپالی نے ترشی سے کہا۔ "زہرہ اب جاؤ۔ مجھے سونے دو۔" کروٹ بدل کر اس نے زہرہ کے متعلق سوچا ـــــــ یہ لوٹم سی ان کم رُو کم حیثیت زہرہ ریحان کی بیوی ہے اس وجہ سے میں اس سے جلتی ہوں۔ مگر اب کیا جلنا اور کیا بُجھنا نون سنس۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ مالا پھر آکر بھوتنی کی طرح دروازے میں کھڑی ہو گئی۔

"اری منہ جلی دفان، کیوں نہیں ہوتی" زہرہ نے غصے سے کہا۔

"رہنے دو زہرہ" دیپالی نے التجا کی۔

"دیدی یہ پاگل عورت حرام خور ہر وقت سر پر سوار رہتی ہے۔"

"بیٹھ جاؤ۔ مالا۔" دیپالی نے اس سے کہا۔ وہ چوکھٹ پر بیٹھ کر آ ـــ آ ـــ کرنے لگی۔ جلد وہ دیپالی کو کیا بتانا چاہتی تھی مگر اپنا مطلب سمجھانے سے قاصر تھی۔

زہرہ پاندان بند کر کے بولی ـــ "آپ ـــ آپ تو ریحان کی پرانی گرل فرینڈ ہیں اُوما دیدی نے مجھے بتایا۔ آپ ہی کی وجہ سے ریحان نے جہاں آرا آپا کو چھوڑا۔ مجھے اُوما دیدی سب بتا چکی ہیں۔"

"تم جو بھی کہہ لو زہرہ اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" دیپالی نے سکون سے جواب دیا۔ "گو ریحان نے جہاں آرا کو میری وجہ سے نہیں چھوڑا۔ میں ان کی زندگی میں بعد میں آئی۔"

"آپ برا نہ مانیئے گا میں نے یوں ہی کہہ دیا۔ میں بہت صاف دل عورت ہوں۔ دیکھیئے مجھے خود یقین نہیں آتا۔ میں اٹھائیس سال سے ریحان کی بیوی ہوں۔ پر یقین نہیں آتا۔ میں ایک غریب زردوز کی لڑکی۔ کم علم اور کم عقل۔ اور ریحان الدین احمد جیسے آدمی کی شریک حیات۔ مگر ان کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اور ـــ میں ایک دفعہ منسٹر کی بیوی بھی رہ چکی ہوں۔ اور اب ارجمند منزل کی بیگم ـــ اللہ کی قدرت ہے۔ قرآن شریف میں اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ـــ ہم جس کو چاہتے ہیں عزت دیتے ہیں جس کو چاہتے ہیں ذلت ـــ"

"آ ـــ آ ـــ آ ـــــ" مالا بولی۔

"ریحان بھی تو ایک غریب کسان کے بیٹے تھے" دیپالی نے کہا۔

"ہاں مگر نواب کے نواسے تو تھے ـــ میری قسمت اچھی تھی جو اُن سے شادی ہوئی۔"

"ایک بات سنو زہرہ ــــ گویا تمہاری خوش قسمتی تھی کہ تمہارے مفلس باپ نرلینڈ ورائے کی موٹر لے نیچے آکر مرے اور بطور تلافی تم سے ریحان نے بیاہ کیا۔ اور یہاں قتل عام ہوا اور تم ارجمند منزل کی مالکن نیں ــــ زہرہ خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔ اور مجھے سونے دو ــــ"

"آ ــــ آ ــــ آ ــــ" مالا نے دہرایا۔

یہ ارجمند منزل ایک بھوت گھر ہے۔ کہتے ہیں جو لوگ اچانک اور بھیانک طریقے سے قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ ان کی آتمائیں ان ہی جگہوں پر منڈلاتی رہتی ہیں۔ کیا ان سب کی آتمائیں مجھے دیکھ رہی ہوں گی۔ ایک وز شام کے وقت وہ سیڑھیاں اتر کر پائیں باغ میں آگئی۔ اوپر جہاں آرا مرحومہ کے کمرے کا دریچہ روشن تھا۔ جس ں اب زہرہ موجود تھی۔ اور اسی تخت پر بیٹھی مغرب کی نماز پڑھ رہی تھی۔

جہاں آرا تم تو بھوساگر سے پار اتر گئیں مگر میں تم سے کتنی شرمندہ ہوں۔ اس فیکٹری کا مالک اور اس ھر کا خانہ داماد نہ بننے کی خاطر ریحان نے تم کو ٹھکرا دیا تھا۔ تم نے ایک غلط آدمی کے ساتھ زندگی جہنم میں گذاری۔ پنے بیٹے کی موت کا غم اٹھایا۔ پھر خود بے دردی سے بے قصور قتل کر دی گئیں۔ اور آج اسی گھر میں وہی ریحان دران کی بیوی نئے نواب اور بیگم کی حیثیت سے براجمان ہیں۔

مایا تیرے کھیل۔

وہ ٹہلتی ہوئی جلسہ گھر کی طرف چلی گئی۔ جس کا دروازہ باغ میں کھلتا تھا۔ کواڑ چوپٹ کھلے پڑے تھے۔ ہ اندر گئی۔ بتی جلائی۔ سامنے دیوار پر ایک بڑی سی تصویر روشن ہو گئی۔ پارسی تھیٹر۔ دھرم تلا اسٹریٹ۔ کلکتہ۔ ندا ور مدھم فوٹو گراف: ماسٹر مصطفیٰ۔ سراج الدولہ ناٹک کا ہیرو۔ مس ننکوری داس دی بنگر۔ مس راداس ۔ سرلا ناٹک کی ہیروئن ۔ ایک بڑی روغنی پورٹریٹ۔

نوابزادہ فخر الزماں چودھری۔ اسے یاد آیا۔ یہ ریحان کے نانا تھے۔ نواب قمر الزماں کے جوانمرگ چچا۔ نہوں نے تھیٹر کے شوق میں اپنے حصے کی جائداد اڑا دی تھی۔ یہ ان کا جلسہ گھر تھا۔ اس میں نواب زادہ صاحب ندوستت دیپالی کے ٹھاکر دادا بھی سنا ہے آکر گایا بجایا کرتے تھے۔ پرانے ارسٹوکریٹک بنگال کے تھیٹر پرست ُساد! ارجمند منزل کے اس جلسہ گھر میں سارا ساز و سامان اسی طرح موجود تھا۔ الماری میں "شاہجہاں" ر "سراج الدولہ" کے کرم خوردہ چوغے۔ نقلی تاج۔ تلواریں۔ بانسریاں ـ سینریوں کے پردے لپٹے ہوئے

ایک طرف رکھے تھے۔ ہال کے چوبی فرش پر گرد جمی ہوئی تھی۔ کونے میں جالے۔ سرخ اور سفید کٹاؤ کے کام کا جھالردار پنکھا۔ چھت گیریاں نوابزادہ نیر الزماں کی شادی کے دنوں میں اسی کمرے سے نکال کر نوابزادہ فخرالزماں مرحوم کے تصنیف کردہ اوپیرا "راجہ بھوج" کا سنگھ آسن تالاب کے کنارے رکھ دیا گیا تھا۔ جس پر ارجمند منزل کی بیگمات اور صاحبزادیاں بیٹھ کر خوش گپیاں کرتی تھیں۔

دیپالی جلسہ گھر سے باہر آگئی۔ اندر بہت حبس تھا۔ اور وحشت۔ باہر پُر فضا باغ میں "وکرم آدتیہ کا سنگھاسن" اب بھی موجود تھا۔ گو پینتیس^{۳۵} برساتوں کی وجہ سے گل چکا تھا۔ اس کی مورتیوں کے رنگ اڑ گئے تھے۔ اس کے جنگلوں میں اٹھائیس^{۲۸} چھوٹی چھوٹی چوبی مورتیاں لگی تھیں۔ چار بڑی چوبی مورتیوں کے سروں پر تخت کھڑا تھا۔ زیادہ تر مورتیاں بالکل شکستہ ہو چکی تھیں۔ سنگھاسن بتیسی کی دیولوک سے جلاوطن اپسرائیں!

گلاب خاص کے نیچے پینچ کردہ تخت کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

ایک مرتبہ، گرمیوں کی ایک معطر شام جہاں آرا نے ذکر کیا تھا۔ "دیپالی۔ ہمارے چھوٹے دادا جان نوابزادہ فخرالزماں چودھری اللہ جنت نصیب کرے۔ انہوں نے "راجہ بھوج" کا اوپیرا خود کمپوز کیا تھا۔ راجہ بھوج کا پارٹ بھی خود ادا کرتے تھے۔ تمہارے ٹھاکر دادا راجہ آندر بنتے تھے — کلکتے کی ایکٹریسیں آکر رمبھا اور اُروشی کے پارٹ گاتی تھیں۔"

اُس شام منہ چڑھی خادمہ مالا حسب معمول تخت کے پاس گھاس پر بیٹھی تھی۔ یاسمین اور روزی بھی آئی ہوئی تھیں۔ جہاں آرا نے حکم دیا — "مالا۔ راجہ بھوج کا قصہ کر —"

"ارے بی بی — ہندو لوگ بولتا ہے کہ دیولوک میں بتیس^{۳۲} ٹھو اپسرائیں تھیں۔ ایک روز انھوں نے شیوجی پر بری نظر ڈالی —"

"گڈ گوڈ —!" دیپالی اور سب لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسیں۔

"ماؤنٹ کیلاش اور ماؤنٹ اولمپس واقعی بہت دلچسپ جگہیں رہی ہوں گی —" یاسمین نے کہا۔

"تو بی بی! پاروتی دیبی جل گئیں! انہوں نے شراپ دیا کہ اپسرائیں بےجان مورتیاں بن کر راجہ اندر کے تخت میں لگ جائیں۔"

"تو وہ جادو کے سیب کا کیا معاملہ تھا۔؟" اختر آرا نے پوچھا تھا۔

"عورت مرد کی بے وفائی - بی بی۔" مالا نے پان چباتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا تھا —
اجین کا راجہ بھرتری ہری اپنی بیوی پر عاشق تھا۔ اسے ایک جوگی نے امر جیون پانے کا سیب دیا۔ اسے کھاؤ
امر ہو جاؤ۔ وہ راجہ نے اپنی بی بی اننگ سینا کو دیا۔ اننگ سینا نے اسے اپنے عاشق سائیس کو دیدیا۔
ائیس مہارانی کو چل دیتا تھا۔ اور اپنی پریمیکا الگ رکھتا تھا جو محل کی داسی تھی۔ وہ داسی بھی سائیس کو دھوکا
یتی تھی اس کا معشوق ایک گوالا تھا۔ داسی نے وہ سیب گوالے کو دیا۔ گوالا بھی داسی کو دھوکے میں رکھتا تھا
س نے اپنی معشوق کو وہ سیب دیا جو اُپلے بیچتی تھی۔ وہ سنہرا سیب ٹوکرے میں اُپلوں کے اوپر رکھے چلی جاتی
تھی۔ راجہ بھرتری ہری جنگل میں شکار کھیلنے آیا اُس نے اسے دیکھ لیا۔ اپنی رانی اننگ سینا کی بے وفائی سے اس کا
ل ٹوٹ گیا۔ تو وہ اپنے بھائی بکرم جیت کو راج پاٹ سونپ کر سنیاس لے لیا۔"

لڑکیاں مبہوت ہو کر یہ اسطوری داستان سن رہی تھیں۔ مالا کہے گئی — "پھر راجہ بکرم جیت کو ایک
نترک جوگی شمشان گھاٹ لے گیا۔ وہاں بیتال درختوں سے الٹے لٹکے ہوئے تھے۔ اور ایک بیتال راجہ کے
ندھے پر بیٹھ کر اسے کہانی سناتا تھا۔ پھر بکرم جیت جو تھے رمبھا اور اُروشی کے ناچ کے مقابلے میں جج بنے
ج بنے ان کے فیصلے سے خوش ہو کر راجہ اندر نے اپنا تخت ان کو بخش دیا جس میں وہی بتیس مورتیاں
گی تھیں۔"

لڑکیوں نے غیر شعوری طور پر اس نقلی اسطوری تخت پر نظر ڈالی اور انھیں محسوس ہوا جیسے وہ
ود اس دیو مالائی راج سنگھاسن پر موجود تھیں۔

"اور بکرم جیت کے مرنے کے بعد اس جیسا لائق راجہ کوئی نہ ہوا۔ تو اس سنگھاسن کو دفن کر دیا گیا اور
دیوں بعد راجہ بھوج نے اسے کھیت میں سے کھود کر نکلوایا۔" جہاں آرا بولی — "اور جب وہ راجہ اس
خت پر بیٹھنے کے لئے بڑھا تو ایک مورتی نے آواز دی — اس تخت پر وہی بیٹھ سکتا ہے جو راجہ وکرم آدتیہ جیسا
خی اور فیاض ہو — اس طرح راجہ بھوج بتیس مرتبہ تخت کی طرف بڑھے اور ہر مرتبہ ایک ایک مورتی نے للکار کر
ن کو وکرم آدتیہ کے اوصاف کے متعلق کوئی قصہ سنایا۔ وفاکیش۔ اصول پرست۔ راست باز۔ بہادر۔
حمدل — یہ — وہ —"

تب یاسمین نے کہا تھا — "آئیڈیا — آپ کے چھوٹے دادا نے اوپیرا بنایا تھا۔ میں اس کا بیلے بناؤں

گی۔ اور پتہ ہے اس راج سنگھاسن کی اصل معنویت کیا پیش کروں گی۔" پھر اس نے بڑی ڈرامائی انداز میں کہا تھا۔" یہ سنگھاسن دراصل ہے۔ عاؤدت کا دل ـــ!! اور آپا اس وقت یہ فرض کیجئے کہ ہم چاروں آپ، روزی آپا، دیپالی دی اور میں اس کی چاروں بڑی مورتیاں ہیں۔ اور کوئی راجہ بھوج اس تخت پر بیٹھنے کے لئے آئے تو ہم اسے للکار سکتے ہیں ـــ ٹھہرو ـــ تمہارے اندر یہ ـــ یہ ـ اوصاف ہیں ـــ؟"

دیپالی نے آنکھیں ملیں ـــ جہاں آرا اور یاسمین کے بھوت غائب ہو گئے۔ سامنے تالاب کی منڈیر پر گونگی مالا چپ چاپ بیٹھی اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکے جا رہی تھی۔ دیپالی نے غیر ارادی طور پر نظریں اوپر اٹھائیں۔ گلاب خاص کی شاخوں سے کیا بیتال الٹے لٹکے ہوئے تھے؟

دور ڈرائیو پر کار آ کر رکی۔ ریحان کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی ملازم سے پوچھ رہے تھے۔ "امریکہ والی سین میم صاحب کہاں ہیں؟"

کسی نے جواب دیا "باگ میں ـ"

نو رگش باگ میں   بہار کی آگ میں
بھرے دل داگ سے   درد دل زدر۔ رنگیلا کو تور
آؤ ـــ آؤ ـــ پیارے ـــ

گلاب خاص کے نیچے لڑکیاں نذرل کا گیت گا رہی ہیں۔ یاسمین کٹھ پتلی کی طرح گردن ہلا ہلا کر منی پوری رقص میں مصروف ہے۔ جہاں آرا اور دیپالی نوابزادہ نیر الزماں کی بری کے جوڑے بیونت رہی ہیں۔

وہ گھاس کو قدموں سے روندتا آ کر ایک فضول خیال کی طرح اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بن مالی۔ بن مالی۔ سندھیا کال آج تم کہاں سے آتے ہو۔

"بیٹھ جاؤ ریحان ـ"

وہ اپنے نانا نوابزادہ فخر الزماں کے بنوائے ہوئے فرضی راجہ اندر کے نقلی تخت پر بیٹھ گیا۔ اچانک دیپالی کا جی چاہا اسے للکارے۔ ٹھہرو تم اس پر نہیں بیٹھ سکتے۔ ریحان نے ایک سگریٹ سلگایا۔ "معاف کرنا آج فیکٹری میں

یر ہو گئی ۔"

"بنگلہ دیش کی تعمیرِ نو میں مصروف ہو؟"

وہ چیں بہ جبیں ہو کر دوسری جانب دیکھنے لگا۔

دفعتاً دیپالی کو محسوس ہوا اوپر دریچے میں سے جہاں آرا جھانک رہی ہے۔ اس نے غور سے
، زہرہ تھی۔ بیگم زہرہ ریحان الدین احمد۔ مجھے ہیلوسی نیشن نظر آنے لگے ہیں۔ مجھے اس چھایا لوک
راز جلد بھاگنا چاہیے۔ محفوظ۔ دور افتادہ پورٹ آف اسپین، پرسکون، غیر گنجلک شوہر بیرسٹر للت
ین، خوش باش برازیلین بھاونج ماریا روزینا۔ ایسٹ انڈین ملازمہ مسٹرس سرسوتی، نیگرو بٹلر ایلیاس۔
ری اصل، راحت بخش آرام دہ دنیا ہے۔ بیتالوں کے اس مرگھٹ سے اتنی مختلف۔ یہاں ہر ہر قدم پر
ال ایک ایک پرانا قصہ دہرائے جا رہا ہے اور جنات کانوں میں مسلسل پوچھ رہے ہیں۔ اور سناؤں؟
اؤں ۔۔۔؟ اور سناؤں ۔۔۔؟

ریحان نے بھی نظریں اٹھا کر جہاں آرا کے کمرے کے دریچے کو دیکھا۔ دیپالی پر نظر ڈالی اور آنکھیں جھکا لیں۔

"مالا ۔۔۔ مالا برابر آ ۔۔۔ آ کر کے مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس کی بات
فیر یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

"ہاں۔ کاش میں بھی اس کی بات سمجھ سکتا۔ کاش ہم سب ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے۔"

دیپالی۔ جہاں آرا۔ یاسمین مجید ۔۔۔ تین مورتیوں میں سے دو بڑی بری طرح ٹوٹیں۔ دیپالی نے
ا آدتیہ کے سنگھاسن" کی ایک مورتی پر ہاتھ رکھ کر دل میں کہا۔

پالکی چوَلے۔ پالکی چوَلے ہو ہو ۔۔۔ وہ آہستہ سے گنگنانے لگی۔

"دیپالی۔ میں نے آج سے پینتیس سال قبل تم سے آخری بار گانا سنا تھا۔ چندر کنج کے پھاٹک پر
سی طرح گھوسے کے وقت ۔۔۔"

"سنا ہو گا۔ مجھے یاد نہیں۔ ریحان تم نے۔ تم نے اتنے شرمناک سمجھوتے کیسے کر لیے ۔۔۔ کلکتے میں
ر یہاں بھی۔" وہ غم و غصے سے جھنجھلا کر رہ گئی۔

"سمجھوتہ! کیا تم نے نہیں کیا؟ کیا تم نے پورٹ آف اسپین میں سمجھوتہ نہیں کیا؟"

"میں نے اپنا ضمیر نہیں بیچا۔"

"یہ بات تم کہہ سکتی ہو۔" وہ بھی جھنجھلا گیا۔ عمر رسیدہ لوگوں میں قوت برداشت کم ہوجاتی۔

"اچھا۔ چلاؤ نہیں۔ لوگ سنیں گے تو کہیں گے دو جھکی بڈھے بڑھیا کیوں لڑ رہے ہیں۔"

ریحان نے تلملا کر سگریٹ اپنے بوٹ کے نیچے کچلا۔

"یہاں اتنی خونریزی ہوئی اور نتیجہ کیا نکلا؟ مغربی پاکستان سے آئی ہوئی بورژوازی کو نکال کر اب مقامی بورژوازی نے اس کی جگہ لے لی۔"

"شٹ اپ۔ یو آر اے سلی اولڈ وومن۔ یہاں کے حالات سے واقف نہیں۔ آجاتی ہیں امرکہ یہاں نصیحتیں کرنے۔" ریحان نے جھلا کر جواب دیا۔

"تم کسی پاگل خانے گئے ہو؟" اس نے ذرا تیز آواز میں کہا۔ "میں ایک مرتبہ اپنے شوہر للت کے ساتھ ایک پاگل خانے گئی تھی۔ برازیل کے ایک شہر میں۔ وہاں ایک آدمی خود کو چار دانی سمجھتا تھا۔ دو کہہ رہا تھا میں جیزس کرائسٹ ہوں۔ ایک عورت کا خیال تھا وہ مگرمچھ ہے۔ ایک عورت کو یقین تھا کہ گرینڈ فادر کلاک نگل چکی ہے۔ وہ مستقل ٹک ٹک ٹک ٹک کر رہی تھی۔ اسی طرح ـــ رونو ـــ سب اپنے آپ کو وہ سمجھتے ہیں جو ہم نہیں ہیں۔"

"معلوم ہے۔ اب آپ بہت عقلمند ہوگئی ہیں۔ مجھے درس دے رہی ہیں۔"

"رونو ـــ ایک قصہ سناؤں؟" دیپالی نے غیر ارادی طور پر سنگھاسن کے پایوں کی باقیماندہ مورتی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "جب ہم لوگ نئے نئے پورٹ آف اسپین پہنچے۔ چھوٹا سا ایک مکان کرائے پر ل گلی کے سرے پر ہمارے سامنے ایک خوبصورت دو منزلہ نورش وضع کا مکان تھا۔ اس کے نچلے برآمدے لب سڑک دو نورانی صورت بڑھیاں برف جیسے سفید بال، روکنگ چیئرز پر بیٹھی نٹنگ کیا کرتی تھیں۔ محلے پادری اور ننز ان کے ہاں آتی جاتی رہتیں۔ وہ پابندی سے چرچ جاتیں۔ پاس پڑوس کے غریبوں کی امداد کرتی ر بڑی دھرماتما سادھوی عورتیں تھیں۔

"دونوں بڑھیاں روز صبح دس بجے ٹیکسی پر بیٹھ کر بازار جاتیں۔ ان کا نیگرو باورچی ایک بڑا سا تھیلا لے کر ساتھ جاتا۔ واپسی پر اس کا تھیلا سامان سے بھرا ہوتا۔ ایک روز میں نے سوچا۔ میں اس جگہ اجنبی ہوں میں بھی ان کے ساتھ سبزی ترکاری کی ان دوکانوں پر جاؤں گی جہاں سے اچھی چیزیں مل سکیں۔ کئی د نکل گئے۔ میں ان فرشتہ صفت بڑھیوں سے نہ مل سکی نہ ان کے ساتھ بازار جانے کے لئے طے کر پائی۔ ایک

جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہوئی ہی تھیں۔ میں نے سوچا دوسری ٹیکسی لے کر میں بھی ان کے پیچھے سی چیدر ر میں پہنچ کر ان کے ساتھ ہی خریداری کروں۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا اس دوسری گاڑی کے پیچھے چلے۔

”میری ٹیکسی مارکیٹ سے گزر کر واٹر فرنٹ کی طرف چلی۔ اگلی ٹیکسی ایک ہوٹل کے سامنے جا رکی جس اندر سے جہازی ملاح نکل رہے تھے۔ ڈرائیور نے ذرا حیرت سے مجھے دیکھا۔ وہ دونوں بڑھیاں اپنی گاڑی اتر کر ہوٹل میں داخل ہوئیں۔ برآمدے میں دس بارہ ملاٹو لڑکیاں صوفوں پر ایک قطار میں بیٹھی سگریٹ پی رہی ن میں تعجب سے ٹیکسی میں بیٹھی دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ بڑھیاں باہر آئیں۔ ٹینگر وبا درچی تھیلا اٹھائے ساتھ تھ۔ دونوں اپنی ٹیکسی میں بیٹھیں اور واپس چلی گئیں۔ ڈرائیور نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ مس آپ ابھی شاید ں نئی نئی آئی ہیں۔ آپ نہیں جانتیں۔ یہ دونوں بڑھیاں پچاس سال پہلے یہاں کی مشہور طوائفیں تھیں۔ دنوں نیو اورلینز سے یہاں آئی تھیں۔ اب اس ہوٹل کی مالک ہیں۔ روز صبح آکر منیجر سے قحبہ خانہ کی آمدنی ساب کتاب کرتی ہیں اور رات کی آمدنی کے نوٹ اس تھیلے میں بھر کر لے جاتی ہیں۔ اور آمدنی کا زیادہ حصّہ ت خلق پر خرچ کرتی ہیں۔ بڑا بڑا پادری لوگ جب یہاں آتا ہے ان کے یہاں ہی ٹھہرتا ہے۔

”جب میں گھر واپس پہنچی۔ وہ دونوں اطمینان سے روکنگ چیئرز پر بیٹھی بائیبل پڑھ رہی تھیں۔

”توردنو ــــ اکثر لوگ دوغلی زندگیاں گزارتے ہیں تم مادموزیل مارسیل اور مادموزیل ماری نہیں۔ تم وہ ٹینگر وبا درچی ہو جو وہ تھیلا اٹھا کر ساتھ چلتا ہے۔ تم بھی شامل ہو۔“

”کیا تم شامل نہیں ہو ــــ ؟ کیا تم کو ویسٹ انڈیز ہجرت کے بعد ایک دولتمند بیرسٹر سے شادی کر کے انوی گورنر جنرل کے ڈنرز میں جانے کے بجائے پلانٹیشنز کے مزدوروں میں انقلابی تحریک کی تنظیم نہیں کرنی ہیے تھی ؟ تم نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ تم تھک چکی تھیں یا ڈزالوژن ہو چکی تھیں یا اب تم بھی آرام اور آسائش واہاں تھیں۔ چراغ مسلسل جلائے رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اب تم محض زبانی یا تخیئلی ہمدردی ، ہو۔ لوگوں کی بے انصافی اور بے ایمانی پر خفا ہوتی ہو۔ مگر تم بھی شامل ہو چکی ہو۔ مسلسل علیحدہ رہنا بہت ہے۔ جو علیحدہ رہتے ہیں ان کو سنکی یا خبطی یا بے وقوف سمجھا جاتا ہے ــــ

”میں نے اخباروں میں تمہارے شوہر کا نام ایک دو بار دیکھا ہے۔ وہ اس جزیرے کی سیاست میں حصہ لے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ ایک دن وہاں کے وزیر اعظم ہو جائیں۔ اور تم پرائم منسٹرز لیڈی۔ اس وقت دیہاتی میں تم سے ملنے آؤں گا۔ اور تم سے پوچھوں گا تم کتنی ’آزاد‘ ہو ــــ تم اور میں لیبوریٹری کی میز پر رکھے ہوئے

مینڈک ہیں جن پر زندگی نے اپنے تجربے کیے ۔"

"لیکن ہماری طرح سب ہی تو بودے نہیں نکلے ۔" دیپالی نے دفعتاً بڑی کمزور آواز میں کہا ۔ "بہت ہیں جنہوں نے اب تک چراغ جلائے رکھا ہے ۔"

"آل لک ٹو دیم ۔" ریحان نے سگریٹ تالاب میں پھینکتے ہوئے جواب دیا ۔

۴۲

ناصرہ نجم السحر قادری

روش پر سے گزرتی ایک اداس صورت لڑکی آہستہ آہستہ چلتی آ کر تالاب کی منڈیر پر بیٹھ گئی ۔

"آداب ماموں جان ۔" اُس نے ریحان کو سلام کیا ۔

"جیتی رہو ۔"

"آداب دیپالی ماشی "

"جیتی رہو ۔ آؤ ۔ یہاں بیٹھو ۔" دیپالی نے تخت کی طرف اسے بلایا ۔

ریحان نے ذرا رکھائی سے دیپالی کو مخاطب کیا ۔ "یہ میری بہن رابعہ کی بیٹی ہیں ۔ مس ناصرہ قادر ک
سے ان کا ذکر کر چکا ہوں ۔"

"ماموں جان پورا نام بتایئے ۔ جہاں آرا خالہ مرحومہ نے میرا نام ناصرہ نجم السحر رکھا تھا ۔ اور میں د
ماشی سے مل چکی ہوں ۔ جب یہ پچھلی بار یہاں آئی تھیں ۔ سن چونسٹھ میں ۔ اکمل کی شادی ۔ اکمل کی ۔
ی آواز ڈوب گئی ۔

"مجھے خوب یاد ہے ۔ کیسی ہو ناصرہ ۔ ؟" دیپالی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا ۔

"آج مجھے معلوم ہوا کہ آپ ویسٹ انڈیز سے آئی ہوئی ہیں ۔ سوچا مل آؤں ۔"

"بہت اچھا کیا ۔ مجھے بہت خوشی ۔ بہت خوشی ۔ آج کل کیا کرتی ہو ؟"

"پہلے جنگ آزادی میں لڑ رہی تھی ۔ اب ایک گرلز کالج میں پولیٹیکل سائنس پڑھاتی ہوں ۔ اسی کالج
آپ نے اور جہاں آرا خالہ نے پڑھا تھا ۔"

"تم جنگِ آزادی میں لڑیں۔" دیپالی نے گویا خود ایک اسٹیٹمنٹ دیا۔

"جی ہاں۔ جب پچھلی مرتبہ آپ یہاں آئی تھیں۔ سن چونسٹھ میں۔ پاکستان ایر فورس کے پائلیٹ آفیسر اکمل مرشد زادہ کی شادی میں شرکت کے لئے۔ اسی تخت پر اسی طرح ایک شام میں نے آپ سے کہا تھا۔ گو ہم مغربی پاکستان کی زیادتیوں کے خلاف ہیں مگر ہم کٹر پاکستانی ہیں اور پاکستان کی حفاظت کے لئے کٹ مریں گے۔" وہ تلخی سے ہنسی۔

"ناصرہ۔ تمہاری والدہ رابعہ کیسی ہیں؟" دیپالی نے تھکی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

"میرے والدین بخیریت ہیں۔ میرے ماموں جان بھی جیسا کہ آپ ملاحظہ کر سکتی ہیں۔ بخیر و عافیت ہیں۔" اس نے ریحان پر ایک تحقیر آمیز نظر ڈالی۔

یہ لڑکی ریحان سے کس حد تک متنفر ہے۔ اور وہ خاموش بیٹھا رہا۔ شاید وہ اس منہ پھٹ، منہ زور، تلخ مزاج، بدزبان نئی پیڑھی سے ہار مان چکا تھا۔ ان سے خائف تھا۔ یا اس کا ضمیر مجرم تھا۔ دیپالی کو وہ وقت بڑا ہی دحشت انگیز معلوم ہوا۔ مجھے یہاں سے بھاگنا چاہئے۔ سیاسی گفتگو کو ٹال کر وہ کچھ دیر تک ناصرہ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔

اسکوٹر کی گڑگڑاہٹ۔ فرقان نے اسکوٹر لا کر سنگھاسن کے بالکل قریب روک دیا۔ "کیا اڈّا ہو رہا ہے؟" اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

"ہاں۔ تمہاری ہی کسر تھی۔ آؤ۔" ناصرہ بولی۔

فرقان، دیپالی نے پہلی بار غور سے دیکھا اپنے انداز اور چال ڈھال میں باپ سے بہت مختلف تھا۔

"یہ پہلے بھوکی پیڑھی کے ہمدرد شاعر تھے اب پیٹ بھری پیڑھی کے لیڈر بننے والے ہیں۔" ناصرہ نے کہا۔

فرقان نے اسکوٹر پر بیٹھے بیٹھے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے۔ "شانتی! شانتی!!" اس نے ہنس کر کہا۔

"شٹ اپ بوگس خونی بیبی فیسٹ۔" ناصرہ نے تلخی سے جواب دیا۔ "معاف کیجئے گا دیپالی دی۔ ہم لوگ ایک بہت بڑے آگ اور طوفان سے ہو کر گذرے ہیں جس کے مقابلے میں آپ لوگوں کی برطانیہ کے خلاف جدوجہد اور تقسیم ہند کی خونریزی ایک پکنک تھی۔"

"شاید یہ ہماری خوش فہمی تھی۔" دیپالی نے عجز سے کہا۔ "ہم سمجھتے تھے نذرالاسلام کے ودروہی ہم ہی لوگ تھے:

"ہم نے بڑی تباہی دیکھی۔ PACIFIST کے بھیس میں کیا لوگ خود سے سمجھوتے نہیں کرتے؟ امن پسند کا ضمیر

کیا کہتا ہے؟" ناصرہ نے پوچھا۔ "انتخاب کیا ہونا چاہیے؟ امن پرستی یا فلسطینی مجاہد؟ امن یا آپ کے نکسلائیٹ؟"

"یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ تم شاید اب بھی ہتھیار نہیں ڈالنا چاہتیں۔ تم شاید ٹائیگر صدیقی کو آئیڈیلائیز کر رہی ہو۔ تم مسلسل پیہم انقلاب کی بات کرتی ہو۔ ناصرہ آپا تم بہت MIXED UP ہو۔" فرقان نے اطمینان سے کہا۔

"یہ ایک بنیادی سوال ہے فرقان احمد ـــــ" ناصرہ چمک کر بولی۔ "کسی دوسرے کو MIXED UP کہنا اوچھا ہتھیار ہے۔ دیپالی ماشی۔ یہ سارا خاندان۔" اس نے ارجمند منزل کی طرف اشارہ کیا۔ "اور ہزاروں لاکھوں مارے گئے۔ میں نے مرگ انبوہ دیکھا۔ میں نے مُلّا کے مذہب کا رول دیکھا۔ میں نے بنگالی پنجابی کی نفرت اور بنگالی بہاری کی نفرت کا سامنا کیا۔ سیاسی لیڈر کا رول دیکھا۔ فرقان احمد! جس وقت ہم یہاں مشین گنوں کا سامنا کر رہے تھے تم اپنے باپ کے پیسے کی بدولت لندن میں مصروفِ عیش تھے۔" وہ ریحان کو اس طرح نظر انداز کر رہی تھی جیسے وہ اس جگہ موجود ہی نہ ہوں۔ چند منٹ بعد وہ اٹھ کر نزدیک روش پر ٹہلنے لگے۔ دیپالی نے ذرا بے آرامی سے پہلو بدلا۔ دلوانی ماں لاجو اس دوران میں کوٹھی کے اندر جا چکی تھی۔ دوبارہ کٹھ پتلی کی طرح سر ہلاتی آکر سنگھاسن کے قریب تالاب کی ایک سیڑھی پر بیٹھ گئی اور پھٹی پھٹی خالی خالی نظروں سے ان تینوں کو دیکھنے لگی۔

اب ناصرہ فرقان سے کہہ رہی تھی ـــــ "ہیومنزم اور QUIETISM اور امن پرستی بڑے خوبصورت الفاظ ہیں۔ لیکن تمہارے ولیم پن اور ساں پیئر اور حیرمی نیتھم آج تک ایک بندوق کی گولی نہ روک پائے۔ گاندھی نے جرمن یہودیوں سے کہا تھا ہٹلر کے مقابلے میں اہنسا استعمال کریں۔ ہا ہا ہا۔ جب یہاں ڈھاکہ گھرا ہوا تھا اس وقت میں ولیم جیمز اور برٹرنڈ رسل کی دہائی دیتی؟ اور تمہارے جارج فاکس کی۔؟ اور تمہارے ٹالسٹائی کی؟"

"ایمرسن۔ جانتی ہو ناصرہ آپا ایمرسن نے کہا ہے کہ جنگ میں دلچسپی ایک کچے اور امیچیور ذہن کی علامت ہے ایک آدمی کے قتل کی سزا پھانسی ہے مگر ہزاروں لاکھوں قتل کر دئے جاتے ہیں۔ ان کے قاتل قومی ہیرو اور جانباز اور مادرِ وطن کے سپوت کہلاتے ہیں اور پھر ایک اجتماعی قتل کو ناجائز قرار دینے کے لئے ایک اور اجتماعی قتل کیا جاتا ہے ـــــ ہم بنگالیوں کو ایک کمزور رومینٹک شعر پرست بودی قوم سمجھا جاتا ہے مگر ٹیٹو میر سے لے کر ٹرسٹ موومنٹ تک اور جب سے مکتی باہنی اور نکسلائیٹ تحریک تک سب سے زیادہ تشدّد یہیں ہوا ہے۔" فرقان نے کہا۔

"اچھا۔ تو میں تم سے ایک سوال کرتی ہوں ـــ" ناصرہ نے جوش سے بات کی۔ "آئین اسٹائن بڑے امن پسند تھے کیا اگر وہ اس وقت زندہ ہوتے تو اسرائیلی EXPANSIONISM کے موافقت نہ کرتے؟ ضرور کر

مغرب کے جتنے یہودی جتنے زیادہ عالم فاضل اور ہیومنسٹ ہیں اتنے ہی زیادہ وہ فلسطینیوں کے مخالف ہیں۔"

"مغرب میں تھوڑے سے یہودی انٹلکچوئیل اعتدال پسند بھی ہیں۔" دیپالی نے پہلی بار بحث میں حصہ لیا۔ وہ ایک ـت بعد اس مانوس خالص بنگالی "اڈے" میں شریک تھی۔ مگر اس زبردست جنریشن گیپ کا بھی اسے شدید احساس ـا جو اس وقت اس کے لوران دونوں کے درمیان حائل تھا وہ ان سے بحث کرتے ہوئے ذرا جھجکتی تھی۔ غالباً ـئش آف ڈیٹ ہو چکی تھی۔ ماضی کے "اڈوں" کا پرانا ساتھی ریحان اپنے خیالات میں کھویا ڈررد شن پر ٹہلنے میں مصروف تھا۔ اور وہ بھی اب اس کا ساتھی نہ رہا تھا۔

"ہر ذہنی رویہ کلاس کی پیداوار ہے۔ امن پرستی سے بھی چند طبقوں کا فائدہ ہوگا۔ آپ پہلے فیکٹری اونر بن جائیے! اور پھر امن کا پرچار کیجیے۔" ناصرہ نے اپنے ماموں اور ماموں زاد بھائی پر کھلی چوٹ کی۔ فرقان خوش دلی سے ہنستا رہا۔ "اور اب شاید تم مذہبی بھی ہوتے جا رہے ہو۔" ناصرہ نے کہا۔

"مذہب میں امن کی اصل روح ہے۔" فرقان نے سنجیدگی سے جواب دیا

"یقیناً! دیپالی آنٹی۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے۔ سی۔ آئی۔ اے نے سوامیوں کے ذریعہ کتنا بڑا جال آدھی دنیا میں پھیلا دیا ہے؟"

"ناصرہ آپا۔ ڈونٹ بی ڈانٹ" فرقان نے برطانوی لہجے میں کہا۔ "کسی کو چھینک آئی! اور تم نے کہا یہ ی۔ آئی۔ اے کی کارستانی ہے۔"

"اور وہ کتنے کامیاب ہیں۔" ناصرہ کہتی رہی۔ "وہ ایک موٹا مسخرہ بال یوگی جو امریکہ میں ہے۔ ایک مشہور لیسٹرن نوجوان انقلابی، نیو لفٹ کا لیڈر اس کا چیلا بن گیا کیا نام اس کا میں نام بھول رہی ہوں اور چیلا بننے کے بعد اس نے پریس کو بیان دیا۔ THE REVOLUTION IS OVER_BABY! __"

"ناصرہ آپا۔ بات یہ ہے کہ اب یسوع بھی میرا ہیرو ہے اور حسینؓ بھی اور حسینؓ کی نسل کے آٹھوں QUIETIST ـام۔ وہ اصل QUIETIST تھے اور چشتی صوفیار۔"

"افیم کا تم پر پوری طرح اثر ہو چکا ہے۔" ناصرہ نے بڑے دکھ سے کہا۔ "مذہب کی امن پرستی! مغرب میں دونوں طرف کی فوجوں کے ساتھ فوجی پادری جاتے ہیں۔ ایک ہی خدا سے فتح کی دعا مانگتے ہیں۔ جو دونوں طرف کے مرنے والوں کے لئے ایک ہی خدا اور اس کے بیٹے سے جنت طلب کرتے ہیں۔ انڈیا پاکستان کی جنگوں میں ایک طرف کے جوان ـرگا کی تصویریں ساتھ لے جاتے ہیں۔ ست سری اکال کے نعرے لگاتے ہیں۔ دوسری طرف نعرۂ تکبیر اور نعرۂ حیدریؑ۔

اور یہاں تو سن اکہتر میں دونوں طرف اسلام ہی اسلام تھا۔" ناصرہ چپ ہو گئی۔ پلاش کے نیچے گلہریاں دوڑتی تھیں۔ سامنے تالاب میں سرخ کنول کھلے تھے۔ دیپالی کو خیال آیا البیر کامیو نے کہا تھا۔ انسان کے مسلسل مبہم سوالات اور کائنات کی مکمل خاموشی ——

ناصرہ پھر گرج کر بولی۔ "کبھی چرچ آف انگلینڈ نے یا پوپ اور امریکہ کے قومی کلیساؤں نے ان جارحانہ لڑائیوں کو ڈناؤنس کیا جو اُن کے لوگوں نے ساری دنیا میں لڑیں؟ پچھلی جنگ میں پوپ نے ناتسیوں اور فسطائیوں کو ڈناؤنس کیا ——؟ اور یہاں تو —— ہمارا یہ پورا دیس ہی مولویوں کا دیس ہے۔ پاکستان کے علماء نے اس جنگ کو ڈناؤنس کیا؟ دونوں طرف ایک سے ایک بڑے مولانا موجود تھے —— یاسمین خالہ مرحومہ کی مثال پیش کردوں ——؟"

"کیا مثال —— ؟" فرقان نے اب ذرا دھیان سے پوچھا۔

"یاسمین خالہ، شاید تمہاری پیدائش سے بھی پہلے ولایت چلی گئی تھیں۔ سگن مگیچے کے مولانا مجید اللہ کی بیٹی۔ پہلے انہوں نے رقص اپنا کیریر بنایا۔ پھر انہوں نے ولایت میں ایک انگریز فیشن ڈزائینر سے شادی کرلی۔ مولانا مجید اللہ نے اُن کو عاق کر دیا۔ حکم صادر کیا کہ کبھی ان کو اپنی شکل نہ دکھائیں۔ یاسمین خالہ کے اپنے لاشعور میں مولویت رچی ہوئی تھی ان کو معلوم تھا کہ انگریز فیشن ڈیزائنر جیرلڈ ایڈرین بلونٹ سے ان کا نکاح قطعی بوگس تھا ایک FARCE ایک پاکستانی نقلی مولوی صاحب، جو دراصل ایک دوست تھے اور گواہ لوگ سب نشے میں آؤٹ۔ تو احساس جرم نے یاسمین خالہ کو ستانا شروع کیا۔ پھر اپنی لڑکی کو اپنی اجازت سے مجبوراً انہوں نے عیسائی بنوا دیا۔ پھر وہ لڑکی نیوڈ ماڈل بن گئی۔ یاسمین خالہ کو ان کے احساس جرم نے مار ڈالا۔ ان کا ضمیر ان کو کھا گیا۔ ٹھیک —— ؟ مجھ کو یہ سب اس طرح معلوم ہے کہ جب ان کو دوسری بار ویسٹ جرمنی میں ہارٹ اٹیک ہوا انہوں نے امّی کو بڑا اندوہناک خط لکھا تھا مفصّل۔ اور آخر میں لکھا تھا کہ رابعہ آپا اگر میں پردیس میں مر جاؤں یہاں نہ جانے میری لاش کا کیا حشر ہو۔ میری موت کی اطلاع پر ڈھاکے کی کسی مسجد میں میری غائبانہ نماز جنازہ ادا کروا دیجیئے گا۔ اچھا تو مولویوں نے یاسمین خالہ کو معاف نہ کیا۔ لیکن جب یہاں کی ہزارہا لڑکیاں ریپ ہوئیں۔ سینکڑوں کو مجبوراً طوائف بنا پڑا تو عالم اسلام کے کسی مولوی نے کچھ نہ کہا ——" ناصرہ چپ ہو گئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

یہ لڑکی اصل باغی ہے۔ بِدروہی۔ ہم لوگ شاید اس حد تک باغی نہیں تھے۔ دیپالی نے سوچا۔ وِدروہی

"اور آپ کو معلوم ہے دیپالی ماشی۔ لوگوں کو کس طرح مارا گیا؟ ان کو اسپتال لے جاتے تھے وہاں کرسی
رہ کر ان کے جسم کا سارا خون نکال لیا جاتا تھا —" دفعتاً وہ زار و قطار رونے لگی۔

AND WOMEN MUST WEEP

AND WOMEN MUST WEEP

دیپالی نے دل میں دہرایا اور خود اپنے آنسو پونچھے۔

"تو پھر کیا میں نہ مارتی —؟ میں نے بھی کومیلا میں اپنے پستول سے ایک پنجابی فوجی سپاہی کو گولی مار دی — اور
جانکنی کا کرب، اس کا تڑپنا اور اس کا مرتا ہوا چہرہ — مرتا ہوا چہرہ مجھے برابر خواب میں دکھائی دیتا ہے۔"
قی رہی۔ "کیا کرے۔ انسان کہاں جائے؟ کس طرف جائے —؟" اس نے آنسو خشک کرتے ہوئے پوچھا۔

"ناصرہ آپا —" فرقان نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے لندن میں ایک بہت پرانی برطانوی فلم دیکھی تھی۔
فیز انیٹی وار فلم PATHS OF GLORY پہلی جنگ عظیم کے متعلق۔ اس جنگ کے زمانے کا ایک
لِلی مارلین دونوں طرف مقبول تھا تو دیپالی آنٹی۔ اتحادی سپاہی ایک جرمن لڑکی کو پکڑ لاتے ہیں اور
سے لِلی مارلین گواتے ہیں۔ اور گاتے گاتے وہ رونے لگتی ہے اور سپاہی خود بھی جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اور پھر
ایک — شاید نوعمر برطانوی سپاہی ہے جو بہت خوفزدہ ہے۔ اور وہ مورچہ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔
سے پکڑ کر واپس لاتے ہیں۔ بھگوڑے کی سزا موت ہے۔ وہ بیمار پڑتا ہے اسے فیلڈ ہسپتال میں داخل
ہیں — اس کا علاج کرتے ہیں۔ جب وہ ذرا بہتر ہوتا ہے اسے اسٹریچر پر ڈال کر میدان میں لاتے ہیں۔ اسٹریچر
نوجوان کو ایک کھمبے سے باندھ دیتے ہیں۔ اور پھر فوجی قانون کے مطابق اسے گولی مار دیتے ہیں —"

ریحان واپس آ چکے تھے اور گلاب خاص کے نیچے کھڑے یہ قصہ سن رہے تھے۔ انھوں نے آہستہ سے کہا۔
رمیں بھی بھگوڑا ہوں۔ ناصرہ — تم — اور دیپالی تم — میرے لئے جو سزا چاہو تجویز کر لو۔"

بڑا دہشتناک سناٹا چھا گیا۔ شام کی ہوا میں جھاؤ کی نازک ڈالیاں سرسراتی رہیں۔

ناصرہ نے سر اٹھا کر پہلی بار ذرا نرمی سے اپنے مضمحل ماموں پر نظر ڈالی اور دھیرے سے ہ "لیکن ماموں
کیا روسی افواج ا ریورپ کے عوامی محاذ والوں کی سرفروشی کے بغیر فسطائیت کو ہرایا جا سکتا تھا؟
عی جنگ بھی جرم ہے؟"

"یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔" باپ کے بجائے فرقان نے جواب دیا۔ "البیر کامیو نے جنگ کے فوراً بعد

لکھا تھا کہ میں کسی ایسی سچائی کو منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں جس کی رو سے بالواسطہ یا براہ راست کسی کی زندگی کی قربانی کا مطالبہ کرنا پڑے ـــــ کیونکہ اسوقت دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد دنیا نیوکلیر عہد میں داخل ہو چکی تھی ـــــ"

اوپر جہاں آرا کے بیڈروم کی کھڑکی کھلی۔ تیز روشنی کا راستہ سا تالاب تک بن گیا۔ زہرہ نے میں سے جھانکا۔ پھر اس نے آواز دی۔ "آؤ ختم کرو۔ کلب سے یاسمین یادگار کیٹی والے کا فون آیا ہے۔ وہاں لوگوں کا ڈنر پر انتظار کیا جا رہا ہے۔"

"آ ـــــ آ ـــــ آ ـــــ" تالاب کی سیڑھی پر بیٹھی گونگی مالا ترائی۔

۴۳

رچرڈ بارلو

ڈنر کی طویل میز پر بہت بڑھیا ولایتی کھانا سرو کیا جا رہا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں پھولوں سے سجی یاسمین بلمونٹ مرحومہ کی تصویر رکھی تھی۔ شہر کے اہم انٹلکچوئیل اخبار نویس، ادیب، چند وزرا ا باقی نئی دولت مند بنگلہ دیشی اپر کلاس کے مرد اور عورتیں چھری کانٹوں سے کھانا کھاتے ہوئے مصروف گفتگو

"تاریخ کے اسباق سے انسان کی نصیحت حاصل نہ کرنے کا نام تاریخ ہے۔" بحری عقاب مچھلیوں اب بھی جھپٹا مار رہے ہیں۔

کھانے کے بعد وہ سب جا کر ایوان نشست میں بیٹھ گئے۔ ریحان الدین احمد شارک اسکن کی سا شیروانی۔ چوڑی دار پائجامہ سلیم شاہی جوتے، سلور گرے بال۔ پہلے سے زیادہ ہینڈسم نظر آ رہے تھے۔ ا اس جگمگاتے مجمع میں اب بھی ہیرو بنے ہوئے تھے۔ اہم، کامیاب، دولتمند ـــــ کل صبح ارجمند منزل بریکفاسٹ کی میز پر وہ صاف گوئی سے کہہ رہے تھے۔ میری مرحومہ امی کی روح خوش ہوگی۔ جن کے ساتھ ا تایا نے بے انصافی کی تھی۔ ان کی جائداد ہڑپ کر کے ان کو ایک غریب کسان سے بیاہ دیا تھا۔ مگر قدرت اب ان کے ساتھ انصاف کیا۔ وہ یہ سن کر بھونچکی رہ گئی۔ انسان کا ذہن، انسان کا دل و دماغ قطعاً نا فہم ہے۔ انھوں نے کہا تھا ـــــ دیکھو میں نے مدتوں پہلے متحدہ بنگال میں جوتیاں چٹخائیں۔ جیل کاٹے۔ پھر

بنگال میں۔ پھر جب مجھے وہاں اور یہاں چانس ملا میں اسے دونوں ہاتھوں سے قبول نہ کرتا؟

شام ناصرہ نے کہا تھا فرقان بھوکی پیڑھی کا شاعر بننے جا رہا تھا اب وہ اس پیٹ بھری پیڑھی کا لیڈر ہوگا۔

کھانا نہایت لذیذ تھا۔ کلب کے چیف شیف نے بہترین فرانسیسی ڈشیں تیار کی تھیں۔ دیپالی نے دوبارہ سوچا اس "جشن یاسمین بلونٹ" پر کتنا بے تحاشا روپیہ خرچ کیا گیا ہوگا۔ جبکہ خود یاسمین نے برسوں در در کی ٹھوکریں کھائیں اور کارخانوں میں مزدوری کی۔

سیاہ چاند پہاڑ کی چوٹی سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا۔ یاسمین تم کیتکی کا پھول تھیں جس نے سانپوں کو اپنی اور کھینچا۔ زندگی کے سانپ تمہیں ڈس گئے۔

اس کے قریب ایک گروپ پاکستان اور بنگلہ دیش کی سیاست پر تبادلۂ خیالات کر رہا تھا۔ "ہم نے یہ کیا۔ انہوں نے یہ کیا ——"

انگریز یا فرانسیسی یا جرمن کہتے ہیں۔ ہم نے یہ جنگ لڑی۔ ہم نے وہ فتح حاصل کی۔ ہم نے فلاں ایکٹ پاس کیا۔ اس سب کونٹینٹ کی ہسٹری میں "ہم" کہیں نمودار نہیں ہوتا —— مغلوں نے یہ کیا۔ ہندوؤں نے یہ کیا۔ پہلے انڈیا اور پاکستان الگ الگ "ہم" تھے۔ اب بنگلہ دیش اور پاکستان الگ الگ "ہم" ہیں۔

اچانک اس نے خود کو کہتے پایا:۔ "اگر جناح صاحب نے پاکستان نہ بنایا ہوتا تو آج بنگلہ دیش بھی نہ ہوتا۔" پھر وہ خاموش ہوگئی۔ اور وہ سوچنے لگی —— "مدر انڈیا" کا تصور بھی باقی ہندوستان کے قوم پرستوں کو دہشت پسند ہندو بنگالیوں نے دیا تھا۔ جو تخریب پسند کالی کے روپ میں شکتی کی پوجا کرتے تھے اور دیوی ماں کے قدیم دراوڑی تصور کے پرستار تھے۔ اور ان اولین دہشت پسندوں میں جن کو انگریزوں نے ٹررسٹ کہا اور ہندوستانیوں نے انقلابی —— کافی اینٹی مسلم بھی تھے۔ اور بنکم چندر کا آنند مٹھ ان کا آدرش تھا۔ اور "بھدرا لوگ" کی سیاست اور "مسلم اشراف" کی سیاست کے CROSS _ CURRENTS نے پاکستان بنایا۔ اور پاکستان کی سیاست نے بنگلہ دیش —— اور انفرادی طور پر مختلف لوگوں کی شخصیتوں اور کرداروں اور مزاجوں اور اعمال و افعال کے CROSS _ CURRENTS کے اثر سے افراد کی اور قوموں کی زندگیاں بنتی اور بگڑتی ہیں۔

وہ جھنجھلا کر سامنے دیکھنے لگی جہاں آرکسٹرا بج رہا تھا۔ اور فلور پر ریحان الدین احمد کا کیمبرج پلٹ بیٹا فرقان برطانوی سفارت خانے کی ایک لڑکی کے ساتھ مصروفِ رقص تھا۔ اس لڑکے کی تازہ ترین ذہنی تبدیلی

جدید، عصریُ مغرب کی نوجوان نسل کے ذہنی رویّوں نے کی تھی۔ وہ برطانیہ اور فرانس کے "نیولفٹ" اور طارق علی کے دور کے بعد کی پروڈکٹ تھا۔ کیا اس امن پرست انٹلکچوئیل فرقان احمد کو معلوم ہے کہ ایک زمانہ میں انقلابی نظمیں لکھنے کی سزا کالا پانی تھی؟ کیا ہم پر تاریخ کے دروازے بند کر دئے جائیں گے۔ میرے چچا دنیش چندر سرکار پھانسی کے تختے پر کیوں لٹک گئے؟ ان کا نام اب کسے یاد ہے؟ یا اشفاق اللہ کا؟ اور اس باغی ناصرہ نجم السحر کا کیا ہوگا؟ کیا بہت جلد وہ خود بھی اپنے موجودہ خیالات کو ترک نہیں کر دے گی؟ کیا کسی ایسے رویّے کے BACKLASH کے طور پر پھر کوئی نیا رویّہ نمودار نہیں ہوگا؟ ناصرہ کب تک باغی رہ پائے گی جب انقلابی مسلسل ایک دوسرے کو REVISIONIST کہہ رہے ہیں؟ جب خود انقلابی اعتدال پسندوں کو انتہا پسند ایک ESTABLISHMENT پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور جب لیڈروں کے ذاتی کرداروں اور ان تعصبات، کمزوریوں اور ان کے مزاجوں اور اعصابی کیفیتوں کا اثر ان کی رہبری پر پڑتا ہے؟ پائلیٹ جو مسافر بردار طیارہ اڑاتا ہے اس کی صحت اور اعصاب کا برابر معائنہ کیا جاتا ہے۔ مگر لیڈر کی ذہنی اور اعصابی صحت کو بالکل نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ہم لوگوں نے، ہماری جنریشن نے کیا کیا ــــ؟ اب ایسا لگتا ہے کہ ہم لوگ ہچ ہائیکر تھے راستے کے کنارے کھڑے انگوٹھے دکھا رہے تھے۔ ایک کار رکی اس نے لفٹ دے کر ماسکو پہنچا دیا۔ دوسری کار رکی اس نے واشنگٹن۔ کچھ لوگ اونٹ پر بیٹھ کر مکّہ مدینہ واپس گئے۔ کچھ بیل گاڑی پر بیٹھ کر بنارس۔

میرے لئے جو کار رکی وہ ذرا آگے جاکر ہی فیل ہوگئی۔

بنگال کی ویشنومت میں ہر مرد کرشن اور ہر عورت رادھا کی تصویر ہے۔ گو اس کو یہ بات معلوم نہیں۔ تو کیا ریحان کرشن تھا اور میں رادھا ــــ؟ لڑکپن میں یہی سمجھا کرتی تھی ــــ ابھی گرمیاں آئیں گی اور یہاں میرے اس پیارے حسین دیس میں کدم کے دل کی شکل والے پتوں میں زرد پھول کھلیں گے۔ لاکھ کے پیڑ پھولوں سے لد جائیں گے۔ سلطانہ چمپا مہکے گی۔ برسات آئے گی۔ ساگوان کے سفید پھول ــــ

"آپ، مجھے مسٹر ریحان الدین احمد نے بتایا کہ برطانوی راج کے خلاف بنگال کی انڈر گراؤنڈ انقلابی تحریک میں شامل رہ چکی ہیں۔" ایک صحافی نے قریب آکر بیٹھتے ہوئے اس کا سلسلۂ خیالات منقطع کر دیا۔ "کل صبح میں آپ کا انٹرویو لے سکتا ہوں۔ مع تصویر ــــ؟"

"ہر گز نہیں۔ ہر گز نہیں ــــ چلے جائیے میرے پاس سے۔" اس نے تقریباً چلّا کر درشتی سے جواب دیا۔

نک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

آئی ایم سوری مسز سین —" صحافی نے نرمی سے کہا اور وہاں سے ٹل گیا۔

"عجیب بد مزاج بڑھیا ہے۔" اس نے باہر جا کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

اب گلپوش ڈائس پر تقریریں شروع ہو چکی تھیں۔ مادام یاسمین بلمونٹ مرحومہ کو خراج عقیدت ضوع تھا۔ ان کے فن کی عظمت پر روشنی ڈالی جا رہی تھی۔ ابھی اس سے بھی تقریر کرنے کے لئے کہا ا آخر اسی مقصد کے لئے اسے اتنی دور ویسٹ انڈیز سے مدعو کیا گیا ہے۔ عجیب بات تھی۔ اس سے ں میں آج تک کسی نے گانے کے لئے نہیں کہا تھا۔ شاید لوگ یہاں کب کے بھول چکے تھے کہ وہ عباس الدین شاگرد تھی۔ کہ ایک زمانے میں اس کے ریکارڈ گھر گھر بجتے تھے۔ کہ وہ آل انڈیا ریڈیو ڈھاکہ سے گاتی تھی۔ یو پاکستان ڈھاکہ بنا اور اب ریڈیو بنگلہ دیش — آواز کی لہریں۔

ریحان تک نے یادگار کمیٹی والوں سے نہیں کہا تھا کہ وہ تقریبات میں کسی روز اس کے گانے کا پروگرام یں۔ ہر طرف عجیب کنفیوژن تھا۔ ریحان اب ہائی فنانس کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ ناقابلِ یقین!

وہ ہال کے ایک کونے کی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ اب ایک اور نوجوان اس کی طرف آیا۔ جھک کر ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس مادام یاسمین بلمونٹ کی ڈائری ہے۔ کیا آپ اسے ہمیں عنایت کریں گی۔ ہ بڑے شاندار طریقے سے کتابی صورت میں چھپوائیں گے۔ وہ ایک ادبی شاہکار ہوگا۔"

دیپالی کا چہرہ طیش سے سرخ ہو گیا۔ اس نے زہریلی نظروں سے نوجوان کو گھورا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ئی جواب نہ دیا اور تیز تیز چلتی ایوان نشست سے باہر نکل آئی۔ اور برآمدے کے آخری در میں جا کر کھڑی ہو سامنے جامن کے درختوں پر پونم کا چاند نکل آیا تھا۔ وہ چاند بھی بہت پشیمان معلوم ہوتا تھا جس طرح ن تھی۔ اور اندر سے دل ہی دل میں ریحان نادم تھا۔ اور ادر یاسمین تو اتنی پچھتائی تھی کہ اس دنیا ہی سے نکلی تھی۔

در کے نزدیک بچھی چھوٹی میز پر ایک سفید فام نوجوان تنہا بیٹھا ڈنر کھا رہا تھا۔ ایک خاتون کو کھڑا دیکھ کر مغربی تہذیب کے مطابق تعظیماً وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

"اندر اتنا ہجوم ہے کہ میں گھبرا کر باہر آگئی۔" دیپالی نے کھوکھلی آواز میں کہا۔ "اس عمر میں انسان زیادہ ھیڑ کا برداشت نہیں کر سکتا۔ میں بہت دور سے آئی ہوں۔ ویسٹ انڈیز سے — یہاں بیٹھ جاؤں

"شیور۔ میم۔"

وہ مقابل کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں کرسٹفر ٹیگرٹ ہوں۔ میں یہاں سیر کے لئے آیا ہوں۔ اس وقت اپنے ایک دوست کا انتظا
رہا ہوں۔ اب تک نہیں آیا۔ لے لیجئے وہ آ رہا ہے۔"

ایک اور سفید فام سنہرے بالوں والا نوجوان لمبے لمبے ڈگ بھرتا آکر میز کے قریب کھڑا ہو گیا۔

"رچرڈ بارلو۔"

"مسز سین۔" "ہاؤ ڈو یو ڈو۔"

"ہلو۔" مسز سین نے کان کھڑے کئے۔

"یہ واقعی بہت مختصر دنیا ہے۔ میں تمہارے والد کو جانتی ہوں اور تمہارے بھتیجے سے چند روز ق
ایتھنز کے راستے میں ملی۔ تمہارا سوتیلا بھتیجا سوامی آتم انند شنکر پرمی۔"

"اوہ۔ آتم آنند۔ کریزی گائے۔" ڈک بارلو نے شفقت سے مسکرا کر سر ہلایا۔

"وہ اگلے مہینے رشی کیش میں تمہارا انتظار کرے گا۔" مسز سین نے کہا۔

ڈک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ اٹھائیس سال کی عمر میں کامی
انٹیریئر ڈیکوریٹر بن چکا تھا۔ مگر زندگی سے مطمئن نہ تھا۔ اس کے دوست کرسٹفر نے اس کے لئے بیرے ک
کا آرڈر دیا۔ ڈک نے کہا۔ "آرتھر کوئسلر نے کہیں پر لکھا ہے کہ اتفاقات کا سلسلہ عقل چکرا دیتا ہے۔
دیکھئے مسز سین۔ آپ کی میرے بھتیجے سے اور مجھ سے ملاقات!"

"ساری زندگی اتفاقات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔" دوسرے انگریز نوجوان کرسٹفر ٹیگرٹ
بہت زیادہ ذہین معلوم نہ ہوتا تھا فلسفیانہ انداز میں اظہار خیال کیا۔

بیرے نے مچھلی کی ڈش لا کر رچرڈ بارلو کے سامنے رکھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں سبزی خو
چکا ہوں۔ میرے لئے سلاد لے آؤ۔" یہ مچھلی ۔۔۔ اس نے دیپالی کو مخاطب کیا ۔۔۔ "کیا معلوم میری مرحو
پھوپھی مس ایلس بارلو یہ مچھلی رہی ہوں۔ وہ گاروہلز میں مشنری تھیں۔ اور ان کی بھی پھوپھیاں ۔۔۔ میری
گریٹ آنٹ۔ مشنری میبل بارلو سیتاپور میں ہیضے سے مریں۔ اور مس ماڈ بارلو چین میں مشن چلاتی تھیں۔
باکسر بغاوت کے دوران چینیوں نے مار ڈالا۔ آنٹ ایلس کو گاروہلز میں کمیونسٹ قبائلیوں نے قتل کر دیا۔

اپنے خیال میں شہید ہوئیں۔ اس وقت زرد پیلے پر اگائے نُور کے ہالے پہنے یسوع مسیح کے سامنے میں گا رہی ہوں گی ۔۔ میتھوڈسٹ حمد ۔

THERE IS A HAPPY LAND
FAR FAR AWAY
WHERE THE SAINTS IN GLORY
STAND BRIGHT BRIGHT AS THE DAY"

وہ گنگنانے لگا۔ وہ متواتر شراب پی رہا تھا اور اس کا عرق آلود چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ "مسز سین
یں آسٹریلیا میں مَیں بھی اسکول میں یہ حمد گایا کرتا تھا۔ لیکن ہیپی لینڈ کہیں نہیں ہے۔ یورپ، امریکہ،
تان، بنگلہ دیش، انڈیا، پاکستان ۔۔ کہیں نہیں۔ اور میرا سوتیلا بھتیجا سوامی آتم آنند شنکر پریمی
ہے ہم سب اپنی اپنی کرموں کا پھل ۔ کھا رہے ہیں ۔۔ اور اپنے سنسکاروں کے مطابق میری بے چاری
ں چھارا خشک مزاج مجرد مقدس آنٹ ایلس دوسرا جنم لے چکی ہوں گی۔ تو کیا پتہ وہ اس مچھلی کی جون میں
بنگال کے ایک دریا میں پیدا ہوئی ہوں۔ اور وہ مچھلی اب اس پلیٹ میں میرے سامنے تلی ہوئی رکھی ہو ۔۔
بے چاری آنٹ ایلس بارلو کو کس طرح نوش کر سکتا ہوں۔ ہاہا"

اب اس نے کرسٹفر ٹیگرٹ کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے پچکارنے لگا۔ دیپالی دفعتاً شدید کراہیت
اتھ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ ڈک بارلو کہتا رہا۔ "مسز سین۔ میم۔ گو میں ۔ BI ہوں مگر مجھے کرسٹفر سے
بت ہے کہ شاید ہم دونوں شادی بھی کر لیں۔ آپ کو پتہ ہے GAY شادیاں اب کافی ہونے لگی ہیں۔"

کرس ٹیگرٹ نے شراب زیادہ نہیں پی تھی اور اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ وہ دیپالی سین کے سامنے
پ کر سرخ ہو گیا۔ اندر ہال میں یاسمین بلمونٹ مرحومہ کے متعلق تقریریں جاری تھیں۔ دیپالی نے کہا۔ "اچھا
نٹ۔ اب میں چلتی ہوں۔"

ڈک نے دہرایا۔ "کیا پتہ اس پلیٹ میں آنٹ ایلس بارلو تلی ہوئی رکھی ہوں یا گریٹ آنٹ میبل ان کو
SIZZLER پر تلا گیا ہو۔ چھُن چھُن چھُن۔ ہم سب SIZZLER پر تلے جا رہے ہیں۔ آپ بھی میں بھی
سب۔ میں ۔ BI ہوں۔ اگر میرے بنگال سویلین امپیریلسٹ بارلو بزرگوں کو اور ناسور گریٹ گرینڈ فادر
یڈورڈ بارلو اور میرے چچا ونگ کمانڈر رچرڈ بارلو کو جن کے اسم گرامی پر میرا نام رچرڈ ایڈورڈ بارلو رکھا گیا۔

معلوم ہو جائے اور میرے خاندان کی ان نامور مرحومہ مشنری خواتین میشلڈا، میبل، ماڈ، ایلس کو معلوم کہ چارلس بارلو آئی سی ایس کا ایک پوتا ہندو سوامی بن گیا اور جیمز بارلو کی ایک پوتا، چارلس بارلو کا ا GAY، تو ان کی قبروں کے اندر ــ قبروں کے اندر بھونچال آجائے گا۔ مسز سین آپ اب بھی .. ہیں۔ ہم NOW جنریشن والے صاف گو لوگ ہیں۔ ریا کاری آپ لوگوں کا اور آپ کے پرکھوں کا تھا۔ میرے بارلو بزرگ اور ان کے ساتھی جب MERRY انگلینڈ کے پبلک اسکولوں میں پڑھتے بھی GAY ہوا کرتے تھے۔ مگر او سکر وائیلڈ کو پرسیکوٹ کرتے تھے۔ لیڈی چیٹرلیز لور ممنوع تھی۔ خواتین وہی سب کرتی تھیں۔ آپ بہت جاذب نظر خاتون ہیں۔ میں BI ہوں۔ کیا آپ محض ERO ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو صدمہ پہنچایا۔ آپ غالباً ایک CLOSET CASE ہیں

وہ جلدی سے اٹھ کر تیز تیز قدم رکھتی واپس کلب کے اندر چلی گئی۔

۴۴

آتمارشانتی ـــ؟

بنگلہ دیش بمان سے ڈم ڈم پر اُتر کر وہ سیدھی ریلوے اسٹیشن گئی۔ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا۔ ا کے تیس سال بعد کے ہندوستانی عوام کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ ٹرین کلکتے سے نکلی۔ پرانے مٹھوں اد الیسٹ انڈیا کمپنی کے کائی آلود دو منزلہ بنگلوں کے برابر سے گزرتی۔ بولپور روانہ ہوئی۔ مقابل کی سید ایک بوڑھی بنگالی بیوہ بال منڈائے سفید موٹی دھوتی کے آنچل سے سر ڈھانپے اکڑوں بیٹھی بڑے انہماک سے کدو کے بیج نکال رہی تھی۔ نوکیلی مونچھوں والا ایک تنومند لمبا تڑنگا پوربی کبھیا گلے میں ت پہنے اپنی چار سالہ بچی کو گود میں بٹھائے کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ بچی کی مانگ میں گہرا سیندور رچ چائیلڈ میرج اب بھی موجود ہے۔ اسے یہ دیکھ کر دھکا سا لگا۔ کونے میں تین طالب علم ایک سیاسی میں مصروف تھے۔ پھر انہوں نے اُکتا کر ایک ساتھ لمبی جمائی لی۔ دوسرے کونے میں ایک بدصورت مارو عورت کارچوبی نائیلون کی گلابی ساری کے آنچل کا گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔ ایک اندھا دشنو بھک ایکتارہ بجاتا بھیک مانگتا کوریڈور میں سے گزرتا ڈبے میں آیا۔ اور مادھو آچاریہ کا مدھر اشٹک الاپنے لگا

دھرم مدھرم ودنم مدھرم نینم مدھرم ہستم مدھرم ۔۔۔ دو مسافروں نے اسے پانچ پانچ پیسے دیئے۔ وہ کچھ دیر متوقع کھڑا رہا۔ پھر ٹٹولتا ٹٹولتا باہر چلا گیا۔ ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی۔ دو مسلمان کسان ۔ بڑی سی چھجے والی تنکے کی ٹوپیاں، چارخانہ تہمدیں، چھدری داڑھیاں، ایک کے باہر کو نکلے ہوئے دانت ۔ ایک بوری اٹھائے اندر آئے۔ ڈبہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ دونوں فرش پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ ٹرین پھر روانہ ہوئی۔

دونوں طرف دھان کے کھیتوں میں سارس کھڑے تھے۔ سپاٹ غیر دلچسپ لینڈ اسکیپ۔ بنگلہ دیش کے مسحور کن پکچریسک مناظر سے اس قدر مختلف۔ وہ میرا وطن تھا۔ دیپالی نے سوچا اور اس کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ وہ میرا وطن تھا ۔۔۔ مشرقی بنگال۔ جس کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں ۔ اور میں جلا وطن۔

بردوان اسٹیشن آیا اور نکل گیا۔ بولپور پر ٹرین رکی، بیگ اٹھا کر وہ پلیٹ فارم پر اتری۔ سامنے ہی شو کیس میں شانتی نکیتن کی مشہور ریشمی ساریاں رکھی تھیں۔ اور مرشد آباد میں اب بالوچر ساریاں دوبارہ بنائی جا رہی ہیں۔ روایتی بالوچر کاریگر استاد عبدالباسط خان کو راشٹرپتی کی طرف سے قومی انعام مل چکا ہے۔ کلکتہ میں کھوکھو کی بیوی نے اسے بتایا تھا جو کاٹیج انڈسٹریز کے محکمے میں ملازم تھی۔ اسٹیشن کے باہر سائیکل رکشاؤں کا ہجوم۔ مدقوق رکشا والے۔ ایک لڑکا دانت نکوسے خالی رکشا چلاتا اس کی طرف آیا۔ سامنے چھوٹا سا بازار۔ اسلامیہ ہوٹل۔ بڑی مسجد۔ پرانا مانوس شانتی نکیتن۔ چند منحنی سے طلبا اٹیچی کیس سنبھالے رکشاؤں پر بیٹھے اسٹیشن کی طرف آ رہے تھے۔

"کہاں چلوں دیدی؟" لڑکے نے پوچھا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟" اس نے پوچھا۔

"آمار نام علی حسین۔"

"علی حسین!" اس نے دہرایا۔ یہ مدقوق رکشا والا علی حسین انڈیا میں بھی موجود تھا۔ بنگلہ دیش میں بھی پاکستان میں بھی۔ اس کے لئے کچھ نہیں بدلا تھا۔

گیسٹ ہاؤس پہنچ کر اس نے اپنے پرانے پروفیسروں کے متعلق دریافت کیا۔ چند مر چکے تھے۔ پروفیسر مرتضیٰ حسین بھی مر چکے تھے جن کے اصرار پر وہ یہاں داخلہ لینے آئی تھی۔ ایک کمرے میں جا کر وہ دھم سے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ باہر رات کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ اور کمرے میں مچھر بھنبھنا رہے تھے۔ اجاڑ۔ اُجاڑ۔ اُجاڑ۔ جلد از جلد پورٹ آف اسپین اپنے گھر واپس پہنچنا چاہئے۔ اس نے اپنے نفیس شاندار بیڈروم کا تصور کیا۔ للت اس وقت

نہ جانے کیا کر رہے ہوں گے۔ وہاں اس وقت نہ جانے کیا بجا ہوگا۔ راونتھ۔ اب یہ سوچنے میں کون سر کھپائے کہ اس وقت وہاں کیا بجا ہوگا ـــ

بے رونق ڈائننگ ہال میں جا کر اس نے بدمزہ کھانا کھایا۔ بدمزہ کھانا۔ بے تکے لوگ۔ پہلی بار اسے احساس ہوا جنوبی امریکہ میں اٹھائیس سال گزارنے کے بعد وہ اس جگہ کے لئے اجنبی ہے۔

صبح تیز دھوپ میں وہ اپنی پرانی مادر درسگاہ پہنچی۔ بے رنگ۔ بے رونق۔ معمولی نوعمری میں یہ جگہ خوابستان معلوم ہوتی تھی۔ شانتی نکیتن کا رومانس! علم و فن اور آدرشوں کا گہوارہ! وہ ادھر ادھر ٹہلی۔ ٹیگور کے مکان کا چکر لگایا۔ واپس گیسٹ ہاؤس جا کر کھانا کھایا۔ سوئی۔ شام کو پھر باہر نکلی۔ یہ جگہ اس کے لئے اجنبی تھی۔ تعجب! بیدلی کے ساتھ اس درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئی جہاں وہ اپنے طالب علمی کے زمانے میں بیٹھا کرتی تھی۔ جہاں مہارشی دیبندرناتھ ٹیگور کو اچانک عرفان حاصل ہو گیا تھا۔

آمار پرانیر آرام

مونیر آنند

آتمار شانتی

غلط۔ بالکل غلط۔ سب فراڈ ہے۔ کیسا عرفان۔ اور کس چیز کا۔

تنے کی اوٹ میں چند لڑکیاں باتوں میں مصروف تھیں۔ وہ امیتابھ بچن اور دھرمیندر کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ سامنے فلم فیئر۔ اسٹارڈسٹ اور اسٹار اینڈ اسٹائل رکھے تھے اور ایک ٹرانزسٹر۔

یہ برصغیر ایک ایسا خلا ہے جس میں معلق نوجوان ٹرانزسٹر پر فلمی گیت سن رہے ہیں۔ ناصرہ نجم السحر اور اس کے جیسے نوجوان شاید بہت جلد اب ان تینوں ملکوں میں انوکھے سمجھے جائیں گے۔ آؤٹ سائیڈرز۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ذرا دقت سے اٹھی۔ سبزے پر سے گزرتی پھاٹک کی سمت بڑھی۔ کلابھون کے باغ میں مہاتما بدھ کا مجسمہ نظر آیا۔ سارا مجسمہ مٹی کا تھا۔ پاؤں بھی مٹی کے تھے۔

شام ہو گئی اور سال کے ایونیو کے پرے سنتھال پرگنے کے کسان درانتی لئے اپنے گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ کنول اور فصل اور دھنک کے دیوا! سوریہ ورن پرتھوی! تو کہ بیج ہے اور درانتی اور ہمارا ہاتھ۔ اور ہمارا دل اور ہمارا گھر۔ تیری تقدیس ہم نے جھانجھ اور بانسری بجا کر کی۔ وہ جنگل کی طرف بڑھی۔

چاند نکل آیا۔ کنج کنج پھرے شام۔ کنج کنج پھرے ـــ دور ایک گول سفید سمادھی چاندنی میں

نماب رہی تھی۔ چاروں طرف سے بند کسی مٹھ کے تہہ خانے کی طرح ہیبتناک گول سمادھی۔ سفید نیچا سا نبد۔ پچھلے کسی زمانے میں ستی ہونے والی کسی مظلوم بے چاری کی خوفناک یادگار۔ دیپالی نے اپنی پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھے۔ دہشت زدہ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کنج سے باہر نکلی اور سڑک پر چلنے لگی۔

بولپور کے ہینڈلوم کارخانے میں باریش مسلمان بنگالی جولاہے کرگھوں پر ساریاں بُن رہے تھے۔ اُن کے رکھوں نے ڈھاکے کی ململ اور مرشد آباد کا ریشم بُنا تھا۔ "مجبور ہیں کرگھے پر بیٹھے، رات پڑے کرگھے پہ بیٹھے۔ ور کے پروں ایسے رنگ والی ساریاں بُننے والے ـــ کسی مہاراجکماری کے بیاہ کے لئے ساریاں بُننے والے ولاہے ـــ او میاں جولاہے ـــ" سروجنی دیبی نے پوچھا تھا۔ "سرد چاندنی میں۔ اتنے سنجیدہ، گمبھیر بیٹھے یا بُنتے ہو میاں جولاہے؟

"شاعرہ! پروں جیسا، بادل جیسا سفید، کسی مرنے والے کا کفن بُنتے ہیں ہم ـــ دلہن کی سرخ ساڑھی ور موت کا سفید کفن ـــ تانا بانا ـــ زندگی اور موت ـــ سکھ اور دکھ ـــ نیکی اور بدی ـــ امن اور تشدد یحان اور جہاں آرا ـــ یاسمین اور شہرزاد۔ فرقان اور ناصرہ نجم السحر۔ چارلس بارلو اور سوامی آتم آنند۔ ادھا بنرجی اور رادھیکا سانیال۔ ریحان اور زہرہ۔ ریحان اور دیپالی ـــ گوری۔ میں نے تمہارے لئے الاب کھدوالا ہے۔ اور سبزی باڑی بنائی ہے۔ میں تمہارے لئے سیندور کی ڈبیا اور ڈھاکے سے سینگ کی وڑیاں لاؤں گا۔" یاسمین ایک بار کہہ رہی تھی وہ ایک روز اپنا ٹروپ بنائے گی۔ اور مولوی حشیم الدین کے کشتی کا نتارا ماتھ کا بیلے تخلیق کرے گی۔" "دیکھو ہم نے اس کتاب پر سروجنی دیبی سے دستخط لئے ہیں۔ سے سنبھال کر رکھنا۔" "دیپالی دیدی میں نے ارجمند منزل کے جلسہ گھر میں سروجنی دیبی کے پالکی بردار کا بیلے یش کیا۔ ہیج ہیج پالکی چلے ـــ پالکی چلے ہو ـــ ہو۔" "میری اُن کی پریت پرانی اُن بِن۔ کل نہ پاؤں ہاں بٹھادے تاں ہی بیٹھوں۔ بیچے تو بِک جاؤں ـــ ارے وہ تو دھنک کی طرح غائب۔ چاند بجھ یا۔ چاندنی بجھ گئی۔

"آدھی رات کا جنگل جہاں ستیہ پرندوں کی آواز میں چہکا اور محبت ستاروں میں جھلملائی اور شانتا ریوں کے روپ میں بھی ـــ" "خزاں نے گایا۔ الم کے دل پر برستی شفق بادلوں پر پھیلی۔ دھان کے کھیتوں کے سنہرے طوفان کو تیز آندھی نے بادل کی طرح اُڑا دیا۔ ہوا نے مجھے آواز دی۔ تم سب کے جاگتے خواب ان

پتّوں کی طرح بکھر گئے — "سانپ افیون کے پھولوں میں خوابیدہ اور جگنو خاموشس چیتے کا راستہ روشن ک رہے ہیں۔" بنگال کے ایک قدیم کوی نے کہا تھا — "ہوائیں جنگل کے مندر میں رقصاں ہیں اور خاموش کا دیوتاؤں کو عود لوبان چڑھا رہی ہیں۔" شہزادی زیب النساء — نہیں — بیگم جہاں آرا مرشد زادہ پھول بن میں چھپی کچھ کہہ رہی ہے۔ مگر اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آتے۔ جہاں آرا، اور یاسمین اور گونگی مالا تینوں کائنات کے جلسہ گھر میں پردے کے پیچھے سے مسلسل چلاّتے جا رہی ہیں۔

- OFF-STAGE

اب صبح کا نارنجی وشنو بیراگی سورج کا لوٹا ہاتھ میں لئے دریا کی اور بڑھ رہا ہے۔ وہ نیلوفر جو آنے وال بہاروں میں کھلیں گے۔ وہ ستارے جو آنے والی راتوں میں جگمگائیں گے۔ وہ یاتری جو مستقبل کے معب کی سمت بڑھیں گے۔ پتّوں کی مہک میں ساوتری کا الم اور سیتا کی وفا اور رادھا کا عشق اور شک کے آنسو اور دمینتی کا خوف پوشیدہ ہے۔

شاعر نے کہا۔ اور زرد پھول جو بہار کے قدموں کے گھنگرو ہیں۔ اس نیم تاریکی میں کسی پہلے خلا کے چمکیلے بھوت معلوم ہو رہے ہیں۔ آسمان کی منڈیر پر ستاروں کے دیئے جل رہے ہیں۔ بادل نوکاؤں کی طرح آسمان کے دریا پر سے گزرتے جا رہے ہیں۔

بولپور ریلوے اسٹیشن کے سامنے مسجد کے نیچے برگد تلے ایک مسلمان بوڑھی اندھی بھکارن اللہ پکار رہی ہے۔

"زندگی کا میلہ جو ابدیت کے میلے کی سمت رواں ہے۔ ایک بوڑھی فقیرنی مسلسل کلمہ پڑھتی ر ہے۔ وہ بارش اور دھوپ میں بیٹھی افلاس اور بھوک اور دکھ سے مصروف گفتگو ہے مگر بشاش دنیا اس پکار سنے یا نہ سنے اس کا ایمان اس کی حاجت اور مصائب سے زیادہ صاف شفاف ہے۔ لا الٰہ الا اللہ م الرسول اللہ" سروجنی دیبی نے کہا۔

ریلوے اسٹیشن کے سامنے رکشاؤں کا ہجوم۔ ہنس مکھ مدقوق علی حسین اسے اپنی رکشا پر گیسٹ ہاؤ سے لایا ہے۔ "دیدی اب کب آیئے گا۔؟" وہ بشاشت سے پوچھتا ہے۔

"معلوم نہیں۔" وہ جواب دیتی ہے۔

سامنے مسجد کے زیر سایہ برگد تلے، بوڑھی اندھی بھکارن لوگوں کے قدموں کی چاپ پر دھیان ل [illegible] بیٹھی ہے۔

۴۵

ونگالہ راگنی

علی پور روڈ کلکتہ اپنی کوٹھی کے برآمدے میں روکنگ چیر پر بیٹھی کماری ادمارلے بالکل اپنی مرحومہ والدہ ن پری توش رائے معلوم ہوئیں۔ وہی غصیلا چہرہ۔ وہی جھُرّیاں۔ بائیں ہاتھ میں بڑے سے زمرّد کی وہی انگشتری رشال۔ برف جیسے سفید بال۔ بالکل کوئی بیوہ مہارانی۔ راج ماتا۔ پہلے جتنی موٹی تھیں بیماری کی وجہ ب اتنی ہی دبلی ہو گئی تھیں۔

وہ اپنے پوڈلز کو ناشتہ کروا رہی تھیں۔ باغ میں چند کالے کلوٹے ننگے پوربی بچے کھرپی لیے گھاس کھودنے مروف تھے۔ چالیس سال قبل ووڈلینڈز۔ رمنا۔ ڈھاکہ میں بھی یہی منظر تھا۔ کون کہتا ہے کہ دنیا بدل گئی۔ یا وش انقلاب" آگیا۔ یا نکسلائیٹ تحریک چلی۔ اور وہی اوتوکریٹک ارسٹوکریٹک ٹھا ذیبی۔ جے کالی :والی۔

"نومشکار اُدمادیدی۔"

"نومشکار۔ کیسے آئیں۔" اب وہ زیادہ کرینکی ہو گئی تھیں۔ دیپالی نے بنگلہ دیش اور انڈیا آنے کا سد بتایا۔

"تم کو معلوم ہے۔ میرا بھائی نرملیندو شراب پی پی کر مر گیا۔ ریحان مجھے چھوڑ کر بنگلہ دیش چلا نغا باز۔" ان کی جھرجھری آواز بھرّا گئی۔ ریحان کی وجہ سے ان کی زندگی کتنی بڑی ٹریجڈی رہی۔ دیپالی سوس کیا۔ وہ خود کنارے پر کھڑی ہلکی پھلکی تماشائی ہے۔

"ریحان اپنی رُوٹس میں واپس گیا اُومادی۔ ایک وقت آتا ہے جب انسان محسوس کرتا ہے کہ ایک موہوم تہذیبی تصادم اور بے آرامی سے بہتر ہے کہ انسان اپنی جڑوں میں واپس چلا جائے۔"

"کیا وہ تم سے یا مجھ سے شادی کر لیتا تو کلچر CLASH کا سامنا کرتا؟"

"شروع میں نہیں۔ مگر آخر میں — بڑھاپے کی طرف بڑھتے ہوئے انسان کو اپنے تہذیبی گہوارے کی ت ہوتی ہے — وہ اپنی ماں کی تہذیب کا متلاشی ہوتا ہے —"

"کیا ارجمند منزل اس کا گہوارہ ہے؟" اُوما دیبی نے آگ بگولا ہو کر پوچھا۔ اور غصّے سے ہا کر کھانسنے لگیں۔

"غالباً۔ ایک حد تک۔ ارجمند منزل بھی۔ اور زہرہ بھی۔" دیپالی نے اطمینان سے جواب دیا میں لڑکپن سے ان سے ڈرتی آئی ہوں۔ اب میں کیوں ڈروں۔ اب یہ میرا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔ اب یہ Bully نہیں کر سکتیں۔ اب میرے بال بھی سفید ہو چکے ہیں۔ اور اب ریحان الدین احمد بھی درمیا نہیں ہے ۔۔۔ نہ ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ یک لخت اسے ایک انتہائی کمینہ خی کیا ۔۔۔ اب میں اُوما رائے سے زیادہ دولتمند ہوں۔ پورٹ آف اسپین میں میرا کولونیل مینشن وُوڈلینڈز کم شاندار نہیں ۔۔۔ تو رعب کس بات کا۔؟ کرسی پر آگے کو جھکی کھانستی ہوئی کھجور کی طرح سوکھی جھر اُوما رائے بیحد قابلِ رحم اور مضحکہ خیز معلوم ہوئیں۔ کیا ہمیں ان سب کو معاف کر دینا چاہیے۔ جنہوں ہمیں اذیتیں پہنچائیں؟ کیا یاسمین نے بھی معاف کر دیا تھا؟ شِوا ۔۔۔ شِوا ۔۔۔

"میں نے ریحان کو ہر حال میں دیکھا اور اس کا ساتھ دیا ۔۔۔" اُوما کھانس کر کہہ رہی تھ

"جنگ سے پہلے کے لندن میں طالبِ علم۔ ڈھاکے میں باؤل فقیر کے بھیس میں انڈر گراؤنڈ انقلابی۔ آدرش وادی۔ ردھینک۔ پارٹیشن کے بعد کلکتے میں سرگرداں پریشاں حال۔ پھر کامیاب لیڈر۔ چندا منسٹر۔ اور اب تم اسے بنگلہ دیش کا نیا ٹائی کُون دیکھ کر آ رہی ہو ۔۔۔ اب وہ مجھے مدتوں خط بھی نہیں لکھ پچھلے دنوں اس کا امن پرست شاعر لڑکا کلکتہ آیا تھا۔ میں نے ٹیلی ویژن کے یُوتھ پروگرام میں اسے دیکھا۔ مجھ سے ملنے تک نہ آیا۔" اچانک انہوں نے پینترا بدل کر کہا۔ "دیپالی۔ تم بہت خوش قسمت ہو۔ تم مجھ سے ہمیشہ بازی لے گئیں۔"

"آپ کا ایسا خیال ہے اُوما دیدی؟" اس نے سکون کے ساتھ کہا۔ معلوم ہوتا تھا محمڈن اسپورٹنگ اور موہن بگان کے فٹ بال میچ کے خاتمے پر دو خواتین کھیل کے متعلق تبادلۂ خیالات کر رہی ہیں۔

الم ایک مہیب سیاہ پرندے کے مانند اڑتا ہوا آیا اور سر جھکا کر پر پھیلا کر ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔

بیرہ حاضر ہوا۔ "مس صاحب۔ گاڑی تیار ہے۔"

"چلو۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔" اُوما رائے نے دیپالی سے کہا۔

وقت کا کپالک کھوپڑیوں کی مالا پہنے۔ عصا میں گھنٹیاں اور جھنڈیاں لگائے آگے آگے چل رہا ہے

"کلب —؟"

"نہیں۔ مندر۔ ماں کے مندر۔"

اُومارائے پہلے لامذہب تھیں۔ اب مذہبی ہوگئی تھیں۔ برہمو خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور ایک جیانک۔ بے جان، گروٹسک مورتی کی پرستش کرنے کے لیے جا رہی تھیں۔ ان میں اور جاہل کھنوتارنی دیبی میں ندگی نے کیا فرق باقی رکھا۔

وہ دونوں برآمدے کی مرمریں سیڑھیاں اتر کر کار میں بیٹھیں۔

"کالی گھاٹ —؟" شوفر نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ بیلوُر۔" مالکن نے جواب دیا۔

بیلور مٹھ کے ایک مرمریں ہال میں درگا کی بڑی مورتی کے سامنے سندھیا کی آرتی اتاری جا رہی تھی۔ راحاطے میں چند تلک دھاری یوروپین اور امریکن سنیاسی ٹہلتے پھر رہے تھے۔ پھاٹک پر کالی کی خوفناک دیریں بک رہی تھیں۔

پوجا کے بعد وہ دونوں باہر آئیں۔ ایک طرف درختوں کا جھنڈ تھا۔ ڈالیوں پر بندر جھول رہے تھے۔ پیڑ کے نیچے گھنے سیاہ بالوں کا جوڑا کنپٹی پر بنائے ایک یوگنی دھیان میں محو آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ بھیروی اور "بادلوں کو کھینچنے والی" میگھ رنجنی راگنی کے مانند دنگالی یا بنگالی بھیرو راگ کی ایک ن قدیم، پراچین بنگال کی راگنی ہے۔ سارے راگ راگنیوں کی طرح اس کے "نادمایا روپ" سے علیحدہ اس دیوتا مایا روپ" یا سائیکک پیکر کا بھی تصور کیا جاتا ہے یوں کہ بنگالی راگنی شیو کی ایک یوگنی ہے جو گھنے ا اپنی کٹی کے سامنے ایک مرگ چھالا پر بیٹھی ہے۔ درختوں پر بندر اور مرگ چھالا کے پاس ایک شیر ببر موجود ہے بیلور مٹھ کے کنج میں بیٹھی یہ بنگالی بیراگن بنگالی راگنی نہیں تھی۔ کوئی معمولی کمزور عورت تھی جس نے شاید گھریلو مسائل سے تنگ آ کر یا بیوہ ہونے کے بعد سنیاس لے لیا ہوگا۔ یا وہ بال ودھوا تھی یا کیا پتہ وہ سچ رفتہ ہو۔ دیپالی نے حیرت سے سوچا۔ وہ اور اُومارائے کنج سے گزر کر ایک سنسان صحن میں داخل ہوئیں۔ بھی مکمل سناٹا تھا۔ وہ ایک منڈیر پر بیٹھ گئیں۔ اُومارائے نے اپنی سینڈلز نیچے گرا دیں۔ پاؤں منڈیر پر ۔ مراقبے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ دیپالی نے بھی اپنے سینڈلز نیچے گرائے پاؤں منڈیر پر سمیٹ لیے۔ ان

دونوں کے جوتے سنگی، سپاٹ زمین پر اِدھر اُدھر پڑے نہایت مضحکہ خیز اور قابلِ رحم معلوم ہوئے۔ دیپا نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ایک لنگور درخت کی شاخ پر بیٹھا اُسے بڑے غور سے ملاحظہ کر رہا تھا۔

"کال راتری!" دیپالی نے ہنس کر کہا۔

"کون ـــ؟" اُوما دیوی نے چونک کر دریافت کیا۔

"کوئی نہیں۔" دیپالی نے ذرا کمینے پن سے کہا۔ "کال راتری۔ شِو کے گھر کا ایک بھُتنا۔ لنگور روپ میں۔ آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ غائب ہو گیا۔"

اس وحشتناک بھورے کواڈرینگل میں چاروں طرف آنجہانی منٹھ دھاریوں کے خالی حجرے بہت اسرار معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے خالی پلنگوں کے اوپر ان کے کھڑاؤں رکھے تھے۔ ہم اپنے جوتے دنیا ہی میں چ
جاتے ہیں۔

سامنے چوڑا دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کالی اور بھیرو کے دس دس ہاتھوں کے مانند بانہیں پھیلائے ا
کی سطح پر بہہ رہے ہیں۔ نروان کی کیا ضرورت ہے۔ کسی نے کہا تھا۔ پانی پانی میں مل گیا۔ میں شکر بننا نہیں چ
شکر کھانا چاہتا ہوں۔

اس کی یاد خوشبو کا بھیس بدل کر ہزاروں میل دور رین ٹری کے سائے میں ٹری ٹاپ ہاؤس کے
بھی پہنچے گی۔

اور نگین ناؤ والے مانجھی۔ تو جوار کے ساتھ آیا نہ بھاٹا کے ساتھ۔ شہد جیسے چیت مہینے میں کوئلیں
پُوس کی چاندنی میں مچھیرے مچھلی پکڑنے گئے۔ پُشپ بن میں بھنورے گونجے۔

محبت کی باؤلی نو کا خشکی پر بھی چلتی ہے۔

غلط۔ بالکل غلط۔

ایک قتل کر دی گئی۔ ایک نے خودکشی کر لی۔ ایک جلاوطن ہے۔

اور اُوما رائے برگد تلے منڈیر پر بیٹھی سر جھکائے آہستہ آہستہ دھونکنی کی طرح کھانس رہی ہیں۔

قہرناک کالی ـــ قہرناک۔ رحیم۔ مادرِ عظیم "تیری قربان گاہ میں میں نے لو دینے کی پتیوں اور
چاول اور موت اور زندگی کے نذرانوں سے انجلی سجائی۔ اُوما ہماوتی۔ میں تیرے لئے کلیاں اور جنگل کی
لے کر آئی ہوں۔ امبیکا پاروتی۔ سارے سکھ اور سارے دکھ تیرے لئے۔ گری جا شمبھوی۔" درختوں نے سرسرا

ہرایا۔ ڈالیاں آدمیوں کے ہاتھوں کی طرح ہلنے لگیں۔ شیل پُتری بخشا دعا کانی دُرگا۔ گیری ددھر۔ دخترِ کوہ

جب رام پرشاد سین ماں ماں پکارتے پکارتے عاجز آ گئے تھے تو انہوں نے کہا تھا۔ ماں۔ ماں مت رو۔ پتہ نہیں وہ مر چکی ہے۔ ورنہ آتی کیوں نہیں۔

اوما رائے اپنی دولت اور اپنے پوڈلز اور اپنے ملازموں کی دُسراتھ میں دنیا میں بالکل تنہا تھیں۔ اچانک انہوں نے سر اٹھا کر بڑے اضطراب سے کہا: "مجھے کوئی اچھی خبر سناؤ۔ میری زندگی ں اچھی خبریں بہت کم ہیں۔"

"اچھی خبریں میرے پاس بھی بہت زیادہ نہیں ہیں اُوما دیدی۔" دیپالی نے کمینے پن سے جواب دیا۔

ہ دو بوڑھی بلیاں تھیں جو ایک سنسان گلی میں برگد تلے اپنے اپنے پنجے تیز کئے ایک دوسرے کے مقابلے پر وجود تھیں۔ چند لمحوں بعد دیپالی نے کہا: "جہاں آرا مع اپنے سارے خاندان کے گولی سے اڑا دی گئی۔"

"اور کوئی بری خبر سناؤ۔"

"یاسمین مجید نے خودکشی کر لی۔"

"اور ـــــ"

"اور اس سے پہلے جہاں آرا کی چھوٹی بہنیں ہوائی جہاز کے حادثے میں ہلاک ہوئیں۔ آلپس کے پہاڑوں پر جہاز گرا۔ اُن کی لاشوں کا پتہ تک نہ ملا۔" وہ ایک مردہ خانہ کے ہیڈ چوکیدار کی طرح اب ذرا تفصیل سے بیان کرنے لگی۔ "اور جہاں آرا جب ماری گئی اس کے خون کے چھینٹوں سے سارا کمرہ لال ہو گیا اور اس بھیجا نکل کر دیوار سے چپک گیا۔ اور نواب قمرالزماں کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ـــــ"

"اور کوئی بری خبر سناؤ۔"

"میرے بابا۔ آپ کے سابق ہینڈسم منگیتر بنوئے چندر سرکار کینسر سے مرے۔ بہت سخت تکلیف سے جان نکلی۔ آخر وقت میں ان کی شکل دیکھی نہ جاتی تھی۔ اور ان سے دو سال پہلے میری پھوپھی بتو مارنی بی اندھی ہو کر مریں ـــ اور اتنا شدید بلڈ پریشر کہ پاگلوں کی طرح چیختی تھیں۔"

"اور کوئی بری خبر سناؤ۔"

ہ اٹھارہویں صدی کا بنگالی شاعر اور کالی بھگت۔ جس سے ایک مرتبہ اس کے گیت شاہی بجرے میں سفر تے ہوئے نواب سراج الدولہ نے بھی سنے تھے۔

" اور ـــ آپ سامنے دیکھ رہی ہیں ـــ وہ اُدھر دیکھیئے ۔ پریتوں[1] کے منہ سے آگ نکل رہی ہے ۔ [2] شوچی مکھ بھوت آپ کے تعاقب میں ہیں ۔ اور میرے تعاقب میں ۔ زمانہ مغرور انسانوں کو کچل کر رکھ دیتا ہے "

" اب تم کالی کے روپ میں میرے سامنے ظاہر ہوئی ہو ۔ " اوما رائے نے خائف ہو کر کہا ۔

" ہم اپنی جونیں اسی طرح بھگتائیں گے ۔ کالی بھی مر چکی ہے ۔ سورج ٹھنڈا پڑنے والا ہے ۔ " دیپالی سرد مہری سے جواب دیا ۔ " میں اپنے باپ اور بھوپی کی راکھ لے کر ہردوار جا رہی ہوں ۔ راستے کا انت ہے ۔ سنئے اُدما دیبی بیلود مٹھ کے سنیاسی کیا گاتے ہیں ۔ میں آپ کو سناؤں ـــ ' دنیا کے اس ہاٹ میں ماں بیٹھی اپنی پتنگ اڑا رہی ہے ۔ لاکھوں ڈوروں میں سے وہ ایک ڈور کاٹ دیتی ہے ۔ اور جب پتنگ کٹ کر بیکراں وسعت میں پہنچ جاتی ہے تو ماں ہنس کر تالی بجاتی ہے '[3]

۴۶

بھیرو راگ

آخر شب کی بیکراں تاریکی میں بوئنگ جیٹ فضائے بسیط میں تیر کی طرح نکلتا چلا گیا ۔ پھر اس کی جگ مگ کرتی روشنیوں کو گھپ اندھیرے نے نگل لیا ۔ تاریکی اور آسمان میں گھرے اس فولادی پنجرے میں کئی سو اجنبی آتماؤں کے ساتھ محصور غیر اہم بے معنی دیپالی سین نے غیر اہم بے معنی یاسمین بلمونٹ کی ڈائری ٹٹولا جو اس کے بیگ میں محفوظ تھی ۔ اسے میں واپس لے آئی ۔ کس کو دوں ۔ کوئی اس کا وارث نہیں ۔ خود میرا دیپالی سین کا کوئی وارث نہیں ۔ ہر انسان اپنا آغاز اور انجام خود ہے ۔ لیکن شاید یاسمین بلمونٹ کی ایک وارث موجود ہے ـــ ناصرہ نجم السحر قادری ۔ شاید ۔

ٹوکیو ۔ ہونولولو ۔ سان فرانسسکو ۔ پورٹ آف اسپین ۔ بہت لمبا سفر ہے ۔ وقت کا اند سفر اور بیرونی ۔ اور اس کے آگے ہڈیاں بہا کر لے جانے والے دریا کا سفر ۔ اور قبر کے کیڑوں کی زمین دو سافت ۔ دفعتاً اسے بڑی شدید طمانیت محسوس ہوئی ۔ وہ ابھی زندہ ہے ۔ زندگی بڑی نعمت ہے

---

[1] مردہ خور بھوت [2] سوئی جیسے باریک منہ والے بھوت

[3] رام پرشاد سین کا ایک بھجن ۔

اسمین نے اپنی ڈائری میں نتک بجو لکھا تھا۔ IT WAS GOOD KNOWING YOU, WORLD!

اس کے برابر بیٹھے ہوئے امریکن نوجوان نے پوچھا۔ "انڈین ــ؟"

"اوورسیز انڈین ــ ویسٹ انڈیز۔"

"اوہ ــ! جمیکا ــ کنگزٹن ٹاؤن ــ؟"

"ٹری نیڈاڈ ــ پورٹ آف اسپین۔"

اچانک بڑی مسرت کے ساتھ اسے اپنے گھر کا خیال آیا۔ اسپینش کولونیل مینشن۔ وسیع باغ الہ۔ رین ٹری کا جھرمٹ۔ کلپسو میوزک۔ مسٹریس سرسوتی۔ مسٹریس خیر النساء۔ قابل اعتبار غیر دلچسپ نوہر للت سین۔ اس کی اپنی آرام دہ خوبصورت متموّل دنیا۔ خوشگوار موسم۔ موسیقی۔ لذیذ کھانے سیر و سیاحت I SHOULD COUNT MY BLESSINGS اُس نے یک لخت بے انتہا ؤفزدہ ہو کر سوچا۔ ہوا میرے باپ۔ دھرتی میری ماں۔ اگنی میرے دوست۔ پانی میرے عزیز۔ آسمان میرے بھائی۔ تمہارے ساتھ رہ کر جنم ملتا ہے۔ انت سمے تم کو سلام بھیجتا ہوں۔ یوگیشور[1] نے کہا تھا۔

اور بیسویں صدی کے نصف آخر کے بنگال کی رقاصہ یاسمین مجید نے لکھا تھا۔ موہنڈتی نہیں۔ للتا ہیں ــ ہنڈول ــ موسم بہار کا بیلے۔ ساری کائنات کا بیلے۔

کہ اپنی ساری بدی اور رذالت اور کمینگی کے باوجود دنیا بڑی سہانی جگہ ہے۔ قابلِ قدر

اس نے کھڑکی سے ناک چپکا کر باہر دیکھنا شروع کیا۔ گھپ اندھیری رات۔ چند لمحوں میں صبح کاذب نیچے سیاہ سمندر اب نظر آنے لگا۔ اوپر سیاہ آسمان۔ تخلیق کی اوّلین رات ــ ہیبت ناک، لرزہ خیز بھیرو کے سُر۔ آہستہ آہستہ ــ بہت مدھم اُجالا ــ اب میں بھیرو راگ کا دھیان کرتی ہوں۔ اُس نے آنکھیں ندکیں۔ شبھ۔ سپید پوشاک۔ ششی دھر[2]۔ گلے میں مالا۔ حلق میں زہر۔ رکت نیترہ۔ خون سی سرخ آنکھیں۔ اتوں میں جگمگاتے کنڈل۔ مخمور بجتے جیسے دیوتا گاتے ہیں ــ آنکھیں کھولیں۔ افق پر ہلکی سی سپیدی آچلی تھی۔ اپنا نرسنگھا پھونکتا شُدھ بھیرو ساری کائنات ــ اُس نے بہت آہستہ آہستہ مختلف سُرگمیں گنگنانی شروع کیں۔ رشو بھیرو۔ ونگالہ بھیرو۔ آنند بھیرو ــ غنودگی سی آگئی۔ وہ راگ کے سُروں پر تیرا کی۔

---

[1] نویں صدی بنگال کا سنسکرت شاعر [2] سر پہ ہلال

پھر اس نے جھانک کر باہر دیکھا۔ اب پو پھٹ رہی تھی۔ اب مجھے بھیرو راگ میں شِو مہاکال کی تقدیس کرنی چاہیے۔ وہ اندر ہی اندر ایک بنگلہ بھجن گنگنانے لگی۔ پھر باہر نظر پڑی۔ بہت ہی خوبصورت منظر تھا۔ حدِّ نگاہ تک شفاف پانی اور شفاف آسمان۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ کس کا خیال کروں؟ مہاکال اور مہاکالی پر تو دھیان نہیں جمتا۔ شو اور شکتی، دونوں فیل ہو گئے؟ اندر ہی اندر بہت سے گیت چیتے ہیں۔ کس پر دھیان لگاؤں۔ اور کون سا راگ گاؤں۔ اندر ہی اندر بہت سے گیت راگ ——

نیچے بحیرۂ چین کی موجیں پگھلی چاندی معلوم ہو رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ اُجالا پھیلا۔ سوریہ ٹھاکر سنہرا نوہ ماسک پہنے جاپان کے اوپر نمودار ہو رہے تھے۔

لاکھوں برس سے سورج اسی طرح طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے۔ اور طلوع ہوتا ہے۔

اور غروب ہوتا ہے اور طلوع